2145

توحید القرآن

مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری

مصباح القرآن ٹرسٹ
۱۰۔ گنگارام بلڈنگ شاہراہ قائد اعظم، لاہور

2145
نجفی کیسٹ لائبریری
(شعبہ کتب)
بیت السجاد - مقابل نشترپارک
سولجر بازار — کراچی

NAJAFI BOOK L
Managed by Masoomeen Welfare Trust (R)
Shop No. 11, M.L. Heights,
Mirza Kalej Beg Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400, Pakistan

توحید القرآن

مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری

مصباح القرآن ٹرسٹ
۱۰۔ گنگارام بلڈنگ، شاہراہ قائداعظم، لاہور

نام کتاب ـــــــ توحید القرآن
مولف ـــــــ مولانا محمد ہارون زنگی پوری
ناشر ـــــــ مصباح القرآن ٹرسٹ
کتابت ـــــــ محمد یوسف خوشنویس
مطبع ـــــــ معراج دین پرنٹرز
تاریخ اشاعت ـــــــ شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ
ہدیہ ـــــــ ۵۰/ روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر

۲۳ - الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

نجفی کیسٹ لائبریری
(شعبہ کتب)
بیت السجاد ۔ مقابل نشتر پارک
سولجر بازار — کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

توحید ایک زندہ حقیقت، زندہ عقیدہ اور دین کی محکم بنیاد ہے۔ زیرِ نظر کتاب توحید القرآن۔ اس زندہ عقیدے کے بارے میں ایک زندہ کتاب ہے، اس کے مؤلف۔ مولانا سید محمد ہارون قبلہ زنگی پوری۔ دنیائے علم و فضل کے آفتاب ہیں اور یہ کتاب ان کے باقیاتِ صالحات میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

یہ قابلِ قدر کتاب دراصل منکرینِ خدا کے اشکالات کو رفع کرنے کے لئے ہے جو ضمنی طور پر دیگر مذاہب کے عقیدۂ توحید پر بھی بحث کرتی ہے۔ تاکہ ذاتِ واجب الوجود کے اثبات کے ساتھ ساتھ اسلام کے عقیدۂ توحید کی فوقیت بھی واضح ہو جائے۔

چونکہ منکرینِ خدا کے مقابل توحید کے متعلق اسلام کے دلائلِ نقلیہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتے تھے، اسلئے مؤلف بزرگ نے اپنی گفتگو کی بنیاد دلائلِ عقلیہ پر رکھی اور ان کی تائید میں دلائلِ نقلیہ پیش کئے ہیں۔ یوں اس کتاب کا طرزِ استدلال عام علمائے اسلام کی روش سے بالکل جدا نظر آتا ہے کیونکہ ان کی بحث کا دارومدار دلائلِ نقلیہ پر ہوتا ہے اور دلائلِ عقلیہ صرف تائید کی خاطر لائے جاتے ہیں۔

اس گرانقدر کتاب میں اثباتِ واجب الوجود کے لئے دلائلِ عقلیہ کا آغاز اسطرح کیا گیا ہے:

"جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اسی نے تمہارے کھانے کے واسطے پھل پیدا کئے پس کسی کو خدا کا ہمسر نہ بناؤ، حالانکہ تم جانتے ہو۔"

(سورۃ البقرہ - آیت ۲۲)

اس آیت میں زمین، آسمان، بارش اور پھل کو خداوند عالم کے وجود کے دلائل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ چاروں چیزیں اتنی واضح اور عیاں ہیں کہ ان کے موجود ہونے میں کسی باہوش انسان کو شک ہو ہی نہیں سکتا۔ جب وہ ان میں سے ہر ایک کے وجود میں آنے پر غور کرے گا تو فعل و فاعل کے عمومی عقلی اصول کے مطابق یہ ضرور سمجھے گا کہ ان کو وجود میں لانے والا کوئی نہ کوئی فاعل بہرصورت موجود ہے۔

اس کے علاوہ اس کی توجہ اس طرف بھی ہوگی کہ کوئی ایک یا سارے انسان مل کر بھی ان چاروں چیزوں میں سے کسی ایک کے وجود لانے کی ہمت اور صلاحیت نہیں رکھتے۔ پس وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان اشیاء کا پیدا کرنا انسان کے ماسوا کسی اور ہستی کا فعل ہے۔ اب خواہ وہ نظر آئے یا نظر نہ آئے۔ مگر اس کا فعل بتا رہا ہے کہ اسے موجود ہونا چاہیے اور جسے موجود ہونا چاہیے۔ وہی واجب الوجود ہے۔

یہ تھا ان پر ہر چہار دلائل عقلیہ کا اجمالی تذکرہ اور ان کا نتیجہ۔ لیکن اگر ایک انسان ان کا تفصیلی جائزہ لینے لگے تو وہ ان میں ایسا نظم و ترتیب پائے گا کہ ان کے پیدا کرنے والے کی حکمت و قدرت کو دیکھتے ہوئے اسے خالق کے علاوہ حکیم اور قادر بھی تسلیم کرلے گا۔

⁂ وہ زمین کے کسی پائیگاہ کے بغیر قرار پانے کے ساتھ ہی اس کی وسعتوں

پہاڑوں، میدانوں، صحراؤں، دریاؤں اور سمندروں پر نگاہ ڈالے گا تو اس کے دل و دماغ پر ان کے پیدا کرنے والے کی عظمت کے نقش ہو جائیں گے۔

۳۔ وہ آسمان کے بغیر کسی ستون کے ٹھہرا رہنے کے علاوہ ان کے بے حساب سیاروں، ستاروں اور ان کے حیرت انگیز نظام کو دیکھتے ہوئے ان کے خالق کی بے پناہ قدرت کا قائل ہو جائیگا۔

۴۔ وہ بلندیوں سے بارش کے برسنے کو دیکھ کر ایک خاص انتظام سے باخبر ہوگا اور سورج کے چمکنے، بخارات کے اٹھنے، بادلوں کے چلنے، بارش کے آنے، دریاؤں کے بہنے اور سمندروں میں جا گرنے سے اس فاعل حقیقی کے وجود کا پتہ پائے گا۔

۵۔ وہ پھلوں یعنی زمین سے اگنے والی اجناس، درختوں، پودوں، پھولوں اور پھلوں کی مختلف صورتوں، رنگوں، خوشبوؤں اور ذائقوں میں غور و فکر کرنے سے خالق کائنات کی ذات و صفات سے آگاہی حاصل کرے گا۔

ان چار دلائل عقلیہ کے علاوہ مؤلف بزرگ نے ذات واجب الوجود کے موجود ہونے کی آٹھ نشانیاں بھی بتائی ہیں جو زبان حال سے اپنے خالق کی موجودگی کا اعلان کر رہی ہیں۔

(۱) آسمان کی خلقت (۲) زمین کی پیدائش (۳) دن رات کی آمد
(۴) پانی پر کشتی کا چلنا (۵) بارش کا بلندیوں سے برسنا (۶) حیوانات کی پیدائش (۷) ہواؤں کا چلنا (۸) فضا میں بادلوں کا چھانا

مذکورہ بالا چار دلائل اور آٹھ نشانیوں کو ذات واجب الوجود کے مظاہر قدرت اور اس کی ذات کے اثبات کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے مؤلف علام نے ان

پر فلسفیانہ بحث فرماتے ہوئے ان کی تائید میں شیعہ و سنی مصادر تفسیر و حدیث سے بہترین شواہد نقلیہ پیش کئے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے منکرین خدا کے اشکالات کو مضبوط دلائل کے ساتھ خالص علمی انداز میں برانداخت کیا ہے۔ نیز ہندو، بدھ، پارسی، عیسائی اور یہودی مذاہب کی کتب میں درج توحیدی نظریات کا قرآنی توحید سے انصاف پسندانہ موازنہ بھی کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا عقیدۂ توحید دیگر مذاہب کے مقابلے جامع اور کامل ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے قرآنی تصریحات کی روشنی میں ارضیات و فلکیات کے متعلق سائنسدانوں کے تصوّرات کو غلط ٹھہرایا ہے۔

گویا کہ توحید القرآن وہ معرکہ آرا تالیف ہے کہ جس میں بیک وقت منکرین خدا کے مفروضات، دیگر مذاہب کے لغویات اور سائنسدانوں کے مفروضات کی ٹھیک ٹھیک تردید کی گئی ہے اور تعلیمات اسلامیہ کی کاملیت روز روشن کی طرح واضح کر دی گئی ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ نے اس نوّے سالہ قدیم اور زندہ کتاب میں محفوظ اپنے علمی ورثے کو ابنائے قوم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے اب ان کا کام ہے کہ اس سے بھرپور استفادہ کریں اور اس کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹا کر مراتب اسلام و قرآن میں لیت فرمائیں۔ وباللہ التوفیق

طالبانِ تعاون

اراکین مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ا۱ر فروری ۱۹۹۰ء

۲۱۱۶

فہرست

باب	عنوان	صفحہ
پہلا	غایت وجودِ انسان	۹
دوسرا	توحید خدا تعالیٰ	۲۱۲
تیسرا	بتوں، ستاروں اور درختوں وغیرہ کی عبادت کی ممانعت	۲۴۸
چوتھا	اس بیان میں کہ اس کے بیوی ہے نہ بچہ	۲۶۵
پانچواں	ذات خدا تعالیٰ کے بارے میں غور کرنا کچھ مفید نہیں	۲۷۷
چھٹا	دینِ حنیف اور فطرت اللہ اور صبغۃ اللہ کے بیان میں	۲۸۴
ساتواں	باری تعالیٰ کی قدامت کے بارے میں بیان	۲۹۰
آٹھواں	عدم جسمانیت خدا	۲۹۴
نواں	رؤیت خدا تعالیٰ کی ناممکن ہے	۳۳۲
دسواں	علمِ خدا تعالیٰ کے بیان میں	۳۵۰
گیارہواں	مسئلہ بداء	۳۷۱
بارہواں	قدرت وارادۂ خدا	۴۰۰
تیرھواں	خدا تعالیٰ ہر شئے کا پیدا کرنے والا ہے	۴۰۸
چودھواں	کلام خدا تعالیٰ کے بیان میں	۴۱۷
پندرھواں	اسمائے خدا تعالیٰ کے بیان میں	۴۲۳
سولھواں	باب جوامع توحید	۴۲۹

غایت وجود انسان

نشهد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ ولا عدیل و لاخلف لقولہ ولا تبدیل ھو الحی القیوم بدیع السمٰوٰت و الارض الذی جعل فی السماء بروجًا وجعل فیھا سراجًا وقمرًا منیرًا والذی جعل اللیل والنھار خلفۃ لمن اراد ان یذکر او اراد شکورا ونشھد ان النبی الامی الذی یجدون مکتوبًا فی التوراۃ والانجیل محمد رسول اللّٰہ وخاتم النبیین و اکرم الاولین والآخرین صلی اللّٰہ علیہ وآلہ المیامین المطھرین المعصومین المکرمین من یومنا ھٰذا الیٰ یوم الدین۔

اما بعد مخفی نہ رہے کہ بہترین اشیاء عالم علم ہے اور بہترین علوم علم المعرفت یعنی خدا تعالیٰ کی ذات وصفات وکمال وجمال وجلال کی معرفت بقدر امکان طاقت بشریہ حاصل کرنی۔ یہی غایت وجود انسان۔ اور یہی نتیجہ عمر بشر۔ اگر انسان ایک طولانی مدت تک دنیا میں زندہ رہا۔ اور اس نے خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل نہ کی تو اس سے بڑا کوئی گناہ گار نہیں۔ کیونکہ جس کی نعمتوں میں زندگی بھر اٹھتا بیٹھتا سوتا۔ جاگتا۔ کھاتا پیتا۔ کروٹیں بدلتا رہا۔ جس کی نعمتیں تمام عمر اس کا اوڑھنا بچھونا رہیں۔ ایک ہلکا سا سانس بھی جس کی نعمت سے علیحدہ نہ لے سکا۔ ایک

خفیف سی حرکت بھی جس کی نعمت سے باہر نہ کر سکا۔ ایک پلک بھی بغیر جس کی نعمت کے نہ مار سکا۔ ایک قدم بھی جس کی نعمت سے الگ نہ اٹھا سکا اور ایک خیال بھی بغیر جس کی نعمت کے نہ دوڑا سکا۔ اگر اسی کی معرفت حاصل نہ کی تو کیا ایسے محسن کش احسان فراموش ناشکرے۔ خود غرض۔ کمینہ فطرت سے زیادہ کوئی قابلِ نفرت ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پھر اس سے بڑھ کر اگر خود ہی محسن و منعم اپنی معرفت کے اسباب بھی پیدا کر دے۔ دلیلیں بھی قائم فرما دے۔ راہنما بھی بھیج دے۔ نرم سے نرم اور ہلکے سے ہلکے اور سہل سے سہل لفظوں اور دلچسپ سے دلچسپ لہجوں میں ہدایت بھی کر دے۔ تب بھی اگر کوئی شخص اس کی معرفت حاصل کرنے کا ارادہ نہ کرے تو یقیناً انسانی خیال اس کی انتہائی قعرِ ذلت و خسران تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کی کمینہ فطرتی کے عمق تک کوئی عمیق فکر کی جا سکتی ہے۔

پس ہر انسان عاقل کا فرض ہوا کہ اپنا معتدبہ وقت اس کام میں صرف کرے اور جس طرح ہو سکے دلیل و تحقیق کی رُو سے اس کی معرفت حاصل کرے۔ رہی یہ بات کہ وہ دلیل یا تحقیق کہاں سے لینی چاہیئے؟ تو ان کے دو مقام ہیں ایک عقل ہے اور دوسری نقل۔ لیکن اگرچہ عقل مقدم ہے پھر بھی ہر شخص میں اتنی دماغی قوت اور ذہنی طاقت نہیں ہے کہ بجائے خود ہر مرحلہ علم المعرفت تک بغیر کسی راہنما کے پہنچ سکے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اس معاملہ میں کسی کو اپنا رہبر بنائے۔ لیکن یہ سوال کہ آخر کس کو راہنما بنائے۔ اس کا جواب صرف اسی قدر کافی ہے کہ اگر تلاش کرنے سے خود اسی کی بنائی ہوئی دلیلیں اور اسی کے عقلی ارشادات مل جائیں اور اُن ارشادات کی تشریحیں اسی کے بھیجے ہوئے اور مقرر کئے ہوئے معلموں سے مل سکیں تو اس سے بہتر کیا بات ہے۔ مگر یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ارشادات اس کی ہدایتیں اور عقلی تعلیمیں کہاں سے ہاتھ آئیں اور کیوں کر یہ یقین ہو کہ یہ تعلیمیں واقعی اس کی ہیں کیوں کہ اہلِ

دنیا نے تو اس معاملہ میں سخت اختلاف آپس میں پیدا کر رکھا ہے۔ حضرات اہلِ اسلام فرماتے ہیں کہ اس کی تعلیمیں قرآن مجید سے مل سکتی ہیں۔ آریہ دھرم اور برہمو سماج فرماتے ہیں کہ اس کا مخزن وید کے چار مجلدات ہیں۔ رگوید۔ یجروید۔ اتھروید۔ شام وید۔ بدھ مذہب کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ بودھ جی کی کتابیں اس کا معدن ہیں۔ پارسی صاحبان کا مقولہ ہے کہ زردشت نبی کی کتاب اس کے لئے اچھا ذخیرہ ہے۔ مسیحی حضرات کا یہ قول ہے کہ انجیل مقدس اس کی کان ہے۔ یہودی لوگوں کا خیال ہے کہ توریت مقدس یا طالمود سے بہتر کوئی کلام نہیں۔ جس سے اس معاملہ میں سبق لیا جائے اور ہر ایک فریق دوسرے فریق کی بنائی ہوئی کتاب کو غلط کہتا ہے۔ ہندو صاحبان قرآن کو۔ مسلمان صاحبان وید کو۔ پارسی انجیل و توریت کو۔ عیسائی ژند یا زند اور دساتیر کو۔ علے ہذا القیاس ہر ایک دوسرے کو غلطی پر سمجھتا ہے۔ پھر ایک ابتدائی جستجو کرنے والے کو ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیئے اور کیونکر اسے کسی ایک کی نسبت رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے۔

بے شک یہ سوال ایک حد تک قابلِ غور ہے لیکن ذرا تامل کرنے سے اس کا جواب خود بخود یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جب کسی ایک امر کے ثبوت کے بعد اس کے انداز و طرق و شان و وقوع میں اختلاف ہو تو اس سے اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ اصل امر تو واقع ہے لیکن چونکہ بیانات اس کی نسبت مختلف ہیں۔ لہذا بجائے خود ان بیانات پر عقل کی گہری نظر سے غور کرنا چاہیئے کہ حقیقت کا زرین لباس اور واقعیت کا مرصع تاج اور راستی کا گوہر آگین خلعت کس کے جسم و سر پر دکھائی دیتا ہے چونکہ عقل ہی تمام امور میں فیصلہ کرنے کے لئے قدرتی قاضی بنائی گئی ہے۔ اس لئے وہ بہت تھوڑے سے تامل میں اس کا فیصلہ کر سکے گی اور چونکہ ایسے قاضی کے فیصلے پر تمام کاموں کا مدار ہی قرار پایا ہے۔ لہذا جو کچھ وہ کہے اسے تسلیم کرنا چاہیئے بشرطیکہ اس نے تامل کے طریقوں میں غلطی نہ کی ہو اس کی تمیز بھی وہ خود ہی کر لے گی جب کہ مقررہ موازین پر اپنے خیالات کو

تو لے گی)۔

لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ وہ ان تمام دعووں کو پیش نظر کرلے اس کے بعد ہر ایک کو بالمقابلہ جانچے جو عقل صحیح کے نزدیک بالکل درست معلوم ہو۔ اسے قبول کرے اور اسی کا نام اس وقت "تحصیل معرفت بہ دلیل و تحقیق"، ہوگا۔

میں نے اس بارے میں نمونہ کے طور پر ہر مذہب کی توحید الالہ کتاب توحید الائمہ کے دیباچہ میں بیان کر دی ہے۔ جس سے ہر عقل منداچھی طرح محسوس کر سکے گا کہ اہلِ مذاہب کی رفتاریں بابا المعرفت میں کس کس راستے پر ہیں اور ان میں سے کون سیدھے راستے پر چلا ہے اور کون ٹیڑھے راستے پر۔ اور اس کے بعد مفصل طور پر اسلامی ریفارمروں کی تعلیمیں بھی دکھا دی ہیں۔ تاکہ کسی کو عذر نہ رہے۔

اس کتاب میں میرا ارادہ یہ ہے کہ جو دلائل معرفت و توحید قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں اور جن کی نسبت اسلام والوں کا یہ دعویٰ ہے کہ واقعی یہی صحیح ہیں اور باقی سب کے بیانات جو اس کے برخلاف ہیں وہ ناقابلِ قبول ہیں انہیں حتی الامکان توضیح و تشریح کے ساتھ بیان کروں۔ تاکہ تمام دنیا کے اہلِ مذاہب۔ کیا ہنود۔ کیا یہود۔ کیا عیسائی۔ کیا مجوسی۔ کیا بدھ مذہب والے۔ کیا نیچری سب لوگ دیکھ لیں۔ کہ اسلام کی اس کتاب کا بیان جسے یہ لوگ آسمانی کتاب کہتے ہیں۔ بمقابلہ ان تمام کتابوں کے جن کی نسبت آسمانی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے توحید کی بابت کیسا ہے اور کیا دنیا میں کوئی بھی کتاب اس سے زیادہ علم المعرفت سکھانے والی ہے یا نہیں اور اگر نہیں ہے تو کیوں اس کی اقتدا نہ کی جائے اور کیوں ہٹ دھرمی سے کام لے کر انجام کار اپنا خراب کیا جائے۔

قرآن مجید اگرچہ اول سے آخر تک بیشتر الٰہیات ہی کا سبق سکھاتا ہے اور نیز اس کے علاوہ ان امور کو بھی بیان کرتا ہے جو خدا تعالیٰ اور بندوں کے تعلقات کے متعلق ہیں یا رفاہ خلق کے مفید۔ مثلاً علم طب۔ علم الاخلاق۔ علم التواریخ۔ علم

تدبیر المنزل۔ علم سیاست مدن۔ علم ہیئت۔ علم نجوم۔ علم الامثال۔ علم الطبیعیات (سائنس) علم التشریح۔ علم الحیوانات۔ علم النباتات۔ علم الجمادات۔ علم النفس اور علم النوامیس بأتمہا و اکملہا جن کے متعلق انشاء اللہ بشرط امکان و فرصت مستقل بیانات اپنے اہل وطن کی خدمت میں حاضر کروں گا۔ لیکن اس وقت صرف معاملہ توحید و ذات و صفات و نفی تعدد الٰہ۔ وغیرہ کے متعلق جو بے شمار آیتیں قرآن مجید کی ہیں۔ اُن سے چند آیتوں کو منتخب کر کے ترجمہ و تفسیر مختصر کے ساتھ قوم کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور یہ رسالہ ان تمام مجموعوں کی ترتیب کا پہلا حصہ ہے۔ انشاء اللہ ان مجموعوں کے مطالعے سے معلوم ہوگا۔ کہ اسلام کی آسمانی کتاب الٰہیات و فلکیات و علم نبوت و علم طبیعیات وغیرہ علوم کا کیسا سبق تعلیم کرتی ہے اور یہ کیسی بے نظیر کتاب ہے۔ جس کی مانند دنیا میں کوئی کتاب نہیں۔ کیا بہ حیثیت ادائے مضامین جس سے مراد کمال فصاحت و بلاغت ہے اور کیا بحیثیت مضامین۔ پس اب میں خدا تعالیٰ کی مدد پر بھروسا کر کے تفسیر آیات اس طریقے سے شروع کرتا ہوں جیسے علمائے مذہب اسلام نے اختیار کیا ہے اور اس کی تائید انشاء اللہ سچے ہادیان کی تفسیر سے بھی کرتا جاؤں گا۔ وما توفیقی الا باللہ العلیم الخبیر۔

محمد ہارون زنگی پوری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب اوّل

تفسیر آیات اثبات صانع عالم مع بعض صفات جن پر یہ آیتیں مشتمل ہیں:

آیۃ اولیٰ سورہ بقرہ رکوع ۳۔ اَلَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ۝

اس آیت کی تفسیر کئی بیانوں میں واضح ہو گی:

بیان اوّل: تحقیق الفاظ کے متعلق ہے لفظ اَلَّذِیۡ اسم موصول ہے جس کے واسطے صلہ کی ضرورت ہے یہ ایک اسم مبہم ہے جو مذکر کے لئے بنایا گیا ہے اس کے مقابلہ میں اَلَّتِیۡ ہے جو مونث کے لئے ہے۔ جوہری کا بیان ہے کہ اَلَّذِیۡ اصل میں صرف لَذِیۡ اس پر الف لام تعریف کا داخل کر کے اَلَّذِیۡ کر لیا گیا ہے مگر اب یہ الف و لام جزو کلمہ ہو گیا ہے بغیر اس کے استعمال اس کا جائز نہیں ہے۔ اکثر استعمال اس کا اسی صورت سے ہوا ہے مگر واقعاً یہ لفظ چار صورتوں سے استعمال ہوا ہے ۱ اَلَّذِیۡ ۲ اللَّذِ بغیر حرف یائے تحتانی کے اور مکسور الذال المعجمہ ۳ اللَّذۡ بسکون ذال معجمہ بغیر یائے تحتانی ۴ اللَّذِّیۡ بتشدید ذال معجمہ اور بقائے یائے تحتانی اس کا تثنیہ تین طرح سے استعمال ہوا ہے۔

۱ اللَّذَانِ ۲ اللَّذَا بغیر نون ۳ اَللَّذَانِّ بتشدید نون۔ جمع اس کی دو صورتوں سے استعمال ہوئی ہے ۱ اللَّذِیۡنَ ہر حالت میں خواہ نصب ہو یا رفع ہو یا جر ۲ اللَّذِیۡ بغیر نون کے۔ بعض لوگوں نے حالت رفع میں اللَّذُوۡنَ بھی پڑھا ہے (مجمع البحرین) فِرَاش بکسر فا ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو بطور فرش کے بچھائی

جائے اس کی جمع فُرُش ہے اور مہاد اور بساط و فراش ہم معنی اور ہم وزن ہیں سَمَاءٌ مشتق ہے سُمُوٌ سے بمعنی بلند ہے اور یہ لفظ ہر اُس چیز پر بولا جاتا ہے جو بطور سقف کے کسی چیز سے اُوپر ہو۔ یہ لفظ مذکر و مونث دونوں صورتوں سے استعمال ہوا ہے اگرچہ تانیث اکثر ہے جمع اس کی سموٰت اور اسمیہ ہے ماءٌ اصل میں مَوَہٌ تھا۔ اسی وجہ سے جمع اس کی امواہ آئی ہے پانی کو کہتے ہیں۔ اَنْدَادًا جمع نِدّ کی ہے اس کے معنی مثل اور ہمسر کے ہیں۔ ندید بھی اسی کا ہم معنی ہے جیسا کہ جریر کہتا ہے۔

اَیتماً تجعلون الیَ نِدًّا   وما یتمٌ لذیٍ حسبٍ ندیدٌ

متعلق معنی۔ (عبادت کرو تم لوگ اپنے اس معبود کی) جس نے

بیان دوم: تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا (جس پر تم سو سکتے ہو اور آسمان کی چھت۔ اور آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعے سے تمہاری رزق رسانی کے واسطے پھل پیدا کئے۔ پس تم لوگ خدا کے لئے شریک نہ قرار دو۔ حالاں کہ تم جانتے ہو کہ (ان شرکا میں سے کوئی ان نعمتوں کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے پھر کیوں اوروں کو معبود سمجھتے ہو)۔

کسی چیز کے ثابت کرنے کے دو طریقے ہیں ایک بطریق نقل۔

بیان سوم: دوسرے براہ عقل۔ نقلی طریقہ صرف اس وقت کام آسکتا ہے جب کہ شخص مخالف (مقابل) اسے سچا مانتا ہو جس کا کلام دلیل میں پیش کیا جائے۔ مثلاً ایک مسلمان کے مقابلے میں کسی مسئلہ کی دلیل ہم حدیث رسولؐ سے پیش کریں تو اس کا نام دلیل نقلی ہوگا اور اس کا مصرف بھی درست ہوگا۔ یا ایک ہندو کے مقابلے میں کسی دعوے کے ثبوت کے واسطے وید کی عبارت پیش کریں تو یہ دلیل نقلی کہی جائے گی اور صدور اس کا بروقت سمجھا جائے گا بخلاف اس کے اگر ہم کسی عیسائی کے مقابلے میں قرآن مجید کی آیت کو دلیل قرار دیں تو اگرچہ بحیثیت نقل کے دلیل نقلی ہو گی لیکن مخالف (مقابل) کے مقابلے میں

وہ دلیل ہی نہ ہو گی۔ کیا نقلی اور کیا عقلی۔

عقلی دلیل برہانی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک لمی۔ دوسری انی۔ برہان لمی وہ ہے جس میں قیاس کا حد اوسط علت وجود حکم ہو جس طرح کہ علت تصدیق حکم ہے جیسے اس مثال میں ہے۔ علم نور ہے اور نور باعث ہدایت ہے نتیجہ یہ ہوا کہ علم باعث ہدایت ہے اس مثال میں لفظ نور جس طرح نسبت ہدایت الی العلم کے اثبات کی علت ہے اسی طرح ہدایت کی بھی علت ہے۔ اور انی وہ برہان ہے۔ جس میں حد اوسط وجود حکم کی علت نہ ہو۔ خواہ حکم کا معلول بھی ہو یا نہ ہو۔ جیسے اس مثال میں زید محموم و کل محموم متعفن الاخلاط نتیجہ یہ ہوا کہ زید متعفن الاخلاط لیکن زید کا تپ کرنا اخلاط کے متعفن ہونے کی علت نہیں بلکہ اخلاط کا متعفن ہونا تپ کی علت ہے اور دوسری مثال جس میں حد اوسط حکم کا معلول بھی نہ ہو یہ ہے زید انسان اور انسان ماشی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زید ماشی یعنی چلنے والا ہے اس مثال میں انسان جو حد اوسط ہے وہ نہ تو ماشی کا معلول ہے اور نہ علت وجود حکم ہے۔

بہر صورت انہیں دو ترکیبوں سے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے اور یہی اقوائے طرق اثبات مدعی ہیں مگر برہانی طریقہ چونکہ سننے والے کو قطعی یقین دلا دیتا ہے اس لحاظ سے اس کا استعمال زیادہ کیا گیا ہے اور علوم معرفت میں اس سے بہت مدد ملی ہے۔ کیوں کہ نقل کا ثبوت تو بعد معرفت ہے اور ابھی اصل معرفت ہی میں بحث ہے۔

چونکہ اہل دنیا کے دو فرقے ہیں ایک وہ لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ عز اسمہ وجل قدسہ کے وجود ذات وصفات کے قائل ہیں۔ دوسرے وہ۔ جو اس کے وجود کے منکر ہیں جنہیں عام طور پر دہریہ یا نیچری بھی کہتے ہیں۔ لہذا جو فرقہ کہ وجود خدا کا منکر ہے اگرچہ تھوڑا ہی سہی اس کے مقابلے میں خدا تعالیٰ کے وجود کے ماننے والوں نے ایسی دلیلیں پیش کی ہیں جو اس کے وجود وہستی کو منکرین کے

ذہن نشین کر دیں اور اس کی دو صورتیں کر دی ہیں ایک بذریعہ موجودات حسیہ اور دوسری بذریعہ مفہومات عقلیہ۔ لیکن اس مقام پہ جو دلیلیں مذکور ہوں گی تقریباً کل یا بیشتر وہی ہوں گی جو موجودات حسیہ کے ذریعہ سے ہوں گی۔ کیونکہ محسوسات سے کسی مطلب کا سمجھنا آسان ہوتا ہے بہ نسبت عقلی مفہومات کے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں اسی امر کا بیشتر التزام کیا گیا ہے تاکہ انسان جو ابتدائی نشوونما سے اس بات کا عادی ہو رہا ہے کہ محسوسات سے ادراک مطالب کرے اُسے سہولت واقع ہو اور مشکل مسائل منطقیہ و فلسفیہ میں پڑ کر حیران و سرگرداں نہ رہ جائے کہ ادھر کا رہے نہ اُدھر کا۔ لہذا ان آدمیوں کے واسطے جن میں عموماً سوائے چند مستثنیات کے سب کی نظریں محسوسات ہی تک محدود ہیں۔ اس کلام مجید میں وجود پروردگار عالم پہ یہ دلیل پیش کی گئی کہ ایھا الناس تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنا کر پیدا کیا اور آسمان سے مینہ برسایا اور اس نے تمہارے رزق کے لئے پھل پیدا کئے۔

اس کلام مقدس میں ایسی حسیّ چار دلیلیں بیان کی گئی ہیں جو فوراً سمجھ میں آسکیں اور غور کی بھی ضرورت نہ پڑے ایک زمین کو پیدا کر کے اُسے فرش بنانا دوسرے آسمان کو پیدا کر کے اُسے چھت بنانا۔ تیسرے بلندی سے مینہ برسانا۔ چوتھے پھل پیدا کرنے۔

خلاصہ دلیل یہ ہوا کہ یہ چار چیزیں ایسی ہیں جو پروردگار کو ثابت کرتی اور یہ بتاتی ہیں کہ ان کا خالق سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہے تحریر دلیل یہ ہے کہ یہ چاروں چیزیں حادث ہیں۔ ان میں سے دو کا حادث ہونا تو بدیہی ہے اور مشاہد ہے یعنی مینہ اور پھلوں کا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مینہ نہ تھا مگر جب ابر اُٹھا ہوا چلی خوب پانی برسا اور علیٰ ہذا القیاس پھل کی حالت ہے کہ جب پانی برستا ہے اور اس کے ذریعہ سے درخت اُگتے ہیں۔ ان میں نشوو

نما ہوتا ہے پھر پھول آتے ہیں۔ تب پھل لگتے ہیں اور دو کا حادث ہونا نظری ہے۔ یعنی آسمان و زمین کا۔ لیکن ان کے حدوث اور عدم سے وجود میں آئے ہوئے ہونے پر یہ دلیل ہے کہ دراصل خواہ حرکت ہو خواہ سکون دونوں ہی حادث چیزیں ہیں اور جس میں حادث چیز پائی جائے وہ بھی حادث ہوتا ہے پس چونکہ آسمان میں حرکت اور زمین میں سکون ہے۔ لہذا یہ دونوں بھی حادث ہیں اور جو چیز کہ حادث ہے یعنی کہ عدم سے وجود میں آئی ہے اس کا کوئی نہ کوئی فاعل ضرور ہونا چاہیئے کیونکہ جو چیز معدوم ہے اس میں خود اس بات کی قابلیت کہاں ہے کہ موجود ہو جائے۔ لہذا کسی نہ کسی موثر کی احتیاج ضروری ہے جو اسے پیدا کرے اور جب ایسی چیزیں موجود ہیں تو لا محالہ ان کا موجود کرنے والا بھی ان سے پہلے موجود ہوگا اور وہی اللہ ہے جس نے انہیں موجود کیا۔ اگرچہ اس بیان میں جو تحریر دلیل میں لکھا گیا خود کئی ایسے مشکل دعوے ہیں جو بجائے خود بڑی بڑی بحثوں اور اقامہ دلائل پر موقوف ہیں لیکن چونکہ میری غرض اس اردو نویسی سے صرف اس قدر ہے کہ اہل ملک جو بڑی بڑی کتب کلامیہ اور مطالب فلسفیہ کو نہیں سمجھ سکتے وہ اس سے فائدہ اٹھائیں اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ حتی الامکان سہل اور مختصر لفظوں میں مطلب کو سمجھایا جائے۔ ورنہ اگر دقت مضامین اور اشکال منظور ہوتا تو خواہ مخواہ اس کتاب کو اردو میں کیوں لکھا جاتا کیوں کہ عربی زبان ایسے مضامین کے بیان کی زیادہ اہل ہے۔

تاہم اس بیان کو زیادہ واضح کر کے یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ فرض کیجیے یہی چار چیزیں زمین۔ آسمان بیج اور پھل۔ یا کسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں یا نہیں۔ اگر کہو کہ کسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو ہمارا مطلب حاصل ہے۔ کیوں کہ اسی پیدا کرنے والے کو تو ہم خدا کہتے ہیں اور اگر کسی کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہیں تو آپ سے آپ پیدا ہو گئے ہوں گے حالاں کہ کسی معدوم چیز کا آپ سے آپ موجود ہو جانا ناممکن ہے کیوں کہ اس کی ذات جب کہ خود ہی معدوم

ہے تو اس میں اثر و وجود پیدا کرنے کی کہاں قابلیت ہو سکتی ہے پس جب تک کہ کوئی خارجی چیز اس کے عدم پر وجود کو ترجیح نہ دے اس کا موجود ہو جانا آپ سے آپ محال ہے۔

نیز یہ کہ آسمان و زمین۔ پانی اور پھل ایسی ایسی عجیب و غریب حکمتوں پر مشتمل ہیں کہ جن کا وجود بغیر کسی بڑے مدبر حکیم کی تدبیر کے ہو نہیں سکتا مثلاً آسمان ہی کو لیجئے کہ مثل چھت کے ہمارے لئے قرار دیا گیا ہے۔ جس میں دو قسم کی لالٹینیں روشن ہیں۔ ایک بڑی لالٹین ہے جو دن میں روشن ہوتی ہے۔ جس کا فائدہ پھلوں کو پختہ کرنا۔ درختوں میں قوت نمو کا بڑھانا حیوانات میں قوت نمو کا زیادہ کرنا فواکہ کو شیریں بنانا۔ رطوبات زائدہ کا خشک کرنا۔ ہوا کو صاف کرنا۔ مسامات کو کھولنا۔ بخارات بدن کے لئے نکلتے رہنے کا سامان کرنا۔ زمین و دریا سے بخارات کا اٹھانا۔ جس سے ابر پیدا ہو سکے وغیرہ وغیرہ۔ دوسری وہ لالٹینیں ہیں، جو رات میں روشن ہوتی ہیں۔ جن میں لاکھوں ہی فوائد ہیں جو غور کرنے سے یا کتب نجوم وغیرہ پر نظر کرنے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک چاند ہے۔ جس میں پھلوں اور پتیوں میں شادابی پیدا کرنا۔ شدت حرارت ہوا میں اعتدال پیدا کر دینا۔ تاریکی شب میں راہ ملنے کا سہارا بننا وغیرہ بے شمار فوائد ہیں۔ پس اگر یہ چھت نہ ہوتی تو آخر یہ ستارے جو مثل لالٹینوں کے ہیں کہاں لٹکتے اور کیوں کر ان کا نظام حرکت قائم رہتا اور زمین کی مخلوقات کو کیوں کر وہ فائدے پہنچ سکتے جو اب پہنچ رہے ہیں۔ پھر اس کا رنگ ایسا ہونا جو بالکل انسانی نگاہ بلکہ حیوانی نگاہوں کے لئے مناسب اور مفید ہے اگر اس کا رنگ سُرخ یا سفید ہوتا تو اس پر نظر کرنے سے آنکھوں میں خیرگی پیدا ہوتی یا نور میں انتشار ہو جاتا اور اگر سیاہ ہوتا تو آنکھیں اس طرف دیکھنے سے نفرت کرتیں۔ لہٰذا سبز رنگ قرار دیا تاکہ آنکھوں کو اس طرف نظر کرنے سے فرحت حاصل ہو۔ بینائی کو قوت ہو۔ جو ضرر آفتاب کی تیز روشنی سے آنکھ کو پہنچا یا

پہنچ سکتا ہو اس کا بدل ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس اور بھی فوائد ہیں۔

پھر زمین کو دیکھو تو اس کی حکمتیں بھی نہایت عجیب ہیں اُس کا ایسا سخت ہونا جس پر انسان و وحوش بآسائش چل سکیں۔ جس طرح چاہیں اپنی معاش کی طلب میں آ جا سکیں۔ پھر اس قدر نرم ہونا کہ جب چاہو کھود لو چاہو اُسے کھود کر کنواں بناؤ۔ خواہ تھوڑا کھود کر کھیت بناؤ۔ خواہ اس میں بنیاد قائم کر کے عمارت اٹھاؤ۔ جب مینہ برسے تو وہ اس کے اندر جذب ہو سکے تاکہ کسی خاص وقت کے لئے ذخیرہ رہے اور نباتات کو اپنی اندرونی رطوبت سے غذا دیا کرتی رہے۔ نیز ایسی ڈلول بنائی کہ جس طرح چاہو اسے مسطح بناؤ۔ مکعب بناؤ۔ اس میں درخت لگاؤ۔ اس پر زراعت کرو۔ پھر اُسی کے اجزا مستحیل ہو ہو کر تمہارے لئے غذا بن سکیں نہ صرف تمہارے ہی لئے بلکہ تمام موالید ثلاثہ کے لئے۔ نیز یہ ایک اچھا ذریعہ اس بات کا ہے کہ آفتاب کی شعاعیں اس پر پڑ کر منعکس ہو سکیں اور جو جو فوائد انعکاس پر مترتب ہو سکتے ہوں وہ مترتب ہو سکیں۔

پھر مینہ کو دیکھو یہ کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ اسی زمین پر جو پانی مجتمع ہے یا اس کے اندر جذب ہو گیا ہے اُسے حرارتِ آفتاب یا خود زمین کی اندرونی حرارت بخارات کو بلند کرتی ہے اور وہ کرۂ زمہریر تک جاتے جاتے بستہ ہو کر ابر بن جاتے ہیں۔ پھر اُن میں ہوائے تیز اثر کرتی ہے اور وہ ابر بقدرت و حکمت غیبیہ جس کی نوعیت کو انسانی دماغ ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ پانی بن کر برس جاتا ہے تو اب اس کے فوائد کو دیکھو کہ اگر مینہ نہ برستا تو نباتات نہ پیدا ہوتی۔ اشجار نہ اُگتے۔ حیوانات کو اس سے شب و روز جو عظیم الشان منفعتیں پہنچتی رہتی ہیں نہ پہنچتیں۔ اور جب نباتات نہ پیدا ہوتے تو حیوانات کی غذا کس چیز سے ہوتی۔ پرند کہاں رہتے۔ حضرت انسان کو جو اب آسائشیں پہنچ رہی ہیں۔ وہ کب پہنچتیں۔ مکانات کی تعمیر جو بغیر پانی کی مدد کے نہیں ہو سکتی وہ کیونکر ہوتی۔ غلاظتیں اور کثافتیں زمین پر سے کیونکر صاف ہوتیں وغیرہ وغیرہ۔

پھر پھلوں کو دیکھئے کہ کتنی قسم کے ہیں اور کیا کیا اُن کے فوائد ہیں کوئی حیوانات کی غذا ہی کے کام میں آتا ہے کوئی دوا میں کام آتا ہے کوئی محض تفکہ کے لئے مفید ہے کوئی صرف انسان کی غذا ہے کوئی صرف طیور کی۔ اور کوئی وحوش کی۔ پھر ان کا مختلف فصلوں میں موسم کے موافق پیدا ہونا کہ اُسی فصل کے ضرروں کو دفع کرے یا جو فصول سابقہ کی خرابیاں ہیں اُن کو بدل سکے۔ نیز اُن کے ذائقوں کا مختلف ہونا تاکہ ایک ہی قسم کے پھلوں کے استعمال سے طبیعت گھبرا نہ جائے کوئی شیریں محض ہے کوئی میخوش ہے کوئی ترش ہے کوئی عفص[1] ہے کوئی پھیکا ہے کسی کا مزاج بارد کسی کا حار۔ کسی کا یابس۔ کسی کا رطب۔ اور کوئی ان چار کیفیتوں سے دو دو کیفیتوں سے مرکب ہے وغیر ذالک۔ نیز اُن کے رنگوں کی کیفیتیں بھی عجیب ہیں۔ جتنے پھل ہیں اُتنے ہی رنگ ہیں۔ کوئی سُرخ ہے کوئی سبز ہے کوئی نارنجی ہے کوئی گلابی ہے۔ کوئی کسی رنگ کا ہے کوئی کسی رنگ کا اور کوئی چند رنگوں سے مرکب ہے۔ جس وقت تک بالکل بچہ ہے کچھ اور ہی کیفیت ذائقہ۔ اور فائدہ رکھتا ہے۔ جب بڑا ہو جاتا ہے تو کچھ اور ہی کیفیت ہو جاتی ہے جب تک کچا ہے اور ہی کچھ اس سے فائدہ ہے اور جب پختہ ہو جاتا ہے تو اس کے اور ہی فوائد ہوتے ہیں۔

تو اب کوئی بتائے کہ آخر یہ سب عجیب و غریب منافع اور فوائد اور حکمتیں بھلا آپ سے آپ اُن میں پیدا ہو گئی ہیں؟ کیا یہ سب فعل طبیعت[2] کے ہو سکتے ہیں جس کو بالکل ادراک و حس نہیں؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں بڑے افسوس کی بات ہے کہ انسان جب کسی مکان میں داخل ہوتا اور اس کے اسباب و آلات و ساخت

---

[1] عفص بمعنی کسیلا ۱۲

[2] جیسا کہ دہریہ کہتے ہیں کہ طبیعت دراصل خالق ہے اور مدبر۔ اس کے سوا کوئی اور خالق و حکیم موجود نہیں ہے جسے خدا تعالیٰ یا اللہ کہا جا سکے۔ ۱۲

کی خوبیاں دیکھتا ہے حالاں کہ اس سے پہلے اس نے نہ اس کے بنانے والے کو دیکھا ہے اور نہ بنتے ہوئے اسے دیکھا ہے۔ پھر مجرد دیکھنے کے کہہ دیتا ہے کہ اس کے بنانے والے نے کیا کیا حکمتیں صرف کی ہیں اور کیسا ریاضی داں تھا۔ ہر گوشہ ہر ستون ہر قاعدہ اس کا علم مناظر علم ہندسہ علم جبر علم مساحت کی میزان میں جنچا تلا ہوا ہے اور ہرگز اس کو خیال بھی نہیں گزرتا کہ یہ مکان آپ سے آپ بن گیا ہوگا۔ لیکن برخلاف کونات عالم کے کہ اس کی عجیب سے عجیب صنعتیں دیکھتا ہے اور پھر بھی یہی کہتا ہے کہ اس کا کوئی بنانے والا نہیں بلکہ آپ سے آپ یہ چیزیں پیدا ہو گئی ہیں کیا ایسے خیال کا نام حماقت نہیں ہے یا کیا اسے جہل مرکب نہیں کہتے؟

اب اس مطلب کو تین بحثوں میں ادا کیا جاتا ہے جو غالباً ناظرین کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گی اور خدائی حکمتوں کا راز بھی معلوم ہوگا۔

تین بحثیں

ہم نے زمین کو فرش بنایا

جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا (خدا نے تمہارے لئے زمین کو

پہلی بحث: فرش بنایا) دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ زمین کو اس قسم سے بنایا ہے کہ اس پر تم سو سکو۔ جیسے اپنے بستر پر سوتے ہو۔ لیکن ابو علی جبائی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں لفظ فراش سے اور ایک اور آیت میں بساط کے لفظ سے (یعنی جو زمین کو بساط فرمایا ہے یعنی فرش) یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ منجمیں (اہلِ ہیئت) جو زمین کی کرویت کے قایل ہیں وہ غلط ہے بلکہ زمین اسی طرح بچھی ہوئی ہے جیسے واقعی بچھونا بچھایا جاتا ہے اگرچہ یہ خیال عالم مذکور کو قرآن مجید کی کئی آیتوں کی برانگیختگی سے پیدا ہوا ہے مثلاً خدا تعالیٰ

فرماتا ہے فَرَشْنَاهَا[1] فَنِعْمَ الْمَاهِدُوْنَ اور وَاللّٰهُ[2] جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا (پ ۲۹۔ رکوع ۹) اور جَعَلَ[3] لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا۔ لیکن یہ خیال ان کی معرفت و علم سے بعید معلوم ہوتا ہے کیوں کہ زمین کا گول ہونا اور پھر اس کا فرش یا بساط بھی ہونا کچھ باہم منافات نہیں رکھتا بہت اچھی طرح ممکن ہے کہ زمین کروی شکل کی بھی ہو۔ اور فرش کا بھی کام دے۔ کیوں کہ جیسا پیمائش سے ثابت ہوا ہے زمین کا قطر آٹھ ہزار میل ہے اور محیط اس کا چوبیس ہزار میل کا ہے اور جیسا کہ رصد قدیم سے معلوم کیا گیا ہے زمین کا دائرہ عظمیٰ (سب سے بڑا دائرہ) آٹھ ہزار فرسخ کا ہے جس کے چوبیس ہزار میل شرعی ہوئے اور قطر اس کا دو ہزار پانچسو پینتالیس فرسخ اور نصف فرسخ کا ہے۔ جس کے سات ہزار پانچسو ڈیڑھ میل شرعی ہوئے اور حاصل ضرب محیط اور قطر کا اس کی سطح کی مقدار ہے جس کی تعداد دو لاکھ تین سو ساٹھ ہزار فرسخ ہوتے ہیں۔ جس کے میل اکسٹھ لاکھ اسی ہزار میل ہوئے۔ جیسا کہ کتاب السماءُ والعالم میں علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے تحریر فرمایا ہے۔ ثم انهم استعملوا بزعمهم مسافة الارض واجزائها ودوائرها فی زمان المامون وقبله فوجدوا مقدار محيط الدائرة العظمى من الارض ثمانية الاف فرسخ وقطرها الفين و خمسماة وخمسة واربعين فرسخا ونصف فرسخ تقريبا ومضروب القطر فی المحيط مساحة سطح الارض وهی عشرون الف الف وثلث ماة وستون الف فرسخ۔ ورُبع ذلك مساحة الربع المسكون واما القدر المعمور من الربع المسكون وهو ما بين خط الاستواء والموضع الذی عرضه تمام الميل الكلی فمساحة ثلثة الاف الف وسبعماة وخمسة وستين الفا واربع ماة و

---

[1] ہم نے زمین کو بچھایا پس ہم اچھے بچھانے والے ہیں ۱۲ [2] اور اللہ نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا تاکہ تم اس کی کشادہ راہوں میں چلو ۱۲ [3] بنایا خدا نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا۔

عشرین فرسخا انتہی) یعنی کہ زمانہ ماموں عباسی میں زمین کی مسافت کی پیمائش کی گئی اور اس سے پہلے بھی تو معلوم ہوا کہ دائرہ کبیر کے محیط کی مقدار آٹھ ہزار فرسخ ہے اور اس کے قطر کی مسافت دو ہزار پانچسو ساڑھے پینتالیس فرسخ تقریباً ہے اور مضروب قطر فی المحیط اس قدر ہے جو مقدار سطح زمین کی ہے اور وہ دو لاکھ تین سو ساٹھ فرسخ ہے اور اس کا چوتھائی حصہ ربع مسکون کی مقدار ہے مگر ربع مسکون میں سے جس قدر آباد ہے اور وہ مابین خط استوا اور اس مقام کے ہے جس کا عرض بلد بقدر تمام میل کلی آفتاب کے ہے اس کی مساحت تیس ہزار سات سو پینسٹھ ہزار اور چار سو بیس فرسخ ہے تو انسان کو اس کی کرویت کیا مضر ہو سکتی ہے کیونکہ اس کی مقدار اس طول و عرض کی بہ نسبت تو اس سے بھی کم ہے جو بڑے سے بڑے پہاڑ کو زمین سے حاصل ہے کیوں کہ علم ہیئت میں ثابت کیا گیا ہے کہ زمین سے ایسے پہاڑ کو وہی نسبت حاصل ہے جو پانچ گھوڑے کے ایک بال کی چوڑائی کو اس کرہ سے حاصل ہے جس کا قطر ایک ذراع کا ہو تو ایسے بال کے نزدیک اس ایک ذراع کے قطر والے کرہ کی کرویت کیا محسوس ہو سکتی ہے یا اگر اس سے زیادہ توسعہ دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ایک مکھی یا مچھر یا چیونٹی جس وقت کسی گھڑے یا اور ایسے ہی کسی کروی جسم پر بیٹھی ہو یا چل رہی ہو تو اس کے نزدیک وہ گھڑا ایسا ہی ہوگا جیسا کہ ہمارے نزدیک زمین۔ نہ چیونٹی کو اس کی کرویت مسطحیت سے خلاف معلوم ہوتی ہے اور نہ ہم کو زمین کی کرویت مسطحیت سے الگ محسوس ہوتی ہے لیکن یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے صغیر الجثہ ہونے کا نقصان ہے کہ ہم اس کی کرویت محسوس نہیں کر سکتے نہ یہ کہ زمین میں کرویت ہی نہیں ہے لیکن اگر ہم غور سے کام لینا چاہیں تو علاوہ دلیل عقلی کے دلیل حسی بھی زمین کی کرویت کو ثابت کر سکے گی اور وہ اس طرح سے کہ ہم جس وقت کسی بہت طویل درخت کو مثل درخت خرما کے ایک میل کے فاصلہ سے دیکھتے ہیں تو وہ ہم کو چھوٹا سا دکھائی دیتا ہے گویا کہ وہ صرف ایک دو ہاتھ

کا لمبا ہے مگر جس قدر ہم اُس سے قریب ہوتے جاتے ہیں اسی قدر وہ ہم کو طویل معلوم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ہم بالکل اس کے قریب آجاتے ہیں تو وہ ہم کو اپنے اصلی قامت کو دکھا دیتا ہے۔

پس اگر زمین گول نہیں ہے اور اس کا ابھار ہمارے خط نظر اور درخت خرما کی جڑ کے درمیان حائل نہیں ہے اور زمین بالکل مسطح مثل فرش کے ہے تو آخر ابتدا ہی سے اس کے نیچے کا حصہ کیوں دکھائی نہیں دیتا، معلوم ہوا کہ یہ بلندی جو زمین کی ہے وہ اس درخت کے دو حصے سے زیادہ طول کو ہماری نظر سے چھپائے ہوئے ہے اور جس قدر ہم اس بلندی پر چڑھتے جاتے ہیں اسی قدر اس کا مخفی حصہ ہمیں دکھائی دیتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم اس خاص بلندی پر پہنچ جاتے ہیں جس پر وہ نصب ہے تو پھر کوئی چیز ہماری نظر اور درخت کے درمیان حائل باقی نہیں رہتی۔ اسی وجہ سے سید شریف مرتضیٰ رحمہ اللہ نے عالم مذکور کے قول کو نہیں مانا ہے اور فرمایا ہے کہ ھذا القدر لا یدل لانہ یکفی فی النعمۃ علینا انیکون فی الارض بسائط ومواضع مفروشۃ ومسطوحۃ ولیس یجب انیکون جمیعھا کذلک ومعلوم ضرورۃ ان جمیع الارض لیس مسطوحًا مبسوطًا وان کان مواضع التصرف فیھا بھذہ الصفۃ المنجمون لایدفعون انیکون فی الارض سطوح یتصرف فیھا ویستقر علیھا وانما یذھبون المنجمون الی ان جملتھا کرویۃ الشکل۔ یعنی صرف اس قدر سے کہ خدا تعالیٰ نے زمین کو فراش یا بساط فرمایا ہے اس کا مسطح مستوی ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ زمین کے ہمارے لئے نعمت ہونے میں اس قدر کافی ہے کہ اس میں مقامات مفروشہ و مسطحہ ہوں (جن پر ہم اپنے ان کاموں کو جو ایسی صورت کے ہونے پر موقوف ہیں انجام دے سکیں)، اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ تمام زمین ہی مسطح ہو حالاں کہ یہ بات معلوم ہے کہ تمام زمین مسطوح نہیں ہے۔ اگرچہ وہ مقدار جس میں تصرفات حیوان و انسان واقع ہوتے ہیں وہ مسطح ضرور

معلوم ہوتی) ہے اور منجمین اسے غلط بھی نہیں کہتے کہ روئے زمین میں ایسے سطوح ہوں جن میں تصرف واقع ہوسکے اور اس پر قیام کیا جاسکے۔ بلکہ اُن کی رائے تو یہ ہے کہ زمین بہشت مجموعی کروی الشکل ہے (نہ کہ اس کا ہر حصّہ جس سے فراشیتہ وبساطیتہ کو نقصان پہنچے)۔

اور عقلی دلیل اس کی یہ ہے کہ عناصر اور نیز ہر بسیط جس میں مختلف کیفیتیں نہیں پائی جاتیں اُن کی طبیعت کا مقتضا یہی ہے کہ وہ گول ہوں یعنی کروی الشکل اس لئے کہ مثلث یا مربع یا مخمس وغیرہ شکل پر ہونا اس بات پر دلالت کرے گا کہ طبعاً اس کے اجزائے اصلیہ میں باہم نسبت مساوات نہیں ہے اسی وجہ سے بعض کسی طرف کو نکل گئے ہیں اور بعض کسی طرف کو اور جب کہ اجزا اس کے ایک طبیعت کے نہیں تو مرکز سے جو نسبت ایک جزو کو ہے وہی نسبت دوسرے کو بھی ہوگی لہذا جو فاصلہ مرکز سے ایک جزو کو ہوگا۔ وہی فاصلہ دوسرے جزو سے بھی ہوگا۔ اسی لئے جسم بسیط ہمیشہ کروی ہوگی۔ شیخ کتاب اشارات میں فرماتے ہیں: ویجب ان یکون الشکل الذی تقتضیہ طبیعۃ البسیط مستدیراً والا لاختلف ھیئاۃ فی مادۃ واحدۃ عن قوۃ واحدۃ۔ یعنی واجب ولازم ہے کہ شکل طبیعی بسیط کی گول (کروی) ہو ورنہ لازم آئے گا اس کی شکل ایک ہی مادہ میں ایک قوت سے مختلف ہو (حالاں کہ یہ ناممکن ہے کہ باوجود طبیعت واحدہ اور مادہ واحدہ اور فاعل واحد اور قابل واحد ہونے کے اختلاف صورت واقع ہوسکے کیونکہ فاعل واحد کا فعل قابلِ واحد میں متعدد ہونا عقلاً ناممکن ہے کما ثبت فی محلہ۔

زمین متحرک ہے

دوسری بحث: جملہ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا باعتبار ظاہر اس بات کو بھی بتاتا ہے کہ زمین مستقر و ساکن ہے متحرک نہیں ہے۔

اگرچہ اس زمانے کے یورپین فلاسفر حرکت زمین کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ زمین آفتاب کے گرد پھرتی ہے اور اس پر چند دلیلیں بھی بیان کرتے ہیں جن کا ذکر آئندہ آئے گا۔

لیکن حق یہ ہے کہ زمین ساکن ہے اور اس پر عقلی اور نقلی دونوں قسم کی دلیلیں موجود ہیں منجملہ نقلی دلیلوں کے ایک یہ بھی آیت ہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ زمین کو ہم نے تمہارے لئے بستر بنایا کیونکہ اس کا مفاد یہ ہے کہ ہم نے زمین کو ایسی صورت میں بنایا ہے کہ تم اس پر آرام و قرار لے سکو۔ اور ہر طرح کا تصرف کر سکو۔ ورنہ اگر متحرک ہوتی تو استقرار ناممکن ہوتا۔ اور فائدہ فراشیۃ بھی مرتفع ہو جاتا۔ علاوہ بریں لفظ فراش ہی خود اس بات کو بتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے علامہ طبرسی علیہ الرحمہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے۔ ای بساطا یمکنکم ان تستقروا علیھا و تفترشوھا و تتصرفوا فیھا و ذلک لا یمکن الا بان تکون مبسوطۃ ساکنۃ دائمۃ السکون۔ یعنی بساط قرار دیا کہ تم کو ممکن ہو سکے کہ اس پر استقرار کر سکو اور اسے فرش بنا سکو اور اس میں تصرف کر سکو اور یہ امر اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ زمین مسطح پھیلی ہوئی ساکن اور ہمیشہ ساکن نہ ہو"

دوسری ایک اور آیت اپنے ظاہری لفظوں سے اس کا مطلب ظاہر کر دیتی ہے (جزو ۱۴۔ ع ۸) وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ" اور اس (خدا نے) زمین پر بھاری بھاری پہاڑ نصب کئے تاکہ یہ زمین تمہیں لے کر کسی اور طرف نہ جھکے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے زمین پر جو پہاڑوں کی میخ گاڑی ہے وہ صرف اسی لئے ہے کہ یہ ساکن رہے متحرک نہ ہونے پائے تاکہ اہل زمین کو اس کے جھکنے اور ہلنے جلنے سے تکلیف نہ ہو۔

تیسری ایک اور آیت جو سورہ ملک میں ہے (جزو ۲۹۔ ع ۱) هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ

ءَ اَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ۔ اس نے تمہارے لئے زمین کو مطیع بنایا پس تم لوگ اُس کے کاندھوں پر چلو اور خدا کی پیدا کی ہوئی روزی کو کھاؤ اور اسی کی طرف بازگشت ہے کیا تم نڈر ہو گئے ہو اُس (خدا) سے جو آسمان کا مالک ہے کہ دھنسا دے تم کو زمین میں پس ناگاہ پڑے جھکولے کھایا کرو" اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت زمین میں صفت مور یعنی حرکت نہیں ہے بلکہ ساکن ہے۔ ہاں خدا تعالیٰ کو قدرت ہے کہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے ایسا کر دے کہ تم اس میں دھنس جاؤ اور وہ حرکت میں آجائے۔

اور عقلی دلیلیں اس مضمون پر بہت ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ فلسفہ میں ثابت ہو چکا ہے کہ زمین بسیط ہے اور ہر بسیط میں ایک ہی قسم کی طبیعت پائی جاتی ہے۔ جس کا مقتضا بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ پس چونکہ زمین میں مرکز ثقل ہے اور اُس میں صرف مبدا میل مستقیم ہے۔ یعنی اس کی حرکت حرکت مستقیمہ ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ ایک جزو زمین مثلاً پتھر یا ڈھیلا جس وقت اوپر کی طرف پھینکا جاتا ہے یا بلندی سے نیچے کی طرف گرایا جاتا ہے تو سیدھا زمین کی طرف آتا ہے۔ بحرکت مستقیمہ۔ البتہ پھینکنے والے کے ہاتھ کی حرکت کی وجہ سے اگر اس میں کوئی قسری حرکت پیدا ہو جائے تو ممکن ہے۔ لیکن جب وہ قوت ختم ہو جاتی ہے اور اس کا میل طبعی نشیب کی طرف شروع ہو جاتا ہے تو اس وقت سوائے حرکت مستقیمہ کے اور کوئی حرکت اس میں نہیں پائی جاتی۔ پس جب کہ زمین کے ایک جزو کا یہ حکم ہوگا۔ کیوں کہ بسیط کے کل وجزو احکام طبعیہ میں کسی طرح مختلف نہیں ہو سکتے اور جب کہ زمین میں صرف مبدا میل مستقیم ہے یعنی اُس کا اقتضائے طبعی حرکت مستقیمہ ہے لیکن انتظام کرات عالم اور قسر قاسر سے درمیان میں قائم ہے۔ تو ناممکن ہے کہ اس میں دوری حرکت بھی پیدا ہو۔ کیونکہ جب اس میں حرکت دوریہ پیدا ہو گی تو لامحالہ اس میں مبدا

میل متضد یہ بھی ہو گا۔ پھر تو دو متضاد چیزیں ایک بسیط میں جس کی طبیعت واحدہ ہے پائی جائیں گی۔ حالاں کہ یہ محال ہے پس اہلِ یورپ کا یہ کہنا کہ زمین میں حرکت دوریہ پائی جاتی ہے بالکل خلاف قانون فطرت ہے جس پہ ان لوگوں کا ایمان ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر زمین متحرک ہو یعنی مغرب سے مشرق کی طرف جاتی ہو تو لازم آتا ہے کہ جو پتھر اُوپر کی طرف پھینکا جائے وہ ٹھیک اسی مقام پہ آکر نہ گرے جہاں سے پھینکا گیا ہے کیونکہ جتنے سکنڈ میں پتھر اُوپر سے نیچے آئے گا اتنے سکنڈ میں زمین اور پھینکنے والا شخص میلوں مشرق کی طرف نکل گیا ہو گا۔ تو چاہیئے کہ یہ پھینکا ہُوا پتھر اس مقام سے جہاں پھینکا گیا ہے۔ کئی میل کے فاصلہ پر مغرب میں گرے حالاں کہ یہ بات مشاہدہ حسیّہ کے بالکل خلاف ہے بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پتھر بیشتر اسی مقام پہ گرتا ہے جہاں سے پھینکا گیا ہے۔

تیسرے یہ کہ کسی اُڑتے ہوئے پرندے کو تیر مارا جائے تو کبھی اس کو نہ لگے اور اگر لگے تو وہ اسی مقام پہ نہ گرے کیونکہ زمین نے اتنے عرصے میں میلوں راہ طے کر لی ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل خلاف مشاہدہ ہے۔

چوتھے یہ کہ اگر دو پتھر ایک ہی طاقت سے پھینکے جاویں ایک مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی طرف تو چاہیئے کہ جو پتھر مغرب کی طرف پھینکا گیا ہے وہ زیادہ تیز جاتا ہوا معلوم ہو اور جو مشرق کی طرف پھینکا گیا ہے۔ وُہ بہت سُست محسوس ہو۔ یا یہ کہ اس کی بالکل حرکت ہی محسوس نہ ہو کیوں کہ زمین نہایت تیزی سے حرکت کر رہی اور مغرب سے مشرق کی طرف بھاگی چلی جا رہی ہے تو ضرور مغربی پتھر تیز جاتا ہوا نظر آئے گا اور مشرقی سُست۔ حالاں کہ دونوں کی حرکت مساوی محسوس ہوتی ہے اور دونوں مساوی وقت میں زمین پر گرتے ہیں اور نیز مساوی فاصلہ پر۔ تو اب بتائیے کہ زمین کہاں حرکت کرتی ہے۔

پانچویں یہ کہ اگر زمین متحرک ہو تو چاہیے کہ کسی وقت ہوا میں سکون نہ ہو۔ حالاں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات ہوا ساکن ہوتی ہے۔ وجہ ملازمت یہ ہے کہ اس رائے کی بنا پر زمین فی گھنٹہ ۱۰۳۶ میل اور فی سکنڈ ۱۵۲۰ فیٹ حرکت کرتی ہے اور بنا برائے ہیٹن صاحب زمین فی سکنڈ ۱۹ میل اور فی گھنٹہ ۶۸۴۰۰ میل حرکت کرتی ہے تو ضرور ہے کہ زمین کی حرکت کے ساتھ ٹھوکر کی وجہ سے ہوا بھی متحرک ہو خصوصاً پہاڑوں۔ عمارتوں۔ درختوں کے صدمے سے ہر وقت ہوا میں وہ سخت تموّج رہا کرے کہ آدمی ایک سکنڈ بھی زمین پر کھڑا نہ رہ سکے۔ حالاں کہ ہم اس کے خلاف دیکھتے ہیں۔ دیکھئے تیز ریل گاڑی جو فی سکنڈ ۴ اگز ۱۰ گرہ اپنی حرکت سے مسافت طے کرتی ہے کس قدر اس کے صدمے سے ہوا میں تموّج پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی گاڑی کے خانے سے منہ نکالے تو معلوم ہوتا ہے کہ سر اُڑ جائے گا۔ باوجودیکہ اس کی رفتار زمین کی رفتار سے بہت کم ہے پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اتنا بڑا جسم ثقیل اس تیزی سے حرکت کرے اور پھر حرکت ہوا محسوس نہ ہو۔

اور اگر اگلی باتوں کا یہ جواب دیا جائے کہ زمین کے ساتھ ہوا بھی حرکت کرتی ہے اس لئے پتھر اُسی مقام پر آگرتا ہے جہاں سے پھینکا گیا ہے۔ تو اوّلاً اس میں یہ خرابی لازم آئے گی کہ چاہیے ہر وقت آندھی سے زیادہ تیز حرکت ہوا کی ہر وقت محسوس رہے۔ کیونکہ فطرتی رفتار ہوا کی یورپین تحقیق کے موافق فی منٹ پونے دو میل ہے اور فی گھنٹہ سو میل۔ تو زمین کی تبعیت سے کس قدر زیادہ ہو جانی چاہیئے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر یہی مان لیا جائے کہ زمین کی حرکت کی وجہ سے ہوائے مجاور بھی حرکت کرتی ہے تو چاہیئے کہ جس وقت ہوا ساکن ہو اور اس وقت دو کشتیاں دریا میں چلائی جائیں ایک مشرق کی طرف دوسری مغرب کی طرف۔ تو وہ کشتی جو مشرق کی طرف چلائی گئی ہے۔ اس میں دو قسم کی قوت تحریک پائی جائے ایک ہوائے مجاور یا دریا کے پانی کی حرکت

ہے۔ اور دوسرے ملاح کی تحریک سے تو اس کی رفتار مشرق کی طرف نہایت تیزی سے ہو اور جو مغرب کی طرف چلائی گئی ہے وہ نہایت سست چلے۔ کیوں کہ اس میں ذاتی قوت حرکت کوئی نہیں ہے۔ بلکہ صرف ملاح کی قوت ہے۔ نہیں نہیں بلکہ ضروری تو اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی کشتی کی حرکت بالکل ہی محسوس نہ ہو۔ کیونکہ وہ زمین اور پانی کے مشرق کی طرف نہایت تیزی سے چلے آنے کی وجہ سے آگے جا ہی نہیں سکتی، حالاں کہ یہ بالکل خلاف مشاہدہ ہے۔

نیز اگر یہی صحیح مان لیا جائے کہ زمین کے ساتھ ساتھ ہوائے مجاور بھی متحرک ہے تو چاہیئے کہ اگر دو پرندے ایک قسم کی طاقت سے فضا میں اڑیں ایک مشرق کی طرف متوجہ ہو اور دوسرا مغرب کی طرف۔ تو وہ پرندہ جو مشرق کی طرف جا رہا ہے بہت سُرعت سے جاتا ہو۔ کیونکہ اس کی معاون دو چیزیں ہیں ایک اس کے ارادے کی حرکت۔ دوسرے وہ ہوا جو مغرب سے مشرق کی طرف بمجاورت زمین نہایت سرعت سے جا رہی ہے اور مغربی پرندہ بہت سست جا رہا ہو یا فضا میں ٹھیرا ہُوا دکھائی دیتا ہو کیوں کہ وہ پہلی قوت کے برعکس ارادہ کر رہا ہے۔ جس کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حالاں کہ یہ امر خلاف معلومات عامۂ ناس ہے۔ چہ جائیکہ خاصۂ ناس۔

علیٰ ہذ القیاس اور بھی خرابیاں ہیں۔ جو حرکت زمین اور حرکت ہوائے مجاور زمین کی بنا پر لازم آتی ہیں جنہیں بخیال طول نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مگر اتنا بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یورپین نئی روشنی کی دلیلیں حرکت زمین پر کیا ہیں۔ اور آیا وہ صحیح بھی ہیں۔ یا صرف نمائشی دھوکا ہیں جو عام طور پر یورپین روشنی کی چیزوں میں ہوتا ہے۔ جس پر ہمارے ہندوستانی اخوان خواہ مخواہ دل دادہ وشیدا ہیں۔

دیکھنے سے معلوم ہُوا ہے کہ ان صاحبوں نے بھی کچھ دلیلیں اس کے متعلق تحریر کی ہیں وہ دلیلیں یہ ہیں جو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا سے مولانا سید

غلام حسنین کنتوری نے نقل کی ہیں اور اُن کو رد بھی فرمایا ہے۔ میں انہیں مع اصل ورد یہاں نقل کرتا ہوں۔

پہلی دلیل: عملی تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بلند منارہ سے اگر کوئی پتھر وغیرہ پھینکو تو اُس نقطہ پر نہ گرے گا جو متوازی (سامنے) ہے۔ بلکہ مشرق کی طرف ہٹ کر گرے گا لہٰذا زمین پچھم سے پورب کی طرف حرکت محوری کرتی ہے۔

پہلی غلطی: میں کہتا ہوں پہلی غلطی اس میں یہ ہے کہ یہ تجربہ مناروں کی چاروں طرف نہیں کیا گیا ہے۔ اگر چاروں طرف کیا جائے ہرگز درست نہ ہوگا اب اس تجربہ کو درست مان کر ہم کہتے ہیں کہ اگر زمین پچھم سے پورب کو حرکت کرتی ہے اور بموجب اس حساب کے جو روزانہ حرکت زمین کی ہے۔ ۲۴ گھنٹہ کے کم میں ۲۴ ہزار میل تخمیناً حرکت کرتی ہے فی منٹ تخمیناً ۱۷ میل چلتی ہے۔ پس اگر وہ پتھر ایک منٹ میں زمین پر گرا ہے اور ہم نے منارہ سے پورب کی طرف پھینکا ہے تو نقطہ متوازی سے ½۱۷ میل پورب کو ہٹ گیا۔ پھر اگر وہ نقطہ جہاں سے پتھر پھینکا ہے اور منارہ اپنی جگہ پہ قائم ہے اور زمین کے ساتھ حرکت نہیں کرتا تو لازم آتا ہے کہ وہ پتھر نقطہ متوازی (محاذی) سے سترہ میل پچھم کی طرف ہٹ کر گرے۔ پورب کی طرف ہٹ کر گرنا کیسا؟ ذرا غور کیجئے۔

اور منارہ اور ہوائے محیط (جس میں وہ نقطہ ہے جہاں سے پتھر گرا ہے) بھی ہمراہ زمین کے حرکت کر رہی ہے تو دونوں نقطے کی محاذات میں فرق نہ ہوگا اور ضرور پتھر کو نقطہ محاذی پر گرنا چاہیئے نہ کہ ہٹ کر۔

باقی رہی ہوا کی حرکت کی کمی بیشی یا ہوا کی مخالفت پوروا اور پچھم ہونے کی۔ یہ دوسری بات ہے اور اس کو زمین کی حرکت پر کوئی دلالت نہیں ہے (یہ بات اس وقت کی ہے جب کہ پتھر منارہ سے پورب کی طرف گرایا جائے)۔

اب فرض کرو کہ پتھر کو تم نے منارہ سے پچھم کی طرف گرایا پس اگر نقطہ محاذی اور منارہ اور ہوائے محیط برابر حرکت کر رہے ہیں تو پتھر ٹھیک نقطہ متوازی پر گرے گا اور اگر ہوا متحرک نہیں ہے اور منارہ ہمراہ زمین کے، ا میل پورب ہٹ گیا ہے تو نقطہ محاذی سے، ا میل پچھم کی طرف پتھر گرے گا۔ پورب گرنا کیسا؟ (اور یہی حال شمال اور جنوب کی طرف گرنے کا ہے)۔

دوسری دلیل: نیوٹن صاحب ڈھیلے کے پورب کی طرف ہٹ کر گرنے کی وجہ بتلاتے ہیں۔ کہ پھینکنے کے مقام سے جو دائرہ مرکز زمین کو لے کر بنے گا وہ دائرہ بڑا ہوگا اس دائرہ سے جو نیچے کے نقطہ (متوازی) سے بنا ہے۔ پس بڑا دائرہ بہ نسبت چھوٹے دائرہ کے سریع ہوگا۔ اور چونکہ زمین مغرب سے مشرق کی طرف گھومتی ہے لہذا وہ پتھر مشرق جانب نقطہ سے گرے گا۔

جواب: میں کہتا ہوں۔ پتھر تو منارہ سے بخط مستقیم حرکت کر رہا ہے اس لئے کہ جذب مرکزی پتھر کو خط مستقیم پر کشش کرتا ہے جو اقصر (بہت چھوٹا) خطوط سے ہے پھر چھوٹا دائرہ اور بڑا دائرہ کس کی حرکت سے نیوٹن صاحب بنا رہے۔ کیا ڈھیلا بھی حرکت دوری مثل زمین کے کرے گا۔

رہی یہ بات کہ بڑے دائرہ کا قطر بڑا ہے چھوٹے دائرہ کے قطر سے۔ اس سے یہاں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ نقطہ فوقانی اور اس کا نقطہ محاذی جو زمین ہے دونوں برابر حرکت کر رہے ہیں لہذا دونوں دائروں کے قطر خط واحد پر ہیں۔ پھر حرکت کی سُرعت پتھر کو اس خط سے ہٹا کر پورب کی طرف کیوں کر لے جائے گی۔ دیکھو اور سمجھو۔

اور فی سکنڈ ۳۲ فیٹ جو تیزی اجسام ساقط میں بڑھتی ہے اس کی وجہ سے سیدھے خط پر گرنا اجسام کا بدل نہیں جاتا۔

دوسری غلطی: اگر نیوٹن صاحب کی یہ توجیہہ درست مانی جائے کہ دائرہ چھوٹا ہونے سے پتھر پورب کو ہٹ کر گرے گا تو جس قدر

زیادہ بلندی سے اجسام نیچے کو گرائے جائیں اسی قدر زیادہ پورب کی طرف ہٹ کر گریں گے اس بنا پر جذب زمین کا قاعدہ جو اقصر یعنی چھوٹے سے چھوٹے خط پر ہے باطل ہو جائے گا۔

تیسری غلطی: نیوٹن کی تجویز میں یہ بھی ہے کہ اگر پتھر کو منارہ سے پچھم کی طرف گرائیں تو وہی صورتیں پیدا ہوں گی جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔

چوتھی غلطی: نیوٹن صاحب کی تجویز میں یہ ہے کہ جذب مرکزی اجسام ساقطہ کو بخط مستقیم اقصر خطوط میں ہوتا ہے۔ مثلاً

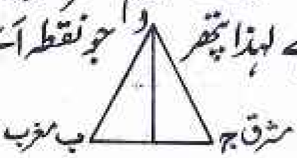

آب منارہ ہے لہذا پتھر جو نقطہ ا سے گرے گا۔ تو ب نقطہ متوازی پر گرے گا۔ اب اگر ہٹ کر نقطہ مشرق پر

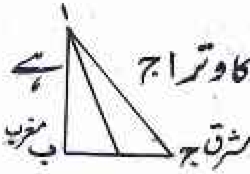

گرے گا۔ تو اب ج جو مثلث قائم الزاویہ ہے جس کا وتر اج ہے ضرور بڑا ہے۔ ضلع اب سے بحکم ش ۴۸ م (۱) اقلیدس کے۔

پس جذب مرکزی زمین اقصر خطوط پر نہ رہا اور یہ تمام فلاسفہ کے نزدیک باطل ہے لہذا زمین متحرک ہو یا ساکن کسی فرض پر یہ پتھر پورب کی طرف ہٹ کر نہ گرے گا نہ پچھم کی طرف۔

تیسری دلیل: جو تائید میں دوسری دلیل کے لکھی ہے وہ ہے کہ بند مکان میں جہاں پر ہوا نہ تھی۔ بنظر احتیاط وہاں پتھر اوپر سے نیچے گرا کر تجربہ کیا وہاں بھی نقطہ متوازیہ سے (متحاذیہ سے) ہٹ کر پورب کی طرف پتھر گرا اس لئے کہ کھلی جگہ میں احتمال تھا شاید ہوا کے سبب سے مشرق کی طرف ہٹ کر پتھر گرتا ہے۔

جواب: میں کہتا ہوں یہ تو اور بھی غلط خیال ہے اس لئے کہ ہوا سے کسی

جگہ کا خالی ہونا اور پھر وہاں آدمی کا زندہ رہ کر پتھر کا گرانا محال ہے۔ لہٰذا بند مکان کی ہوا اور کھلے مکان کی ہوا میں فرق کیا رہا۔

اور جب بند مکان کی ہوا بھی اور نقطہ متوازیہ زمین کا بھی برابر حرکت کر رہا ہے تو پھر محاذات بدستور باقی ہے اور جو خرابیاں ہم کھلی ہوا میں لکھ چکے ہیں۔ سب یہاں بھی بدستور جاری ہیں۔

اب اگر آپ کہیں کہ بند مکان میں ہوا کم ہے اور کھلی جگہ میں زیادہ ہے اور کم ہوا کی مصادمت (تھپیڑا) سے پتھر اس قدر ہٹ نہیں سکتا کہ پتھر کو ہمراہ نقطہ محاذیہ کے لے چلے تو الٹی تادیل ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پتھر نقطہ محاذیہ سے پچھم کی طرف ہٹ کر گرے گا۔

وجودِ آسمان

تیسری بحث: وَالسَّمَآءَ بِنَآءً صاف لفظوں میں اس بات کو بتاتا ہے کہ آسمان موجود ہے اور وہ سفلی موجودات کے واسطے بطور سقف کے ہے جیساکہ وَجَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا میں ارض یعنی زمین ایک موجود چیز ہے جسے بجائے فرش بنایا گیا ہے کیونکہ کسی چیز کو کوئی اور شے بنانا اس بات کو چاہتا ہے کہ وہ چیز موجود ہو۔ مثلاً کہا جائے کہ کمہار نے مٹی کو گھڑا بنایا تو یقیناً سمجھا جائے گا کہ مٹی ایک موجود چیز ہے۔ جسے گھڑے کی صورت میں بنا لیا گیا ہے نہ یہ کہ مٹی کوئی چیز نہیں ہے اور پھر اس کو گھڑا بنا لیا ہو۔ لہٰذا یہ جو پروردگار نے فرمایا ہے کہ ہم نے آسمان کو چھت بنایا ہے۔ چاہتا ہے کہ آسمان کوئی موجود چیز ہو۔ جو بجائے سقف کے ہو سکے۔ پس بعض متجددین کا قول کس قدر اس مقام پر بیہودہ ہے جو کہتے ہیں کہ آسمان کوئی موجود چیز نہیں ہے۔ بلکہ محض بلندی کا نام سما ہے یا یہ کہ سبع سماوات میں سات بلندیاں مراد ہیں اور جسے اہلِ اسلام سما یا فلک یا آسمان کہتے ہیں محض موہوم چیز اور فقط

حد نگاہ کا نام ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب خواہ مسلم ہوں یا ہنود۔ پارسی ہوں یا یہود۔ سب آسمان کے وجود کے قائل ہیں اور ان کی کتابیں بھی اسی بات کو بتاتی ہیں۔ مسلمانوں کی کتاب الٰہی تو قرآن کو کہا جاتا ہے۔ وہ صاف لفظوں میں اس کے وجود کا قائل ہے اور اس معاملہ میں بے شمار آیتیں موجود ہیں مثلاً اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَ اِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ۔ جب کہ آسمان پھٹ جائے گا اور ستارے بکھر جائیں گے۔ اِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتْ۔ جب کہ آسمان کی کھال کھینچی جائے گی۔ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ۔ جب کہ آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل کرے گا اور یہ اُس کا فرض ہے پس اگر آسمان موجود نہیں ہے۔ تو کیا چیز پھٹ جائے گی۔ کیا حد نظر یا شئے موہوم؟ یا کسی نیچری کا سر؟ اور اگر آسمان موجود نہیں ہے تو کس کی کھال کھینچی جائے گی؟ کیا کسی نیچری کی جو مسلمان ہونے کا مدعی ہو؟ نیز فرماتا ہے اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ خدائے تعالیٰ وہ ہے جس کے لئے آسمان اور زمین کا ملک ہے۔ اگر آسمان شئے موہوم کا نام ہے تو اسے ملک کہنا کیا معنی رکھتا ہے ملک تو اسی کو کہہ سکتے ہیں جس میں آبادی بھی ہو اور آبادی بغیر اس کے نہیں ہو سکتی کہ کوئی چیز ایسی ہو جس پر اہل ملک قیام کر سکیں۔ پس اگر آسمان محض حد نگاہ کا نام ہے تو کہاں فرشتوں کا قیام ہے اور کیونکر سمار ملک کہا گیا؟ نیز فرماتا ہے۔ اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان آدمیوں جیسے اور پیدا کر دے" اگر آسمان موہوم چیز ہے تو خدا نے کیسے پیدا کیا ہے؟ موہوم چیز کی نسبت پیدا کرنے کا لفظ صادق نہیں آسکتا۔ اور اگر کوئی شخص واہمہ خلاق سے استدلال کرے تو اسے لازم ہے کہ اپنی عقل کے ناخن لے۔ نیز فرماتا ہے لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِکَ الْقَمَرَ

وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَکُلٌّ فِی فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ۔ نہ آفتاب ہی سے بن پڑتا ہے کہ چاند کو پائے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہے اور ہر ایک۔ ایک نہ ایک آسمان میں تیر رہے ہیں۔" اس آیت سے صرف آسمان ہی نہیں بلکہ تعدد آسمان بھی سمجھا جاتا ہے۔ نیز فرمایا ہے۔ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔ یہ جو لوگ خدا کے لئے اولاد کی تجویز کرتے ہیں اس سے تو قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔" اس آیت میں بھی لفظ یتفطرن فرمایا ہے جو موہوم چیز کے لئے ناممکن ہے۔ نیز فرماتا ہے وَبَنَیْنَا فَوْقَکُمْ سَبْعًا شِدَادًا، وغیر ذالک الغرض قرآن مجید سے اس امر کا ثابت کرنا کہ آسمان کوئی چیز نہیں ہے محض حماقت یا جنون ہے جو شخص کچھ بھی عربیت رکھتا ہوگا وہ اس بات کا مدعی نہ ہوگا اور مجنون کو میں نے آپ ہی مستثنیٰ کر دیا ہے۔

باقی رہیں اسلامی حدیثیں جن پر کمال وثوق ہے وہ بھی ہر فریق میں اس کے اثبات کے لئے بکثرت موجود ہیں جن میں سے بعض کو اس مقام پر نقل کیا جاتا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے درمنثور میں اس حدیث کو نقل کیا ہے جسے بعینہٖ علامہ مجلسی نے کتاب السماء والعالم جلد ۱۴ بحار الانوار میں وارد فرمایا ہے۔

۱: اور وہ یہ ہے: الدر المنثور السیوطی نقلاً من تسعة عشر من کتبهم عن العباس بن عبد المطلب قال کنا عند النبی فقال هل تدرون کم بین السماء والارض قلنا الله ورسوله اعلم قال بینهما مسیرة خمسمأة عام ومن کل سماء الی سماء مسیرة خمسمأة عام وکثف کل سماء خمسمأة سنة وفوق السابعة بحر بین اعلاه واسفله کما بین السماء والارض ثم فوق ذالك ثمانية اوعال بین رکبهن واظلافهن کما بین السماء والارض ثم فوق ذالك العرش بین اسفله واعلاه کما بین السماء والارض۔

۲: پھر ایک اور حدیث اسی مضمون کی نقل کی ہے۔ عن ابی ذر قال قال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مابین السماء والارض مسیرۃ خمسمأۃ عام وغلظ کل سماء مسیرۃ خمسماۃ عام ومابین السماء الی التی تلیھا مسیرۃ خمسماۃ عام لک الی السماء السابعۃ والارضون مثل ذالک ومابین السماء السابعۃ والعرش مثل جمیع ذالک

۳: پھر ایک اور حدیث نقل کی ہے۔ وعن الربیع بن انس قال السماء الدنیا موج مکفوف والثانیۃ مرمرۃ بیضاء والثالثۃ حدید والرابعۃ نحاس والخامسۃ فضۃ والسادسۃ ذھب والسابعۃ یاقوتۃ حمراء ومافوق ذالک صحاری من نور۔ الخ

۴: پھر ایک اور حدیث سلمان فارسی سے نقل کی ہے۔ عن سلمان الفارسی قال السماء الدنیا من زمرد خضراء اسمھا رفیعا والثانیۃ فضۃ بیضاء واسمھا ارقلون والثالث من یاقوتۃ حمراء واسمھا قیدوم والرابعۃ من درۃ بیضاء واسمھا ماعونا والخامسۃ من ذھبۃ حمراء واسمھا دیقا والسادسۃ من یاقوتہ صفراء واسمھا وفنا والسابعۃ من نور واسمھا عربیا۔

یہ تو وہ حدیثیں ہیں جو بطریق اہل سنت وجماعت مروی ہیں اور شیعوں کے طریق سے بھی روایتیں اس مضمون میں بے شمار وارد ہیں:

۵: اور بحار الانوار کی اسی جلد مذکور میں مذکور ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔ العلل والعیون والخصال فی خبر الشامی عن امیر المومنین ؑ انہ سالہ مما خلق السماوات قال من بخار الماء وسالہ عن السماء الدنیا مما ھی قال من موج مکفوف وسالہ عن طول الکواکب وعرضہ قال اثنا عشر فرسخا فی اثنی عشر وسالہ عن الوان السماوات السبع واسمائھا فقال لہ اسم السماء الدنیا رفیع وھی من ماء ودخان واسم السماء الثانیۃ قیدوم وھی علی لون النحاس والسماء الثالثہ

اسمها المادم وھی علی لون الشبہ والسماء الرابعۃ اسمہا ارقلون وھی علی لون الفضۃ والسماء الخامسۃ اسمہا ھیعوف (ھیعون) وھی علی لون الذھب والسماء السادسۃ اسمہا عروس وھی یاقوتۃ خضراء والسماء السابعۃ اسمہا عجماء وھی درۃ بیضاء۔

ترجمہ حدیث نمبر ایک تفسیر در منثور میں انیس کتابوں سے نقل کیا ہے۔ عباس بن عبد المطلب سے انہوں نے بیان کیا کہ ہم رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ نے فرمایا تم لوگ جانتے ہو کہ آسمان اور زمین کے درمیان کیا فاصلہ ہے؟ ہم نے عرض کی اللہ اور اس کے رسولؐ خوب واقف ہیں! فرمایا ان دونوں کے درمیان پانچ سو برس کی راہ کا فاصلہ ہے اور ہر آسمان سے دوسرے کو پانچ سو برس کی راہ کی دوری ہے۔ دبازت ہر آسمان کی بھی پانچ سو برس کی راہ کی مسافت ہے۔ ساتویں آسمان پہ ایک دریا ہے۔ جس کا تہہ و بالا اتنا ہے جتنا فاصلہ آسمان و زمین کا ہے۔ پھر اس سے بالا آٹھ بکریاں ہیں۔ جن کے گھٹنے اور سموں کے درمیان کا فاصلہ آسمان و زمین کا فاصلہ ہے۔ پھر اس کے اوپر عرش ہے جس کے اسفل و اعلیٰ کا فاصلہ بھی اسی قدر ہے۔

ترجمہ حدیث نمبر ۲۔ ابوذر نے رسول اللہؐ سے روایت کی کہ آسمان و زمین کے درمیان کی مسافت پانچ سو برس کی ہے اور دبازت ہر ایک آسمان کی پانچ سو برس کی مسافت ہے اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو برس کی راہ ہے۔ ساتویں آسمان تک یہی حال ہے اور زمین کا بھی یہی حال ہے اور ساتویں آسمان اور عرش کے درمیان کا فاصلہ ان سب کے مجموعہ کے برابر ہے۔

ترجمہ حدیث نمبر ۳۔ ربیع نے انس سے روایت کی ہے کہ نیچے والا آسمان ایک موج مکفوف کی صورت میں ہے اور دوسرا آسمان مرمر سفید ہے۔ تیسرا لوہے کا ہے۔ چوتھا تانبا ہے۔ پانچواں چاندی ہے۔ چھٹا سونا ہے۔ ساتواں

یاقوت سرخ ہے اور اس سے بالا میدان ہائے نور ہیں۔

ترجمہ حدیث نمبر ۴۔ سلمان فارسی سے منقول ہے کہ آسمان زیریں زمرد سبز ہے۔ جس کا نام رقیعا ہے۔ دوسرا نقرہ سفید کا جس کا نام ارقلون ہے تیسرا یاقوت سُرخ ہے۔ جس کا نام قیدون ہے۔ چوتھا گوہر سفید ہے جس کا نام ماعونا ہے۔ پانچواں طلا سُرخ ہے جس کا نام دیقا ہے۔ چھٹا یاقوت زرد جس کا نام دفنا ہے۔ ساتواں نور ہے جس کا نام عربیا ہے۔

ترجمہ حدیث نمبر ۵۔ کسی شامی نے جناب امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آسمان کس چیز سے پیدا کئے گئے تو فرمایا کہ پانی کے بخارات سے۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ آسمانِ دنیا کیا چیز ہے تو فرمایا کہ موج بستہ ہے۔ پھر پوچھا کہ طول اور عرض ستارے کا کتنا ہے۔ فرمایا ایک سو چوالیس فرسخ پھر اس نے آسمانوں کے رنگ اور اُن کے نام دریافت کئے۔ فرمایا آسمانِ دنیا کا نام رفیع ہے جس کی ترکیب پانی اور دھوئیں سے ہے۔ دوسرے آسمان کا نام قیدوم ہے اور وُہ برنگ نحاس ہے۔ تیسرے کا نام ماذوم ہے اور وہ برنگ پونجھ کے ہے چوتھے کا نام ارقلون ہے اور وہ چاندی کے رنگ کا ہے پانچویں کا نام ہیفوف (دہیون) ہے اور وہ سونے کا رنگ ہے۔ چھٹے کا نام عروس ہے اور وہ یاقوت سبز کے رنگ کا ہے۔ ساتویں کا نام عجماء ہے اور وُہ سفید موتی کے رنگ کا ہے۔

توریت بھی اس مضمون سے مملو ہے میں صرف دو تین آیتیں بطور نمونہ کے پیش کروں گا (کتاب پیدائش باب ۲۔ آیت ۴) یہ آسمان اور زمین کی پیدائش کا بیان ہے۔ جب وے پیدا ہوئے جس دن کہ خداوند خدا نے زمین اور آسمان کو بنایا۔

(۲) ۲۲ باب کتاب سلاطین آیت ۱۹۔ پھر اس نے کہا کہ اس لئے کہ تم خداوند کے سخن کو سنو۔ میں نے خداوند کو اس کی کرسی پر بیٹھے دیکھا اور آسمانی سارا لشکر اس کے پاس اس کے داہنے ہاتھ اور اس کے بائیں ہاتھ کھڑا تھا۔"

دوسرے کتاب سلاطین باب ۲ - آیت ۱۰۱ - اور یوں ہوا کہ جب خداوند نے چاہا کہ ایلیاہ کو ایک بگولے میں اڑا کے آسمان پر لے جاوے۔ تب ایلیاہ الیسع کے ساتھ جلجال سے چلا۔"

انجیل متی باب ۳ - آیت ۱ - اور اُن دنوں میں یوحنا بپتسمہ دینے والا یہودیہ کے بیابان میں ظاہر ہو کے منادی کرتے اور یہ کہنے لگا کہ توبہ کرو۔ کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک ہے۔"

انجیل مرقس باب ۱۳ - آیت ۲۴ - اور اُن دنوں میں اس تکلیف کے بعد سورج اندھیرا ہو گا اور چاند اپنی روشنی نہ دے گا اور آسمان سے ستارے گر پڑیں گے اور آسمان کی قوتیں ہلائی جائیں گی۔"

انجیل لوقا باب ۲۴ - آیت ۵۱ - اور ایسا ہوا کہ جب وہ انہیں برکت دے رہا تھا۔ اُن سے جدا ہوا اور آسمان پر اٹھایا گیا۔" اور علیٰ ہذا القیاس سینکڑوں آیتیں ہیں کہاں تک کوئی نقل کرے۔

(رگوید سکت ۷ - منتر ۱۳ - صفحہ ۱۸۰) اے اندر جس وقت تونے اپنے بجر سے ورترا کا اور اس کے تیر کا جو اس نے چلایا۔ مقابلہ کیا۔ اس وقت لے اندر تیری طاقت جب کہ تیرا مصمم ارادہ ورترا کے قتل کرنے کا تھا۔ آسمانوں میں پرگھٹ ہوئے۔ اور تیری حکومت اس سے ظاہر ہوئی۔"

(رگ وید تیسرا ادھیائے سکت ۳ - منتر ۹) اے اندر تو آسمان و زمین پر برابر جوان ہے اپنے قد سے تونے تمام عالم کو ڈھک لیا ہے۔ تونے قزاق کو ان منتروں کے زور سے جو ان لوگوں کی خاطر پڑھے جاتے ہیں۔ جو اُن کو نہیں سمجھتے بھگا دیا ہے۔"

(ژند پاژند معہ ترجمہ۔ تیسری قسم کی وحی ، یوں بیان کی ہے) نیم دم کا جفر ماہزدیم کرسدی دفا فرہوش ہز شہر ددام ورشدی۔ سیم دربیداری کہ از تن گسیختی و با فرشتہ از آسمان ہا گذشتی۔" اس آیت میں بھی آسمان

کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ بذریعہ منقولات تو اس کا ثبوت بیّن ہے اور انکارِ آسمان اس راہ سے معلوماتِ عالم کے برخلاف رائے زنی ہے۔ جس کی سفاہت حد سے زیادہ واضح ہے۔ رہی عقل وہ بھی اس امر کی حاکم ہے کہ آسمان موجود ہے موجود ہی نہیں بلکہ اس کا وجود لازم ہے۔ چنانچہ عقل کی دلیلیں یہ ہیں:

جیسے فلاسفہ نے بیان کیا ہے۔ یہ ہے کہ دو چیزوں کا وجود

پہلی دلیل: بدیہی ہے۔ جس کا انکار نہیں ہو سکتا! بلندی یا پستی جسے فوق اور تحت سے تعبیر کر لیجیے۔ کون اس بات کو نہیں جانتا کہ اوپر اور نیچے یہ دو جہتیں ہیں۔ جیسے دائیں بائیں آگے پیچھے چار جہتیں ہیں۔ جو مجموعتہً چھ ہیں، مگر، چار جہتیں چونکہ بدلتی رہتی ہیں۔ اس وجہ سے ان سے بحث کرنی مقصود نہیں ہے۔ صرف اُن دو سمتوں سے بحث ہے۔ جنہیں اُوپر اور نیچے کہا جاتا ہے۔ اگر چہ ہر اُوپر سے اُوپر اور ہر نیچے سے نیچے۔ یعنی ہر فوق سے فوق اور ہر تحت سے تحت ممکن ہے لیکن کسی نہ کسی جگہ اس کی انتہا ہونی چاہیے فوق کی کوئی ایسی انتہا ہونی لازم ہے۔ جس سے اُوپر کچھ نہ ہو۔ اور تحت کی بھی کوئی ایسی انتہا ہونی چاہیے جس سے نیچے کچھ نہ ہو اور اگر ایسا نہ ہو گا۔ تو غیر تناہی کا وجود لازم آئے گا۔ حالاں کہ کسی غیر تناہی چیز کا خارج میں پایا جانا محال ہے اور اس پر متعدد دلیلیں فلسفیوں نے قائم کی ہیں۔ مثلاً برہان سلمی، برہان ترسی برہان تضعیف۔ برہان تطبیق وغیرہ۔ نیز اگر کوئی حد فوق اور تحت کی قائم نہ کی جائے گی۔ جس کے بعد پھر فوق و تحت نہ ہو لازم آئے گا کہ دنیا میں فوق و تحت کا وجود ہی نہ ہو۔ اس وجہ سے کہ جب کوئی حد فوق کی معین نہ ہوئی تو عالم میں فوق حقیقی کا وجود ہی نہ ہوا۔ اور جب فوق حقیقی کا وجود نہ ہوا تو فوق اضافی کا بھی وجود نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ اس کی فرع ہے پس جب اصل ہی کا وجود نہیں تو فرع کا وجود کب ہو سکے گا۔ نیز اگر فوق اور تحت کی کوئی حد مقرر نہ ہو

گی۔ تو اس کی طرف اشارہ بھی ناممکن ہے اس لئے کہ جو چیز موجود ہی نہیں ہے۔ اس کی طرف اشارہ کیوں کر ہو سکتا ہے (ہمیشہ کسی موجود چیز کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں) حالانکہ ہم اشارہ سے بتا سکتے ہیں۔ کہ وہ سمت فوقانی ہے اور یہ سمت تحتانی ہے تو معلوم ہوا کہ کوئی نہ کوئی ایسی حد فوقانی اور تحتانی جہتہ میں ہے جہاں تک اشارہ اور امتداد اشارہ منتہی ہوتا ہے اور اگر نہ ہو تو ہمارا اشارہ محال ہو جائے حالانکہ ممکن ہے۔ پس اب یہ بتانا چاہیئے کہ وہ کیا چیز ہے جہاں تک اشارہ منتہی ہوتا ہے اور وہ کیا چیز ہے۔ جس نے فوق اور تحت کی حد بندی کی ہے۔ اگر کہو کہ خلائے حد بندی کی ہے۔ تو محال ہے۔ اس لئے کہ خلاء کوئی چیز نہیں ہے اور نہ سوائے تخیل کے اس کا کہیں وجود ہے اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ خلا میں فوق و تحت کی حد ہے تو سوال کیا جائے گا کہ آیا یہ خلا متناہی ہے یا نا متناہی اگر کہو کہ غیر متناہی ہے تو بھلا تمہیں بتاؤ کہ غیر متناہی چیز کسی کی تحدید کیا کر سکتی ہے۔ جب کہ خود اسی کی کوئی حد نہیں اور اگر کہو متناہی ہے تو ضرور ہے کہ اس خلا کی انتہا کسی جسم یعنی ملا تک ہوتی ہوگی تو اب حد بندی کرنے والا وہ ملا رہا یعنی جسم ٹھیرا یا خلا تمہیں سوچو۔ پس اب لا محالہ تم کو یہ کہنا پڑے گا کہ جہاں فوق اور تحت کی انتہا ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی ملا یعنی جسم ہے جس کے آگے خلا نہیں۔ پس وہی جسم جہاں تک اشارہ فوقانیہ اور تحتانیہ کی انتہا ہوتی ہے۔ فلک ہے اور وہی سما رہے اور وہی آسمان۔ اسی وجہ سے لازم ہے کہ اُسے گول یعنی کروی مانا جائے۔ کیونکہ اگر مربع یا مثلث یا کسی اور شکل کا ہوگا تو اس میں ہرگز دو انتہائی حدیں جو آپس میں مقابل ہوں نہ نکل سکیں گی۔ کیونکہ تم جان سکتے ہو کہ مربع کے ایک زاویہ سے اگر دوسرے زاویہ تک خط کھینچو تو وہ بڑا ہوگا۔ بہ نسبت اُس خط کے جسے وتر مربع پر عمود قائم کرو اسی طرح۔ دوسری جانب میں بھی پیدا ہوگا اور ان خطوط کا باہم ایک دوسرے سے چھوٹا بڑا ہونا لازم ہے۔ علی ہذا القیاس مثلث اور مثمن وغیرہ

میں ہے۔ بخلاف کروی شکل کے کہ جس طرف سے تم اس میں خط کھینچو۔ سب آپس میں برابر ہی ہوں گے۔ اس لئے ہر خط جو دائرہ سے مرکز پر ہوتا ہوا گذرتا ہے اور دوسری طرف دائرے سے ملتا ہے۔ وہ دوسرے خط کے بالکل مساوی ہوتا ہے۔ جو اسی طرح دوسری جانب میں کھینچا گیا ہو۔ تو کروی جسم میں تم جو مقام فرض کرو گے۔ بشرطیکہ مرکز سے مقابل ہو۔ وہ دوسری جانب سے اس جسم کروی کے انتہائی بعد پر ہو گا۔ اور وہی دونوں حدیں فوق و تحت کہی جائیں گی اور یہی مطلوب تھا۔

دوسری دلیل: عقلی یہ ہے کہ رنگ ایک ایسی چیز ہے جو بغیر کسی اور شے کے جس کے اندر ہو کر اس کا وجود ہو نہیں پائی جا سکتی۔ دیکھو سفیدی کسی کپڑے میں ہو گی کسی جانور کے پروں میں ہو گی۔ کسی جانور کے بالوں میں ہو گی۔ کسی شیشہ میں ہو گی۔ غرض کوئی نہ کوئی اس کا محل ہو گا جس میں وہ قائم ہو۔ تم ہرگز سفیدی یا سرخی یا زردی یا سیاہی کو بغیر کسی جسم کے نہ دیکھو گے۔ کیونکہ یہ عرض ہے اور ہر عرض اپنے وجود میں کسی جوہر کا محتاج ہوتا ہے پس اب یہ بتاؤ کہ یہ فیروزی رنگ یا یوں کہو زبرجدی یوں جو تمہیں اوپر کی سمت میں دکھائی دیتا ہے جب کہ تم نظر اٹھاتے ہو۔ کس چیز میں ہے کیا کوئی موہوم شے میں ہے؟ حالانکہ موہوم شے کا وجود خارج و واقع میں نہیں ہوتا۔ جس میں کسی رنگ کا قیام و بقا ہو سکے۔ لامحالہ تم کو کہنا ہو گا کہ یہ کوئی نہ کوئی جوہر ہے جس میں اس عرض کا قیام ہے اسی جوہر کا تو نام فلک یا آسمان ہے اور اگر کہو کہ یہ ہوا کا رنگ ہے تو یہ غلط ہے کیوں کہ ہوا کا رنگ سبز ہے۔ ہوا میں جب رنگ پیدا ہوتا ہے تو کسی نہ کسی سبب سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً آفتاب کی شعاعوں کی وجہ سے سفید رنگ۔ یا رات کی تاریکی کی وجہ سے سیاہ رنگ یا رنگین غبار کی وجہ سے سرخ سیاہ۔ زرد رنگ وغیرہ وغیرہ۔ تو اگر یہ رنگ ہوا میں قائم ہے تو تمہیں بتانا پڑے گا کہ اس کا سبب کیا ہے اور وہ کیسا سبب لازمی ہے۔ جس

کا کبھی زوال نہیں ہوتا اور آخر سوائے وہاں کی ہوا کے دوسرے مقام کی ہوا میں یہ رنگ کیوں نہیں ہے؟

تیسری دلیل: عقلی یہ ہے کہ عکس اسی شے کا پڑ سکتا ہے جو خارج میں کوئی چیز موجود ہو۔ تم آئینہ میں اپنی صورت کا عکس دیکھتے ہو۔ اگر تم موجود نہ ہوتے۔ تو یہ عکس تمہاری صورت کا کہاں سے آتا۔ پانی میں درختوں، مکانوں۔ ستاروں وغیرہ چیزوں کا عکس تمہیں نظر آتا ہے اگر یہ چیزیں موجود نہ ہوتیں تو کس کا عکس پڑتا بھلا تم اپنی خیالی تصویر کا یا وہمی صورت کا عکس تو پانی یا آئینہ میں ڈال لو۔ ہرگز ممکن نہیں ہے۔ پس اب جو ہم آئینہ میں یا پانی میں کسی فوقانی چیز کو زبرجدی رنگ میں دیکھتے ہیں۔ تو آخر یہ کیا ہے؟ کیا کسی قوت واہمہ کی وہمی تصویر ہے۔ کیا کسی خیال کا خیالی نقشہ ہے؟ توبہ کرو! بلکہ یقیناً یہ کوئی بہت بڑا طویل وعریض جسم ہے۔ جس کا یہ رنگ تمہیں دکھائی دیتا ہے۔ اور وہی آسمان ہے۔

چوتھی دلیل: یہ ہے کہ ہر شئے کے رکنے کے واسطے کوئی جسم ہونا لازمی ہے۔ اور جسم بھی ایسا جو کثیف ہو۔ شفاف نہ ہو۔ جیسے شیشہ۔ ورنہ اس پر سے گزر جانا ممکن ہوگا۔ پس ہر شعاع یا نظر جو آپ کسی طرف دوڑاتے ہیں وہ جب تک کسی جسم کثیف سے متصادم نہیں ہوتی دیا یوں کہو کہ ٹھوکر نہیں کھاتی) کسی طرح رُک نہیں سکتی۔ اب آپ جو اوپر کی جانب نظر کرتے ہو اور نگاہ ایک حد پر جا کر ٹھہر جاتی ہے گویا اس کی کوئی روک آگے لگی ہوئی ہے۔ جو اسے اپنے سے آگے نہیں جانے دیتی۔ وہ کیا چیز ہے؟ اگر کہو کہ وُہ ایک جسم زبرجدی ستون ہے تو ہمارا مطلب حاصل ہے۔ کیونکہ ہم اُسی کو آسمان کہتے ہیں اور اگر کہو کہ خلا ہے تو یقین جان لو۔ کہ خلا میں یہ طاقت نہیں کہ نظر سی شفاف اور نورانی چیز کو روک سکے۔ جب کہ وہ خود ہی کوئی موجود چیز نہیں ہے اور اگر کہو کہ حد نگاہ ہے تو تمہیں بتانا پڑے گا کہ حد نگاہ کس جا کو

کا نام ہے۔ جس سے تمہاری عقل کا پتہ لگایا جا سکے۔ اور معلوم ہو کہ کس حد تک تمہارے ذہن کی رسائی ہے۔

علاوہ اس کے مشاہدہ رصدی بھی وجود فلک کو بتاتا ہے۔ اگرچہ ایک فیثا غورث کو اس کی نگاہ کی کمزوری کی وجہ سے اتنا بڑا فلک نہ دکھائی دیا۔ لیکن ان سے پہلے ہزاروں حکماء و فلاسفر نے مدتوں۔ رصد خانوں میں بیٹھ کر اور حرکات و اوضاع ثوابت و سیارات کو دیکھ کر معلوم کیا ہے کہ اس مقام پر نو مختلف حرکتیں پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کے لئے محل کا ہونا لازم ہے کیونکہ حرکت بغیر جسم کے نہیں ہوتی۔ تو لامحالہ یہ حرکتیں ویسے ہی مختلف اجسام میں ہوں گی اور وہ نو آسمان ہیں۔ جن میں سے دو کو عرش و کرسی کہتے ہیں۔ اور سات کو فلک۔

نیز۔ جب کہ زمین کا سکون معلوم ہو گیا۔ تو پھر بغیر اس کے کہ افلاک کا وجود مانا جائے کوئی چارہ نہیں ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ فیثا غورث نے آسمان کے وجود سے انکار کر کے زمین کی حرکت مانی تھی (اور صرف اس کا سبب یہ تھا کہ میری رائے سب سے الگ رہے۔ اور کوئی نئی بات کہو چاہے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ تا کہ میری شہرت ہو۔ اور میں پانچ سواروں میں شمار کیا جاؤں) کیوں کہ اگر زمین کو متحرک نہ مانتا تو سیارات و ثوابت ستاروں کی اوضاع حرکت میں خلل پڑ جاتا۔ نہ کبھی صبح ہوتی۔ نہ شام۔ نہ دوپہر۔ نہ تیسرا پہر نہ دن نہ رات۔ اسی حرکت کی وجہ سے آفتاب کا طلوع۔ غروب۔ صعود۔ ہبوط۔ محسوس ہوتا ہے اسی حرکت کے ذریعہ سے ستارے نکلتے ہیں۔ چاند روشن ہوتا ہے۔ اور اس میں مختلف صورتیں ہر تیس روز کے درمیان میں واقع ہوتی ہے۔ پس جب کہ زمین کا سکون ثابت ہو جائے گا تو لامحالہ آسمان کا وجود ماننا پڑے گا۔ جس سے یہ حرکتیں قائم رہ سکیں۔ کیونکہ خود آفتاب۔ ماہتاب اور دیگر سیارات تو مشرق سے مغرب کی طرف یا مغرب سے مشرق کی طرف حرکت کرتے ہی نہیں۔ ورنہ لازم آئے گا کہ ان میں

تین متضاد حرکتیں ہر وقت پائی جائیں۔ ایک مشرق سے مغرب کی طرف بحرکت مستقیمہ۔ دوسری مغرب سے مشرق کی طرف علی توالی البروج۔ تاکہ سال و ماہ کا تعین ہو سکے۔ تیسری اُن کی ذاتی حرکت اپنے مرکز کے گرد۔ جیسا کہ ایک ہیئت دان پر مخفی نہیں ہے۔ حالانکہ کسی ایک چیز سے تین متضاد افعال کا ایک وقت میں صادر ہونا بالکل محال ہے۔ لیکن ہم بداہتہً دیکھتے ہیں۔ کہ ان سیارات میں یہ تین قسم کی حرکتیں بالفعل وقت واحد میں موجود ہیں تو لامحالہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ وہ جو مشرق سے مغرب کی طرف ان کے لیے محسوس ہوتی ہے اور وہ اسرع حرکات ہے۔ اس کا سبب تو حرکت فلک الافلاک ہے۔ جو یوم بلیلتہ میں اپنا دورہ پورا کر لیتا ہے اور جو حرکت مغرب سے مشرق کی طرف ہے وہ اس فلک کی وجہ سے ہے جس میں یہ سیارات مرکوز ہیں۔ اور حول المرکز جو حرکت ہے۔ وہ ان کی ذاتی حرکت ہے۔ لہذا اب منافات نہ رہی اور محال بھی مرتفع ہو گیا۔

نیز وجود آسمان پر ایک اور دلیل نہایت متین سمجھ میں آتی ہے اور وہ تشابہ نظام عالم صغیر بہ عالم کبیر ہے۔ راس الحکماء المتالہین و امام الفلاسفۃ العارفین کا ارشاد ہے کہ اے انسان خاکی۔

اتزعم انک جرم صغیر　　وفیک انطوی العالم الاکبر

تو خیال کرتا ہے کہ تو جسم صغیر ہے۔ حالانکہ تجھ میں عالم اکبر منطوی ہے۔

سوق استدلال یوں ہے۔ کہ جسم انسان مخزن بلکہ ہو بہو نمونہ ہی اس عالم کا ہے جسے جہان اعظم یا کائنات کمونہ یا عالم اکبر کہتے ہیں۔ اس جسم میں تمام وہ چیزیں موجود ہیں۔ جو عالم اکبر میں ہیں۔ پہاڑوں کے قائم مقام بدن کی بڑی چھوٹی ہڈیاں ہیں۔ دریاؤں کی قائم مقام بڑی رگیں ہیں۔ جو تمام جسم میں دوڑی ہوئی ہیں۔ ندیوں کی قائم چھوٹی رگیں ہیں۔ جو رقیق و نرم مقامات میں جاری ہیں۔ نباتات کے قائم مقام اُس کے تمام اعضا ہیں جو مثل درختوں اور نباتی چیزوں کے بڑھتے ہیں۔ گھاس اور سبزہ کے قائم مقام اس کے بال ہیں جو سر پہ چہرہ پر یا تمام بدن

پر اُگتے ہیں۔ حیوان تو خود ہی ہے۔ یعنی جسم نامی حساس متحرک بارادہ پرنالے اور موریوں کے قائم مقام وہ رستے ہیں۔ جس طرف سے فضول دفع ہوتے ہیں۔ بجائے بادشاہ کے اس کا دل ہے۔ بجائے وزیر کے دماغ ہے۔ بجائے فوج کے قوی ہیں۔ بجائے غنیم کے امراض ہیں۔ جو اُس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ بجائے مخبر اور جاسوس کے حواس ظاہرہ و باطنہ ہیں۔ نیز بجائے نقارہ شہر کے دونوں کان ہیں بجائے ترجمان کے زبان ہے۔ بجائے دیدبان کے آنکھیں ہیں۔ بجائے طباخ کے معدہ ہے نیز بجائے ستاروں اور آفتاب و ماہتاب کے یہ دو لالٹینیں ہیں جو سر میں لگی ہوئی ہیں یعنی دو آنکھیں بجائے تدویر قمر کے دو حلقہ چشم ہیں۔ جن کے اندر آنکھیں گردش کرتی ہیں۔ اور بجائے آسمان کے جس کے اندر یہ تدویر اور چاند سورج قائم ہیں۔ انسان کا سر ہے۔ یہ تشابہ جس کا ذکر کیا گیا۔ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ اُن امور میں سے ہے کہ اس سے ہم بہت اچھی طرح استدلال کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جب اس جسم میں عالم اکبر کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ مثلاً عناصر اربعہ یعنی پانی۔ ہوا۔ خاک۔ آگ (جس سے مراد حرارت غریزیہ ہے) اور موالید ثلاثہ یعنی نباتات۔ جمادات۔ حیوانات اور کواکب یعنی آنکھیں اور ملائکہ۔ جس کی تعبیر اس جسم میں عقل اور نفس۔ اور قوائے مدبرہ۔ و مولدہ۔ مصورہ و غاذیہ و ہاضمہ و دافعہ ماسکہ و جاذبہ و قابضہ و باسطہ سے ہے۔ تو صرف ایک ہی چیز کی کیوں کمی رہ جائے۔ اور اس کا سر قائم مقام آسمان کا کیوں نہ سمجھا جائے!! اگرچہ یہ قیاس، قیاس برہانی نہیں ہے۔ مگر قیاس مع الفارق بھی نہیں ہے۔ کم از کم تمثیل یا تقریب کا کام ضرور دے سکتا ہے۔ والعلم عند اللہ

چوتھی بحث: وَالسَّمَاءَ بِنَاءً سے بعض لوگوں نے سمجھا ہے کہ آسمان واقعی کوئی مسطح چیز ہے اور جیسے مکان کی چھت ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی بالائے زمین ہے۔ مگر یہ خیال محض غلط ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سلسلہ نظام کل کروی ہے۔ افلاک اور فلکیات اور عناصر جنہیں بسائط بھی

کہتے ہیں۔ ہر ایک کرہ ہے۔ اور اس طرح ایک دوسرے پر ہے۔ جیسے پیاز کے چھلکے تہ بتہ ہوتے ہیں اور پھر اُس کی سقفیت میں فرق نہیں آتا۔ کیونکہ آسمان اسی طرح بالائے زمین نظر آتا ہے۔ جیسے مکان کے اندر اس کی چھت اور یہ ارشاد بھی پروردگار عالم کا بحسب ظاہر حس ہے نہ بحسب حقیقت۔ جبکہ دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ رفع السموات بغیر عمد ترونہا۔ اگرچہ یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ کسی کرہ کا ایک مرکز پر قائم کرنا اور اس میں کسی قسم کا سہارا نہ لگانا اور پھر اس کا بے سہارے کھڑا رہنا یا اپنے ہی مرکز کے گرد پھرتے رہنا۔ خلاف حرکت وضعیہ حرکت نہ کرنا۔ بہت بڑی قدرت کو خالق مطلق اور قادر علی الاطلاق کے ثابت کرتا ہے۔ لیکن اس ارشاد کا مطلب بھی وہی ہے۔ جو پہلے عرض کیا گیا۔ یعنی نظر بظاہر محسوس جسے عوام الناس سمجھ لیں۔ کیونکہ اگر اسی بیان کو رنگ حقیقت اور طرز فلسفین میں بیان کیا جاتا۔ تو اس وقت کے سننے والوں کے دل و دماغ اُس کے سمجھنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے اور نہ انہیں اُس کا تحمل تھا۔ اس لئے انہیں ادق مضامین کو سہل تقریباً الی ذہن السامع اس طرح بیان کر دیا جسے وہ سمجھ سکیں۔

پانچویں بحث: وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ جس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ آسمان سے پانی برسایا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ آسمان کی طرف سے پانی برسایا۔ کیونکہ بخارات وغیرہ جو باعث وجود ابر کے ہیں۔ وہ آسمان ہی کی طرف صعود کرتے ہیں۔ اور پھر وہیں ابر بن جاتے ہیں اور وہیں سے نیچے کی جانب برس پڑتے ہیں۔ تو اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہوئی کہ انزل من سمت السماء یا نحو السماءِ ماءً یا یہ مطلب ہے کہ مینہ کا برسنا بھی اسباب سماویہ سے ہے۔
کیونکہ اگر حرکت آسمان نہ ہو۔ مختلف طلوع وغروب نہ ہوں۔ حرارت شمس نہ ہو۔ تو بخارات پیدا ہی نہ ہوں۔ اور اگر اس حرارت و برودت طلوع وغروب کی وجہ سے ہوا میں تخلخل و تکاثف نہ ہو تو بخارات نہ ابر بن سکیں۔ اور نہ اس سے مینہ برس سکے۔ یا اس عبارت میں یہ صفت کی گئی ہو۔ کہ ایک مقام پر اسے ایک معنی

میں استعمال کیا ہو۔ اور دوسرے مقام پر دوسرے معنی میں۔ یعنی چوں کہ سماء کے دو معنی ہیں۔ ایک آسمان۔ دوسرے بلندی۔ تو پہلے لفظ سماء سے تو آسمان مراد لی ہے۔ جہاں فرمایا ہے والسماء بناء۔ اور دوسرے لفظ سماء سے بلندی مراد لی ہو۔ جہاں فرمایا ہے۔ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً۔ تو اب معنی یہ ہوں گے کہ تمہارا پروردگار وہ ہے۔ جس نے بلندی سے تمہارے لئے مینہ برسایا۔ یہ تینوں ہی احتمال بجائے خود صحیح ہو سکتے ہیں۔ مگر تفسیروں میں۔ آخری احتمال پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ تفسیر صافی میں ہے۔ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً یعنی المطر منزله من علا لیبلغ قلل جبالکم وتلالکم وهضابکم واوهادکم۔ تفسیر مجمع البیان میں مِنَ السَّمَآءِ کی تفسیر من السحاب کی ہے۔ گویا یہ مطلب ہے کہ سحاب یعنی ابر چونکہ بلندی پر ہوتا ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے مجازاً سحاب کی سماء سے تعبیر فرما دی۔ خیر اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کیوں کہ مجازات کا استعمال قرآن مجید میں بکثرت ہے۔

پروردگار عالم کے اس ارشاد میں نعمتِ آب کی عظمت کا بھی ظاہر کرنا مقصود ہے۔ یعنی دیکھو تمہارا پروردگار کتنا بڑا منعم ہے کہ اس نے تمہارے واسطے بلندی سے مینہ برسایا۔ اور اس میں عجیب و غریب حکمتیں رکھیں۔ اب کہ بلندی سے پانی آتا ہے۔ تمام پہاڑوں پر پڑتا ہے۔ جس سے عجائب غرائب بوٹیاں دوائیں سبزے۔ اشجار پیدا ہوتے ہیں۔ نیز تمام بلند مقامات پر آپ سے آپ پہنچ جاتا ہے۔ اگر تم کو دریا سے پانی لانا پڑتا۔ تو بلند مقامات پر اس کے پہنچانے میں کس قدر تم کو زحمتیں ہوتیں۔ اب نہ تم کو ہاتھ ہلانے پڑتے ہیں نہ پاؤں خود بخود بلندیوں پر پانی برس جاتا ہے۔ جس سے بخوبی وہاں بھی کاشت کر سکتے ہو۔ باغ لگا سکتے ہو۔ سبزی اگا سکتے ہو۔ پھر کتنا ہی نشیب سے نشیب کیوں نہ ہو۔ اور کتنا ہی بلند سے بلند مقام کیوں نہ ہو۔ ہر جگہ یہ پانی پہنچ جاتا ہے پھر بلندی سے اس کے برسنے میں ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ زور سے زمین پر

گرنے کی وجہ سے اس کے باریک مسامات کے رستوں سے اندر جذب ہوتا ہے اور دُور تک زمین میں اس کا اثر پہنچ جاتا ہے۔ نیز ایک مرتبہ مشک کی مشک لڑھکا نہیں دی جاتی۔ بلکہ قطرہ قطرہ کر کے برستا ہے۔ تاکہ بار بار زمین پر پڑ کر اس میں نفوذ کرے۔ اور کھیتوں۔ سبزوں۔ درختوں کی جڑوں۔ تنوں اور شاخوں میں آہستگی سرایت کر کے پورا فائدہ پہنچا سکے اگر یہ پانی نشیب کی طرف سے آتا تو یہ فوائد کب حاصل ہو سکتے تھے بھلا بغیر خالق۔ مدبر۔ حکیم کے یہ افعال آپ سے آپ ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ عجائب فطرت اور غرائب قدرت ہیں جو اس امر پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کا کوئی نہ کوئی خالق۔ اور وہ بھی بہت بڑا حکیم۔ قادر۔ علیم۔ خبیر۔ مانا جائے۔ کیوں کہ یہ سب چیزیں آثار ہیں۔ جو بغیر موثر کے ہو نہیں سکتیں۔ پھر یا تو اس موثر کو بے ادراک و شعور مانو۔ جیسے دہریہ اور نیچری کہتے ہیں۔ یا با ادراک و شعور مانو۔ اس کے بے ادراک ماننے میں تو یہ خرابی لازم آتی ہے کہ جب اس کو شعور ہی نہیں۔ تو اس سے ایسے افعال جن میں باریک سے باریک حکمتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ کیوں کر ظہور میں آئیں۔ لامحالہ ماننا پڑے گا کہ وہ با ادراک و شعور ہے اور وہی اللہ ہے۔ جو خالق الکل اور رازق الکل ہے۔ اور یہی مطلب ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کے اس کلام کا جسے توحید بحار میں مجلسی نے نقل فرمایا ہے۔ جع سئل امیرالمومنین علیہ السلام عن اثبات الصانع فقال البعرۃ تدل علی البعیر والروثۃ تدل علی الحمیر و آثار القدم تدل علی المسیر فھیکل علوی بھذہ اللطافۃ و مرکز سفلی بھذہ الکثافۃ کیف لا تدلان علی اللطیف الخبیر۔ کسی نے حضرت امیرالمومنینؑ سے پوچھا کہ خدا تعالیٰ کے وجود کا کیا ثبوت ہے؟ آپ نے فرمایا مینگنی تو اونٹ پر دلالت کرتی ہیں اور پشک گدھوں پر (یعنی جس مقام پر پڑے ہوں تو دیکھنے والا معلوم کرلے گا کہ ادھر سے اونٹ اور گدھے گزرے ہیں) اور قدم کے نشان راہ چلنے پر دلالت کرتے ہیں (یعنی بتاتے ہیں کہ ادھر سے کوئی گیا ہے)، پس یہ ہیکل علوی

(آسمان) باوجود اس لطافت کے اور مرکز سفلی (زمین) باوجود اس ثقل و کثافت کے خدائے لطیف و خبیر کے وجود پر دلالت نہیں کرتی؟ نیز آپ کا ارشاد ہے کہ بصنع اللّٰہ یستدل علیہ۔ خدا تعالیٰ کی صنعتیں دیکھ کر اس کے موجود ہونے کا پتہ لگایا جاتا ہے۔

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ کے

چھٹی بحث: ظاہری معنی یہ ہیں کہ "پس تم خدا تعالیٰ کے لئے شریک نہ قرار دو اور تم جانتے ہو۔ کہ اس کا کوئی شریک نہیں۔ یا یہ کہ جنہیں تم اس کا شریک بناتے ہو وہ ان نعمتوں کے پہنچانے پر قادر نہیں ہیں۔ یا یہ کہ تم تو باعقل و تمیز ہو پھر کیونکر اس کے لئے شریک تجویز کرتے ہو۔ یا یہ کہ لے اہل توریت و انجیل تم اس بات کو توریت و انجیل میں پڑھ چکے ہو پھر کیوں کسی غیر کو خدا کا شریک قرار دیتے ہو۔ بہرصورت یہ بات معلوم کر لینی چاہیئے۔ کہ خدا کا شریک کسی کو قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ غیر خدا تعالیٰ کو بھی قابل پرستش سمجھا جاوے جیسا کہ ہنود مذہب کے لوگ سوائے خدا تعالیٰ کے گنیش جی۔ رام چندر۔ کالی جی۔ کرشن جی وغیرہ کو جو کہ آدمی تھے۔ مگر اچھے آدمی تھے۔ قابل عبادت سمجھ کر سجدہ کرتے ہیں۔ تو ان کی تصویریں خیالی یا واقعی بنا کر پوجا کرتے ہیں۔ یا ستارہ پرست لوگ ستاروں کو قابل عبادت سمجھ کر عبادت کرتے ہیں۔ یا دو خدا مانے جاویں۔ جیسے مجوسی نور و ظلمت کو خالق عالم جانتے ہیں اور معاملہ خلقت میں غیر خدا کو اس کا شریک سمجھتے ہیں۔ یا ذات خدا تعالیٰ کو معطل مان لیا جاوے۔ اس طرح پر کہ اس نے صرف عقل اوّل کو پیدا کیا۔ پھر اس سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ آخر عقل اوّل نے عقل ثانی اور فلک اوّل کو پیدا کیا۔ اور عقل ثانی نے عقل ثالث اور فلک ثانی کو پیدا کیا۔ یہاں تک کہ سلسلہ دس عقلوں تک پہنچا۔ پھر دسویں عقل نے عناصر و موالید کو پیدا کیا۔ جیسا کہ ایک فریق کا حکمائے یونان سے مسلک ہے یہ بھی شرک ہے۔ یا یہ کہ اس طرح پر اُسے معطل مان لیا جائے کہ

اس نے تمام عالم کے انتظام کو کسی آدمی کے حوالہ کر دیا اور اب خود کچھ نہیں کرتا جیسا کہ مفوضہ کا خیال ہے کہ خدا تعالیٰ نے محمدؐ اور علیؑ کو تمام جہان کا منتظم کر دیا ہے۔ یہی مارتے ہیں یہی جلاتے ہیں۔ یہی پیدا کرتے ہیں یہی روزی دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی شرک ہے۔ یا اُس کے ساتھ وجود میں کسی غیر چیز کو ہمسر سمجھنا جیسا آریہ دھرم۔ مادہ اور روح کو خدا تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ساتھ قدیم مانتے ہیں اور ان دونوں کو اس کا مخلوق نہیں سمجھتے۔ یا اُس کی صفت یا ذات میں کسی کو بیٹا یا بیٹی بنا کر شریک کرنا۔ جیسا کہ اہلِ یورپ حضرت عیسیٰ پیغامبر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا جانتے ہیں۔ یا یہود کا ایک فرقہ حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا جانتا تھا۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے۔ قَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارٰى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ۔ لیکن حق یہ ہے کہ تمام باتیں خلاف عقل ہیں۔ اور عدم معرفت پر دلالت کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ یہ جتنے اہل مذاہب سوائے اہل اسلام کے ہیں۔ جو معرفت خدا کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی سیدھی راہ پر چلنے والا نہیں اور نہ کسی مذہب کی کتاب اس طرح کی توحید سکھانے والی ہے۔ جیسی توحید و روحانیت اور حقانیت اور معرفت قرآن مجید نے سکھائی ہے۔

اس مطلب کو چونکہ ایک اور مقام پر لکھنا مقصود ہے۔ اس لئے یہاں مختصراً یہی کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید یہ سبق دیتا ہے کہ اے آدمیو! جس نے تم کو ایسی ایسی نعمتیں دیں۔ تمہاری خاطر زمین پیدا کی۔ جس سے تم ہزاروں قسم کے فائدے اٹھا سکتے ہو۔ تمہارے واسطے آسمان کو پیدا کیا جو ہر وقت تمہیں مختلف صورتوں سے نفع پہنچاتا رہتا ہے۔ مثلاً آفتاب کی شعاعوں سے۔ چاند کی روشنی سے۔ ستاروں کے تناسب و نظرات سے۔ اپنی حرکت کے اوضاع سے اور تمہارے لئے بلندی سے مینہ برسایا۔ جس سے بے حد فائدے تم کو پہنچے۔ تمہارے ہی واسطے۔ مینہ کے ذریعے سے پھل پیدا کیا۔ پھر بھی تم اس کو نہیں مانتے۔ اور

کہتے ہو۔ کہ عالم تو قدیم ہے۔ یا جو کچھ کیا مادہ نے کیا۔ مادہ ہی بس قدیم ہے یا یہ کہ یہ سب افعال طبیعت کے ہیں۔ جسے کوئی حس وادراک نہیں۔ یا یہ کہ دنیا کی مخلوقات کے خالق آسمان اور ستارے ہیں۔ جیسا کہ اہلِ نجوم کا خیال تھا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مخلوق کو تو خالق مانتے ہو۔ اور خالق کو کچھ بھی نہیں یا اگر صرف مانتے بھی ہو تو اَوروں کو اس کے ساتھ شریک عبادت کرتے ہو۔ خدا تعالیٰ جل مجدہٗ اور عزّ اسمہٗ کو چھوڑ کر پتھر کو سجدہ کرتے ہو۔ ستاروں کو پوجتے ہو۔ آگ کے آگے سر جھکاتے ہو۔ عضو تناسل کی ڈنڈوت کرتے ہو۔ کیا اسی کا نام عقل ہے اور کیا اسی کو معرفت کہا جا سکتا ہے؟ دیکھو ایسا مت کرو۔ غور کرو۔ اور سمجھو کہ یہ موجودات سب کے سب حادث ہیں۔ کوئی بڑا قادر و توانا و حکیم و خبیر اُن کا محدث و موجد ہے۔ سب اُسی کے محتاج ہیں۔ بس وہ ایک غنی ہے اس کا کوئی شریک نہیں پس وہی معبود برحق ہے۔ اور اسی کی عبادت لازم۔

(سورہ بقرہ۔ رکوع ۱۹) اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ اس آیت کے متعلقات چند بیانوں میں واضح کیے جاتے ہیں۔

بیان اوّل: تحقیق الفاظ۔ خلق کے معنی ہیں پیدا کرنا کسی چیز کا باندازہ معین بغیر نمونہ دیکھے ہوئے۔ جیسا کہ تفسیر مجمع میں ہے الخلق هو الاحداث للشی علی تقدیر من غیر احتذاءٍ علی مثال۔ تو آیت میں لفظ خلق سے یہ مراد ہوگی کہ جو چیزیں اس میں مذکور ہیں وہ اس طرح پیدا کی گئی ہیں کہ پہلے اُن کا کوئی نمونہ سامنے نہیں رکھ لیا گیا تھا۔ ایسا نہیں ہوا کہ کسی اور آسمان کو دیکھ کر یہ آسمان بنایا گیا ہو۔ یا کسی اور زمین کو دیکھ کر اُس کے

انداز پر یہ زمین بنائی گئی ہو۔ بلکہ ابتداءً اسی طرح کی پیدا کی گئی ہیں تاکہ معلوم ہو کہ ان کا موجد ایسا حکیم ہے کہ اُسے نمونہ قائم کرکے ایجاد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سماوات - جمع سماء کی ہے۔ جس کے معنی آسمان کے ہیں جیسا کہ آیت سابقہ میں بیان کیا گیا۔ لیکن یہاں یہ دیکھنا ہے کہ لفظ سماوات تو جمع استعمال کیا گیا ہے اور لفظ ارض جو بمعنی زمین ہے۔ واحد لایا گیا۔ حالاں کہ جس طرح آسمان کے طبقات مختلف ہیں اور کئی آسمان ہیں۔ اُسی طرح زمین کے بھی طبقے مختلف ہیں۔ جیسا کہ اسی قرآن کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ۔ یعنی اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے۔ اور زمین سے بھی مثل انہیں (آسمانوں) کے (سات درجے) پیدا کئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آسمانوں کے سات طبقے ہونے کو تو چوں کہ بتصریح کئی مقام پر بیان کیا ہے۔ اس لئے واحد لانے میں اختلاف بیان کا شبہ ہوتا۔ اور نیز یہ بھی سبب ہے کہ آسمانوں کا تعدد بیّن ہے۔ احکام اُن کے مختلف ہیں۔ تدبیریں اُن کی مختلف ہیں۔ حرکتیں اُن کی مختلف ہیں۔ اور وہ بآلات رصدیہ محسوس و مرصود بھی ہیں۔ بخلاف زمین کے کہ اس کے طبقات اگرچہ مختلف ہیں لیکن اس طرح متشاکل و متشابہ ہیں کہ گویا سب طبقے مل کر شئے واحد بن گئے ہیں۔ اور سب طبقے ایک دوسرے سے لپٹے اور چپٹے ہوئے ہیں۔ بخلاف آسمان کے کہ اس کے طبقات سب علیحدہ علیحدہ۔ اُن کے حرکات علیحدہ علیحدہ ہیں۔ لہٰذا ارض کو واحد استعمال کیا اور سماوات کو جمع۔

اختلاف یکے بعد دیگرے آنا جانا۔ نیز اختلاف ضدّ اتفاق بھی ہے کہتے ہیں۔ دو آدمی آپس میں اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ جب کہ ایک کی رائے دوسرے کی رائے کی ضد ہو۔ یہاں پر دونوں ہی معنی درست ہو سکتے ہیں۔ پس اختلاف اللیل والنہار کے یہ معنی ہوں گے کہ رات اور دن کا یکے بعد دیگرے آنا جانا۔ کیوں کہ جب کہ رات آتی ہے تو دن چلا جاتا ہے۔ اور جب دن آتا

ہے تورات چلی جاتی ہے اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں۔ کہ رات اور دن کا باہم رنگوں میں۔ کیفیتوں میں مختلف ہونا۔ لیل اس تاریکی کا نام ہے جو دن کی روشنی کے بعد حادث ہوتی ہے۔ واحد اس کا لیلہ ہے۔ نھار اس روشنی کا نام ہے جو آفتاب کے طلوع کے وقت سے غروب آفتاب تک رہتی ہے۔ فلک بمعنی کشتی۔ اس کا واحد اور اس کی جمع دونوں ہم صورت ہیں۔ اگرچہ وزن میں اختلاف ہے۔ فلک بروزن قفل واحد ہے اور بروزن اُسد جمع ہے۔ نفع یا بمعنی لذت ہے یا بمعنی سرور۔ یا اس چیز کو نفع کہتے ہیں۔ جس سے سرور یا لذت پیدا ہو۔ اس کے معنی میں حظ اور خیر بھی ہیں۔ انزل من السّماء میں سماء سے بعض لوگوں نے سحاب مراد لی ہے اور اکثروں کا وہی خیال ہے جو تفسیر آیہ سابقہ میں گذرا ہے۔ فاحیی بہ الارض۔ پس زمین کو اس نے زندہ کیا۔ زمین کے زندہ کرنے سے مطلب یہ ہے کہ اس کو آباد کیا۔ اس پر سبزی اُگائی۔ درخت پیدا کئے اور مردہ کرنے سے اس کا خشک کر دینا مراد ہوتا ہے۔ بثّ کے معنی پھیلانا ہے۔ دابّۃ ہر وہ چیز ہے۔ جو زمین پر چلے یہاں تک کہ چیونٹی۔ کیڑے مکوڑے۔ آدمی اور باقی حیوانات لیکن علاوہ لغوی معنی کے عرف عام میں گھوڑے کا نام پڑ گیا ہے۔ مگر یہاں پہ وہی لغوی معنی مراد ہیں۔ تصریف الریاح۔ ہواؤں کو اِدھر سے اُدھر پھرانا۔ یعنی مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق جنوب سے شمال اور شمال سے جنوب کی طرف۔ ریاح۔ جمع ریح کی ہے۔ بمعنی ہوائے متحرک۔ اور اس کی چار قسمیں ہیں ۱ شمال ۲ جنوب ۳ صبا ۴ دبور۔ شمالی وُہ ہوا ہے۔ جو قبلہ کے دائیں جانب یعنی اُتر سے چلے اور جنوب وُہ ہوا ہے جو قبلہ کے بائیں جانب یعنی دکھن سے چلے۔ صبا وہ ہے جو مشرق سے چلے۔ اور دبور وُہ ہے جو مغرب سے۔ سحاب مشتق ہے سحب سے جس کے معنی کھینچنے کے ہیں۔ چونکہ بادل چاروں طرف فضا میں اپنے دامن کھینچتا پھرتا ہے اس کو سحاب کہا گیا۔ عرب بولتے ہیں تسحب المرأۃ ذیلھا عورت اپنا دامن زمین

پر کھینچی چلتی ہے۔ تسخیر کے معنی مطیع کرنا۔ چونکہ ابر درمیان آسمان و زمین کے قائم کیا گیا ہے۔ اور اطاعت حکم خالق کر رہا ہے۔ اس لئے اس کو مسخر کہا۔

بیان دوم : معنی آیت ان فی خلق السمٰوٰت والارض بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں واختلاف الیل والنھار اور رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے جانے میں والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس۔ اور اس کشتی میں جو دریا میں آدمیوں کے نفع کے واسطے چلتی ہے وما انزل اللہ من السمآء من مآء۔ خدا تعالیٰ کے آسمان سے مینہ برسانے میں وبث فیھا من کل دابۃ اور زمین پر ہر قسم کے جاندار پھیلا دینے میں (پیدا کر دینے میں) والسحاب المسخر بین السمآء والارض اور اس ابر میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر کر کے قائم کیا گیا لآیات لقوم یعقلون۔ ظاہر نشانیاں اور روشن دلیلیں ہیں عقلمندوں کے واسطے۔

بیان سوم : مطلب یہ ہوا کہ اتنے آثار قدرت اور نشان حکمت تم لوگوں کے سامنے موجود ہیں اور پھر بھی تم وجود خالق کے اور اس کی حکمتوں کے قائل نہیں ہوتے۔ دیکھو کہ آسمان اور زمین بغیر کسی نمونے کے بنائے گئے اور پھر فضا میں قائم کئے گئے۔ نہ زمین کو کسی عمود کی ضرورت ہے جس پر وہ ٹھیرائی جائے اور نہ آسمان کو کسی ستون کی حاجت ہے۔ جس پر وہ روکا جائے۔ نہ کسی رسّی میں ان دونوں کو باندھ کر قائم کیا گیا ہے۔ پھر یہ کہ اُن کی خلقت میں کیسی کیسی حکمتیں ودیعت کی گئیں۔ اور کیا کیا عجیب صنعتیں صرف ہوئیں کس طرح زمین کو ساکن کیا گیا اور کس طرح آسمان متحرک۔ حالاں کہ نہ اس میں کوئی کل لگی ہوئی ہے۔ جو اسے ہر وقت متحرک رکھے۔ اور نہ اس میں طنابیں بندھی ہوئی ہیں جو اسے ساکن رکھیں۔ کیا باوجود ان باتوں کے یہ دونوں وجود خالق کو نہیں بتاتے۔ بے شک اس کے وجود قدرت کی دلیلیں

ہیں۔ نیز رات اور دن کا آنا جانا۔ ان کے لئے ایک خاص اندازہ مقرر ہونا۔ فصول کے اختلاف سے اُن کا گھٹنا بڑھنا۔ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ کوئی نہ کوئی صانع ان کا ضرور ہے۔ جس نے یہ اندازے قائم کئے ہیں۔ نیز وہ کشتی جو پانی پر چلتی ہے آخر کس نے لکڑی کو ایسا بنایا کہ پانی پر تیرتی رہے۔ کس نے آدمی کو یہ عقل دی کہ اس صورت کی کشتی بناؤ۔ تو تم اس پر بیٹھ کر سمندروں سے آر پار جا سکو گے۔ اپنی اشیائے تجارتی کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جا سکو گے۔ مختلف بلاد کے حالات و کیفیات و امزجہ معلوم کر سکو گے اور کس نے پانی کو یہ طاقت دی کہ ہزاروں من کے بوجھ سے لدی ہوئی کشتی کو اپنے اوپر اٹھائے رہے۔ اور کس نے پانی میں یہ سیلانی کیفیت دی کہ اس پر نہایت تیزی سے کشتی چل سکے۔ بے شک کوئی بڑا حکیم ہے۔ جس نے ایسی چیزیں پیدا کیں اور پھر اس کے استعمال میں لانے کی تدبیریں بتائیں۔ وہی تو خالق العالم و مبدع الاشیاء ہے۔ نیز آسمان کی طرف سے مینہ برسنا۔ اور زمین پر مختلف قسم کے جانداروں کا ہونا اور چاروں طرف سے ہواؤں کا چلنا اور فضائے آسمان میں ابر کا قائم رہنا۔ صاف صاف اس بات کی دلیلیں ہیں کہ ان کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے اور وہی اللہ ہے۔

خالق کائنات کی آٹھ نشانیاں

اس آیت میں آٹھ نشانیاں یعنی دلیلیں وجود خالق تعالیٰ شانہٗ کی بیان کی گئی ہیں۔ ۱۔ آسمان کا پیدا کرنا ۲۔ زمین کا پیدا کرنا ۳۔ رات اور دن کا اختلاف ۴۔ پانی پر نفع خلائق کے لئے کشتی کا چلانا ۵۔ آسمان سے مینہ برسنا اور زمین کو اس سے زندہ کرنا ۶۔ حیوانات کا پیدا کرنا ۷۔ ہواؤں کا چلانا ۸۔ ابر کا فضائے آسمان میں قائم رکھنا۔ میں ان آٹھوں دلیلوں کو کسی قدر واضح کر کے بیان کرتا ہوں۔ جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ کیوں کر یہ اشیاء وجود خالق پر دلیل

ہیں اور جو ان میں کوئی بحث ہوگی وہ بھی مختصراً عرض کی جائے گی۔

پہلی نشانی: آسمانوں کی خلقت ہے۔ یہ وہ عجیب موضوع ہے کہ اگر اس کے سوا اور کوئی چیز عالم میں نہ موجود ہوتی۔ تب بھی صرف یہی ایک خدا تعالیٰ کے وجود۔ قدرت۔ حکمت۔ علم۔ غلبہ۔ کمال۔ قدم اور لطف کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا۔

اس کی صنعتوں اور عجائب قدرت کو اگر علم ہیئت کے مذاق پر بیان کیا جائے تو صرف اسی ایک نشانی کی تفسیر میں ایک بڑی کتاب مرتب ہو جائے اور اگر زبان شریعت سے اس کی تشریح کی جائے۔ تب بھی ایک عظیم الشان دفتر تیار ہو جائے۔ لیکن چوں کہ مجھ کو اس آیت کے علاوہ اور آیتوں سے بھی بحث کرنی مقصود ہے اس لئے ضروری ہے کہ نہایت مختصر لفظوں میں اس مطلب کو ادا کروں۔

ملاحظہ ہو۔ آسمان کیا چیز ہے؟ اور آسمان کتنے ہیں۔ آسمان ایک عظیم الشان جسم کروی ہے۔ جس کے طول و عرض کی مقدار کے خیال کرنے سے حیرت ہوتی ہے۔ جب کہ اُس کے ایک چھوٹے سے جرم نیر یعنی آفتاب کا قطر (۸۸۰۰۰۰) میل اور محیط (۲۷۶۴۰۰۰) میل کا ہے۔ تو پورے آسمان کا دور کتنا ہوگا۔ یہ ایک جسم بسیط ہے۔ جیسا کہ فلسفہ طبعیہ میں ثابت ہو چکا ہے۔ اس میں نفس فلکی بھی موجود ہے جو اسے متحرک رکھتا ہے۔ مگر چوں کہ اس کی طبیعت واحدہ بسیط ہے۔ اس لئے اس میں سوائے حرکت دوریہ وضعیہ کے دوسری حرکت نہیں ہو سکتی۔ اور یہی سبب انتظام عالم کا بھی ہے۔ ورنہ اگر اس کی مختلف حرکتیں ہوتی رہتیں۔ کبھی صعودی۔ کبھی ہبوطی۔ کبھی مستقیمہ کبھی دوریہ۔ تو وہ انتظام افعال و حرکات اور وہ انتظام شب و روز اور وہ انتظام فصول جو اب حاصل ہے۔ کبھی نہ ہو سکتا۔ پھر کیا ایسے عظیم الشان جسم کا پیدا ہو جانا جس کے ایک چھوٹے سے جزو کا قطر اور محیط اتنا ہے جو بیان ہوا آپ سے آپ ممکن ہے۔

جب تک بہت ہی بڑا اقدر القادرین اس کا خالق نہ مانا جائے۔ پھر ایک ہی آسمان نہیں ہے بلکہ جیسا کہ آلات رصدیہ سے معلوم کیا گیا ہے۔ تہ بہ تہ نو آسمان ہیں۔ سات تو صرف وہ ہیں جن میں سے ہر ایک پر ایک سیارہ ہے یعنی ماہتاب عطارد، زہرہ۔ آفتاب۔ مشتری۔ مریخ۔ زحلؔ اور آٹھواں وہ آسمان ہے۔ جس

لہ من بحار السماء والعالم۔ اعلم ان اصحاب الهيئة قالوا بعد مقعر فلك القمر عن مركز العالم احد واربعون الفًا وتسعماة وستة وثلثون فرسخا وبعد محدبه الذى هو مماس لقعر فلك عطارد بزعمهم خمسة وثمانون الف فرسخ وسبعماة فرسخ وثلث فراسخ وبعد مقعر فلك الزهرة مأتان وخمسة وسبعون الف فرسخ وثلث ماة وثمانون فرسخا وبعد مقعر فلك الشمس الف الف فرسخ وثمانماة واربعون الف فرسخ وثمانماة واربعون الف فرسخ وثمانماة وخمسة وثمانون فرسخا وبعد مقعر فلك المريخ الفا الف فرسخ وسبعة وعشرون الف فرسخ وتسعماة واربعون وثلثون فرسخا وبعد مقعر فلك المشترى اربعة آلاف الف فرسخ وسبعماة وسبعون الف فرسخ وستماة واثنان وسبعون فرسخا وبعد مقعر فلك زحل ثلثة وعشرون الف الف فرسخ وتسعماة وثمانون فرسخا وبعد مقعر الفلك الاعلى ثلثة وثلثون الف الف فرسخ وخمسماة واربعة وعشرون الف فرسخ وستماة وتسعون فراسخ وبعد محدبه الاعلى لا يعلم احد الا الرب تبارك وتعالى۔ ومن اوحى اليه۔ وذكروا ان قطر القمر سبعماة واحد وثلثون فرسخا وجرمه سدس سبع جرم الارض وقيل جزء من تسعة وثلثين جزء منها وقطر العطارد مأة وتسعة فراسخ وجرمه جزء من اثنى عشر الف جزء وسبعماة وتسعة وستين جزءً من جرم الارض وقطر الزهرة تسعماة فرسخ وخمسة وستون فرسخًا وجرمه ثلث تسع جرم الارض وقيل جزء من سبعة وثلثين جزء من الارض وقطر الشمس سبعة عشر الف فرسخ وخمسماة وثمانية وستون فرسخا وجرمه ثلثماة وثمانية وعشرون ضعف جرم الارض وقيل

بقیہ حاشیہ صفحہ

پر یہ تمام ثابت ستارے ہیں۔ جیسے عیوق۔ سہیل۔ ثریا۔ نسر طائر۔ نسر واقع۔ دب اصغر دب اکبر۔ جدی۔ سماک رامح۔ سماک اعزل وغیرہ وغیرہ جن کی آج تک رصدیں بھی ٹھیک طور پر نہ ہو سکیں۔ اور نہ جن کی تعداد کسی کو معلوم ہے۔ الّا ماشاء اللہ۔ اور نواں وہ آسمان ہے جس پر کوئی ستارہ نہیں ہے۔ اسی کو فلک الافلاک اور

(بقیہ حاشیہ) مأة وستة وستون ضعفا وقطر المريخ ثلثة الاف فرسخ وسبعماة و خمسة وتسعون فرسخا وجرمه ثلثة اضعاف جرم الارض وقيل مثل الارض ونصفها وقطر المشترى اربعة عشر الف فرسخ وخمسماة وستة وتسعون فرسخا وجرمه مأة وثمان وثمانون ضعفا من الارض وقيل اثنان وثمانون ضعفا وربعا منها وقطر زحل اربعة عشر الف فرسخ واربعماة وخمسة وثلاثون فرسخا وجرمه ماة واثنان وثمانون ضعفا من الارض وقيل سبع سبعون ضعفا۔ والكواكب الغير المرصودة لا يعلم عددها الا الله وحججه عليهم السلام ومارصد وامنها الف واثنان وعشرون كوكبا فاعظمها على ما ذكره بعضهم ثمانية وتسعون ضعفا للارض وسدسها۔ واصغرها عشرة اضعاف وثلث من الارض وعلى ما ذكره آخرون اعظمها مأتان واثنا عشرون ضعفا من الارض واصغرها ثلثة وعشرون ضعفا منها۔ ورتبوا اقدارها فى ست مراتب ينقص كل مرتبة عن صاحبها فى القطر بسدس فاولها اعظمها وفيها خمسة عشر كوكب۔ وفى الثانية خمسة واربعون وفى الثالثة مأتان وثمانية و فى الرابعة اربعماة واربع وسبعون وفى الخامسة ثمانماة وسبعة وعشر وفى السادسة تسعة واربعون۔ واربعة عشر خارجة عن المراتب۔ تسعة خفية تسمى مظلمة وخمسة سحابية كانها قطعة غيم وقد يزاد ثلثة تسمى ضفيرة۔ اھ

ترجمہ: معلوم ہو کہ علم ہیئت کے جاننے والوں نے بیان کیا ہے کہ فاصلہ مقعر فلک قمر کا مرکز عالم سے اکتالیس ہزار نوسو چھتیس فرسخ ہے اور اس کے محدب کا فاصلہ پچاسی ہزار

بقیہ حاشیہ صفحہ

عرش- اور فلک اطلس بھی کہتے ہیں۔ یہ نواں آسمان۔ باقی آٹھ آسمانوں کو اپنے ساتھ لئے ہوئے مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے۔ جس سے چاند سورج کا طلوع مشرق سے معلوم ہوتا ہے اور غروب مغرب میں۔ اور جن سے رات والے ستارے مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ) سات سو اور ثلث فرسخ ہے۔ مقعر فلک زہرہ کا فاصلہ اور دو سو چھہتر ہزار تراسی فرسخ ہے اور فلک آفتاب کے مقعر کا فاصلہ دس ہزار آٹھ سو چالیس ہزار آٹھ سو پچاسی فرسخ ہے۔ فلک مریخ کے مقعر کا بیس لاکھ ستائیس ہزار اور تینتالیس فرسخ ہے۔ مقعر فلک مشتری کا فاصلہ چالیس لاکھ سات سو ستر ہزار چھ سو بہتر فرسخ ہے۔ فاصلہ مقعر فلک زحل کا دو کروڑ بیس لاکھ نو اسی فرسخ ہے اور فاصلہ مقعر فلک اعلیٰ کا تین کروڑ تیس لاکھ پانچ سو چھبیس ہزار چھ سو نوے فرسخ ہے۔ اور اس کے محدب کا فاصلہ تو کوئی سوائے خدا کے جانتا ہی نہیں۔ یا وہ لوگ جانتے ہیں جنہیں بذریعہ وحی بتایا گیا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ چاند کا قطر سات سو اکتیس فرسخ ہے۔ اور اس کا جرم جرم زمین کا $\frac{1}{39}$ جزو ہے اور بنا بر ایک قول کے $\frac{1}{43}$ جزو ہے۔ عطارد کا قطر ایک سو نو فرسخ ہے اور اس کا حجم $\frac{1}{12000}$ جزو اور $\frac{1}{922}$ جزو حجم زمین کا ہے۔ زہرہ کا قطر نو سو پینسٹھ فرسخ ہے اور اس کا حجم $\frac{3}{49}$ حجم زمین کے برابر ہے اور بنا بر دوسرے قول کے $\frac{1}{44}$ جزو ہے۔ آفتاب کا قطر ستر ہزار پانچسو پینسٹھ فرسخ ہے اور اس کا حجم زمین کے حجم سے تین سو اٹھائیس حصہ زیادہ ہے۔ اور بنا بر قولے ایک سو چھیاسٹھ مثل زمین کا ہے۔ قطر مریخ تین ہزار سات سو پچانوے فرسخ ہے اور اس کا حجم تین حصہ حجم زمین سے زیادہ ہے۔ اور بنا بر قولے ڈیڑھ مثل زمین کا ہے۔ قطر مشتری چودہ ہزار پانچ سو چھیانوے فرسخ ہے اور اس کا حجم ایک سو اٹھاسی گنا زمین کا ہے۔ اور بنا بر قولے بیاسی گنا اور ایک ربع زمین کا ہے۔ قطر زحل چھ ہزار چار سو پینتیس فرسخ ہے اور اس کا حجم زمین کا بیاسی گنا ہے اور بنا بر قولے ستتر گنا ہے اور غیر مرصودہ ستارے اس قدر ہیں کہ جن کے عدد کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ مگر ان میں سے ایک ہزار بائیس ستاروں کے حالات

بقیہ حاشیہ صفحہ

یہ آسمان صرف چوبیس گھنٹے میں اپنا پورا دورہ تمام کر لیتا ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ فی منٹ کتنے میل اس نے مسافت طے کی ہے جب کہ صرف اس کا مقعر یعنی نیچے کی سطح کا عرض اتنی دیر میں کہ کوئی شخص "واحد" کا لفظ زبان سے کہے ۱۸۱۵۵۱ ½ میل کی مسافت طے کر لیتا ہے۔ جیسا کہ سید داماد حاشیہ دعائے صحیفہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ رہے باقی آسمان پس ان میں سے جو ممثلات ہیں سوائے جوزہر قمر کے سب مغرب سے مشرق کی طرف حرکت کرتے ہیں اور نیز آٹھواں آسمان بھی مغرب سے مشرق کی طرف حرکت کرتا ہے مگر بنا بر رائے قدما کے تیس ہزار برس میں اور بنا بر رائے متاخرین کے چوبیس ہزار برس میں اپنا دورہ پورا کرتا ہے باقی آسمان کوئی پورے سال بھر میں دورہ پورا کرتا ہے جیسے فلک آفتاب اور کوئی تقریباً ایک سال میں دورہ پورا کرتا ہے۔ جیسے فلک زہرہ و عطارد۔ اور کوئی دو برس ساڑھے دس مہینے میں دورہ پورا کرتا ہے جیسے فلک مریخ۔ اور کوئی بارہ برس میں دورہ پورا کرتا ہے جیسے فلک مشتری اور کوئی تیس برس میں دورہ ختم

(بقیہ حاشیہ) معلوم کئے ہیں۔ ان میں سے جو سب سے بڑا ہے بنا بر قولے اٹھانوے گنا اور اور ½ زمین سے بڑا ہے اور چھوٹے سے چھوٹا دس گنا اور ½ زمین سے بڑا ہے اور بنا بر دوسرے قول کے بڑے سے بڑا ستارہ ان میں سے دو سو بائیس گنا زمین سے بڑا ہے اور چھوٹا اس سے تیئس گنا زمین سے بڑا ہے۔ نیز اہل ہیئت نے اُن کی مقداروں کو چھ درجوں میں ترتیب دیا ہے۔ ہر درجہ اُن میں سے دوسرے سے قطر کی مقدار میں ½ کم۔ پس پہلا اُن میں سے جو سب سے بڑا ہے اور اس میں پچیس ستارے ہیں۔ دوسرے میں پینتالیس ستارے ہیں تیسرے میں دو سو آٹھ۔ چوتھے میں چار سو چونسٹھ۔ پانچویں میں آٹھ سو سترہ ہیں۔ چھٹے میں ۴۹ اور ۱۴ ہیں۔ جو خارج از مدارج مذکورہ ہیں تو ان میں سے خفی ہیں جنہیں مظلمہ کہتے ہیں اور پانچ سحابیہ ہیں۔ یعنی ابر کے ٹکڑے کی صورت کے معلوم ہوتے ہیں اور کبھی اُن پر تین زیادہ کر کے ضفیرہ کہتے ہیں + ۱۲

کرتا ہے جیسے فلک زحل۔ اور کوئی صرف اٹھائیس روز میں گردش ختم کر لیتا ہے جیسے فلک قمر۔ ان کے علاوہ انہیں آسمانوں کے اندر اور بھی آسمان ہیں۔ جنہیں، افلاک جزئیہ کہتے ہیں۔ مثلاً تداویر کواکب۔ یا افلاک حاملہ۔ یا فلک مائل وغیرہ جن کی تعداد چوبیس یا پچیس آسمانوں تک پہنچتی ہے۔ پھر اُن کی حرکتوں کے منتظم ہونے کو خیال کیجئے۔ تو ایسا عجیب انداز ان کے لئے قائم کیا ہوا ملے گا۔ کہ اس میں کبھی فرق آتا ہی نہیں۔ ایک آسمان تو ان سب کو لئے ہوئے۔ چوبیس گھنٹے میں دورہ پورا کر لیتا ہے۔ مگر اسی کے اندر باقی آسمان اپنی ذاتی حرکتوں سے ایسے پیمانہ پر گردش کرتے ہیں کہ ان میں ہزاروں برس میں بھی ذرا فرق نہیں آتا۔ جو آسمان اوّل سے سال بھر میں دورہ پورا کرتا آتا تھا۔ وہ اب بھی اسی طرح دورہ ختم کرتا ہے۔ اور جو تقریباً ایک ماہ میں گردش پوری کر لیتا تھا۔ وہ اب بھی اُسی طرح گردش کر لیتا ہے۔ انہیں گردشوں سے سال کا حساب مرتب ہوتا ہے۔ انہیں گردشوں سے مہینے مرتب ہوتے ہیں۔ انہیں سے ہفتے قائم کئے گئے۔ انہیں سے رات اور دن کا انتظام ہوا۔ انہیں سے قرن مقرر کئے گئے۔ یہی وہ حرکتیں ہیں۔ جو فصلوں کی بنیاد قائم کرتی ہیں۔ اگر یہ مختلف حرکتیں نہ ہوتیں اور ہر روز آفتاب کی حرکت ایک نئی مدار پر مدارات یومیہ میں سے نہ قرار پاتی تو آج گرمی سردی۔ ربیع خریف۔ کہاں سے پیدا ہوتے۔ اگر ہمیشہ گرمی رہتی تو انسان۔ نباتات۔ جمادات۔ حیوانات اور عناصر سب تباہ و برباد ہو جاتے جل جاتے اور فنا کے رستہ پر جاتے ہوئے نظر آتے۔ اگر ہمیشہ سردی رہتی۔ تو تمام چیزوں میں انجماد اور تکاثف پیدا ہو جاتا اگر ہمیشہ مینہ برسا کرتا تو کاہے کو کسی ذی حیات کی زندگی قائم رہ سکتی۔ اب کہ روزانہ کی حرکت کے بدلتے رہنے سے آہستہ آہستہ فصلیں بدلتی رہتی ہیں۔ دن بڑے چھوٹے ہوتے رہتے ہیں تو مخلوقات کے لئے کس قدر فوائد ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے اگر ایک ہی فصل دنیا میں رہتی۔ تو آدمی اس سے تنگ آجاتے اور اس کا بدلنا چاہتے۔ دیکھو قدرت نے اس خواہش سے

پہلے ہی تدبیر کر دی کہ آسمانوں کی حرکتوں کو اس قسم کا بنایا کہ وہ آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ موسم کو پلٹتے رہیں۔ تاکہ انسان ہر روز ایک نئی کیفیت حاصل کرتا رہے۔ بلکہ اگر دیکھو تو انہیں اوقات شبانہ روزی میں تمہیں چاروں فصلیں دکھائی دیں گی۔ چار بجے صبح سے دس بجے دن تک فصل بہار ہے۔ پھر اس وقت سے چار بجے شام تک موسم گرما ہے۔ پھر اس وقت سے دس بجے شب تک مثلاً خریف ہے اور وہاں سے چار بجے صبح تک موسم سرما ہے۔ کیا ان چاروں وقتوں میں انسان چاروں فصلوں کی کیفیت حاصل نہیں کر لیتا۔

اور دیکھو کہ کیسے انتظام سے ان میں بارہ برج قرار پائے ہیں۔ جیسے خود خدا تعالیٰ دوسرے مقام پر اس قرآن میں فرماتا ہے۔ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ جن میں سیارات کی سیر ہوتی ہے۔ اور جس کے ذریعے سے حسابوں کا انتظام ہوتا ہے۔ انہیں میں منازل بھی قرار پائے۔ مثلاً منازل قمر جو اٹھائیس ہیں ان میں ماہتاب کے رہنے سے جو کیفیتیں حادث ہوتی ہیں۔ اسے تم علم نجوم سے معلوم کر سکتے ہو۔ میں یہاں تفصیلاً بیان نہیں کر سکتا۔

اور دیکھئے کہ یہی وہ آسمان ہے جس کا اصلی رنگ تو وہ ہے جسے آپ فیروزی بھی کہہ لیتے ہیں مگر اس میں وہ چیزیں بھی جو بنفسہٖ یا بغیرہٖ روشن ہیں کتنی مناسبتوں کے ساتھ پیدا کی گئی ہیں۔ جن کو ایک ماہر علم ہیئت اور واقف علوم نجوم اچھی طرح جان سکتا ہے۔ کس خوبی سے ان روشن ستاروں کی ترتیب قائم کی گئی ہے۔ کہ کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا نہیں سکتے۔ کبھی ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر نہیں چلے جاتے جو اپنے اثر کو بلحاظ نظرات باطل کر دیں۔ بالکل قریب نہیں بنائے گئے۔ جن کی روشنی آنکھوں کو تکلیف پہنچائے اور نہ بالکل دور کہ جن کی روشنی سے ہم فائدہ ہی نہ اٹھا سکیں۔ بلکہ جس کے لئے جو فاصلہ مناسب تھا وہی قرار دیا گیا۔ مثلاً آفتاب کا بعد جواب زمین سے ہے اگر اس سے زیادہ قریب ہوتا تو یبوست و حرارت کو اعتدال سے زیادہ

بڑھا دیتا اور اگر اس سے زیادہ دور ہوتا تو وہ فوائد جو اجسام فواکہ۔ اغذیہ اور میاہ وغیرہ کو اس سے پہنچتے ہیں نہ پہنچتے۔ اگر اتنے ثوابت ستارے ہم سے قریب ہوتے تو شدت روشنی سے مخلوقات کی آنکھوں میں خیرگی رہتی۔ اور اگر اس سے زیادہ دُور ہوتے تو نہ وہ کیفیت زینت فلک معلوم ہوتی۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ۔ اور بے شک ہم نے نیچے والے آسمان کو (چراغوں) ستاروں سے زینت دی اور اُن کو شیطانوں کے واسطے رجم کرنے والے قرار دیا۔ اور نہ وہ فائدہ جو چراہوں کے معلوم ہونے۔ رستوں کے دکھائی دینے میں اب حاصل ہے وہ حاصل ہو سکتا۔ " وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ۔

پھر یہ ستارے محض رہنما یا زینت ہی نہیں ہیں بلکہ اُن کے کرشمے تو اس وقت کھلتے ہیں۔ جب فلسفۃ النجوم پر نظر ڈالی جائے۔ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے سے وہ تناسب ہیں جنہیں نظرات کواکب آتے ہیں۔ کسی کو کسی سے نظر تسدیس ہے کسی کو نظر تربیع۔ کسی کو نظر تثلیث وغیر ذلک اور اُن پر عجیب و غریب آثار مرتب ہوتے ہیں۔ جو واقفان فن ہی کو بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں۔ ان کے خواص حرکات و خواص قرب و بعد اس قدر کثیر ہیں کہ انسانی عقلیں سب کو ادراک نہیں کر سکتیں۔ صرف چند معدودہ ستاروں کی جو کیفیتیں اس وقت تک معلوم ہو سکی ہیں۔ وہی اس قدر ہیں جن کے لیے مستقل علم تدوین کیا گیا۔

پس اب غور کیجیے کہ آسمانوں کا اس ترتیب سے ہونا۔ ان میں باہم فاصلے کا قائم رہنا۔ ان کا متساوی الحال حرکت کرنا۔ اور ان میں کبھی فرق نہ پڑنا۔ اُن کے اندر دو قسم کے ستاروں کو جڑنا ایک ثوابت اور دوسرے سیار۔ ثوابت سے اور فوائد بخشے اور سیارات سے کچھ اور پھر اُن کی باہم مناسبتوں سے جو تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ اُن سے عجائب آثار کا ظاہر ہونا۔ پھر اُن کی جسامتوں کو خیال کرو تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ باوجود اس کے ان کا اتنی بلندی پر قائم رہنا۔ اور گر نہ پڑنا

ان میں سے بغیر کسی مدد کے روشنی کا پیدا ہونا کہ نہ وہاں کوئی روشنی کرنے والا ہے۔ نہ آگ ہے۔ نہ تیل ہے نہ گیس ہے۔ نہ بجلی ہے۔ قدرتی طور پر ان کا منور ہونا۔ اور جو ذاتاً روشن نہیں ہے اُس کو اس ترکیب سے قائم کرنا کہ روشن جسم سے اس کا برابر مقابلہ گھٹتا بڑھتا رہے۔ جس سے مہینے کی تاریخیں مرتب ہو سکیں مثلاً چاند کا آفتاب سے نسبت محاذات تدریجی رکھنا۔ پھر ہر ایک کے آثار جُدا جُدا قرار پاتے۔ باوجود اتنے کہنہ سال ہوتے کے نہ کسی ستارے میں کہنگی کا اثر ظاہر ہونا اور نہ کسی آسمان میں۔ نہ کسی کا ایک دوسرے کی طاقت سے کھنچ جانا۔ نہ طنابوں کے ٹوٹ جانے سے دور ہو جانا۔ اور نہ باوجودیکہ یہ آسمانی اجرام ذوات الثخن ہیں۔ ان کے اندر ہزار دو ہزار برس یا سو دو سو سال میں کسی قسم کا نقصان آنا جس کی مرمت کی ضرورت پڑے۔ کیا اس امر کو نہیں بتاتا کہ ہم اپنے تغیرات حرکات و تبدلات احکام کی وجہ سے حادث الوجود ہیں۔ عدم سے وجود میں آئے ہیں۔ قدیم نہیں ہیں بلکہ کسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارا پیدا کرنے والا بہت ہی بڑا اقدر القادرین۔ حکیم الحکماء۔ اقدم القدماء۔ اقوی الاقویاء۔ اغلب الغالبین ہے اور ایک خاص وقت تک کے لئے ہم کو بنایا ہے اس لئے ایسا محکم بنایا ہے کہ ہم میں اس وقت تک شکستگی پیدا نہ ہو۔ کہنگی عارض نہ ہو۔ مرمت کی ضرورت نہ پڑے۔ ورنہ اوروں کے کام میں اور اس اقدر القادرین کے کام میں کیا فرق تھا اور چونکہ وہ اپنی قدرت کاملہ کو ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے ہمیں ایسا بنایا ہے کہ ہم میں سے کسی ایک کے مثل بھی دنیا کے تمام عقلا اور تمام روحانیات جمع ہو کر نہیں بنا سکتے۔ دیکھو تو ابن مقنع نے جب نخشب میں چاند بنایا تو کیسا منہ کے بل کنوئیں میں گرا۔ اس اقدر القادرین اور رب العالمین کا مقابلہ کرنا چاہا لیکن نہ ہو سکا۔ کیونکہ واجب الوجود کی صناعی۔ اور ممکن الوجود کی کاریگری میں بھلا کیا مناسبت ہو سکتی ہے جو اس نے آسمان بنایا تھا۔ وہ بھی چند پتھروں سے ٹوٹ گیا۔ اور جو مصنوعی چاند

بنایا تھا۔ وہ بھی اپنی روشنی کھو بیٹھا مگر دیکھو کہ اس کی جو لالٹین ہے وہ ہزاروں لاکھوں برس سے بے تیل اور بے گیس کے روشن چلی آتی ہے۔ مگر کبھی اس کی روشنی میں فرق نہیں پڑتا۔ البتہ چند ستارہ پرستوں کی تنبیہ کے واسطے کبھی کبھی دن اور رات کی بعض بعض لالٹینوں کی روشنی کسی کسی وقت مدہم کر دی جاتی ہے تاکہ کم عقل لوگ ان کو معبود حقیقی نہ سمجھنے لگیں۔ اور اگر سمجھتے ہوں تو جان لیں کہ یہ واقعی معبود نہیں ہیں۔ ورنہ ان میں تغیر و تبدل نہ ہوتا! اور چونکہ وہ اپنی تحتانی مخلوقات پر حد سے زیادہ مہربان ہے۔ تو اس نے ہماری حرکتوں میں عجیب و غریب خواص پیدا کر دیئے ہیں۔ جن سے وہ فائدہ اٹھا سکیں۔ مثلاً ہم میں سے کسی کے اثر سے مینہ برستا ہے۔ کسی کے اثر سے ہوا چلنے لگتی ہے۔ کسی کے اثر سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ کسی کے اثر سے بیماریاں دفع ہوتی ہیں۔ کسی کے اثر سے نباتات پیدا ہوتے ہیں۔ کسی کے اثر سے کیڑے مکوڑے اور موذی جانور مر جاتے ہیں۔ کسی کے اثر سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور ایسی ایسی ہزاروں خاصیتیں ہم میں دیں۔ جن سے ان مخلوقاتِ سفلی کا انتظام تمدن قائم رہ سکے اور ان میں کوئی فساد نہ پڑے اور چونکہ وہ اپنی ذوی العقول مخلوقات پر اپنی لایزالی ابدیت و ازلیت جتانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے ہمیں ایسا بنایا کہ مدتوں ہم میں زوال نہ ہوتا کہ لوگ سمجھیں کہ جب اس کی پیدا کی ہوئی چیزیں ایسی ہیں کہ اُن کی صورت نوعیہ و شخصیہ میں تغیر نہیں ہوتا۔ تو پھر ان کا پیدا کرنے والا کیسا لازوال ازلی اور ابدی ہوگا۔ بے شک صنعتِ افلاک و فلکیات اور استحکام ان کے امور و احوال کا پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ کہ لا الٰہ الا اللّٰہ هو اللّٰہ الخالق البارئ المصور له الاسماء الحسنیٰ والامثال العلیا فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین!! والحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ محمد و آلہ الطاہرین۔

اور اگر لسانِ شریعت سے اس کی مختصر حقیقت دیکھنی ہو تو یہ حدیث ملاحظہ

ہو(خصال ابن بابویہ علیہ الرحمہ) جناب امام علیؑ بن موسٰی رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا مجھ سے بیان کیا۔ موسٰیؑ بن جعفرؑ نے فرمایا مجھ سے بیان کیا جعفرؑ بن محمدؑ نے فرمایا مجھ سے بیان کیا محمدؑ بن علیؑ نے فرمایا مجھ سے بیان کیا علیؑ بن الحسینؑ نے فرمایا مجھ سے بیان کیا حسینؑ بن علیؑ نے فرمایا کہ علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام کوفہ کی مسجد جامع میں تشریف رکھتے تھے کہ ناگاہ ایک شخص اہل شام میں سے اٹھ کھڑا ہُوا اور چند مسائل پوچھے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ سوال تھا کہ یا امیر المومنینؑ آپ مجھے آسمانوں کے رنگ سے اطلاع دیجئے۔ فرمایا آپ نے اسم سماء الدنیا رفیع وھی من مآء ودخان واسم الثانیہ قیذوم وھی علی لون النحاس والسمآء الثالثہ اسمھا الماروم وھی علی لون الشبہ والسمآء الرابعۃ اسمھا ارفلون وھی علی لون الفضۃ والسمآء الخامسۃ اسمھا ھیفون وھی علی لون الذھب والسمآء السادسۃ اسمھا عروس وھی یاقوتۃ خضرآء والسمآء السابعۃ اسمھا عجمآء وھی دُرّۃ بیضآء "نیچے والے آسمان کا نام رفیع ہے اور یہ پانی اور دھوئیں سے مرکب ہے۔ دوسرے آسمان کا نام قیذوم ہے۔ اور اس کا رنگ تانبے کا سا ہے اور تیسرے کا نام ماروم ہے اور اس کا رنگ شبہ کا سا ہے۔ (شبہ اُسے کہتے ہیں جو معدنیات میں سونے کے رنگ سے مشابہ ہوں اور وہ کانسی سے بہتر ہوتا ہے!! مجمع البحرین) اور چوتھے آسمان کا نام ارفلون ہے اور اس کا رنگ چاندی کا سا ہے اور پانچویں کا نام ہیفون ہے اور اس کا رنگ سونے کا سا ہے اور چھٹے کا نام عروس ہے اور وہ (گویا) زمرد سبز ہے اور ساتویں کا نام عجمار ہے اور وہ (گویا) گوہر سفید ہے۔" یہ اس عارف حقیقی کا بیان ہے جو فرمایا کرتا تھا کہ سلونی عما دون العرش اور جس کے علم سے بہتر دنیا میں بعد پیغمبر خدا کے کسی کا علم نہ تھا۔ رسولِ خداؐ خود فرما گئے ہیں۔ انا مدینۃ العلم وعلی بابھا۔ پس ایسے بزرگوار کا جو ارشاد ہے وہی اصل اور حقیقی ہے۔ باقی جتنے بیانات ہیں وہ سب ظنی وتخمینی ہیں۔ کیونکہ

جو کچھ حکمار نے بیان کیا ہے۔ وہ سب اپنے خیالات و ظنون کی تخمین سے بیان کیا ہے اور اس بزرگوار نے یا اس کے جانشینوں نے جو بیان کیا ہے وہ اسی علم الٰہی کے ذریعہ سے بیان کیا ہے جو ان کو من جانب اللہ حاصل تھا۔ اور یہی وہ لوگ تھے جو خزانہ داران علوم الٰہیہ ہو سکتے تھے۔

(کافی میں مذکور ہے) محمد بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے جناب ابو جعفرؑ (امام محمد باقرؑ) سے دریافت کیا کہ سورج میں چاند سے زیادہ کیوں روشنی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے آفتاب کو روشن آگ سے پیدا کیا ہے اور صاف پانی سے ایک طبق اس کا بنایا ہے۔ اور ایک طبق اُس کا۔ یہاں تک کہ جب سات تہ اس طرح قرار دے کر (سورج کو بنا لیا) تو اسے آگ کا لباس پہنا یا (یعنی اس میں آتشی حرارت بیرونی جانب قرار دی) اس لئے سورج میں چاند سے زیادہ حرارت ہے۔ میں نے عرض کی "میں آپ پر فدا ہوں" اور چاند (میں روشنی ٹھنڈی کیوں ہے) فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے چاند کو آگ کے نور کی ضو سے پیدا کیا ہے۔ اور صاف پانی کی ایک تہ اس کی دی ہے اور ایک تہ اس کی۔ اور جب سات تہیں پوری ہو گئیں۔ تو اسے پانی کا لباس پہنایا۔ اسی وجہ سے چاند بہ نسبت آفتاب کے ٹھنڈا ہے۔ اور عیون الاخبار میں مروی ہے کہ یزید بن سلام نے رسولؐ خدا سے دریافت کیا کہ چاند اور سورج ضو اور نور میں مساوی کیوں نہیں ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ جب خدا تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا تو یہ خدا تعالیٰ کے مطیع ہوئے۔ اور اس کی نافرمانی بالکل نہیں کی (بلکہ جو ان کے لئے حکم دیا گیا۔ اس کے حامل ہوئے) پھر خدا تعالیٰ نے جبرئیلؑ کو حکم دیا کہ چاند کی ضو کو مٹا دے تو جبرئیلؑ نے اسے محو کیا۔ پس ان کے محو کرنے سے چاند میں سیاہ سیاہ خطوط ڈال دیئے اور اگر چاند اسی حالت اصلیہ پر چھوڑ دیا جاتا اور اس کی ضو نہ مٹائی جاتی تو رات اور دن کی شناخت نہ ہو سکتی اور نہ روزہ دار سمجھ سکتا کہ کتنے دن روزے رکھوں اور نہ لوگوں کو سال کا حساب معلوم ہو سکتا۔

یہی مطلب ہے اس آیت کا۔ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَا اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ۔

جناب امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ آفتاب کے لئے تین سو ساٹھ بُرج ہیں۔ (یعنی درجات یا مدارات ہیں) اس کا ہر برج مثل ایک جزیرہ کے ہے جزائر عرب سے پس ہر روز یہ ایک برج میں نزول کرتا ہے۔ پس جب غائب ہو جاتا ہے تو وسط عرش تک پہنچتا ہے۔ پھر برابر سجدہ (خضوع وخشوع) خالق میں رہتا ہے صبح تک اور پھر اپنے مطلع کی طرف واپس کر دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ دو فرشتے رہتے ہیں۔ جو پکارتے رہتے ہیں۔ اس کا اگلا رُخ اہل آسمان کی طرف ہے اور پشت اس کی اہل زمین کی طرف ہے۔ اور اگر کہیں اس کا اگلا رُخ اہل زمین کی طرف ہوتا تو زمین اور زمین پر رہنے والے اس کی شدت حرارت سے سب جل جاتے۔ اور آفتاب کے سجدہ کرنے کے وہی معنی ہیں۔ جس معنی میں خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ "کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک پروردگار کو سجدہ کرتے ہیں تمام وُہ جو زمین پر ہیں، اور سورج چاند ستارے پہاڑ درخت چوپائے اور بہت سے آدمی اسے سجدہ کرتے ہیں۔

دوسری نشانی: وجود پروردگار عالم کی جو اس آیت میں مذکور ہے ارض (زمین) ہے۔ اس کی دلالت بھی وجود ذات باری عزّ اسمہٗ پر واضح و بیّن ہے۔ بشرطیکہ ذرا تامل و غور سے کام لیا جائے۔ کیوں کہ اس کا ایسا جسم ثقیل الوزن طویل القطر عظیم المحیط ہونا اور پھر فضا میں قائم رہنا، کسی چیز پر اس کا سہارا نہ ہونا اور اس پر اضافہ یہ کہ بڑے بڑے پہاڑوں، دریاؤں حیوانات، نباتات اور معادن کا اٹھائے رہنا اور پھر بھی اس کا دھنس نہ جانا

ایسے امور ہیں جو صاف بتا رہے ہیں کہ کسی بڑی طاقت والے قادر مطلق کا حکم اسے اپنے مقام پر قائم کئے ہوئے ہے۔ ورنہ جب کہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس میں بداز میل تقسیم اسفل کی جانب ہے۔ جیسا کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے اور نیز یہ عنصر بہ نسبت اور عناصر کے کثیف و ثقیل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ محیط آسمان کے بیچوں بیچ اس کا استقرار ہے۔ حالاں کہ نہ کوئی دلیل اس امر پہ قائم ہوئی ہے کہ اس میں بالنسبۃ فلکیات کے کوئی مقناطیسی قوت ہے اور نہ اس پہ کہ فلکیات میں بہ نسبت زمین کے کوئی جاذبہ طاقت ہے۔ سوائے اس کے کہ یورپ کے چند خیال بازوں نے جن کو لوگ فلاسفر کہتے ہیں۔ اپنے ذہنی تکے لگا کر یہ کہہ دیا ہے کہ ستاروں میں قوت مقناطیسی ہے جو اسے اپنی طرف کھینچے ہوئے ہے۔

میں کہتا ہوں : کہ اگر واقعی ستاروں میں قوت مقناطیسی ہے جو وہ زمین سی ثقیل الوزن چیز کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اور بنا بران کے دعوے کے ہر سال کچھ نہ کچھ زمین اوپر کی جانب اٹھتی جاتی ہے۔ تو لازم آتا ہے کہ وہ اجسام منفصلہ ارضیہ جو وزنا ہلکے ہیں۔ زمین سے اُڑ اُڑ کر ستاروں میں جا چمٹیں اور کم از کم یہی ہو کہ جو پتھر نیچے سے اوپر کی طرف پھینکا جائے وہی دوبارہ واپس زمین پر نہ آئے کیونکہ وہ زمین سے بلند ہو کر ستاروں سے قریب ہو گیا ہے۔ حالاں کہ ہم اس کے برخلاف دیکھتے ہیں کہ وہ پھر رجعت قہقری کر کے زمین ہی پر گرتا ہے اگر اس کا یہ جواب دیا جائے کہ ازبسکہ ہر چیز اپنے مرکز کی طرف رجوع کرتی ہے اس لئے پتھر اوپر سے زمین ہی پر گرتا ہے۔ ستاروں سے جا کر چمٹ نہیں جاتا۔ تو اس کے جواب میں نہایت ادب سے یہ گزارش کی جائے گی۔ کہ حضرت یہ تو مسلّم ہے لیکن حضور کا تو یہ دعویٰ ہے کہ ستاروں میں قوت مقناطیسی ہے جس سے وہ اس کرہ ارض ثقیلۃ الوزن والجم ہی کو اپنی طرف گھسیٹے لیتے ہیں تو اتنے بڑے پتھر کی کیا ہستی ہے۔ آخر اسے کیوں نہیں گھسیٹ لیتے اور جب کہ خود زمین ہی بسبب کشش سیارات کے اپنا مرکز چھوڑ رہی ہے۔ تو اُس کے

اجزائے منفصلہ کی کیا ہستی ہے۔ جو وزناً اور حجماً ہر صورت سے اس سے ہلکے ہیں اچھا اگر ہم بالفرض تسلیم بھی کر لیں کہ زمین اپنے جذب مرکزی سے اس پتھر کو اپنی طرف کھینچتی ہے تو کم ازکم یہ ضرور لازم آتا ہے کہ وہ پتھر نہ زمین پر گرے اور نہ ستارے سے جا لگے پھر فضا میں ٹھیرا رہے۔ کیوں کہ سیارہ اسے اپنی طرف جذب مقناطیسی سے کھینچ رہا ہے اور زمین اسے اپنے جذب مرکزی سے۔ پس دونوں قوتوں کا عمل تو اسی وقت متیقن ہوگا جب کہ پتھر زمین پر واپس نہ آئے اگر پھر بھی آپ اسی سے مدد لیں گے اور فرمائیں گے کہ یہ قوت اس قوت سے بڑھی ہوئی ہے تو حضور کو یاد رہے کہ آپ کا یہ دعویٰ پہلے ہی تشریف لے جائے گا کہ زمین ہر سال کسی قدر اوپر کو کھنچ جاتی ہے۔ کیونکہ اگر یہ قوت اس قوت سے مقاومت کر سکتی ہے تو کوئی وجہ حرکت زمین کی نہیں ہے۔ مع ذالک اس قول کی سفاہت اسی سے ظاہر ہے کہ سیارات میں مقناطیسی قوت جاذبہ ارض تسلیم کی جاتی ہے۔ کیوں کہ اگر واقعاً یہ قوت ان سیاروں میں ہوتی۔ تو آج تک کب کی یہ زمین آسمان پر پہنچ گئی ہوتی۔ اس لئے کہ جس قدر سیارات ہیں۔ سوائے ماہتاب کے سب کے سب زمین سے بہت بڑے ہیں۔ مثلاً یہی ایک آفتاب ہے جو زمین سے قدیم تحقیقات کے مطابق ۳۲۸ یا ۱۳۶ گونہ بڑا ہے۔ (جدید تحقیقات نے کچھ اور راگ گایا ہوگا) تو یقیناً اس کی طاقت بھی زمین کی طاقت سے اتنی ہی زیادہ ہوگی پھر بھلا زمین کا جذب مرکزی اس کو یہاں کب ٹھیرا سکتا تھا پس اگر یہ قوت مقناطیسی سیارات میں ہوتی تو لامحالہ اہل یورپ نے اب تک بغیر غبارہ وغیرہ کی مدد کے عطارد تک پہنچ کر وہاں کی بھی سلطنت پر قبضہ کر لیا ہوتا۔ بھلا یہ کب چوکنے والے تھے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ دعویٰ دعوائے محض اور بے دلیل ہے۔

خلاصہ یہ کہ زمین ایک ایسی چیز ہے۔ چاہے اسے زندہ کہو اور چاہے مُردہ دونوں معنی اس پر صادق آتے ہیں۔ مُردہ تو اس لحاظ سے کہ اس میں حس و

ادراک نہیں۔ اس پر چلو پھرو۔ اسے کھودو۔ اس پر ہل چلاؤ۔ اس پر گھوڑے دوڑاؤ۔ گاڑی دوڑاؤ۔ جس طرح سے چاہو اسے کام میں لاؤ تمہیں مانع نہ ہوگی اور نہ خود اسے کوئی تکلیف پہنچے گی۔ اور زندہ اس لحاظ سے ہے کہ جونہی اس پر مینہ برسا۔ اسی وقت جاندار چیزوں کو اپنے میں سے پیدا کر دیتی ہے۔ کیسی کیسی سبزی کیسے کیسے درخت اور حشرات الارض اس سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے اس آیت میں یوں فرمایا گیا ہے فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا۔ نیز اس کا مدور ہونا بھی خاص حکمت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ زمین مسطح ہوتی تو جس قدر اوپر سے مینہ برستا ہے۔ وہ سب اسی پر جمع رہتا۔ اور اب چونکہ مدور ہے۔ اس لئے صرف بقدر ضرورت تو اس میں جذب ہوتا ہے اور باقی اِدھر اُدھر بہہ کر دریاؤں اور سمندروں میں چلا جاتا ہے۔ چنانچہ جناب صادق علیہ السلام حدیث مفضل میں فرماتے ہیں۔ ومن تدبیر الحلیم جل وعلا فی خلقۃ الارض ان مھب الشمال ارفع من مھب الجنوب فلم یجعل اللہ عزوجل کذلک الا لیتخذ المیاہ علی وجہ الارض فیسقیھا و ترویھا ثم تفیض اخر ذلک الی البحر فکانما یرفع احد جانبی السطح و یخفض الآخر لینحدر الماء عنہ و لا یقوم علیہ کذلک جعل مھب الشمال ارفع من مھب الجنوب لھذہ العلۃ بعینھا ولو لا ذلک لبقی الماء متحیراً علی وجہ الارض فکان یمنع الناس من اعمالھا و یقطع الطرق والمسالک۔

نیز اس کا ساکن ہونا بھی عجیب و غریب حکمت پر مشتمل ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر یہ متحرک رہتی کہ دنیا کے کاروبار میں خلل پڑ جاتا۔ نیند موقوف ہو جاتی۔ چلنا پھرنا دشوار ہو جاتا۔ جب کہ نہایت تیزی سے حرکت کرتی۔ جیسا کہ اہل یورپ کا دعویٰ ہے۔ دیکھئے اسی حکمت کو ہمارے مولا صادق آل محمدؐ نے حدیث مفضل میں یوں ارشاد فرمایا ہے۔ (اے مفضل)، ثم فکر فی خلق ھذہ الارض علی ما ھی علیہ حین خلقت راتبۃ راکنۃ فیکون موطنا مستقر اللاشیاء فیتمکن

الناس من المشي عليها فی مآربهم والجلوس عليها لراحتهم والنوم لهدوهم والاتقان لاعمالهم فانها لوكانت رجراجة منقلبة لم يكونوا يستطيعون ان يتقنوا البناء والنجارة والصياغة وما اشبه ذلك بل كانوا لا يتهنون بالعيش والارض ترتج من تحتهم۔ اے مفضل غور کرو اس زمین کی خلقت میں کہ مع ان تمام چیزوں اور حالتوں کے جن کے ساتھ یہ زمین اس وقت موجود ہے۔ ثابت و ساکن پیدا کی گئی۔ تاکہ یہ تمام چیزوں کے رہنے کی جگہ ہو سکے۔ اور انسان بھی اپنی ضرورتوں کے واسطے اس پر چلتے ہیں اور اپنے آرام کے لئے اس پر بیٹھنے اور سکون حاصل کرنے کے لئے اس پر سوتے ہیں اور اپنے کاموں کو عمدہ بنا سکنے میں قادر ہو سکیں۔ کیونکہ اگر یہ متحرک اور الٹتی پلٹتی رہتی تو انسانوں سے یہ ممکن نہ ہو سکتا کہ عمارت اور نجاری اور ظروف سازی وغیرہ اچھی طرح کر سکیں۔ ایسی حالت میں کہ زمین اُن کے پاؤں کے نیچے حرکت کر رہی ہو اپنی زندگی بھی بآرام نہ بسر کر سکتے۔

غرضیکہ ایسی ایسی حکمتوں پر جو چیز مشتمل ہو اُسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا کوئی بنانے والا نہیں ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ جس طرح آسمان کی ساخت اور اس کی حکمتیں وجود باری تعالیٰ کی دلیلیں ہیں اُسی طرح زمین بھی اپنی تمام حالتوں اور کیفیتوں سے اپنے صانع قدیر کے وجود کا بزبانِ حال اقرار کر رہی ہے۔ سنریهم ایاتنا فی الافاق و فی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق۔ خداتعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم دکھلائیں گے اپنی نشانیاں جہان کے چاروں طرف اور خود انسانوں کے اندر (یعنی جو جو عجائب و غرائب صنعتیں جسم انسان میں صرف کی گئی ہیں) تاکہ انہیں صاف معلوم ہو جائے کہ وہی معبود برحق سچا معبود ہے۔ ان نشانیوں سے یہی دنیا کی چیزیں زمین آسمان۔ رات دن۔ موالید و عناصر۔ اعراض و جواہر۔ ارواح و اجسام مراد ہیں۔ جن میں سے ہر ایک چیز لاکھوں صنعتوں کے ساتھ بلند آواز سے پکار کر کہہ رہی ہے۔ کہ ہم ایک بڑے حکیم مدبر کی پیدا کی

ہوئی ہیں۔ ہرگز آپ سے آپ ہمارا وجود نہیں ہوا ہے۔

تیسری نشانی: وجود صانع عالم کی رات اور دن کا اختلاف یعنی آمد و رفت اور یکے بعد دیگرے ان کا توارد ہے۔ ان میں بھی عجیب عجیب حکمتیں ہیں جو بجبر انسان سے اس بات کا اقرار لیتی ہیں کہ خالق عالم وہ موجود ازلی ہے جس کی حکمتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ منجملہ اُن کے یہ ہے کہ آفتاب و ماہتاب اس طرح پر مسخر و مطیع فرمان ہیں کہ برابر اُن کا ایک طرح سے طلوع و غروب و طلوع ہوتا رہتا ہے۔ آخر وہ کون ہے۔ جس نے اتنے بڑے جرم کروی کو ایسی سریع حرکت دی جو ایک منٹ نہ پیچھے رہ سکتا ہے۔ اور نہ مقدار معین سے ایک منٹ آگے جا سکتا ہے۔ بلکہ خاص خاص اوقات معینہ پر طلوع و غروب کر کے رات اور دن کو حادث کرتا رہتا ہے۔

نیز عالم کی حالت تین حالتوں میں ایک ضرور ہوتی بلکہ ہونی چاہیئے تھی اور یہی وہ تین حالتیں ہیں جن کے لئے چوتھی نہیں ہے یا ہمیشہ روشنی ہی روشنی رہتی۔ یا ہمیشہ تاریکی ہی تاریکی رہتی یا روشنی اور تاریکی دونوں رہتیں پہلی دو حالتیں تو کسی طرح مخلوقات سفلیہ کے مناسب حال ہی نہ تھیں۔ کیونکہ اگر ہمیشہ روشنی رہتی تو وہ فائدہ جو اب بارہ یا چودہ گھنٹوں کے مثلاً تاریکی آجانے سے ہے حاصل نہ ہوتا۔ کیونکہ اس صورت میں تو دن بھر کے کام سے تھکے تھکائے آدمی یا طلب آب و گیاہ میں دوڑے دھوپے ہوئے جانور اندھیرا چھا جانے سے اپنے اپنے مسکنوں میں آرام کر لیتے اور تمام دن کی تھکن کو دفع کرتے ہیں۔ پس اگر ہمیشہ روشنی ہی روشنی رہتی تو نہ آدمی اپنا کاروبار چھوڑ کر سونے کے لئے جاتے اور نہ جانور آب و گیاہ چھوڑ کر اپنے مسکنوں کی طرف واپس آتے۔ حرص طبیعتوں پر غالب آتا اور آخر نتیجہ یہ ہوتا کہ آدمی کام کرتے کرتے تھک کر تلف ہو جاتے اور جانور کھاتے کھاتے اور پیتے پیتے تخمہ اور بدہضمی میں مبتلا ہو کر مرجاتے نیز یہ بھی ضرور ہوتا کہ دھوپ کی گرمی تمام اشیاء کو سوختہ کر دیتی۔ اور اس طرح

سخت نقصان پہنچتا۔ اور اگر ہمیشہ تاریکی رہتی تو ہزاروں خرابیاں ہوتیں۔ جن میں ایک یہ بھی ہے کہ آدمی کاروبار سے معطل ہو جاتے اور حیوانات بھی آب وگیاہ سے۔ لہٰذا مناسب ہوا کہ ایک حصہ زمانہ کا روشن کیا جائے اور دوسرا حصہ تاریک۔ تاکہ احوال عالم برابر منتظم رہیں۔ **فائدہ :** رات اور دن اگرچہ یکے بعد دیگرے آتے جاتے ہیں۔ اور یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ ان میں سے کون مقدم اور کون مؤخر۔ مگر احادیث اہل بیت طاہرین سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث مجمع البیان نے اس مضمون کی تفسیر عیاشی سے نقل فرمائی ہے :۔

العیاشی باسنادہ عن الاشعث بن حاتم قال کنت بخراسان حیث اجتمع الرضاء والفضل بن سھل والمامون فی الایوان الحمیری بمرو فوضعت المائدۃ فقال الرضاؑ ان رجلاً من بنی اسرائیل سألنی بالمدینۃ فقال النھار خلق قبل ام اللیل فما عندکم فاداروا الکلام فلم یکن عندھم فی ذلک شیٔ فقال الفضل للرضاؑ اخبرنا بھا اصلحک اللہ قال نعم من القرآن ام من الحساب قال لہ الفضل من جھۃ الحساب فقال قد علمت یا فضل ان طالع الدنیا السرطان والکواکب فی مواضع شرفھا فزحل فی المیزان والمشتری فی السرطان والشمس فی الحمل والقمر فی الثور وذلک یدل علی کینونۃ الشمس فی الحمل فی العاشر من الطالع فی وسط السمآء فالنھار خلق قبل اللیل واما فی القرآن فھو فی قولہ تعالیٰ لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النھار ای قد سبقہ النھار۔ عیاشی نے اپنی سند سے اشعث بن حاتم سے روایت کی ہے کہ میں خراساں میں اس وقت موجود تھا۔ جب کہ امام رضا علیہ السلام اور فضل بن سہل اور مامون ایوان حمیری میں مقام مرو میں تھے۔ دستر خوان بچھایا گیا۔ امام علیہ السلام نے یوں گفتگو شروع کی کہ مجھ سے ایک اسرائیلی نے مدینہ میں دریافت کیا کہ دن پہلے پیدا کیا گیا یا رات تم لوگ اس معاملہ میں کیا کہتے ہو۔ پس لوگ گفتگو کرنے لگے مگر کسی نے کوئی معقول بات نہ کہی۔ اس وقت

[illegible]

فضل نے امام علیہ السلام سے عرض کی کہ خدا تعالیٰ کی آپ پر رحمت ہو آپ بتلائیں۔ کہ ان میں سے کون مقدم ہے کون موخر۔ آپ نے فرمایا قرآن سے بیان کروں یا قاعدۂ ہیئت سے۔ فضل نے کہا قاعدہ ہیئت سے بیان فرمائیے۔ آپ نے فرمایا اے فضل تم جانتے ہو کہ دنیا کا طالع سرطان ہے (یعنی جب دنیا پیدا ہوئی تھی تو اس وقت کا طالع سرطان تھا) اور تمام ستارے اپنے اپنے شرف کے مقام میں تھے۔ زحل تو میزان میں تھا اور مشتری سرطان میں آفتاب برج حمل میں۔ چاند برج ثور میں۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آفتاب برج حمل کے طالع کے دسویں درجے وسط آسمان پر رہا ہو گا۔ تو لا محالہ دن کی خلقت رات سے پہلے ہوئی۔ لیکن قرآن مجید کی رُو سے تو یہ آیت ہے۔ لا الشمس ینبغی لھا ان تدرك القمر۔ یعنی دن رات سے سابق ہے۔ ملاحظہ ہو یہ بیان جو صادق آلِ محمدؐ نے ان دونوں کے متعلق مفضل سے فرمایا ہے۔ اور میں نے اسے مشرح طور پر کتاب توحید الائمہ میں درج کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ فکر یا مفضل فی طلوع الشمس وغروبھا لاقامۃ دولتی النھار واللیل فلولا طلوعھا البطل امر العالم کلہ فلم یکن الناس یسعون فی معایشھم ویتصرفون فی امورھم والدنیا مظلمۃ علیھم ولم یکونوا یتھنؤا بالعیش مع فقدھم لذۃ النور وروحہ والادب فی طلوعھا ظاھر مستغن بظھورہ عن الاطناب فی ذکرہ والزیادۃ فی شرحہ بل تامل بالمنفعۃ فی غروبھا فلولم یکن غروبھا لم یکن للناس ھدءٌ ولا قرار مع عظم حاجتھم الی الھدء والراحۃ لسکون ابدانھم وجموم حواسھم وانبعاث القوۃ الھاضمۃ لھضم الطعام وتنفیذ الغذاء الی الاعضاء ثم کان الحرص یستحملھم من مداومۃ العمل ومطاولتہ علیٰ ما یعظم نکایتہ فی ابدانھم فان کثیراً من الناس لولا جثوم ھذا اللیل لظلمۃ علیھم لم یکن لھم ھدءٌ ولا قرار حرصاً علی الکسب والجمع والادخار ثم کانت الارض تستحمی

بدوام الشمس بضیاءھا وتحمی کلما علیھا من حیوان ونبات فقدرھا اللہ بحکمۃ وتدبیرہ تطلع وقتاً وتغرب وقتاً بمنزلۃ سراج یرفع لاھل البیت تارۃً لیقضوا حوائجھم ثم یغیب عنھم مثل ذالک لیھدؤا ویقرّ وانصار النور والظلمۃ مع تضادھما منقادین متضاھرین علیٰ ما فیہ صلاح العالم وقوامہ۔" یعنی اے مفضل طلوع آفتاب اور غروب آفتاب میں غور کرو جو دولت شب و روز کے قائم کرنے کے لئے ہیں۔ پس اگر طلوع آفتاب نہ ہوتا تو عالم کا معاملہ باطل و برباد ہو جاتا۔ آدمی نہ اپنے معاش میں کوشش کر سکتے۔ اور نہ اپنے امور میں تصرف کر سکتے۔ جب کہ دنیا اُن کی آنکھوں کے سامنے تیرہ و تار ہوتی۔ اور نہ وہ اپنی زندگانی سے خوش ہو سکتے۔ جب کہ ان کو لذت نور اور راحت روشنی ہی نہ ملتی (غرض) آفتاب کے طلوع کی حاجتیں تو ظاہر ہیں۔ اس کے بیان میں طول دینے اور زیادہ شرح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اے مفضل! تم اس کے غروب کے معاملہ میں غور کرو۔ پس اگر غروب آفتاب نہ ہوتا تو آدمیوں کو سکون و قرار ہی نہ ہو سکتا۔ باوجودیکہ ان کو اپنے بدنوں کے تئیں ساکن کرنے اور اپنے حواس کو ٹھیرانے اور ہضم غذا کے واسطے قوت ہاضمہ کے برانگیختہ کرنے اور اعضا میں غذا کے نفوذ کرانے کے لئے سکون و راحت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ پھر اگر غروب آفتاب نہ ہوتا تو حرص اور لالچ اُن کو برابر کام کرتے رہنے پر آمادہ کرتا۔ جس سے ان کے اجسام میں بڑی خرابی واقع ہوتی کیوں کہ اکثر آدمیوں کی یہ حالت ہے کہ اگر رات کی تاریکی نہ ہو تو ان کو بسبب حرص کسب معاش اور جمع مال اور ذخیرہ کرنے کے سکون و قرار ہی نہ ہو۔ پھر (اگر آفتاب ہمیشہ روشن رہتا تو) آفتاب کی روشنی کے سبب سے زمین برابر گرم رہا کرتی۔ اور تمام وہ چیزیں تپتی رہتیں۔ جو روئے زمین پر ہیں خواہ حیوانات ہوں یا نباتات۔ لہذا خدا تعالیٰ نے اپنی حکمت سے ایسا مقدور معین کر دیا ہے کہ آفتاب ایک وقت میں طلوع کرے دوسرے وقت میں غروب کرے۔ جیسے چراغ

ہوتا ہے کہ کبھی تو اہل خانہ کی ضرورتوں کے واسطے روشن کیا جاتا ہے اور پھر اسی طرح بجھا دیا جاتا ہے۔ تاکہ ان کو سکون و قرار ہو سکے۔ (دیکھو کہ) نور اور ظلمت دونوں ہی باوجود متخالف الجنس ہونے کے کیسے منقاد و مطیع ہیں۔ اور مدد پہنچا رہے ہیں۔ ان امور میں جن میں عالم کے لئے صلاح و قوام ہے۔"

وجود صانع عالم کی والفلک التی تجری فی البحر بنفع الناس

چوتھی نشانی: وہ کشتی ہے جو پانی پر نفع رسانی انسان کے لئے چلتی ہے۔ اس میں دلیل وجود خالق کی ہے۔ کہ لکڑی اور پانی دونوں ہی اس صورت پر واقع ہوئے ہیں کہ باوجود اختلاف طبائع کے۔ ایک دوسرے کا متحمل ہو سکتا ہے۔ لکڑی میں یہ طاقت پیدا کی گئی کہ وہ پانی پر تیرتی رہے۔ اور پانی میں یہ قوت دی گئی کہ وہ لکڑی کو اٹھائے رہے۔ اور پھر اس میں ایسا سیلان رکھا گیا۔ کہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر لکڑی منتقل ہوتی رہے۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ایک تیسری چیز اور بنائی گئی جو اس نقل و تحویل میں مدد دے سکے۔ یعنی ہوا جو پانی کو زور سے متحرک رکھتی ہے۔ اور کشتی کو چلاتی ہے۔ اگر ہوا نہ ہوتی تو کشتی میں بادبان لگانے سے کیا فائدہ ہوتا۔ اور جس سرعت سے اب کشتی چل سکتی ہے۔ بغیر ہوائی مدد کے کیوں کر اس تیزی سے چل سکتی۔ تو اب غور کرنا چاہیئے کہ کس نے یہ سمجھا تھا۔ کہ آدمیوں کو اس بات کی ضرورت ہوگی۔ کہ ایک ملک سے دوسرے میں تبادلہ خیالات یا صیغہ تجارات یا حج و زیارات کے لئے پانی کے ذریعے جائیں گے۔ لہٰذا لکڑی کو اس طرح پر بنانا چاہیئے کہ وزن اس کا پانی کے وزن سے ہلکا ہو۔ تاکہ اسے تراش کر قابل نشست اور قابل حمل اشیائے تجارتی مستطیل یا مدور یا مربع شکل میں جس صورت سے لوگ چاہیں بنا سکیں۔ اور پانی اس طرح کا بنانا چاہیئے کہ اس میں قوت تحمل اشیائے ثقیلہ ہو۔ اور پھر اس میں قوت سیلان پیدا ہونی چاہیئے۔ جس سے کشتی اس پر چل سکے اور یہی نہیں بلکہ اس میں ہر وقت تموج رہنا چاہیئے۔ کہ کشتی کے چلنے میں مدد مل سکے۔ اور پھر ایسی ہوا

بھی پیدا کرنی چاہیئے۔ جو تیزی سے کشتی کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچا سکے اور پھر کس نے انسان کو یہ عقل دی اور کس نے سکھایا کہ لکڑی اور پانی سے یہ کام لیا جا سکتا ہے اور کس نے بتایا کہ اگر اس صورت کی ایک چیز بنائی جائے گی تو وہ پانی پر چلنے آدمیوں کو اٹھائے رہنے۔ اسباب گراں وزن کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے جانے میں مدد دے گی۔ اسی نے ناجس نے انسانوں کے جداعلیٰ حضرت نوحؑ کو یہ وحی کی تھی کہ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ۔ اور اسی نے ناجو فرماتا ہے کہ حَمَلْنَاكُمْ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ۔ اور اسی نے ناجس نے اس پر سوار ہونے کا طریقہ یوں تعلیم فرمایا کہ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا۔ اور اسی نے ناجس نے اس پر سے اترنے کی یوں تعلیم دی کہ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِمَّنْ مَعَكَ۔" (سورہ ہود ع ۴) اور اسی نے ناجو فرماتا ہے۔ و من آیاتہ ان یرسل الریاح مبشرات ولیذیقکم من رحمتہ ولتجری الفلک بامرہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون۔" اور اسی نے ناجو فرماتا ہے۔ الم تر ان الفلک تجری فی البحر بنعمۃ اللہ لیریکم من آیاتہ ان فی ذلک لآیات لکل صبار شکور۔" پھر کیا عجائب حکمت وغرائب صنعت اس امر کو نہیں بتاتے کہ ضرور بالضرور ہماری آنکھوں سے مخفی کوئی ایسا مدبر حکیم صانع وخلاق رحمٰن ورحیم بھی ہے۔ جس نے ہماری ضرورتوں کی چیزوں کو ہمارے سوچنے سے پہلے ہی نہایت متانت اور استحکام کے ساتھ پیدا کر دیا ہے کیا لکڑی بے چاری آپ سے آپ پیدا ہو سکتی تھی اور کیا اس کی طبیعت اس امر کو سمجھ سکتی تھی کہ اسے ایسا بنائے۔ جس سے وہ پانی پہ چل سکے اور کیا پانی کی طبیعت نے پہلے اس بات پر غور کیا تھا کہ مجھ پر کشتی چلے گی لہذا مجھے ایسا ہونا چاہیئے۔ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں!! فسبحان اللہ عما یصفون۔ دیکھئے اسی مطلب کو صادق آل محمدؐ جو اکمل معلمین درس معرفت اور اشرف ملقنین

اسباق حکمت ہیں۔ یوں ارشاد فرماتے ہیں۔ حدیث مفضل از بحار ومن جسیم المصالح فی الخشبة انه یطفو علی الماء فکل الناس یعرف هذا منه ولیس کلهم یعرف جلالة الامر فیه فلولا هذه الخلة کیف کانت هذه السفن والاظراف تحمل امثال الجبال من الحموله وانی کان ینال الناس هذا الوفق وخفة المؤنة فی حمل التجارات من بلد الی بلد وکانت تعظم المؤنة علیهم فی حملها حتی یلقی کثیر مما یحتاج الیه فی بعض البلدان مفقودًا اصلاً او عسرًا وجودُہٗ۔ یعنی لکڑی میں بہت بڑی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ وہ پانی پر ابھری رہتی ہے۔ اور تمام آدمی اس بات کو جانتے ہیں لیکن ہر شخص اس کی جلالت قدر کو نہیں جانتا۔ پس اگر یہ صفت اس میں نہ ہوتی۔ تو کیوں کر یہ کشتیاں اور بجریاں پہاڑوں جیسے بوجھ کو اٹھا سکتیں۔ اور کہاں سے آدمی کو یہ آسانی اور کمی مشقت اشیائے تجارتی کی ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف لے جانے میں ہوتی (بلکہ انہیں بڑی مشقت اُن کے لے جانے میں پڑتی (اگر لکڑی میں یہ صفت نہ ہوتی اور اس سے کشتی نہ بن سکتی) یہاں تک کہ اکثر ضرورتوں کی چیزیں بعض بعض شہروں میں یا بالکل مفقود ہوتیں یا دشواری سے دستیاب ہو سکتیں" (اور اب کہ کشتی بن سکتی ہے۔ تو نہایت آسانی سے وہ چیزیں ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف جا سکتی ہیں۔

پانچویں نشانی: وجود صانع عالم کی آسمان سے مینہ برسانا۔ اور اس سے زمین کو زندہ کرنا ہے۔ اس میں بھی عجائب حکم ودیعت کئے گئے ہیں جو یہ تمام نہ بیان میں آسکتے ہیں۔ اور نہ کسی ایک آدمی کو سوائے ان لوگوں کے جو تعلیم گاہ الٰہی کے تعلیم یافتہ ہیں معلوم ہو سکتے ہیں مگر مختصراً یہ کہ پانی ایک عجیب نعمت الٰہیہ ہے۔ جس کے بعض فوائد یہ ہیں! یہ کہ پانی وہ چیز ہے۔ جس سے خلقت و بقائے مخلوقات سفلی۔ اور ان کی حیات ہے وَجَعَلْنَا مِنَ

الماء کل شیئ حی افلا تعقلون۔ دیکھیے کہ اگر حیوانات پیدا ہوتے ہیں تو اسی پانی سے مع ترکیب دیگر عناصر۔ اگر نباتات پیدا ہوتے ہیں تو اسی سے اور اگر جمادات پیدا ہوتے ہیں تو اسی سے۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ سونا۔ چاندی۔ یاقوت۔ زمرد۔ زبرجد۔ ہیرا۔ پکھراج۔ نیلم۔ پارہ۔ گندھک شورہ وغیرہ معدنیات اسی وقت پیدا ہوتے ہیں۔ جب کہ زمین کے اندر جذب شدہ پانی ایک عرصے تک وہاں ٹھیرا رہتا ہے۔ اور اس میں اجزاء ارضیہ مل جاتے ہیں۔ زمین کے بخارات اور آفتاب کی گرمی ان میں اثر کرتی ہے۔ اور ایک مدت تک وہ پانی مع ان اجزاء کے جو اس سے مخلوط ہو گئے ہیں۔ اُسی مقام پر موجود رہتا ہے۔ تو کبھی اس سے سونا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور کبھی چاندی۔ کبھی پارہ۔ کبھی ابرک۔ کبھی یاقوت۔ کبھی فیروزہ وغیر ذالک۔ اور یہ اختلاف ان قوتوں کے اختلاف کے سبب سے ہے جو اس میں شامل ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی میں کبریتی اجزا زیادہ ہیں کسی میں زیبقی اجزاء زیادہ ہیں کسی میں ملحی اجزاء زیادہ ہیں۔ کسی میں حرارت کم پہنچی اور پورا نضج نہ ہو سکا۔ کسی میں ضرورت سے زیادہ حرارت پہنچ گئی تو وہ جل اٹھا۔ کسی میں معتدل حرارت پہنچی تو وہ پختگی کی حد کو پہنچ گیا۔ مثلاً پارہ ہے کہ یہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ آبی اور خاکی بخارات باہم اس طرح سے مل جاتے ہیں کہ مقدار آبی بخارات کی خاکی بخارات سے زیادہ ہوتی ہے اور بعد آمیزش و نضج کے حرارت آفتاب سے بخار آبی منعقد اور بستہ ہو جاتا ہے۔ یا سونا ہے کہ گندھک اور پارہ کے صاف و شفاف اجزا جن کی ترکیب بھی انہیں بخارات آبی و خاکی سے ہوتی ہے۔ جب آپس میں خوب مختلط ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ جوہر ان دونوں کے ایک دوسرے پر غالب نہ ہوں۔ اور بعد آمیزش کے کامل طور پر تصفیہ پا جاتے اور نہایت متشابہ الاجزا ہونے چاہئیں۔ اور پھر ان میں خارجی برودت اثر کرتی ہے۔ تو بستہ ہو کر سونا بن جاتے ہیں۔ اور چونکہ برودت خارجیہ کے سبب سے اُن کا انعقاد ہوا ہے اسی سبب سے آگ کی گرمی پا کر گداختہ بھی ہو جاتے ہیں اور

چاندی کے پیدا ہونے کی بھی یہی ترکیب ہے۔ لیکن صرف فرق یہ ہے کہ سونے میں جو برودت عاقدہ پہنچی ہے۔ وہ بعد کمال نفخ و پختگی کے پہنچی ہے اس لئے اس کا رنگ سرخ ہے اور چاندی میں ابھی اتنی پختگی نہیں آئی تھی۔ اور حرارت نے پورا عمل نہیں کیا تھا کہ برودت نے اس کو بختہ کر دیا۔ اس وجہ سے اُس کا رنگ سفید رہ گیا۔ یا مثلاً لوہا ہے کہ یہ بھی کبریت وسیماب کے بخارات ناصافی سے مرکب ہوتا ہے۔ مگر اوّل ہی سے اس کے اجزا غیر نفخ یافتہ ہوتے ہیں اور بعد ترکیب وامتزاج کے بھی خام ہوتے ہیں کہ برودت آکر انہیں بستہ کر دیتی ہے علیٰ ہٰذا القیاس اور بھی اجسام جمادات ہیں جن کو اگر بطور تفصیل وتحقیق بیان کیا جائے۔ تو یہی بیان ایک بڑا دفتر بن کر فن کیمیا کی عظیم الشان کتاب ہو جائے لہٰذا اختصار سے کام لیا گیا۔

نباتات کا پانی سے پیدا ہونا اور پانی ہی سے اُن کی زندگی ہونی اور پانی ہی سے اُن کا باقی رہنا۔ اور پانی ہی کی بدولت اُن میں پھل پھول لگنے یہ ایک ایسی بات ہے جس کے مفصل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ حیوانات کی خلقت بھی اسی سے ہے۔ اگر حشرات الارض ہیں تو اسی کی مدد سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آبی جانور ہیں۔ جیسے مچھلیاں تو اسی کی مدد سے پیدا ہوتی۔ اگر خاکی جانور ہیں تو بھی اسی کے ذریعے سے وجود میں آتے ہیں۔ اگر فضا کے جانور ہیں تو اسی کے ذریعے سے۔ اور اگر حضرت انسان کو دیکھئے تو اسی کے ذریعے سے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ بَیْنَ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۔ اگر تھوڑے سے عرصے کے لئے ان ذی حیاتوں سے پانی کے سلسلے کو قطع کر دیا جائے تو ہرگز باقی نہیں رہ سکتے۔ حیوانات پیاس سے مرجائیں اور نباتات فوراً خشک ہو جائیں پھر نہ روئے زمین پر انسان رہے۔ نہ اور کوئی حیوان۔ نباتات رہیں اور نہ استعمال میں لانے والے۔

۲۔ فائدہ یہ ہے کہ پانی ہی وہ چیز ہے جو زمین کی کثافتوں کو دھو دیتی ہے

اسی سے زمین کے اٹھتے ہوئے فاسد بخارات ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ اسی سے گندگی دفع ہوتی ہے۔ اسی سے راہیں صاف ہو جاتی ہیں۔ اور اسی سے ارضی بیماریاں دفع ہوتی ہیں۔

۳۔ فائدہ یہ ہے کہ پانی ہی وہ چیز ہے جس سے انسانوں کو باطنی اور ظاہری طہارت حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر گندگی لگی ہو تو اس سے دھو کر صاف کر ڈالو۔ اور اگر باطنی نجاست مثل جنابت و حیض کے حاصل ہوا ہو تو اس سے اس کی طہارت کر لو۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَآءً طَهُوْرًا۔ یعنی طاہراً فی نفسہٖ و مطہرٌ لغیرہٖ" اس پر شاہد ہے۔

۴۔ فائدہ تفریح ہے اور دفع کسل۔ اگر آدمی تھکا ہو تو اس سے ہاتھ منہ دھو کر فرحت حاصل کر سکتا اور کسل کو اپنے دفع کر سکتا ہے۔

۵۔ اسی کے ذریعے سے انسان سخت سے سخت چیز کو نرم کر سکتا ہے۔ کبھی انسان کھانا نہیں پکا سکتا اگر اس کے پاس پانی نہ ہو۔

۶۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہر صورت سے استعمال میں لا سکتا ہے۔ اسی کو گرم سے گرم کر کے استعمال کرو چاہو سرد سے سرد بنا کر کام میں لاؤ۔

۷۔ اسے ہر طرح اپنی دوا میں استعمال کر سکتے ہیں۔ کبھی شرباً۔ کبھی تکمیداً کبھی ضماداً۔ کبھی غسلاً۔ کبھی بطور آبزن۔ کبھی بطور احتقان۔ دیکھئے کہ عقل والوں نے اسے کہاں تک وسعت دی ہے اور کتنی صورت اس سے معالجہ کرنے کی نکالی ایسی میں آفتاب کی شعاعیں مختلف حیثیتوں سے ڈال کر مختلف امراض میں استعمال کرتے ہیں۔ اور اسی کو آگ کے بخارات سے گرم کر کے بیشتر معالجات میں کام میں لاتے ہیں۔

۸۔ اسی پانی کو ایسا بنایا گیا کہ ہر وقت بھی ہمارے پاس رہ سکے۔ اور نہ بھی رہ سکے۔ جس وقت ضرورت ہو اسے اپنے سے قریب کر سکتے ہیں۔ اور جب ضرورت نہ ہو اپنے سے دور کر سکتے ہیں۔ جب ہمیں ضرورت ہوتی ہے۔ تو دریاؤں نہروں۔

اور تالابوں سے اسے کھینچ کر اپنی زراعتوں اور باغوں میں لاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں اس کا سلسلہ منقطع کر دیتے ہیں۔ بلکہ تدبیر حقیقی ہی نے ایسا کیا ہے کہ ہر وقت ہمارے سر پر موجود نہیں رکھا ہے۔ بلکہ اس کی خاص خاص فصلیں مقرر کر دی ہیں کہ اُن میں اس کا نزول اور کثرت ہو۔ تاکہ اوقات معینہ پر اس سے کامل انتفاع حاصل کیا جا سکے۔ اور اس کی بارش بیکار و ہدر نہ جائے۔ اور ہر وقت کی ضرورتوں کے واسطے اس کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے پاس موجود کر دیا ہے۔ جس سے مراد دریا و تالاب وغیرہ ہیں۔

۹۔ اسی کے ذریعے سے ہم اپنی کشتیوں کو چلا سکتے اور سیر و سیاحت کر سکتے اور اشیائے تجارت لے آ اور لے جا سکتے ہیں۔ اگر پانی نہ ہوتا۔ تو ہم خود اپنی پیٹھوں پر ان چیزوں کو اس کثرت سے ایک ملک سے دوسرے ملک میں جو لاکھوں میل کے فاصلہ پر ہے۔ پہنچا سکتے تھے؟ یا ہمارے جانور ان کی مسافت طے کر سکتے تھے؟ اور اگر طے بھی کر لیتے۔ تو کیا سخت زحمت و تکلیف ہمیں نہ پہنچتی؟ بخلاف اس وقت کے کہ ہر طرح کی ہم کو اس سے آسانی ہو گئی ہے۔

۱۰۔ اسی نے تمام قدیم و جدید ریفارمروں کے جو منجانب اللہ آنے کا دعویٰ کرتے تھے ان اقوال کو صحیح ثابت کر دیا جو معاملہ حشر و نشر میں وہ ہم سے بیان کرتے ہیں۔ کیوں کہ جب یہ خشک زمین پر گرتا ہے جو بالکل مردہ ہو گئی ہو تو اس میں جان تازہ ڈال دیتا ہے اور اس کو پھر اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس سے جاندار چیزیں نکال جائیں۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اگر مرے ہوئے مینڈک کی بوسیدہ مٹی کو تالاب کی مٹی میں ملا کر رکھ لو اور جب مینہ برسے اسے صحن میں ڈال دو تو اسی مٹی سے صبح کے وقت تمہیں ہزاروں مینڈکیاں کودتی اور اچکتی ہوئی ملیں گی۔ اور کیا تم نے دیکھا نہیں کہ ادھر مینہ برسا اور سینکڑوں کیڑے جن کے تخم اور اجزا سوکھ کر مردہ ہو گئے تھے۔ وہ صرف ایک دن کے مینہ برسنے سے جی اُٹھے اور اڑنے لگے۔ اور کیا یہ نہیں دیکھا ہے کہ بالکل بے آب زمین جب کہ اس نے بارش کا

پانی پایا فوراً اپنے اندر سے اس نے لہلہاتے سبزے نکال دیئے۔ پس معلوم ہوا کہ جب اس طرح مُردوں کا جی اٹھنا آج ممکن ہے تو کل کیوں نہ ممکن ہوگا۔ قال من یحی العظام وھی رمیم قل یحییھا الذی انشاءھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم۔ واللہ الذی ارسل الریاح فتثیر سحابا فسقناہ الی بلد میت فاحیینا بہ الارض بعد موتہا کذالک النشور۔

فائدہ صحیح رائے یہی ہے کہ پانی اصل مرکبات ہے۔ یعنی جس قدر بھی مرکبات ہیں خواہ عنصریہ ہوں۔ خواہ فلکیہ ہوں سب کی اصل پانی سے ہے اور اس خیال کی ایک انسانی اور دو الٰہی رائیں ہیں۔ جن کا غلط ہونا ناممکن ہے۔

۱۔ دنیا میں سب سے پہلا شخص جو حکیم کہا گیا اور جس نے مصر میں علوم فلسفیہ حاصل کرکے ملطیہ کی طرف ہجرت کی وہ حکیم فلوطرخیس ہے۔ اس کی رائے ہے کہ اصل میں پانی مرکب ہے۔ چنانچہ صاحب ملل ونحل نے اس کی رائے نقل کی ہے۔ (جلد دوم ملل ونحل ابن حزم ظاہری و برحاشیہ ملل شہرستانی ص۹) قال ان اصل المرکبات ھو الماء فاذا تخلخل صافیا وجد النار واذا تخلخل وفیہ بعض الثقل صار ھواء واذا تکاثف تکاثفاً مبسوطاً صار ارضاً۔

۲۔ حکیم الٰہی۔ اعرف العرفاء و اعلم العلماء و راس الحکماء مولانا امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: (نہج البلاغۃ ص۱۲ مطبوعہ بیروت ثم انشأ سبحانہ فتق الاجواء وشق الارجاء وسکائک الھواء۔ فاجری فیھا ماء متلاطما تیارہ۔ متراکما زخارہ۔ حملہ علی متن الریح العاصفۃ والزعزع القاصفۃ فامرھا بردہ۔ وسلطھا علی شدہ۔ وقرنھا الی حدہ۔ پھر فرماتے ہیں۔ حتی عب عبابہ۔ ورمی بالزبد رکامہ۔ فرفعہ فی ھواء منفتق وجو منفھق فسوی منہ سبع سماوات جعل سفلاھن موجا مکفوفا وعلیاھن سقفا محفوظا وسمکا مرفوعا۔ بغیر عمد یدعمھا ولا دسار ینتظمھا۔ دوسرے مقام پر ایک خطبہ میں فرماتے ہیں (نہج البلاغۃ ص۲۳۴) وکان من اقتدار جبروتہ وبدیع

لطایف صنعتہ ان جعل من ماءِ البحر الزاخر متراکم المتقاصف یبساً جامداً ثم فطر منہ اطباقاً ففتقھا سبع سماواتٍ بعد ارتتاقھا فاستمسکت بامرہٖ وقامت علی حدّہٖ وارسیٰ ارضاً یحملھا الاخضر المثعنجر والقمقام المسخر الخ۔

فائدہ۔ کتاب خصال میں مروی ہے کہ رسولِ خدا نے فرمایا کہ چار نہریں جنت کی ہیں۔ فرات۔ نیل۔ سیحان اور جیحان۔ پس فرات تو پانی کی نہر ہے دنیا و آخرت میں اور نیل شہد کی نہر ہے اور سیحان شراب کی اور جیحان دودھ کی (یعنی جنت میں)۔

اور در منثور سیوطی میں مروی ہے کہ رسولِ خدا نے فرمایا کہ جنت سے پانچ نہریں آئی ہیں۔ ایک سیحون جو ہندوستان میں ہے۔ اور جیحون جو بلخ کی نہر ہے اور دجلہ اور فرات جو عراق کی نہر ہے اور نیل جو مصر کی نہر ہے۔ ان سب کو خدا تعالیٰ نے جنت کے ایک چشمہ سے جبرئیل علیہ السلام کے بازوؤں کے ذریعے سے اتارا اور پہاڑوں میں ساکن کیا۔ اور زمین پر ان کو جاری فرمایا اور قسم قسم کی معیشتوں میں انسان کو ان سے نفع پہنچایا۔ یہی مطلب ہے۔ خدا تعالیٰ کے اس قول کا وانزلنا من السمآء مآءً بقدرٍ فاسکناہ فی الارض۔ پس جب یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا۔ تو خدا تعالیٰ جبرئیل کو بھیجے گا اور وہ زمین سے قرآن مجید اور تمام علم اور حجر اسود اور مقام ابراہیم اور تابوتِ موسیٰ مع تمام چیزوں کے جو اس میں ہیں اور ان پانچ نہروں کو لے جائیں گے اور یہی مطلب ہے خدا تعالیٰ کے اس قول کا وانا علی ذھاب بہ لقادرون۔ اور جب یہ سب چیزیں اٹھ جائیں گی تو اہلِ زمین سے خیر دنیا و آخرت اٹھ جائے گا۔

کتاب اکمال الدین میں مروی ہے کہ ایک یہودی نے جناب امیر المومنین علیہ السلام سے عرض کی کہ وہ کون سا پہلا درخت ہے جو روئے زمین پر اُگا۔ اور وہ کون سا اول چشمہ ہے جو زمین سے پھوٹا۔ اور وہ کون سا پہلا پتھر ہے۔ جو زمین پر رکھا گیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ پہلا درخت جو زمین پر اُگا اس کی نسبت

یہود تو یہ کہتے ہیں کہ وہ زیتون کا درخت ہے حالانکہ وہ جھوٹے ہیں بلکہ کھجور کا درخت ہے جسے آدم علیہ السلام جنت سے لائے تھے اور بویا تھا۔ اور تمام کھجوروں کی اصل وہی ہے۔ لیکن اوّل چشمہ جو زمین پر پھوٹ بہا تو یہود کہتے ہیں کہ وہ چشمہ بیت المقدس ہے اور تحت سنگ ہے مگر وہ جھوٹ کہتے ہیں۔ بلکہ وہ چشمہ حیات ہے کہ جو کوئی وہاں پہنچا ہمیشہ زندہ رہا۔ اور جناب خضر ذوالقرنین بادشاہ کے مقدمۃ الجیش کے افسر تھے۔ اس نے آب حیات کو تلاش کیا۔ تو حضرت خضر نے اُسے پا لیا اور اس میں سے پیا۔ اور ذوالقرنین نے نہ پایا۔ لیکن اول پتھر جو روئے زمین پر رکھا گیا۔ پس اس کی نسبت یہود تو یہ کہتے ہیں کہ وہ سنگ بیت المقدس ہے اور وہ جھوٹ کہتے ہیں بلکہ وہ حجر اسود ہے۔ جسے حضرت آدم جنت سے لائے تھے۔ اور اسے رُکن خانہ کعبہ میں رکھا۔ اور لوگ اسے (اب) بوسہ دیتے ہیں، یہ پتھر بہت سفید تھا۔ مگر بنی آدم کی خطاؤں کی وجہ سے سیاہ ہو گیا۔

کامل الزیارہ میں یہ بھی وارد ہے کہ دو نہریں مومن ہیں اور دو نہریں کافر ہیں۔ کافر تو نہر بلخ اور دجلہ ہے اور مومن نیل مصر اور فرات ہے۔" (مراد کافر اور مومن سے یہ ہے کہ نہر دجلہ و بلخ سے سیرابی زراعات وغیرہ کی بدشواری ہوتی ہے اور بڑی مشکل سے لوگ ان سے فائدہ مند ہوتے ہیں اور نہر فرات و مصر سے بلا مشقت لوگوں کو انتفاع پہنچتا ہے۔ لہذا یہ دونوں نفع پہنچانے میں مثل اہلِ ایمان کے ہیں۔ اور وہ دونوں عدم نفع رسانی میں مثل کافر کے ہیں۔ حضرت کا یہ ارشاد بر بنائے تشبیہ ہے۔

نیز جناب رسولؐ خدا سے نوادر راوندی میں مذکور ہے کہ بدترین یہود یہود بلیسان ہیں۔ اور بدترین نصاریٰ نصاریٰ نجران اور بہترین آب جو زمین پر پھوٹ نکلا آب زمزم اور بدترین آب جو زمین پر جاری ہوا آب برہوت جو وادی حضر موت میں واقع ہے۔ وہیں کفار کی روحیں جاتی ہیں۔

درمنثور میں یہ بھی مروی ہے کہ رسولؐ خدا نے فرمایا کہ جو کوئی آب زمزم

کو بغرض شفا پئے گا۔ اُس کو خدا تعالٰی شفا دے گا اور جو کوئی بھوک میں پئے گا اسے سیر کرے گا۔ یا کسی حاجت کے لئے پئے گا تو اس کی حاجت کو پروردگارِ عالم بر لائے گا۔

مد و جزر کی نسبت اگرچہ حکماء نے بہت کچھ خود رائیاں ظاہر کی ہیں۔ اور قیاس کے گھوڑے دوڑائے ہیں مگر کوئی بھی ان اقوال میں سے قابل توجہ نہیں۔ البتہ خزینہ دار علم الٰہی امیر المومنین علیہ السلام نے اس کا راز یوں بیان فرمایا ہے کہ ایک فرشتہ ہے جو دریاؤں پر موکل ہے۔ اُسے رومان کہتے ہیں۔ جب وہ اپنے پاؤں دریا میں ڈالتا ہے تو مد اٹھتا ہے اور جب وہ نکال لیتا ہے تو جزر ہو جاتا ہے (علل الشرائع منقول از کتاب سماء والعالم بحار)۔

۴۔ خود الہ الحقیقی فرماتا ہے۔ وجعلنا من الماء کل شیئ حیی" پس اب کسی کو پانی کے اصل مرکبات ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

چھٹی نشانی: وجود پروردگارِ عالم کی حیوانات کا پیدا کرنا ہے وبث فیھا من کل دابۃ۔ اللہ اکبر! یہ وہ نشانی ہے کہ جس کے عجائب صنعت و غرائب حکمت کو ہرگز انسانی بیان محیط نہیں ہو سکتا۔ اور نہ یہی کافی طور پر ادا ہو سکتا ہے کہ کس کس طرح اور کن کن صورتوں سے خلقت حیوانات دلیل وجود صانع حکیم تعالٰی مجدہ و جل شانہ ہے۔ اگر ان کی تعداد کو دیکھئے تو لاتعد و لاتحصٰی نظر آئے گی اور اگر ان کی صورتوں کو دیکھئے تو اس میں بھی عقلیں رہ جائیں گی۔ اگر ان کے رنگوں کی صنعت کو ملاحظہ فرمائیے تو اس میں وہ حیرت ہوتی ہے کہ ہرگز اس دریا سے انسان پار نہیں ہو سکتا۔ اگر ان کے اغراض و فوائد پر نظر کی جائے تو اتنے ہیں کہ ہرگز ایک شخص کا بیان انہیں محیط نہیں ہو سکتا۔ اگر ان کے مساکن کو دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا کرشمہ قدرت ہے اگر ان کی غذاؤں پر غور کیجئے تو وہ الگ حیرت انگیز نظر آئیں گی۔ اگر اُن کی ساخت اور تنوعات اشکال پر نظر ڈالئے۔ تو کوئی انتہا نہیں دکھائی دیتی۔

ان کی انواع کے اقسام اور اقسام کے اصناف اور اصناف کے اشخاص اتنے ہیں کہ لایمکن ان یحدّہ عاد او یحصیہ محص الا الذی خلقہا فقد رہا و باری صورۃ ماشاء رکبہا۔ البتہ بے شک صحیح ہے لا یعلم جنود ربک الا ھو افواج خدا کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔" کیونکہ اگر صرف فہرست ہی اُن کی لکھی جائے۔ تب بھی تعدید اُن کی دشوار ہے۔ نہ معلوم کہ کتنے بری حیوانات ہیں اور کتنے بحری۔ اور کتنے ہوائی۔ اور بری۔ کتنے سم دار ہیں۔ کتنے بے سم کے۔ کتنے شاخ دار ہیں۔ کتنے بے شاخ کے۔ کتنے بڑے بالوں والے ہیں۔ کتنے چھوٹے بالوں والے۔ کتنے اُنسی ہیں اور کتنے وحشی۔ کتنے چرند ہیں اور کتنے پرند۔ کتنے دانہ خوار ہیں کتنے علف خوار۔ کتنے سفید رنگ ہیں کتنے سیاہ رنگ۔ کتنے سبز رنگ ہیں اور کتنے زرد رنگ۔ کتنے کبود رنگ ہیں اور کتنے کاہی رنگ۔ اور علی ہذا القیاس پھر رنگوں کے اختلاف کی کوئی حد نہیں۔ کیوں کہ ہر رنگ بہتیرے رنگوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک سرخ ہی رنگ ہے کہ اس کے اصناف بحسب اختلاف شدت و ضعف بے شمار ہیں۔ جو ان رنگوں سے رنگین ہیں۔ پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ کتنے یک رنگ ہیں۔ اور کتنے دو رنگ اور کتنے سہ رنگ۔ پھر سب کی صورتوں کو دیکھنا چاہیئے کہ کتنی قسم کی صورتیں ہیں۔ پھر اگر پرندوں کو دیکھئے تو اُن کے اقسام کی انتہا ہے۔ اور نہ اُن کی صورتوں کی۔ نہ اُن کے رنگوں کی۔ پھر اگر حشرات الارض کو دیکھئے تو اُن کی قسمیں بھی لا تعد ولا تحصیٰ نظر آئیں گی۔ آپ صرف شب کے وقت کسی کھلے میدان میں لیمپ روشن کر کے دیکھئے کہ کتنی قسم کے جانور اُس کے گرداگرد جمع ہو جاتے ہیں اور ان کی کیسی کیسی صورتیں ہیں۔ پھر اُن میں بھی کئی قسم کے جاندار ہیں۔ کوئی پردار ہیں کوئی بے پر کوئی زہریلا ہے تو کوئی بے زہر۔ کوئی پاؤں والا ہے اور کوئی بے پاؤں کا۔ کسی کے بے شمار پاؤں ہیں جیسے کنکھجورا۔ اور کسی کے ایک بھی نہیں جیسے سانپ۔ پھر اگر دریا میں آ نکلیے تو اس کے اقسام کو بھی حصر نہیں کر سکتے۔ صرف ایک مچھلی ہے کہ اگر اس

کے تمام اقسام کو انسان شمار کرنا چاہے تو ناممکن ہے۔ چہ جائیکہ ان کے افراد و اشخاص کہ ان کا حصر تو کسی طرح ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر ان سب کے خواص و منافع کی طرف رجوع کیجئے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ جتنی ہی ان کی قسمیں اتنے ہی اُن کے فوائد ہیں۔ اور چونکہ اُن کے اقسام لاتعداد ہیں تو لامحالہ اُن کے منافع و خواص بھی لاتحصی ہوں گے۔ اور اگر ان سب سے قطع نظر کی جائے اور صرف انہیں حیوانات کو لیا جائے جو بری ہیں اور تری میں بھی صرف مایدب علی الارض (یعنی جو زمین پر چلتے ہیں) کو شمار کیا جائے۔ تو کون سا دفتر ان کی تعداد بیان کرنے اور اُن کی اقسام کے حصر کرنے اور ان کے اصناف کے شمار کرنے اور اُن کے رنگوں کی تعریف کرنے اور اُن کے منافع کے احصا کرنے اور اُن کے مضار کے بتانے اور ان کی صورتوں کی تعدید کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ کون بتا سکتا ہے کہ دواب میں سے کتنے طویل العنق۔ اور کتنے قصیر العنق، کتنے طویل الارجل اور کتنے قصیر الارجل۔ کتنے۔ کتنے طویل القامت۔ اور کتنے قصیر القامت۔ اور طول و قصر کے درمیان کتنے اقسام ان کے ہیں۔ اور اگر ان سب سے قطع نظر کر لی جائے۔ اور صرف حضرت انسان ہی کے اصناف پر غور کیا جائے۔ تو آج کون ایسا دنیا میں ہے جو ان کی اصناف۔ ان کی اشکال ان کے اختلاف امزجہ ان کے اختلاف الوان۔ ان کے اختلاف السنہ۔ ان کے اختلاف اقطار جسمیہ کو شمار کر کے بتا سکتا ہے اور جب کہ ان کا حصر و شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ تو کسی کی کب مجال ہے کہ ان حکمتوں، صنعتوں۔ رمزوں۔ حکمتوں۔ لطافتوں، منفعتوں، مضرتوں کو بیان کر سکے۔ جو ان کے اندر صناع قدرت و خلاق فطرت و مبدع ازل و مخترع اوّل و حکیم لاشریک لہٗ و مدبر لاندّلہٗ نے ودیعت فرمائے ہیں۔ صرف اگر ایک ہی صنف کے انسان کو دیکھا جائے اور اس کے امور کلیہ پہ نظر سرسری ڈالی جائے اور پوچھا جائے کہ اس کے دو ہاتھ کیوں ہیں۔ اور اگر ہیں تو گردن کے پاس کیوں لگے ہیں۔ اگر گردن

کے پاس لگے ہیں۔ تو ان میں تین جوڑ کیوں ہیں۔ ان کی انگلیوں کی ساخت اس طرح کی کیوں ہے۔ ہتھیلی اس طرح کی کیوں بنی۔ پشت دست اس انداز کا کیوں رکھا گیا۔ ان کے جوڑ صرف ایک ہی طرف کیوں مڑتے ہیں۔ دوسری طرف کیوں نہیں مڑتے۔ پھر سر کی حکمتوں پر غور کیا جائے اور اس کے اندر جو حواس ظاہرہ اور حواس باطنہ قرار دیئے گئے ہیں اُن کی حکمتوں کو سوچا جائے۔ پھر سینہ کی ساخت۔ اور اس کی حکمتیں پھر پیروں کی بناوٹ اور اُن کی تدبیریں۔ پھر اندرونی آلات امعاد قلب و جگر و ریہ و طحال مرّہ و اغشیہ و معدہ و عروق و غضاریف و رباطات و اعصاب و اوردہ و شرائین وغیر ذلک کو دیکھا جائے اور ان کی حکمتوں کو غور سے سمجھا جائے۔ پھر اُن کے اندر مختلف الانواع قوتیں۔ اور متنوع الاقسام طاقتیں رکھی گئی ہیں۔ اُن پر نظر تامل ڈالی جائے۔ تو معلوم[1] ہو سکتا ہے کہ یہ ضرور کسی کے مصنوع و مخلوق ہیں۔ اور ان کا خالق اتنا بڑا حکیم و مدبّر و صناع و مخترع و موجد و خالق و مبدع و باری ہے۔ جس سے بڑھ کر عقلاً محال ہے کہ کوئی دوسرا ہو سکے۔

خیر انسان تو انسان۔ یہ تو ایک نمونہ عالم اکبر ہے۔ اور اس میں تو تمام عالم میں جس قدر چیزیں ہیں۔ مثلاً آسمان و کواکب و زمین و عناصر و موالید و ملائک و جن و وحش و طیر سب ہی کے نمونے موجود ہیں۔ اور اس کے حکم و مصالح و منافع۔ خواص و حرکات و سکنات و طبائع و امزجہ کو کوئی کیا بیان کر سکتا ہے۔ محض اگر ایک چیونٹی ہی کی خلقت کو غور کیا جائے۔ جو موجودات سفلیہ میں بہت ہی چھوٹا دابہ ہے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ خزانہ حکمت حکیم فیاض اس قدر وسیع ہے کہ ہرگز کسی کا وہم و گمان بھی وہاں تک نہیں جا سکتا۔ اتنا چھوٹا سا تو آپ کا جسم اور

---

[1] اگر ان کی عجیب حکمتیں معلوم کرنی مقصود ہوں، تو دیکھو کتاب توحید الائمہ۔ جو مصنف کی تالیف سے ہے۔ اور چند سال ہوئے شائع ہو چکی ہے۔ ۱۲

اس کے اندر چار یا چھ پاؤں۔ دو ٹونک۔ سر۔ آنکھیں۔ کمر۔ پیٹ۔ آنتیں۔ دماغ اور قوت دماغیہ۔ احساس وادراک۔ تفرس۔ ذہانت۔ فہم سب ہی چیزیں تو موجود ہیں۔ کیا تو اس کے سر کی مقدار ہے۔ مگر اس میں آنکھیں بھی ہیں۔ ناک بھی ہے۔ منہ بھی۔ قوت متخیلہ بھی ہے۔ قوت حافظہ بھی ہے۔ قوت ہاضمہ و دافعہ۔ ماسکہ و جاذبہ بھی ہے۔ قوت شامہ ایسی قوی ہے کہ کتنی ہی حفاظت سے کوئی شیرینی رکھیئے مگر حضرت نملہ ہیں کہ وہاں موجود ہیں۔ پچاس تہوں کے اندر سے بھی اس کی خوشبو ان کی ناک تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر جب یہ تمام قوتیں اس میں موجود ہیں تو لا محالہ ان کے مقامات بھی علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ تو اب اس کی قدر مسافت کو غور کیجئے۔ اور اس میں اس تقسیم کو کہ کتنا کتنا حصہ اس کے جسم کا ان تمام قوتوں کے لئے مقرر ہوا ہے۔ اور کہاں کہاں اس کے مقامات قرار پائے ہیں۔ اس کی آنتیں کہاں ہیں۔ اس کے دل و جگر۔ و گردہ وغیرہ کس مقام پر ہیں۔ اور کتنے کتنے بڑے ہیں۔ تو اس وقت خلاق عالم کی قدرت کاملہ اور صنعت تامہ کا حال کسی قدر معلوم ہو سکے گا۔ جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں (نہج البلاغۃ ص۱۹۶)

ولو فکّروا فی عظیم القدرۃ وجسیم النعمۃ لرجعوا الی الطریق۔ وخافوا عذاب الحریق۔ ولکن القلوب علیلۃ والبصائر مدخولۃ الا ینظرون الی صغیر ما خلق کیف احکم خلقہٗ واتقن ترکیبہ وفلق لہ السمع والبصر وسوّی لہ العظم والبشر انظروا الی النملۃ فی صغر جثتہا ولطافۃ ہیئتہا لا تکاد تنال بلحظ البصر ولا بمستدرک الفکر کیف دبّت علی ارضہا وصبت علیٰ رزقہا تنقل الحبۃ الی حجرہا وتعدہا فی مستقرہا تجمع فی حرّہا لبردہا وفی وردہا لصدرہا مکفولۃ برزقہا مرزوقۃ لوفقہا لا یغفلہا المنّان ولا یحرمہا الدیّان ولو فی الصفا الیابس والحجر الجامس ولو فکّرت فی مجاری اکلہا فی علوہا وسفلہا وما فی الجوف من شراسیف بطنہا وما فی الراس من عینہا واذنہا لقضیت من خلقہا عجبًا ولقیت من وصفہا

تعباً فتعالی الذی اقامہا علی قوائمہا وبناہا علی دعائمہا لم یشرکہ فی فطرتہا فاطر ولم یعنہ فی خلقہا قادر ولو ضربت فی مذاہب فکرک لتبلغ غایاتہ ما دلتک الدلالۃ الا علی ان فاطر النملۃ ھو فاطر النخلہ لدقیق تفصیل کل شیٔ وغامض اختلاف کل حیی وما الجلیل واللطیف والثقیل والخفیف والقوی والضعیف فی خلقہ الا سواء" انتہی بقدر الحاجۃ!!

اگر لوگ (خدا تعالیٰ) کی بڑی قدرت اور عظیم الشان نعمت کو غور کریں۔ تو ضرور راہ پر آجائیں۔ اور عذاب دوزخ سے ڈریں۔ لیکن (کیا ہو سکتا ہے) دل تو بیمار ہیں۔ اور عقلیں فاسد ہیں۔ کیا یہ لوگ اس چھوٹی سی چیز کو نہیں دیکھتے جسے اس نے پیدا کیا ہے؟ کہ کس طرح اس کی ساخت و ترکیب کو محکم و مضبوط بنایا ہے۔ اور اس کے لئے کان اور آنکھیں پیدا کی ہیں۔ اور اس کے لئے ہڈی اور جلد ترتیب دی۔ چیونٹی کو دیکھو! کہ اتنی چھوٹی سی اور باریک شکل ہونے میں قریب ہے کہ آنکھ سے بھی دکھائی نہ دے۔ اور فکر و غور سے بھی نہ معلوم ہو سکے (مگر باوجود اس کے)، زمین پر چلتی ہے۔ اور اپنی روزی کی تلاش میں دوڑتی پھرتی ہے۔ دانہ کو اپنے سوراخ میں پہنچاتی اور اپنے مسکن میں اس کو جمع و مہیا کرتی ہیں۔ گرمی کے موسم میں جاڑے کے لئے اور اپنے آنے کے وقت میں نکلنے کے وقت تک کے لئے ذخیرہ کر لیتی ہیں۔ اس کی روزی کی بھی (خدا تعالیٰ کی طرف سے) ضمانت کر لی گئی ہے۔ اور اس کی حیثیت کے موافق اسے بھی رزق پہنچایا گیا ہے ؎

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی ہے بار بار لے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار

خدائے منان اس سے بھی غافل نہیں ہے۔ اور جزا دہندہ اس کو بھی محروم نہیں رکھتا۔ اگرچہ وہ (چیونٹی) چکنے خشک پتھر پر ہو (جس کی چال کی آہٹ بھی نہ محسوس ہو سکے) اور سنگ بستہ پر۔ اور اگر تم اس کے مجاری غذا (ان رستوں اور سوراخوں پر جس راہ سے غذا اس کے پیٹ میں جاتی ہے)، اس کے بلند و پست حصہ (جسم) میں ہے۔ غور کرو۔ اور جو اس کے جوف بدن میں اس کے پیٹ کی پسلی ہڈیاں ہیں اور اس کے سر میں

آنکھیں اور کان ہیں۔ انہیں تامل سے دیکھو۔ تو تمہیں اس کی ساخت کے انداز میں بہت تعجب ہوگا اور اسکے اچھی طرح درک کرنے میں تکلیف ہوگی (بلکہ اگر چاہو گے کہ ہم اس کی پوری حقیقت بیان کر دیں۔ تو تم سے ممکن نہ ہوگا) پس بلند مرتبہ ہے وہ (معبود حقیقی)، اُس کو اُس کے قوائم (ٹانگوں) پر اُسے قائم کیا ہے۔ اور اس کے ستونوں (پاؤں) پر اس کی بنیاد رکھی ہے (باوجودیکہ) نہ اس کے پیدا کرنے میں کوئی اور پیدا کرنے والا اس کا شریک ہوا ہے۔ نہ کسی اور طاقت والے نے اس کی ساخت میں اس (خالق حقیقی) کی مدد کی ہے۔ اور اگر تم اپنے فکر کے رستوں میں اس غرض سے دوڑو بھی کہ اس (خلقت) کی انتہا تک پہنچ جاؤ۔ تو دلیلیں تمہیں یہی بتائیں گی کہ جو چیونٹی کا پیدا کرنے والا ہے وہی (اتنے بڑے) درخت خرما کا بھی خالق ہے کیونکہ ہر شے کی باریک تفصیل اور ہر زندہ رہنے والی چیز کا مخفی اختلاف تمہیں اسی طرف راہنمائی کرے گا۔ اُس (معبود) کے پیدا کرنے میں کیا جلیل یا لطیف کیا ثقیل کیا خفیف۔ کیا قوی اور کیا ضعیف سب ہی تو یکساں ہیں" سبحان اللہ کیا اچھی تشریح و توضیح ہے)۔

ساتویں نشانی: وجود صانع کی تصریف الریاح یعنی ہواؤں کا چلانا ہے یہ نشانی بھی اعظم دلائل سے ہے۔ بشرطیکہ انسان اس پر غور کرے۔ کیونکہ اس کا مشتمل ہونا بے شمار حکمتوں اور ان گنت فائدوں اور مصلحتوں پر صاف بتاتا ہے کہ بے شک اسے بھی کسی بڑے طاقت ور حکیم ازلی نے پیدا کیا ہے۔

پہلی بات جو اس میں قابل غور ہے۔ وہ یہی ہے کہ اگرچہ ہوا ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہے۔ لیکن پھر بھی کسی کسی وقت تو اس میں حرکت ہوتی ہے۔ اور کسی وقت نہیں ہوتی۔ اس کا کیا سبب ہے اور کیوں ایسا ہے۔ دوسرے یہ کہ کبھی چاروں طرف سے اور کبھی صرف ایک طرف سے خواہ شمال سے خواہ جنوب سے خواہ مشرق سے اور خواہ مغرب سے چلتی ہے۔ کیا مصلحتیں ہیں۔ تیسرے یہ کہ کوئی ہوا

سخت گرم ہوتی ہے اور کوئی بہت سرد کوئی بہت رطب اور کوئی بہت یابس ہوتی ہے اس میں کیا کیا فوائد ہیں۔ کس کی زبان میں اتنی طاقت ہے اور کس کے قلم میں اتنا زور ہے کہ اس کی پوری حقیقت کو لکھے یا بیان کر سکے۔ مگر نہایت مختصر چند لفظوں میں اجمالی حالت اس کی گوش گزار سامعین اور نذر نظر ناظرین کی جاتی ہے۔

ہوا کے فائدے

مطلق ہوا میں ایک تو یہ فائدہ ہے کہ بہت سے جانداروں کی زندگی اسی کی بدولت ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی ہوا منقطع کر دی جائے تو جاندار مر جائے (مثلاً کسی صندوق میں آدمی یا کسی حیوان کو اس طرح بند کیا جائے۔ کہ اس کے اندر کی ہوا کسی آلہ کے ذریعے سے نکال لی گئی ہو۔ مگر باہر سے صاف ہوا بھی نہ داخل ہو سکتی ہو، تو تھوڑی دیر میں اندرونی ہوا خراب ہو کر اُس ذی حیات کو ہلاک کر دے گی۔

دوسرے یہ کہ یہی ہوا تنفس کی راہ سے کھینچ کر پھیپھڑے تک پہنچتی ہے۔ اور اندرونی بخارات کو دفع کرتی ہے۔ پھیپھڑے تک جا کر اسے تفریح دیتی ہے اور وہاں سے آتے ہوئے بخارات کو اپنے ساتھ لیتی آتی ہے۔ پس اگر تھوڑی دیر کے لئے منافذ ہوا بند کر دیئے جائیں تو ذی حیات چند دقیقوں میں مر جائے گا۔ اسی لئے عقل والوں نے یہ تجویز کیا ہے کہ ہر وقت صاف ہوا میں رہنا چاہیئے۔ جو بسبب بخارات ارضیہ یا مائیہ کے غلیظ و فاسد نہ ہو گئی ہو۔ تاکہ زندگی حیوان میں خلل انداز نہ ہو سکے۔

تیسرے یہ کہ یہی ہوا جب کہ متحرک ہوتی ہے تو ابر کے پیدا ہونے کا سبب بنتی ہے۔ اور اُسے اُن مقامات تک پہنچاتی ہے۔ جہاں قدرت نے مینہ برسنے کا حکم دیا ہے۔

چوتھے یہی ہوائے متحرک پانی میں تموج پیدا کر کے اُس کے فاسد مادوں کو دفع کرتی ہے اور تازہ بہ تازہ تبدیلی سے اس میں تازگی لاتی ہے۔
پانچویں یہی ہوائے متحرک پانی میں کشتیوں کو چلاتی ہے۔ اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف لے جانے میں مدد دیتی ہے۔
چھٹے یہی ہوا متحرک ہو کر ساکن ہوا کے فسادات کو جو بخارات تنفس یا بخاراتِ زمین یا بخاراتِ آب سے پیدا ہو گئے ہیں دفع کرتی ہے۔
ساتویں یہی ہوا متحرک ہو کر درختوں کو پھلنے اور پھولنے میں مدد دیتی ہے آپ جانتے ہوں گے کہ اسی کے ذریعے سے جب درخت خرما کے نر کا پھول مادہ پر جا کر پڑتا ہے تو اس میں اچھے بڑے اور خوش مزہ پھل آتے ہیں۔
آٹھویں یہی ہوا متحرک ہو کر گرمی کے موقع پر خنکی اور خنکی کے موقع پر گرمی پیدا کرتی ہے۔
نویں یہی ہوا حامل حرارت و برودت ہوتی ہے۔ اگر ہوا نہ ہو تو حرارت شمس و برودت شب کی حامل کوئی چیز نہ ہو سکے۔
دسویں یہی ہوا آوازوں کو کانوں تک۔ خوشبوؤں کو دماغ تک پہنچاتی ہے اور اگر واسطہ درمیان میں نہ ہو تو نہ کوئی آواز سنائی دے سکتی ہے۔ اور نہ بُری یا اچھی بُو ناک تک پہنچ سکتی ہے۔
علیٰ ہذا القیاس اور بہت سے فوائد ہیں جس کی تفسیر بقدر فہم انسان زبان شریعت نے بھی کی ہے۔ اور بقدر طاقت بشریہ فلسفہ نے بھی۔ زبان شریعت سے ایک مختصر بیان اس کے متعلق عرض کیا جاتا ہے۔ جناب صادق آل محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین مفضل سے ارشاد فرماتے ہیں۔ وانبّھُک یامفضّل! علی الریح وما فیھا الست تری رکودھا اذارکدت کیف یُحدث الکرب الذی یکاد ان یاتی علی النفوس ویحرض الاصحاء وینھک المرضی ویفسد الثمار ویعفن البقول ویعقب الوباء فی الابدان والآفۃ فی الغلات ففی ھذا بیان ان ھبوب

الرّیح من تدبیر الحکیم فی صلاح الخلق" اے مفضل میں تمہیں خبر دیتا ہوں ریح کی۔ اور جو کچھ اس کے اندر حکمتیں ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ جب ہوا رک جاتی ہے۔ تو کیسی بے چینی پیدا کرتی ہے کہ جانوں کے تلف ہو جانے کا ڈر ہو جاتا ہے۔ صحیح وسالم آدمیوں کے بدن کو خراب کر دیتی ہیں۔ بیماروں کو لاغر بنا دیتی ہیں۔ پھلوں کو فاسد بقول کو متعفن کر دیتی اور اجسام میں وبا لاتی ہیں۔ اور غلوں میں آفت۔ پس اس میں صاف دلیل اس بات کی ہے کہ ہوا کا چلنا کسی حکیم کی تدبیر سے ہے۔ جس نے مصلحت خلائق کے واسطے اس کو متحرک کیا ہے۔

پھر فرماتے ہیں: فالرّیح تروّح عن الاجسام وتزجی السحاب من موضع الی موضع لیعم نفعہ حتی لستکثف فیمطر وتقضۂ حتی یستخف فیتفشّی وتلقح الشجر وتسیر السُّفن وترخی الاطعمۃ و تبرّد الماء و تشُبّ النّار وتجفف الاشیاء الندیۃ وبالجملۃ انہا تحیی کلما فی الارض فلولا الرّیح لذوی النبات ومات الحیوان وحمّت الاشیاء وفسدت۔ پس چلنے والی ہوا اجسام کو راحت پہنچاتی اور اس سے فسادات کو دفع کرتی ہے۔ ابر کو ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ہنکا لاتی ہے۔ تاکہ اس کا نفع عام ہو یہاں تک کہ جب ابر کثیف ہو جاتا ہے تو برس جاتا ہے اور اسے منتشر کر دیتی ہے یہاں تک کہ ہلکا ہو جاتا ہے تو پھیل جاتا ہے۔ اور درخت کو حمل دیتی ہے کشتیوں کو چلاتی ہے۔ کھانے کی چیزوں کو نرم کر دیتی ہے۔ پانی کو ٹھنڈا کرتی ہے۔ آگ کو مشتعل کرتی ہے۔ اور تر چیزوں کو خشک۔ خلاصہ یہ کہ ہوا تمام ان چیزوں کی زندگی کا باعث ہے جو روئے زمین پر ہیں۔ پس اگر یہ نہ ہو تو نباتات سوکھ جائیں۔ حیوانات مر جائیں۔ اور تمام اشیائے خراب اور برباد ہو جائیں۔

فوائد: پہلا فائدہ ۔ ریح ۔ یعنی ہوائے متحرک کے پیدا ہونے کے اسباب فلسفہ نے کیا بیان کئے ہیں۔ اہل طبعیات کا یہ خیال ہے کہ ریح چاروں وجہوں سے پیدا ہوتی ہے ۱ تخلخل ۲ تکاثف ۳ صعود بخارات ۴ نزول۔

تخلخل سے تو اس طرح کہ جب آفتاب کی حرارت کسی طرف ہوا پر اپنی کیفیت زیادہ ڈالتی ہے۔ اور اس وجہ سے ہوا میں انتشار پیدا ہوتا ہے کیونکہ حرارت کی شان سے مادہ منجمدہ کو پھیلانا اور اس میں تخلخل پیدا کر دینا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جب ایک کٹورہ پانی سے بھر کر آگ پر رکھا جاتا ہے۔ بشرطیکہ تھوڑا سا خالی بھی ہو۔ تو جب آگ کی حرارت پانی کو گرم کر دیتی ہے۔ تو اس کا حجم اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ پانی کٹورے کے لب سے چھلکنے لگتا ہے۔ حالاں کہ اصلی پانی لب تک نہ تھا۔ بلکہ ایک دو جَو نیچے تھا۔ تو معلوم ہوا کہ اسی حرارت نے اس میں تخلخل پیدا کر کے اسے مقدار حجم میں بڑھا دیا) تو وہ ہوائے متخلخل پھیلنا چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک وہ آگے کی ہوا کو نہ ہٹائے۔ تب تک وہ پھیل نہیں سکتی۔ اس لئے وہ اپنے آگے کی ہوا کو۔ یہاں تک کہ تمام ہوائے متقارب میں تموّج پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی تموّج ہوا کے زور سے چلنے کا باعث ہوتا ہے۔

اور تکاثف سے اس طرح کہ جب کوئی سمت ہوا کی قرب دریا یا ژالہ باری سے ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور اس ٹھنڈک کے سبب سے اس میں انجمادی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو وہ پھیلاؤ ہوا کا جو پہلے تھا اس میں کمی ہو کر انقباض پیدا ہوتا ہے۔ پس جب ایک مقدار ہوا کی سمٹی۔ تو جگہ خالی ہوئی اور جب وہ خالی ہوئی تو دوسری طرف کی ہوا جو اس سے دبی ہوئی تھی۔ خالی جگہ پا کر اس طرف چلی اور حرکت پیدا ہوئی تو اس حرکت کے پیدا ہونے سے جو ہوا میں تموّج ہوتا ہے وہی باعث ہبوب ریاح کا ہوتا ہے۔

نزول سے اس طرح کہ پانی اور زمین کے بخارات اوپر کو جاتے ہیں اور کُرہ زمہریر تک پہنچ کر اس کی خنکی کے سبب سے ان کی حرارت زائل ہو جاتی ہے اور اُن میں غلظت اور ثقل پیدا ہوتا ہے۔ وہی اس امر کا باعث ہوتا ہے کہ زمین کی طرف مائل ہوں۔ پس اس سبب سے ہوا میں تموّج پیدا ہو کر حدوث

ریح ہوتا ہے۔

اور صعود سے اس طرح کہ بخارات آبی و زمینی بالائے ہوا متصاعد ہو کر لطیف حصہ ان کا تو فوراً ہی ہوا بن جاتا ہے اور غلیظ حصہ ابر۔ تو یہ ہوا اور ابر جو ان بخارات سے پیدا ہوئے ہیں۔ آپس میں ٹکراتے ہیں اور اس سے حدوث ریح ہوتا ہے۔ قال فی حکمۃ العین" وان انکسر حر الدخان الصاعد الی الطبقۃ الباردۃ ببرودتھا طلب النزول للتقل الحاصل لہ بسبب البرد فیتموج بہ الھوآء فیحدث الریح وان لم ینکسر صعد الی کرۃ النار فیرد الحرکۃ الدوریۃ فیتموج بہ الھوآء فیحدث الریح ایضا وقد یحدث الریح من تخلخل الھوآء واندفاعہ من جانب الی آخر والدوابع انما یحدث من التقآء ریحین قویین مختلفی الجھۃ فیلتقیان فتستدیران"

دوسرا فائدہ: متحرک ہوا کے چار نام ہیں۔ اور ہر ایک سمت کی ہوا کا نام مختلف ہے۔ جو ہوا قطب شمالی کی طرف سے آتی ہے اس کو شمال کہتے ہیں اور جو اس کے مقابل سے آتی ہے۔ اس کو جنوب۔ اور جو مشرق سے آتی ہے اس کو صبا اور قبول کہتے ہیں۔ اور جو مغرب کی طرف سے آتی ہے اس کو دبور۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے۔ الصبا ریح مھبھا من مطلع الثریا الی بنات النعش صبا وہ ہوا ہے جو ثریا کے مطلع سے بنات النعش تک چلتی ہے۔ والشمال بالفتح ویکسر الریح التی تھب من قبل الحجر او ما استقبلک عن یمینک وانت مستقبل والصحیح انہ ما مھبہ بین مطلع الشمس وبنات النعش او من مطلع الشمس الی مسقط النسر الطائر ویکون اسماء وصفۃ ولا تکاد تھب لیلاً۔ شمال بفتح شین اور بعض بالکسر بھی پڑھتے ہیں۔ وہ ہوا ہے۔ جو حجر اسماعیل کی طرف سے چلتی ہے۔ یا مطلع آفتاب سے مغرب نسر طائر (چند ستاروں کا نام ہے جو اڑتے ہوئے گدھ کی صورت میں گوشہ شمال و مشرق پر دکھائی دیتے ہیں) تک چلتی ہے۔ والجنوب ریح تخالف الشمال مھبھا من مطلع سھیل الی مطلع

الثریا۔ اور جنوب وہ ہوا ہے جو ہوائے شمال کے مخالف ہے۔ یہ ہوا مطلع سہیل یعنی سے لے کر مطلع ثریا تک چلتی ہے۔ اور دبور کو لکھا ہے۔ ھو ریح تقابل الصبا۔ صبا کے مقابل سے جو ہوا چلتی ہے۔ وہ دبور کہی جاتی ہے۔

صاحب مجمع البحرین تحریر فرماتے ہیں۔ وعن بعض اہل التحقیق ان الصبا محلھا مابین مطلع الشمس والجدی فی الاعتدال والشمال محلھا من الجدی الی مغرب الشمس فی الاعتدال والدبور من سہیل الی المغرب والجنوب من مطلع الشمس الیہ۔ یعنی بعض اہل تحقیق سے منقول ہے کہ صبا کی رفتار درمیان مشرق وجدی سے ہوتی ہے۔ زمانہ اعتدال میں اور شمال کی رفتار جدی سے مغرب شمس کی طرف ہوتی ہے اور دبور کی رفتار سہیل سے مغرب تک اور جنوب کی مطلع شمس سے سہیل تک ہے۔ اسی کو کسی نے نظم بھی کر دیا ہے۔

مھب الصبا من مطلع الشمس واصل الی الجدی والشمال حتی مغیبھا
وبین سہیل والغروب تفردت دبور ومطلعھا الیہ جنوبھا

کچھ ہوائیں نکبا بھی کہی جاتی ہیں۔ اُن کی چار قسمیں ہیں۔ ۱۔ ا ثیب جو درمیان صبا و جنوب سے چلے ۲۔ صابیہ جسے نکیبا بھی کہتے ہیں۔ جو درمیان صبا و شمال کے چلے ۳۔ جربیا جو شمال و دبور کے درمیان چلے ۴۔ ھیف جو درمیان جنوب اور دبور کے چلے اور مطلق نکبا اُس ہوا کو کہتے ہیں۔ اور دو ہواؤں کے درمیان ہے۔ اور بعضوں نے تخصیص بھی کی ہے کہ جو درمیان صبا و شمال کے چلے۔ وہی نکبا ہے لیکن اول اصح ہے

ہوائے جنوب کو تعاقی بھی کہتے ہیں اور شمال کو محوۃ۔ مسعا اور نسعا بھی۔ عرب ہوائے جنوب کو لاقح کہتے ہیں۔ گویا ان کا خیال ہے کہ اسی کے ذریعے خرما کے درخت میں پھل آتے ہیں۔ اور ہوائے شمال کو حائل (جس سے پھل نہ پیدا ہوں) یہ بھی ان کا خیال ہے۔ کہ ہوائے دبور ابر کو اٹھاتی اور اسے چلاتی ہے۔ اور جب ابر بلند ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنا عمل چھوڑ دیتی ہے اور پھر ہوائے صبا

آجاتی اور ابر کو تہ بہ تہ کر کے ایک پختہ مسطح بنا دیتی ہے۔ پھر ہوائے جنوب اسے پھیلاتی ہے۔ مگر ہوائے شمال جب چلتی ہے تو ابر کو پراگندہ کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ ہوائے شمال کو نہایت ناپسند جانتے اور منحوس سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے برودت پیدا ہوتی اور ابر زائل ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر مکروہ چیز کو مشول کہنے لگے۔

ان ہواؤں کے بحیثیت مختلف اور بھی نام ہیں۔ مثلاً ریح۔ صرصر۔ سموم اور قاصف وغیرہ ریح عقیم ہوائے عذاب کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اس سے نہ ارحام میں لقاح ہوتا ہے۔ اور نہ نباتات میں۔ صاحب مجمع البحرین تحریر فرماتے ہیں۔ وھی ریح تخرج من تحت الارض السابعۃ۔ یہ وہ ہوا ہے جو زمین کے ساتویں طبقے سے نکلتی ہے۔ جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ لم یخرج منہا شی قط الا علی قوم عاد حین غضب اللہ علیہم فامر الجن ان یخرجوا منہا سعۃ الخاتم فعصفت علی الخزنۃ فخرج منہا بمقدار منخر الثور تغیظا منہا علی قوم عاد فاھلکتھم۔ اس ہوا میں سے کبھی کوئی حصہ باہر نہیں آیا۔ مگر قوم عاد پر جب کہ خدا تعالیٰ اُن پر غضبناک ہوا تو جنوں کو حکم دیا کہ اس میں سے بقدر حلقہ انگشتری کے نکالیں مگر ہوا نے اپنے خزانہ داروں پر زور کیا اور بقدر منخر گاؤ نر کے نکلی۔ کیونکہ قوم عاد پر اس کو غیظ و غضب تھا اور ان کو فنا و ہلاک کر دیا۔

اس کلام میں اشارہ ہے کلام خدا تعالیٰ کی طرف جو فرماتا ہے وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْھِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ۔ اور سموم اس ہوا کو کہتے ہیں جو گرم ہو۔ اکثر دن میں چلتی ہے اور کبھی رات میں صرصر اس کے مقابلہ میں ہوائے سرد و تند کو کہتے ہیں۔ وَاَمَّا عَادٌ فَاُھْلِکُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَۃٍ[1]۔ اور قاصف اس اعتبار سے کہتے

---

[1] لیکن قوم عاد پس وہ ہلاک کی گئی ہوائے صرصر تند سے۔ ۱۲

ہیں کہ جب اتنی تند چلے کہ درختوں کو توڑ دے مکانوں کو ڈھا دے۔ اور عاصف محض باعتبار شدت رفتار (ولسلیمان الریح عاصفۃً ۔ ہم نے سلیمانؑ کے تابع کیا تھا تیز چلنے والی ہوا کو)

تیسرا فائدہ: اطباء نے بیان کیا ہے کہ ہوائے شمالی۔ اعصاب کو قوت دیتی اور انہیں سخت کرتی ہے۔ مسامات کو بند کر دیتی ہے۔ ہضم کو قوی کرتی ہے اور ادرار بول و جریان بطن کو روکتی ہے۔ اور ہوائے جنوبی مُرخی[1] قوت اور مفتح مسامات اور مسوّر اختلاط و محرک مواد ہے۔ اس سے حواس میں ثقل پیدا ہوتا ہے۔ زخموں کو اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ بدن میں سستی و ضعف پیدا ہوتا ہے۔ نیند زیادہ آتی ہے تپ و نقرس اس سے حادث ہوتا ہے اور زخموں میں خارش۔ ہوائے مشرقی اگر آخر شب اور اول روز میں چلے تو آفتاب کی حرارت کی تعدیل کرتی ہے۔ اور اُن ہواؤں سے جو سختی یا مثلاً رطوبت پیدا ہوئی ہے اسے کم کر دیتی ہے اور اگر آخر روز اور اول شب میں چلے تو اس سے برخلاف اس سے نتیجے ظاہر ہوں گے۔ ہوائے مغربی۔ اگر آخر شب اور اول روز میں چلے تو کثیف و غلیظ ہو گی کیوں کہ اس میں آفتاب کی حرارت نے کچھ عمل نہیں کیا ہے اور اگر آخر روز اور اول شب میں چلے تو لطیف ہو گی"۔

یہ کم از کم وہ بیان ہے جو ہوا کے متعلق کیا جا سکا۔ اور اس قدر ایک ایسے شخص کو جو آیاتِ الٰہیہ سے نصیحت و عبرت حاصل کرنی چاہے کافی ہے۔

واللہ الھادی الی سواء السبیل۔

چوتھا فائدہ: ہوا کے متعلق احادیث میں جو کچھ ذکر ہے۔ ان میں سے مختصراً یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ کافی سے صاحب بحار نے نقل فرمایا ہے کہ ابو بصیر نے جناب امام ابو جعفر علیہ السلام کی خدمت میں ہوائے شمال و جنوب و صبا و دبور کا سوال کیا۔ اور عرض کی کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہوائے شمال جنت سے چلتی ہے۔ اور

---

[1] مرخی بمعنی سست کرنے والی ۱۲۔

جنوب دوزخ ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی کئی فوجیں ہوا کی ہیں جن سے عذاب نازل کرتا ہے۔ جن لوگوں پر چاہتا ہے اپنے نافرمانوں میں سے۔ اور ہر ہوا پر ایک فرشتہ مؤکل ہے۔ پس جب خدا تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ کسی قوم پر کسی قسم کا عذاب کرے تو اس فرشتہ مؤکل کو حکم دیتا ہے کہ اسی قسم کی ہوا ان کی طرف روانہ کرے۔ جس قسم کی ہوا سے اُن لوگوں پر عذاب نازل کرنا چاہتا ہے پس وُہ ہوا اس طرح جوش میں آتی ہے جیسے شیر غضب ناک۔ کیا تم نے خدا تعالیٰ کے اس قول کو نہیں سنا ہے۔ کَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُسْتَمِرٍّ۔ اور ایک مقام پر فرماتا ہے۔ الرِّيحَ الْعَقِيمَ۔ اور فرمایا ہے۔ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ اور فرمایا ہے۔ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ۔ وغیر ذالک۔ جن کا ذکر خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے اور جن سے اپنے نافرمانوں کو معذب کیا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا خدا تعالیٰ نے چند ہوائیں رحمت کی بھی پیدا کی ہیں۔ جو درختوں کو بار آور کرتی ہیں۔ اور علاوہ ان کے بھی ہیں۔ جن کو اپنی رحمت کے سامنے چلاتا ہے۔ اور منجملہ اُن کے وُہ ہے جو ابر کو اٹھاتی ہے۔ اور منجملہ اُن کے وہ ہوائیں ہیں جو ابر کو آسمان و زمین کے درمیان ٹھیرائے رہتی ہیں۔ اور منجملہ اُن کے وہ ہوائیں ہیں جو ابر کو دبا کر مینہ برساتی ہیں۔ اور منجملہ اُن کے وُہ ہیں جو ابر کو پراگندہ کر دیتی ہیں۔ اور منجملہ اُن کے وہ ہوائیں ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے اور شمار کیا ہے۔ لیکن باقی رہیں ہوا ہائے۔ شمال و جنوب و صبا و دبور تو یہ ان فرشتوں کے نام ہیں جو ان پر مؤکل ہیں۔ پس جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہوائے شمال چلے۔ تو اس فرشتہ کو حکم دیتا ہے جس کا نام شمال ہے۔ پس وہ خانہ کعبہ پر اترتا ہے اور رکن شامی پر کھڑا ہوتا ہے اور اپنے بازوں کو مارتا ہے تو ہوائے شمال پھیلتی ہے۔ جہاں جہاں خدا تعالیٰ چاہتا ہے خشکی میں ہو یا تری میں۔ اور جب چاہتا ہے کہ ہوائے جنوب چلے۔ تو اس فرشتہ

کو حکم دیتا ہے۔ جس کا نام جنوب ہے۔ پس وہ خانہ کعبہ پر اترتا ہے اور رکن شامی پر کھڑا ہوتا ہے اور اپنے بازوؤں کو مارتا ہے (یا ان کو حرکت دیتا ہے) تو ہوائے جنوب بر و بحر میں پھیلتی ہے۔ جہاں جہاں خدا تعالیٰ چاہتا ہے۔ غرض اسی طرح ہوائے صبا اور ہوائے دبور کے چلنے کا ذکر بتایا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم نے اس کا قول نہیں سنا ریح الشمال و ریح الجنوب و ریح الدبور و ریح الصبا کہ یہ سب منسوب و مضاف ہیں اُن فرشتوں کی طرف جو ان پر موکل ہیں (یعنی ریح الشمال وغیرہ کی ترکیب ترکیب اضافی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ شمال کی ہوا یعنی وہ ہوا جو شمال فرشتے کی تحریک سے پیدا ہوتی ہے۔)

کتاب علل الشرائع میں مروی ہے کہ ریح عقیم اس زمین کے نیچے ہے جس پر ہمارا قیام ہے۔ ستر ہزار لوہے کے لگاموں سے روکی ہوئی ہے (یعنی نہایت سختی کے ساتھ اس کو خدا تعالیٰ نے روک رکھا ہے اور ہر باگ پر ستر ہزار فرشتے مقرر کئے ہیں۔ پس جب کہ اسے قوم عاد پر مسلّط کیا تو اس ہوا نے اپنے خزانہ داروں سے اجازت لی کہ بقدر منخر گاؤ نر کے نکلے۔ اور اگر پروردگار عالم اسے اجازت دے دیتا تو روئے زمین پر کسی چیز کو بغیر جلائے نہ چھوڑتی۔ پس پروردگار عالم نے خزانہ داران ہوا کو حکم دیا کہ اس ہوا میں سے بقدر سوراخ انگشتری کے نکالیں۔ تو اسی قدر ہوا سے قوم عاد ہلاک ہوئی۔ اور اسی ہوا سے خدا تعالیٰ پہاڑوں۔ ٹیلوں۔ بلندیوں۔ شہروں اور عمارتوں کو قیامت کے دن ریزہ ریزہ کرے گا۔ یہی مراد ہے قول خدا تعالیٰ سے۔ ویسئلونک عن الجبال فقل ینسفھا ربی نسفًا فیذرھا قاعًا صفصفًا لا تری فیھا عوجًا ولا امتًا۔ اور قاع سے مراد وہ زمین ہے جس میں گھاس نہ ہو۔ اور صفصف وہ زمین ہے جس میں کجی نہ ہو اور امت سے مراد بلند ہے! اس ہوا کو عقیم اس وجہ سے کہا گیا کہ یہ عذاب سے تو حامل ہے۔ اور رحمت سے عقیم (بانجھ ہے یعنی اس میں رحمت بالکل نہیں ہے) مثل عقیم ہونے رحم کے جس سے کچھ نہ پیدا ہو۔

نیز علل الشرائع میں مذکور ہے کہ جناب صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ سایہ (متحرک ہوا) رکن شامی کے نیچے بند ہے۔ پس جب چاہتا ہے پروردگا عالم کہ اس میں سے کچھ نکالے۔ جنوب یا شمال یا صبا یا دبور کی صورت تو ان اطراف میں اسے خارج کرتا ہے۔ اور اس کی علامت (کہ یہ ہوا رکن شامی کے نیچے بند ہے) یہ ہے کہ گرمی جاڑا رات دن تم دیکھو گے کہ رکن شامی متحرک رہتا ہے (بحار السماء والعالم)

ابن عمر سے مروی ہے کہ ہوائیں آٹھ ہیں۔ چار اُن میں سے رحمت کی ہوائیں ہیں۔ اور چار عذاب کی۔ لیکن رحمت کی ہوائیں تو ناشرات۔ مبشرات۔ مرسلات اور ذاریات ہیں۔ اور عذاب کی ہوائیں۔ عقیم۔ صرصر۔ جو خشکی پر چلتی ہے اور عاصف و قاصف جو دریاؤں میں چلتی ہیں۔ (در منثور سیوطی)

جناب رسولؐ خدا سے مروی ہے کہ تم لوگ ہوا کو گالیاں نہ دو۔ کیوں کہ وہ حکم خدا سے چلتی ہے۔ (اس کا خود کوئی قصور نہیں) کیوں کہ جو کوئی کسی پر لعنت کرتا ہے۔ جو اس کا مستحق نہیں۔ تو وہ لعنت اسی لعنت کرنے والے پر لوٹ آتی ہے۔ نیز ابن عباس سے مروی ہے کہ جب کبھی ہوا چلتی تھی تو رسولؐ خدا گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتے تھے اور یہ دعا کرنے لگتے تھے۔ کہ خدایا اس ہوا کو رحمت کی ہوا قرار دینا۔ عذاب کی ہوا نہ بنانا۔ خدایا اس کو ریاح بنانا۔ ریح نہ بنانا۔ (کیونکہ ریح عقیم نے قوم عاد کو تباہ کیا تھا)۔ (در منثور سیوطی)

جناب رسالتمآبؐ نے مرسلات ذاریات وغیرہ کی تشریح بھی فرمادی ہے کہ مرسلات تو ابر کو اٹھاتی ہے اور مبشرات ابر کو بارور کرتی ہے (یعنی اس میں یہ قابلیت پیدا کر دیتی ہے کہ اس سے مینہ برس سکے) اور ذاریات کا یہ کام ہے کہ ابر کو اٹھاتی ہے کہ اس سے اس طرح مینہ برسے۔ جیسے دودھ دینے والی اونٹنی سے دودھ نکلتا ہے اور ناشرات کا یہ کام ہے کہ جو بعد مینہ برسانے کے ابر کو منتشر کر دیتی ہے (در منثور)

وجود صانع حکیم کی والسحاب المسخر بین السمآء والارض

آٹھویں نشانی: یعنی وہ ابر ہے جو درمیان آسمان و زمین کے بحکم خدا فضا میں ہوا پہ قائم رہتا ہے۔

واقعی اس کا سبب خلقت۔ اور خود اس کی ساخت و حدوث۔ اور پھر اس کا استحالہ۔ اور اس سے مینہ برسنا۔ اور باوجود اتنی مقدار پانی کی لئے ہوئے ہونے کے ہوا میں قائم رہنا سوائے اس کے کہ کسی قادرِ مطلق کی قدرت کی طرف حوالہ کیا جائے کوئی چارہ نہیں ہے۔

اگر صرف اسی اہتمام کو ملاحظہ فرمائیے کہ ایک ابر کے واسطے کیا کیا امُور پہلے سے قائم کئے گئے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً یہ کسی بڑے مدبّر کی تدبیر اور کسی عظیم الشان حکیم کی حکمت ہے۔ مثلاً ۱ یہ دریاؤں، سمندروں۔ پہاڑوں کی غاروں میں پانی کا جمع کرنا ۲ زمین کے اندر حرارت پیدا کرنی جو بخارات کو اُبھار سکے ۳ آفتاب کو پیدا کرکے اس کی حرارت کو پانی پر ڈالنا۔ جس سے بخارات اُٹھ سکیں ۴ ہوا کو پیدا کرنا۔ جو بخارات کی متحمل ہو سکے ۵ متحرک ہواؤں کا پیدا کرنا جو ان بخارات کو ایک طرف سے دوسری طرف لے جا سکیں ۶ تھوڑی بلندی پر جا کر ہوا کو نہایت سرد بنا دینا کہ (جوں ہی) یہ بخارات دادخنہ وہاں پہنچیں بستہ ہو کر قطعات سحاب بن سکیں۔ اور اس سے اوپر نہ چلے جائیں۔ کہ پھر مینہ برسنے میں دقت واقع ہو۔ پھر ہواؤں کو اس پر مسلّط کیا کہ اس میں حرکت پیدا کریں۔ تاکہ مختلف مقامات پر پھیل جائے۔ اور حرکت سے حرارت پیدا ہو اور وہ پانی کی صورت میں مستحیل کر سکے اور بلندی سے مینہ برس کر خلق کو نفع تام اور فیض عام پہنچا سکے!! کیا کوئی شخص ان امور پر غور کرنے کے بعد کہہ سکتا ہے کہ ابر بغیر حکم خدا تعالیٰ اور بدون حکمت خدا تعالیٰ پیدا ہُوا ہے۔ آخر یہ کون سوچ سکتا تھا کہ اگر یوں تدبیریں کام میں لائی جائیں گی تو اس صورت کی ایک شے بن سکے گی۔ اور اس صورت میں اس کا استحالہ ہو سکے گا اور اس طرح مخلوقات

کو فائدہ پہنچ سکے گا۔ کیا ان چیزوں کی لاشعور بے طبیعتیں ان معانی لطیفہ کا ادراک کر سکتی تھیں یا مادہ کو ایسا غور حاصل ہوا تھا؟ استغفر اللہ ربی واتوب الیہ۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ یہ حکمتیں جو نہایت باقاعدہ طریقے سے قائم کی گئی ہیں۔ بغیر تدبیر و تقدیر مدبّر و مقدّر اقدر القادرین ظہور میں آسکتی ہیں۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ پس بے شک آسمانوں اور زمینوں کا موجود ہونا اور ان میں تغیّرات و احتمال زیادتی و نقصان کا ہونا دلیل ہے اس بات کی کہ یہ حادث ہیں۔ اور ان کا حادث کرنے والا کوئی بڑا توانا و قادر ہے اور نیز ان کا استحکام و اتقان انتظام و اتساق اور ایک نہج مستقیم پر برابر ان کا قائم رہنا دلیل ہے اس امر کی کہ ان کا خالق عالم و حکیم بھی ہے۔ اور رات اور دن کا یکے بعد دیگرے آنا جانا اور ایک ہی صورت سے ان کا قائم رہنا۔ اور فصول کے اختلاف سے ان ان میں بقدر ضرورت کمی بیشی کا ہونا۔ آفتاب و ماہتاب کے مجاری سے اُن کا متعلق ہونا دلیل ہے اس امر کی کہ ان کا خالق بڑا عالم اور بڑا مدبّر ہے جس سے نہ کبھی بھول ہوتی ہے۔ نہ کبھی چوک۔ کیوں کہ یہ افعال اس استحکام و انتظام و ترتیب سے قائم کیے گئے ہیں کہ جن میں کسی قسم سے کوئی خلل ڈالنے والا خلل پیدا نہیں کر سکتا۔ اور کشتیوں کا پانی پر چلنا۔ پانی کا اس قدر لطیف و سائل ہونا جس پر اُس کی روانی ممکن ہو۔ ہواؤں کا اس کے چلانے پر مسخر ہونا کہ اگر پانی کی روانی کشتی کی رفتار کے مخالف بھی ہو۔ تب بھی یہ ہوا اسے منزلِ مقصود کی طرف لے جاسکے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا موجد و معلم و خالق بڑا صاحب انعام و فضل بھی ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی آسائش کے واسطے یہ سامان مہیا کیے۔ نیز پانی کا بلندی سے قطرہ قطرہ ہو کے برسنا یکبارگی سیل کی طرح نہ آنا جس سے شہروں اور آبادیوں اور زراعتوں اور باغوں کو نقصان پہنچے۔ پھر اس کا فضا میں قائم رہنا۔ باوجودیکہ پانی کی طبیعت اور فطرت اصلیہ زمین ہی پر رہنے کو چاہتی ہے اور اس کا اپنے مرکز اصلی سے بلند ہو کر غیر مرکز میں ٹھیرا رہنا صرف اوقات معینہ پر

برسنا۔ غیر وقت میں نہ برسنا اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا موجد و مخترع تمام چیزوں پر قادر و توانا ہے۔ جو چاہے اور جس وقت چاہے کر سکتا ہے۔

زمین کا زندہ ہونا جس سے پھلوں، پھولوں، سبزوں، زراعتوں اور انواع و اقسام کے اشجار و نباتات کا ظاہر ہونا محسوس و معلوم ہوتا ہے۔ جن سے مخلوقات سفلیہ کی غذا ہو سکے۔ جو حیوانات کے لئے علف بن سکیں۔ دواؤں میں کام آسکیں اور جو ہر صورت میں ایک نئی خاصیت نیا نفع نیا اثر دکھلا سکیں۔ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ وہ بڑا بدیع الحکمت اور عجیب القدرت ہے۔

پھر حیوانات کا پیدا ہونا ان کی قسموں کا لامتناہی ہونا۔ ان کی صورتوں کا بے شمار ہونا۔ اُن کی ترکیبوں اور ساختوں کا عجیب و غریب ہونا ان کے فائدوں کا بے حصر و احصا ہونا۔ ان کے خواص کا بے تعداد ہونا۔ ان کے اعضا و جوارح و اعصاب و عروق و عظام و لحوم و شحوم کا عجائب حکمت و غرائب منفعت پر مشتمل ہونا صاف دلیل ہے۔ اس امر کی کہ وہ بدیع الفطرت غریب الحکمت عظیم القدرت اور جسیم النعمت ہے۔

ہواؤں کا متحرک ہونا۔ مختلف اطراف سے مختلف فوائد کے لئے ان کا چلنا کبھی گرم ہونا کبھی سرد، کبھی خشک ہونا، کبھی تر۔ کبھی آہستہ چلنا۔ کبھی زور سے۔ کبھی عقیم ہونا۔ اور کبھی لاقح۔ صریح اس امر کی برہان ہے کہ ایسے افعال سوائے واحد ازلی اور ابدی اقدر القادرین و باری العالمین کے کوئی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر تمام عالم بھی مجتمع ہو کر یہ کوشش کرے کہ ہم ان میں سے ایک چیز کے مثل بھی بنا سکیں یا وجود میں لا سکیں۔ تو قطعاً محال اور یقیناً ناممکن ہے۔ آج کوئی ایسا ہی کر کے تو دکھا دے کہ جو ہوا جنوب سے چلتی ہے یا شمال سے۔ مشرق سے چلتی ہے یا مغرب سے اس میں تبدیل کر دے یا روک دے۔

ابر کا فضا میں مسخر رہنا۔ اور بوقت ضرورت اس کا پانی کی صورت میں مستحیل ہو جانا۔ اور غیر صورت میں اس کا متلاشی و پراگندہ و فنا ہو جانا اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اس کا خالق بے شبہ و بے نظیر ہے کیونکہ جسم ثقیل کا بے علاقہ و

دبے دعا مہوا میں ٹھیرانا ممکنات عالم میں کسی کے امکان میں نہیں۔

پس بے شبہ وہی سبوح وقدوس وحکیم وعلیم وقدیر وخبیر ومنعم ومتفضل و صانع وبدیع وحیّ قیوم ہے۔ جو کسی امر سے کسی چیز سے عاجز نہیں۔ کوئی شے اس پر مخفی نہیں۔ کوئی حکمت اُس سے چھوٹی نہیں۔ بے شک وہی سمیع وبصیر ہے پس اس کے سوا کوئی بھی مستحق عبادت نہیں۔ اشهد ان لا اله الا هو الخالق البارئ المصور له الاسماء الحسنیٰ والامثال العُلیا۔

چونکہ یہ آیت شریفہ جس کی کچھ تھوڑی سی تشریح اس وقت کی جا سکی۔ باری تعالیٰ کی عجیب قدرت وحکمت وعلم وانعام کو ظاہر کر رہی ہے۔ اس لئے جناب سرور کائنات اشرف المخلوقات نتیجہ خلقت عالم وعالمیان ثمرہ فطرت جہان جہانیان خیر البشر حبیب اللہ الاکبر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تلاوت کے وقت ارشاد فرمایا ویل لمن لاکھا بین لحیتہ۔ وائے ہے اس پر جو اس آیت کو اپنی دونوں ڈاڑھوں کے درمیان چھپائے۔ یعنی زبان سے تو پڑھے۔ مگر اس کے معانی ومطالب وحقائق ودقائق پر غور نہ کرے۔

یہ ایک نہایت مختصر بیان ہے جو اس آیت کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ کما حقہٗ تو کیا اپنی خواہش کے موافق بھی اس کی تفصیل نہ کی جا سکی۔ باوجودیکہ خیال یہ تھا کہ اس آیت کو اچھی طرح سے مفصل بیان کیا جائے مگر سبب اس کا صرف یہ ہے کہ اگر اسی آیت کو زیادہ بسط کر دیا جائے تو اور آیتیں جو لکھنی ہیں۔ ان کا موقع ہاتھ سے جاتا رہے اور ان کی تفصیل نہ ہو سکے گی۔

اس سے یہ مقصود نہیں کہ مجھ میں اتنی طاقت یا علم ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام کی مفصل تفسیر لکھ سکوں۔ نہیں نہیں۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ یہ کلام ہی اس قسم کا ہے کہ بعید تفصیل وتشریح وتبیین وتفسیر کو چاہتا۔ گو سوائے آئمہ طاہرین علیہم السلام کے جو عرفائے حقیقی اور علمائے واقعی تھے۔ کوئی شخص اس سے عہدہ

برآ نہیں ہو سکتا۔ البتہ وہ شخص اس فرض سے ضرور سبکدوش ہو سکتا ہے۔ جس نے یہ فرمایا ہو۔ کہ اگر میں چاہوں تو صرف سورۂ حمد کی تفسیر سے ستر اونٹ بار کر سکتا ہوں۔ اور جسے رسولؐ خدا نے خود فرمایا ہے۔ انا مدینۃ العلم و علی بابھا۔ اور جس کی نسبت خود پروردگار عالم کا ارشاد ہوا۔ وکل شیئٍ احصیناہُ فی امام مبین اور جو کلام الٰہی کے تمام ناسخ و منسوخ و مجمل و مفصل و خاص و عام و محکم و متشابہ و مطلق و مقید و مرسل و محدود و رخص و عزائم و فواصل و قواطع و اوامر و نواہی و زواجر و مواعید و حرام و حلال و ترغیب و ترہیب و قصص و احکام و عبر و اخلاق و نکات و دقائق و حقائق و رقائق و غوامض و ظواہر اچھی طرح جانتا ہو۔ و ان ھم الا علی بن ابی طالب والباقون من اھل بیت الرسول فصلوات اللہ وسلامہ علیھم مادام للنجوم طلوع و افول۔

وجود صانع کی آٹھ نشانیاں

سورۂ رعد رکوع ۱۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝ وَھُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْھَا رَوَاسِیَ وَاَنْھٰرًا وَمِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْھَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝ وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَھَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (سورۂ رعد۔ رکوع ۱)

یہ مجموعاً تین آیات ہیں جن میں وہ آیات و علامات اور نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ جو وجود صانع عالم اور اس کی قدرت، حکمت، علم، ادراک اور کمال تدبیر و تقدیر کو ثابت کرتی ہیں ان تین آیتوں میں آٹھ نشانیاں ہیں۔ ایک آسمان

کا بغیر عمود کے بلند کرنا۔ دوسرے آفتاب و ماہتاب کا پیدا کرنا اور ان کا حرکت محدودہ معینہ کے موافق چلانا۔ تیسرے زمین کی خلقت۔ چوتھے پہاڑوں کا پیدا کرنا پانچویں نہروں کا پیدا کرنا۔ چھٹے ہر قسم کے پھلوں کو پیدا کرنا اور ان کو زوجین اثنین قرار دینا۔ ساتویں شب و روز کو پیدا کرنا۔ اور رات کو دن پر ڈھانک دینا۔ آٹھویں زمین میں قطعات متجاورات کا پیدا کرنا۔ اور اگر جنات اعناب و زروع و نخیل صنوان وغیر صنوان کو بھی لیا جائے اور اُن کا ایک پانی سے سیراب ہونا بھی ان نشانیوں میں شمار کیا جائے۔ تو چھ نشانیاں اور ہوتی ہیں۔ جن کا مجموعہ چودہ ہوتا ہے مطلب یہ ہوگا کہ یہ چودہ چیزیں ایسی ہیں جو وجود قدرت و حکمت و علم و کمال و تدبیر خدا تعالیٰ پر گواہ ہیں۔ پس جب کہ کسی امر کے ثبوت کے لئے دو گواہ کافی سمجھے جاتے ہوں تو اس امر کے ثبوت کے واسطے چودہ گواہ کیوں نہ کافی سمجھے جائیں۔

اس آیت کی مختصر تشریح چند بیانوں کے ذیل میں ادا کی جاتی ہے۔

پہلا بیان: تحقیق الفاظ۔ عَمَد اسم جمع ہے بمعنی ستونہا۔ اور واحد ان کا عمود اور عماد ہے۔ جن کی جمع عُمُد آتی ہے۔ اِستویٰ کے معنی کئی ہیں: ۱ اعتدال ۲ بلغ اشدہٗ۔ یا بلغ اربعین سنۃً کے ہیں۔ یعنی پختگی تک پہنچایا چالیس برس کے سن کو پہنچا۔ چالیس برس والے آدمی کو بھی مستوی کہتے ہیں۔ جو اٹھارہ برس سے لے کر تیس برس تک کے سن کو کہتے ہیں ۳ اگر آسمان کے متعلق استعمال کیا جائے۔ مثلاً استویٰ الی السماء تو چڑھنے یا قصد کرنے یا متوجہ ہونے کے معنی ہوں گے (دیکھو قاموس اللغت) نیز بولتے ہیں استویٰ بشر علی العراق تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ استولی من غیر سیف ودم یھریقہ۔ یعنی بغیر شمشیر کشی اور خونریزی کے فلاں شخص عراق پر غالب آگیا (دیکھو مجمع البحرین) اجل بمعنی مدت و وقت معین۔ آیتہ کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ منجملہ اُن کے قرآن مجید کا وہ کلام متصل ہے جو ایک مقام سے شروع ہو کر دوسرے مقام پر منتہی ہوتا ہے۔ مثلاً قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ط یہ ایک آیت ہے۔ اسی معنی میں

خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ واذا تلیت علیھم آیاتہ زادتھم ایمانًا، (جب تلاوت کی جاتی ہیں اُن کے سامنے آیتیں تو ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں) یا مثلاً منہ اٰیات محکمات و اخر متشابھات (یعنی قرآن مجید کی کچھ آیتیں محکم ہیں اور کچھ متشابہ) اور عبرت کے معنی میں آیا ہے۔ جیسے خدا تعالیٰ فرماتا ہے ولقد ترکنا ھا آیۃ فھل من مدکر۔ (ہم نے کشتی نوح کو عبرت بنا کر چھوڑا تھا۔ پس آیا کوئی یاد کنندہ ہے؟) معجزے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ جیسے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وان یروا اٰیۃً یعرضوا ویقولوا سحر مستمر (جب وہ معجزہ دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ مستمر جادو ہے) اور ولقد آتینا موسیٰ تسع اٰیاتٍ بیّنات۔ بے شک ہم نے موسیٰ کو نو معجزے کھلے کھلے دیئے تھے" عذاب کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے وما نرسل بالاٰیات الا تخویفا، ہم عذاب نہیں بھیجتے مگر ڈرانے کے واسطے۔ نشانی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسے حضرت زکریا کے قصہ میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ قال ربّ اجعل لی اٰیۃ۔ زکریا نے کہا اے میرے پروردگار مجھے کوئی نشانی دے۔ قال اٰیتک ان لا تکلم الناس ثلٰث لیالٍ سویا۔ خدا نے کہا کہ تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم تین راتوں لوگوں سے نہ بولو دلیل کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے ان فی ذٰلک لاٰیات لقوم یعقلون۔ رواسی جمع راسیہ یعنی گڑھے ہوئے مستحکم غشی ڈھانک لینا۔ صنوان۔ ایک ہی جڑ سے کئی درخت نکلے ہوئے۔ درخت خرما جس کے گرداگرد اور بھی درخت ہوں۔ اور غیر صنوان اسی کا مقابل ہے۔

دوسرا بیان: باعتبار معنی اللہ الذی رفع السمٰوٰت بغیر عمدٍ ترونھا معبود برحق وُہ ہے جس نے بلند کیا آسمانوں کو بغیر ایسے عمودوں کے جنہیں تم دیکھتے ہو ثم استویٰ علی العرش پھر وہ غالب ہوا عرش پر وسخر الشمس والقمر کل یجری لاجلٍ مُسمّی اور مطیع بنایا سورج اور چاند کو ہر ایک چلتا رہے گا وقت متعین تک یُدبّر الامر۔ وہ معبود کام کی تدبیر کرتا ہے

یفصل الآیات۔ اور دلیلوں کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ لعلکم بلقاء ربکم توقنون۔ تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات یعنی حشر و نشر کا یقین کرو۔ وھو الذی مدّ الارض۔ وہی معبود وُہ ہے جس نے زمین کو پھیلایا۔ و جعل فیھا رواسی و انھارًا۔ اور اس میں گڑے ہوئے پہاڑ اور نہریں قرار دیں۔ و من کل الثمرات زوجین اثنین۔ اور ہر قسم کے پھلوں سے جوڑے دو دو یعنی دو دو قسم کے مثلاً سفید و سیاہ میٹھے و کھٹے۔ گرمی کے جاڑے کے تر و خشک۔ یا یہ مطلب ہو کہ ہر قسم کے پھل کو جوڑا یعنی نر و مادہ پیدا کیا۔ جیسے کھجور کے درخت میں ہوتا ہے کہ ایک ان میں نر ہوتا ہے اور ایک مادہ۔ اور جب تک نر کے پھول مادہ پر ڈالے نہیں جاتے جسے عرب لوگ تدبیر کہتے ہیں۔ تب تک مادہ میں اچھے پھل نہیں آتے۔ ہندوستان میں بھی قدیم زمان سے وہی رسم ہے کہ بعض درخت کی بعض سے شادی کی جاتی تھی۔ جیسے آم اور مہوہ یا آم اور جامن۔

اور علیٰ ہذا القیاس اور قسم کے درختوں میں بھی ہے۔ اگرچہ عام طور پر لوگوں کو تشخیص نہیں۔ یغشی اللیل النھار۔ رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے یعنی دن کی روشنی کو مخفی کر کے رات کی تاریکی لاتا ہے۔ ان فی ذٰلک لاٰیات لقوم یتفکرون بے شک اس میں دلیلیں ہیں ان لوگوں کے لئے جو فکر و غور کریں۔ وفی الارض قطع متجاورات۔ اور زمین میں ایک دوسرے سے قریب قریب قطعے ہیں۔ کوئی نرم ہے کوئی سخت۔ کوئی شیریں ہے کوئی شور ہے کوئی خشک ہے کوئی گیلا کیچڑ کے مثل ہے۔ کوئی قابل زراعت ہے۔ کوئی بنجر ہے۔ وَجنات من اعناب و زرع۔ اور باغ ہیں انگوروں کے اور زراعتیں ہیں۔ و نخیل صنوان و غیر صنوان۔ اور خرما زار جُٹے درخت ہیں۔ اور علیحدہ علیحدہ۔ یسقی بماءٍ واحد۔ جو ایک پانی سے سینچے جاتے ہیں۔ و نفضّل بعضھا علی بعض فی الاکل۔ اور (پھر بھی)، ہم بعض کو بعض پر پھل میں ترجیح دیتے ہیں کہ کسی کو زیادہ میٹھا کرتے ہیں کسی کو کم میٹھا کسی میں زیادہ خوشبو کر دیتے ہیں کسی میں کم۔ کوئی

بڑے قد کا ہوتا ہے۔ کوئی چھوٹے قد کا (باوجودیکہ سب ایک ہی باغ میں ایک ہی پانی سے سینچے جاتے ہیں) ان فی ذالك لآیات لقوم یعقلون۔ بے شک اس میں دلیلیں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھیں۔

تیسرا بیان: حاصل مطلب یہ ہے کہ آسمان بغیر ستون کے قائم رکھنا حالاں کہ یہ اتنے بڑے بڑے اور جسیم و دبیز ہیں اور اُن پر نہایت ہی وزنی وزنی اور بڑے بڑے قطروں کے ستارے ہیں۔ پھر عرش کا قصد کرنا یا اس پر غالب آنا جو بہت ہی بڑی چیز ہے۔ جس کے متعلق حدیثوں میں بہت کچھ تشریح ہے۔ میں صرف جناب امیرالمومنینؑ کا ارشاد جو کتاب توحید صدوق علیہ الرحمہ میں منقول ہے اور جسے تفسیر صافی میں نقل کیا گیا ہے۔ بیان کرتا ہوں۔ حدیث جاثلیق میں حضرتؑ نے فرمایا۔ ان الملائکۃ تحمل العرش ولیس العرش کما یظن ھیئۃ السریر ولکنہ شی محدود مخلوق مدبر وربك عزوجل مالکہ لا انہ علیہ ککون الشی علی الشی۔ بے شک فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور عرش ایسا نہیں ہے جیسا لوگ خیال کرتے تھے کہ اس کی صورت تخت کی سی ہے۔ لیکن وہ محدود و مخلوق اور باتدبیر و حکمت بنائی ہوئی ایک چیز ہے اور تمہارا پروردگار اُس کا مالک ہے نہ یہ کہ وہ اس پر بیٹھا ہے۔ جیسے ایک شے دوسری شے پر ہوتی ہے۔ اور آفتاب و ماہتاب کو ایسا پیدا کرنا کہ باوجودیکہ جسامتہً بہت بڑے ہیں نہ ان کے لئے ہاتھ ہیں نہ پاؤں۔ اور پھر اپنی حرکت فلکیہ کے ذریعے سے کیسی ٹھیک اور باقاعدہ حرکت کرتے ہیں۔ جس میں کبھی فرق نہیں آتا۔ جس سے سال و ماہ میں فرق پڑ جائے۔ اسی لئے دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ لتعلموا عدد السنین والحساب۔ تاکہ تم برسوں کے اعداد اور حساب کو جانو۔ اور زمین کو ایسی بڑی بنایا اور چوں کہ اُس کا قیام بغیر اوتاد کے نہیں ہو سکتا تھا۔ لہذا اس پر بڑے بڑے پہاڑوں کا قائم کرنا جس سے اسے حرکت و تزلزل نہ ہو۔ اور خلق اللہ کے واسطے ان پہاڑوں سے نہریں نکالنی۔ اور چشمے پیدا کرنے جو میٹھے بھی ہوتے ہیں۔ شور بھی۔ ٹھنڈے بھی ہوتے

ہیں گرم بھی۔ اور مختلف مصلحتوں میں کام آتے ہیں۔ مثلاً پینے میں۔ زراعت میں۔ دوا میں وغیرہ وغیرہ۔ اور ہر قسم کے پھل پیدا کرنے۔ جن کی نہ کسی کو تعداد معلوم ہوسکتی ہے اور نہ کوئی حصر کر سکتا ہے۔ کیوں کہ نباتات دو قسم کے ہیں۔ کچھ بحری ہیں کچھ بری ہیں اور بری میں کچھ جبلی ہیں کچھ سہلی ہیں۔ اور دونوں ہی یا بیلدار ہیں یا بغیر بیل کے ہیں۔ اور بغیر بیل کے یا تنہ دار اور سخت وطویل ہیں۔ یا اس کے خلاف ہیں۔ اور پھر یا محض پھول والے ہیں۔ یا پھل والے۔ اور پھولدار یا سرخ پھول کے ہیں۔ یا زرد پھول کے۔ یا سیاہ یا اودے۔ یا کاسنی۔ یا سفید یا نارنجی وغیرہ وغیرہ یا دو رنگے ہیں یا سہ رنگے یا چہار رنگے۔ یا اس سے بھی زیادہ والے ہیں۔ اور چھوٹے پھولوں والے یا بڑے پھولوں والے۔ اور خوشبودار ہیں یا بے خوشبو کے اور خوشبوئیں بھی یا متفق ہیں یا مختلف ہیں۔ اگر مختلف ہیں تو کتنی قسموں کی ہیں۔ اور پھلدار درخت یا دوا کے کام کے ہیں یا غذا کی۔ انسان کی غذا کے بکار آمد ہیں یا پرندوں وحشیوں کے بکار آمد ہیں۔ یا اہلیوں کے اور میٹھے پھل والے ہیں یا کھٹے پھل کے اور مٹھاس بھی ایک قسم کی ہے یا جتنے پھل ہیں سب کے مزے الگ الگ ہیں۔ اگر ترش ہیں۔ تو ایک قسم کی ترشی ہے یا کئی قسم کی۔ اور مزاج ان کے یا حار ہیں یا بارد۔ رطب ہیں یا یابس۔ وغیر ذلک۔ من التفاصیل التی لاتحصی لھا۔ اور پھر ہر ایک قسم کے درختوں میں سے یا وہ ہیں جو بیج کے ذریعے سے پیدا ہوتے یا قلم لگانے سے اور ہر ایک ان میں آیا دیرپا ہیں۔ یا جلد فنا ہوجانے والے ہیں۔ زرعی ہیں یا بستانی ہیں۔ اور تعدادیں اُن کی محدود ہیں یا نا محدود۔ پس اگر ان سب کو جمع کیا جائے۔ تو کروڑ در کروڑ بلکہ ارب در ارب شمار ہوسکتا ہے۔ مگر اُن کے اقسام و انواع و اصناف و افراد محدود نہیں ہوسکتے نہ ان سب کے اسماء معلوم ہوسکتے۔ اور نہ خواص۔ سوائے اس کے کہ جن کو علم نباتات والوں نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ اور اُن سے بڑی بڑی ضخیم ضخیم کتابیں ترتیب دی ہیں لیکن پھر بھی کل اقسام کو محدود نہیں کرسکے۔ کیوں کہ ہر ایک پھل میں بیس بیس تیس تیس

بلکہ اس سے بھی زیادہ زیادہ خواص و منافع و فوائد ہیں۔ جو ابھی تک بہت سے معلوم نہیں ہو سکے اور وقتاً فوقتاً الہام الٰہی سے اہل علم و فکر کو معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ اور رات کا دن کو ڈھانک لینا تا کہ مخلوقات راحت و آرام پا سکے۔ وجعلنا اللیل لباساً۔ اور زمین کے قطعے قطعے کی الگ الگ خاصیت اور حالت بنائی کوئی قابل زراعت ہے اور کوئی قابل باغ لگانے کے ہے۔ کوئی صرف سبزہ پیدا کر سکتی ہے۔ کوئی پھول کے درختوں کے لئے مناسب ہے۔ کوئی پھل کے درختوں کے واسطے کوئی شور ہے کوئی شیریں۔ کوئی قطعہ سرخ مٹی کا ہے کوئی سفید مٹی کا۔ کوئی زرد مٹی کا۔ کوئی علاج میں کام آتا ہے۔ کوئی ظروف سازی میں۔ غرض اس کے بھی بے شمار خواص و افعال و فوائد و منافع ہیں۔ پھر انگوروں اور زراعت کے دانے پیدا کرنے کہ ہر ایک ان میں سے بہت سی قسموں پر مشتمل ہے۔ انگور اپنی اقسام اور فوائد و خواص میں مختلف ہے۔ اور زراعت کے دانے اپنی اقسام و خواص و افعال میں بے شمار ہیں۔ اگر ان سب کو بیان کیا جائے تو علم النباتات کا خلاصہ اسی کتاب میں ترتیب پا جائے۔ لیکن میں تو صرف ان امور کی طرف اجمالی اشارہ کرتا جاتا ہوں اور خرما کے درخت پیدا کرنا اور ان میں نر و مادہ کا فرق کرنا اگر مادہ درخت کے پاس نر درخت نہ ہو۔ تو نہ اس میں شادابی آتی ہے اور نہ پھل اچھے ہوتے ہیں۔ پھر اس میں عجیب و غریب مشابہت انسان سے ہونی۔ کہ نر کے پھول میں وُہی خوشبو ہے جو انسان کے نطفہ میں بُو ہوتی ہے اور یہ کہ اگر چند سال نہ پھلے اور مالک اسی کی جڑ پر کاٹنے کے ارادہ سے آرہ لگائے اور دوسرا کوئی کہہ دے کہ اسے نہ کاٹو۔ سال آئندہ میں یہ پھلے گا۔ پھر وہ چھوڑ دے تو سال آئندہ اس میں ضرور پھل لگیں گے۔ اور نیز اس میں انسان سے یہ مشابہت ہونی کہ اگر اس کا سر کاٹ دیا جائے۔ تو کبھی دوبارہ اس میں شاخیں اور پتیاں نہ نکلیں گی۔ اور اس کے اقسام کا مختلف ہونا۔ اس کے پھلوں کا مختلف ذائقہ رکھنا۔ قد میں بڑا ہونا چھوٹا ہونا رنگوں میں مختلف ہونا۔ ایک ہی جڑ

سے کئی درخت نکلے ہوں۔ تب بھی اُن کے پھلوں میں مختلف ذائقہ مختلف رنگ مختلف خوشبو ہوتی۔ خامی کی حالت میں کوئی ذائقہ اور پختگی میں کوئی۔ پھر ان سب کے خواص کا مختلف ہونا یقیناً اور حتماً جزماً یہ ایسے امور ہیں۔ جو اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ ہمارا پیدا کرنے والا کوئی بڑا حکیم و خبیر و مدبّر و منعم و رحیم و رحمان ہے فسبحانہ تعالیٰ شانہ وعظیم برھانہ۔

سورہ حجر رکوع ۲۔ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ۔ وَحَفِظْنَاهَا مِن كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ۔ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ۔ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ۔ وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ۔ وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ۔ (سورہ حجر۔ رکوع ۲)

علم ہیئت اور طبعیات کا بیان

یہ مجموعی آٹھ آیتیں ہیں۔ جو ایک ہی مقام پر بیان فرمائی گئی ہیں۔ ان آیتوں میں علم ہیئت اور طبعیات کا بڑا حصہ بیان کیا ہے۔ جن کو اگر تفصیل سے لکھا جائے تو بہت طول ہوگا۔ لیکن مختصر طور پر اس مقام کی تفسیر چند بیانوں میں واضح کی جاتی ہے۔

جن اور شیاطین

بیان اوّل: تحقیق الفاظ۔ بروج جمع ہے برج کی جس کے معنی قصر عالی ہیں۔ مگر یہاں مراد آسمان کے اُن بارہ حصوں سے ہے۔ جس میں سیارات کی گردش ہوتی ہے۔ اور اُن کے نام علی حسب التوالی یہ ہیں۔ ۱۔حمل ۲۔ثور ۳۔جوزا

۴۔سرطان ۵۔ اسد ۶۔ سنبلہ ۷۔ میزان ۸۔عقرب ۹۔ قوس ۱۰۔ جدی ۱۱۔ دلو ۱۲۔ حوت
بعض کا قول ہے کہ برج سے مراد ستارے ہیں۔ جیسا کہ ابن عباس سے منقول ہے
اور واقعی یونہی ہے۔ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ شیطان سرکش کو کہتے ہیں۔ اصل
اس کی یہ ہے کہ اشتقاق اس کا شطن سے۔ بمعنی بعد ہے۔ چونکہ یہ فرقہ خیر و نیکی سے
دور اور شر و فساد سے قریب ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو شیطان کہا گیا۔ یہ بھی معلوم
ہونا چاہیئے کہ شیطان کسی خاص قوم کا نام نہیں۔ بلکہ جو سرکش ہو۔ اسے شیطان
کہتے ہیں۔ خواہ وہ از قسم جن ہو۔ یا از قسم انس۔ سرکش جن کو شیطان الجن۔ اور
سرکش انسان کو شیطان الانس۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ واذا خلوا الی
شیاطینھم قالوا انا معکم انما نحن مستھزؤن۔ اور جن کی نسبت یہ آیت ہے
فازلھما الشیطن عنھا فاخرجھما مما کانا فیہ۔ تقریب دلیل یہ ہے کہ ابلیس
نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔ جیسا کہ ان آیتوں سے معلوم ہوتا
ہے۔ فسجدوا الا ابلیس ابی واستکبر وکان من الکافرین۔ واذ قلنا للملئکۃ
اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس کان من الجن ففسق عن امر ربہ۔ اور
اسی نے حضرت آدم کو بہکایا بھی جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اس کو شیطان
کہا فوسوس لھما الشیطان۔ نیز ایک مقام پر فرمایا ہے وکذلک جعلنا
لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف
القول غرورا۔ پس معلوم ہوا کہ شیطان ہر سرکش کو کہتے ہیں خواہ انسی ہو خواہ
جنی۔ لیکن ہندوستان کے فیلسوف متسمّی بریفارمر سید احمد خانصاحب نے
جو شیطان و جن کے وجود سے انکار کیا ہے۔ وہ محض قلت تدبّر اور تبعیت اہل یورپ
سے ہے۔ نہ بطور تحقیق۔ کیونکہ جنوں کا وجود یقینی بلکہ بدیہی ہے۔ اور اس کا انکار
کرنا عقل و نقل دونوں سے دشمنی کرنی ہے۔ عقل سے تو اس سبب سے کہ کسی نہ دیکھی
ہوئی چیز کی نفی کرنی حماقت میں داخل ہے۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو
انسان نے اب تک نہیں دیکھا تو کیا اُن کے وجود کا انکار کردے گا۔ روح کو

کس نے دیکھا۔ قوائے جسمانیہ کو جو خاص اپنے ہی بدن میں ہیں۔ کس نے دیکھا۔ ہوا کی صورت کس نے دیکھی۔ اور خدا تعالیٰ ہی کو کس نے دیکھا (میں ان لوگوں سے علیحدہ بحث کروں گا جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تعالیٰ نعوذ باللہ مرد کی صورت میں آسمان سے اترتا اور اہل دنیا کو دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ یہ قول دیوانہ کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔) پھر ان سب چیزوں کے وجود سے انکار کر دینا چاہیئے۔ اور اگر کہا جائے کہ اُن کے آثار سے ہم نے اُن کے وجود کا پتہ لگایا تو ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ جن کے وجود کا بھی پتہ اُس کے آثار سے معلوم ہوا۔ بہت دنیا میں ایسے لوگ ہیں جن سے جنوں نے کلام کیا اور اُن کی وجہ سے آرام یا تکلیف لوگوں کو پہنچی اور پہنچتی رہتی ہے اور یہ واقعات اس قدر متواتر ہیں کہ ان کا انکار کرنا ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی کہہ دے کہ روئے زمین پر مکہ کوئی شہر نہیں ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ ابھی تک حج کے لئے مکہ کو نہیں گیا ہے۔ حالانکہ لاکھوں آدمی جو حج کرکے آئے ہیں وہ اس کے موجود ہونے کو بتاتے ہیں۔

پس جب کہ اس کے آثار صفحۂ ہستی پر لاکھوں موجود ہیں۔ تو انکار کرنے کی کیا وجہ؟ علاوہ اس کے صورت و شکل مجسم میں بھی لوگوں نے جنوں کو دیکھا ہے تو کیا صرف سید احمد خاں صاحب کا نہ دیکھنا اس کے عدم کی دلیل ہو سکے گا۔ ہرگز نہیں؟ اور نقل سے دشمنی اس وجہ سے ہے کہ خدا تعالیٰ خود اس کے وجود کا اقرار فرماتا ہے۔ والجان خلقناھم من قبل من نار السموم ہم نے جنوں کو پہلے ہی نار سموم سے پیدا کیا ہے۔ نیز فرماتا ہے۔ خلق الانسان من صلصال کالفخار و خلق الجان من مارج من نار۔ (خدا تعالیٰ نے) پیدا کیا انسان کو ٹھیکری کی طرح بجتی ہوئی مٹی سے اور جنوں کو آگ کی لَو سے۔" اس کے علاوہ اور بہت سے مقامات پر خدا تعالیٰ نے ان دونوں نوعوں کے وجود و خلقت کو ارشاد فرمایا ہے۔ پس جن کے وجود کا انکار کرنا قدرت خدا تعالیٰ کا انکار ہے۔ یعنی کہ گویا وہ ایسی

چیزیں ہی نہیں پیدا کر سکتا۔ جو آنکھوں سے دکھائی نہ دے سکیں۔ حالانکہ اس نے نمونے کے طور پر بدن انسان میں روح اور نفس کو پیدا کر کے دکھا دیا ہے کہ ہم ایسی چیزیں خلق فرمانے پر بھی قادر ہیں۔ جن کو آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ نیز اس میں استبعاد و استحالہ ہی کیا ہے کہ کوئی شے آگ سے پیدا ہو۔ جب کہ مٹی سے پیدا کرنا کسی چیز کا ممکن ہے تو آگ سے بنانا بھی ایسے اقدر القادرین کو کیا دشوار ہوگا۔ کیا آگ کے کیڑے، سمندر کو آپ نے نہیں دیکھا یا کتابوں میں اس کا حال نہیں پڑھا ہے؟ کیا یہ کیڑا آگ سے نہیں پیدا ہوتا اور کیا اس کی زندگی آگ سے نہیں ہے۔ دیکھو خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کو ہر صورت سے ظاہر کر کے دکھا دیا ہے۔ کچھ چیزیں ایسی پیدا کی ہیں۔ جن میں مٹی کے اجزاء زیادہ رکھے۔ جیسے حیوانات۔ نباتات۔ جمادات۔ کچھ چیزیں ایسی پیدا کیں۔ جن میں آبی اجزا زیادہ رکھے اور گویا وہ رطوبات و مائعات ہی سے پیدا ہوتے ہیں جیسے اکثر دریائی حیوانات۔ جن کی زندگی پانی ہی سے ہے۔ کچھ چیزیں آگ سے پیدا کیں۔ جن میں اجزائے ناریہ زیادہ رکھے جیسے سمندر اور جن اور کچھ چیزیں ایسی پیدا کر دی ہیں جن کو ہوا ہی سے زیادہ تعلق ہے جو استحالۂ ہوا سے پیدا ہو جاتے ہیں اور اس قسم کے جانور ہوں گے جو فضائے وسیع زمین و آسمان میں باریک باریک نظر آتے ہیں تو ہر صورت سے ان ذی حیاتوں کے پیدا کرنے میں اپنی قدرت کا اظہار مقصود ہے اور سید صاحب اس قدرت کا انکار فرماتے ہیں۔ دیکھئے علمائے اسلام میں سے امام رازی فرماتے ہیں۔ الاصح ان الشیاطین قسم من الجن فکل من کان منہم مومنا فانہ لا یسمی بالشیطان وکل من کان منہم کافرا یسمی بھذا الاسم صحیح یہ ہے کہ شیاطین بھی از قسم جن ہیں پس جو مومن ہیں اُن کا نام شیطان نہیں۔ اور جو مومن نہیں ان کا نام شیطان ہے۔

ایک عالم نے کیا خوب عقلی دلیل وجود کی بیان کی ہے۔ اور وہ ان لفظوں میں ہے۔ ما سوی اللہ بحسب القسمۃ العقلیۃ علی ثلثۃ اقسام المتحیز و الحال فی والذی لا یکون متحیزا ولا حالا فیہ وھذہ القسم الثالث لم

يقم الدليل على فساد القول به بل الدلائل الكثيرة قامت على القول به وهذا هو المسمّٰی بالارواح فبهذه الارواح ان كانت طاهرةً مقدسة من عالم الروحانيات المقدسة فهم الملائكة وان كانت خبيثةً داعية الى الشرور عالم الاجساد ومنازل الظلمات فهم الشياطين ـ یعنی علاوہ ذات خدا تعالیٰ کے جتنے موجودات ہیں۔ وہ تین قسم کے ہو سکتے ہیں۔ یا تو حیز (یعنی مکان خاص) میں رہنے والے ہوں گے۔ (جیسے ہوا آگ پانی مٹی اور ان کے مرکبات نباتی وجمادی وحیوانی) یا اس متحیز کے اندر حلول کئے ہوئے ہوں گے۔ (جیسے قوائے حیوانیہ ونباتیہ وغیرہ۔ یا رنگ و بو وشکل وغیرہ) یا دونوں سے الگ ہوں گے۔ یعنی نہ خود کسی حیز میں ہوں گے اور نہ کسی حیز والے میں حلول کئے ہوں گے (وہ دو قسمیں تو قطعی الثبوت ہیں کیونکہ ان کا وجود بدیہی ہے۔ ہر شخص نباتات وجمادات وحیوانات اور ان کی کیفیات وحرکات وقوے کو آنکھوں سے دیکھتا ہے) رہی تیسری قسم اس کے نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں بلکہ بہت سی دلیلیں اس کے وجود پر قائم ہو چکی ہیں۔ اسی تیسری قسم کے موجودات کو ارواح کہتے ہیں۔ پس ان میں سے جو روحیں پاک ہیں وہ ملائکہ ہیں۔ امور بد کی طرف رغبت دلانے والے اور عالم اجسام ومنازل ظلمت کی طرف لے جانے والے ہیں۔ تو وہ شیاطین ہیں۔ اور خبیث ہیں۔

علامہ دمیری نے کتاب حیوۃ الحیوان میں لکھا ہے ان الجن اجسام هوائية قادرة على التشكل باشكال مختلفة لها عقول وافهام وقدرة على الكلام والاعمال الشاقة وهم خلاف الانس الواحد جني ويقال انما سميت بذلك لانها تتقى ولا ترى وروى الطبراني باسناد حسن عن ثعلبة الخشني ان النبي قال الجن على ثلثة اصناف فصنف لهم اجنحة يطيرون بها فى الهوا وصنف حيات وصنف يحلون يظعنون وروى ابو الدنيا فى كتاب مكايد الشيطان من حديث ابى الدرداء ان النبي قال خلق

اللہ الجن ثلثۃ اصناف صنف حیات وعقارب وخشاش الارض وصنف کالریح فی الھواء وصنف علیھم الحساب والعقاب وخلق اللہ الانس علی ثلثۃ اصناف صنف کالبھائم لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا وصنف اجسادھم اجساد بنی آدم وازواجھم ارواح الشیاطین وصنف کالملائکۃ فی ظل اللہ یوم لا ظل الا ظلہ واجمع المسلمون علی ان محمداً المبعوث الی الجن کما ھو مبعوث الی الانس۔

یعنی جن اجسام ہوائیہ ہیں مختلف شکلوں سے متشکل ہو سکتے ہیں۔ اُن کی عقل و فہم بھی رکھتے ہیں۔ کلام اور سخت کاموں کے کرنے پر بھی قادر ہیں اور وہ انسان کے بالکل برخلاف اور علاوہ ہیں۔ واحد اس لفظ کا جنی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ نام اس وجہ سے قرار پایا کہ رہتے تو ہیں۔ مگر دکھائی نہیں دیتے۔ طبرانی نے سید حسن ثعلبہ حسنی سے روایت کی کہ پیغمبر خدا نے فرمایا جن تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ قسم ہے جن کے پَر ہیں۔ ہوا میں اڑتے ہیں۔ دوسری قسم سانپ ہیں۔ اور ایک وہ صنف ہیں کہ وہ کوچ و مقام بھی کرتے ہیں۔ ابوالدنیا نے کتاب مکائد الشیطان میں روایت کی ہے حدیث ابو درداء سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جن تین قسم کے ہیں ایک قسم سانپ ہیں اور بچھو اور حشرات الارض۔ دوسری قسم مثل تند ہوا کے فضا میں رہتے ہیں۔ تیسری قسم کے وہ جن ہیں جن پر حساب عقاب بھی ہے (یعنی مکلف ہیں)۔ اور آدمیوں کو بھی خدا نے تین قسم کا پیدا کیا ہے۔ ایک تو مثل بہائم کے ہیں جن کے پاس دل تو ہیں مگر سمجھتے نہیں۔ اُن کے کان ہیں مگر سُنتے نہیں۔ اُن کی آنکھیں بھی ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں (یعنی بے عقل محض ہیں جیسے جنگلی اور بدوی آدمی) اور دوسری قسم کے وُہ آدمی ہیں کہ جسم اُن کے تو مثل بنی آدم کے ہیں مگر رُوحیں ان کی شیطان کی سی ہیں (یعنی شریر و بدمعاش لوگ) تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو مثل ملائکہ کے سایہ خدا میں رہیں گے۔ اس دن جس دن کوئی سایہ سوائے اس کے سایہ کے نہ ہوگا" اور مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ محمدؐ جن کی طرف بھی مبعوث کئے

گئے ہیں اسی طرح جیسے آدمیوں کی طرف۔

صاحب مقاصد کا بیان ہے کہ ظاہر قرآن و حدیث سے جہاں تک ثابت ہوتا ہے اور یہی قول اکثر امت رسول کا ہے کہ ملائکہ اجسام لطیفہ نورانیہ ہیں۔ قادر ہیں کہ مختلف شکلوں سے متشکل ہو سکیں۔ آگے چل کر کہتے ہیں۔ والجن اجسام لطیفہ ھوائیۃ متشکل باشکال مختلفۃ و یظھر منہ افعال عجیبۃ منھم المومن و منھم الکافر والمطیع والعاصی والشیاطین اجسام ناریۃ شانھا القاء النفس فی الفساد والغوایۃ بتذکیر اسباب المعاصی۔ اور جن اجسام لطیفہ ہوائیہ ہیں جو مختلف شکلوں میں متشکل ہو سکتے ہیں اور ان سے افعال عجیبہ ظاہر ہوتے ہیں ان میں مومن کافر مطیع نافرمان سب قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور شیاطین اجسام ناریہ جن کی شان نفس کو فساد میں ڈالنا ہے۔ معصیت کے اسباب کو یاد دلا کر" پھر کہا ہے۔ الغالب علی الشیطان عنصر النار و علی الآخر عنصر الھوا۔ شیطان میں تو عنصر ناری زیادہ ہے۔ پھر کہا ہے۔ والقائلون من الفلاسفۃ بالجن والشیاطین زعموا ان الجن جواھر مجردۃ لھا تصرف و تاثیر فی الاجسام العنصریہ من غیر تعلق بھا تعلق الا لنفوس بالابدان البشریۃ۔ جو حکما جن و شیاطین کے وجود کے قائل ہیں ان کا گمان ہے کہ جن جواہر مجردہ ہیں۔ جن کو اجسام عنصریہ میں تصرف و تاثیر کا اختیار ہے مگر ان کا تعلق اجسام سے ایسا نہیں ہے۔ جیسا کہ نفوس کا ابدان بشریہ سے" پھر کہا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض حکما کا یہ خیال ہے کہ نفوس بشریہ یعنی آدمیوں کی روح بدن سے جدا ہونے کے بعد جن کہے جاتے ہیں۔ بشرطیکہ نیک اور مطیع دواعی عقلیہ کے ہوں۔ اور اگر شریر ہوں اور معین گمراہی ہوں اور غوایت میں انہماک ان کا کام رہا ہو۔ تو وہ شیاطین ہیں۔ وبالجملۃ فالقول بوجود الملئکۃ والشیاطین مما انعقد اجماع الآراء نطق بہ کلام اللہ تعالی وکلام الانبیاء علیھم السلام۔ یعنی حاصل کلام یہ کہ ملائکہ اور جن اور شیاطین کے وجود پر تمام عقول

وآرا امت کا اجماع ہے۔ قرآن مجید اور کلام انبیاء بھی اس پر شاہد ہے (یہ ہے حاصل کلام مصنف کتاب المقاصد فی علم الکلام) علامہ راوندی نے ایک طولانی بحث اور لطیف تشریح کے بعد لکھا ہے اور دسواں مرتبہ رُوح کا وہ ہے جو سفلی ہیں اور اُن کا تصرف اجسام نباتیہ اور حیوانیہ میں ہوتا ہے جو اس عالم میں موجود ہیں۔ اور جانور کی یہی روحیں کبھی روشن۔ نیک اور سعید ہوتی ہیں اُن کو جن کہتے ہیں اور کبھی کدر سفلی ہوتی ہیں۔ اُن کو شیاطین کہتے ہیں۔ انتہی محصل ترجمہ (منقول از بحار الانوار)

یہاں تک تو اسلامی علما کی رائیں معلوم ہوئیں کہ متفق علیہ سب کے سب جن وشیاطین کے وجود کے قائل ہیں پس ایک شخص کا اختلاف کیا فائدہ دے سکتا ہے علاوہ اس کے احادیث بھی بکثرت اس بارہ میں موجود ہیں۔ درمنثور میں علامہ سیوطی نے معاذ بن جبل سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسول خدا کے پاس صدقہ کے خرمے لائے گئے میں نے انہیں ایک غرفہ میں رکھ دیا مگر ہر روز ان میں کچھ کم پاتا تھا۔ اس کی شکایت رسول خدا سے کی۔ آپ نے فرمایا یہ شیطان کا کام ہے ذرا گھات تو لگاؤ۔ پس میں نے گھات لگائی۔ جب تھوڑی رات گزری تو ہاتھی کی صورت کا ایک جانور آیا۔ جب دروازہ تک پہنچا۔ تو دروازہ کی درزوں سے صورت بدل کر داخل ہوا اور خرموں کے پاس گیا اور کھانے لگا۔ میں نے اپنے کپڑے سمیٹے اور اس کے پاس گیا اور کہا کہ اشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمداً عبدہ ورسولہ۔ اے دشمن خدا وثبت الی التمرۃ واخذتہ وکانوا احق بہ منک لا رفعنک الی رسول اللہ فیفضحک فعاھدنی ان لا یعود۔ تو نے لپک کر چھوارے کھانے شروع کر دیئے حالاں کہ اور لوگ تجھ سے زیادہ اس کے مستحق تھے۔ میں تجھے رسول خدا کے پاس پکڑ کر لے چلوں گا۔ تو آنحضرت تجھے رسوا کر دیں گے۔ پس اس نے مجھ سے عہد کیا کہ دوبارہ نہ آئے گا۔ وعن ابن عباس قال۔ کان رسول اللہ نازلا علی ابی ایوب فی غرفۃ وکان طعامہ فی سلۃ فی المخدع فکانت تجی من الکوۃ کھیئۃ السنور تاخذ الطعام من السلۃ فشکی ذلک الی رسول

اللہ فقال رسول اللہ تلك الغول فاذا جاءت فقل عزم علیك رسول اللہ ان لا تبرحی فجاءت فقال لها ابو ایوب عزم علیك رسول اللہ ان لا تبرحی فقال یا ابا ایوب دعنی هذه المرة فواللہ لا اعود فترکها۔

ابن عباس سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآب ابوایوب کے پاس غرفے میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ آپ کا کھانا کوٹھری میں ایک ٹوکری میں رکھا ہوا تھا۔ تو کوئی شخص مثل نور کے جھروکے سے آتا اور کھانے میں سے کچھ نکال لیتا۔ ابوایوب نے اس کی شکایت آنحضرتؐ سے کی آپؐ نے فرمایا وہ غول ہے (یعنی شیطان) اب جو آئے تو کہنا کہ رسولِ خدا نے تجھ کو قسم دی ہے کہ یہاں سے نہ ہٹنا۔ پس وہ آیا اور ابوایوب نے بھی کہا اس نے کہا اے ابوایوب اب کے مرتبہ مجھے چھوڑ دو۔ تو خدا کی قسم پھر یہاں نہ آؤں گا۔ آخر ابوایوب نے اسے چھوڑ دیا۔

علاوہ اس کے اور بھی حدیثیں سیوطی نے اس تفسیر میں نقل کی ہیں۔ جن سے وجود جن صاف ثابت ہوتا ہے۔ بعض اُن میں سے وہی ہیں۔ جنہیں دمیری نے کتاب حیوۃ الحیوان میں نقل کیا ہے۔

اور شیعہ طریقے سے بھی سینکڑوں حدیثیں موجود ہیں۔ منجملہ اُن کے دو تین یہاں مذکور ہوتی ہیں۔ عن معاویۃ بن عمار عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال الاباء ثلثۃ آدمؑ ولد مومنا والجانّ ولد کافرا وابلیسؑ ولد کافرا ولیس فیهم نتاج انما یبیض ویفرخ۔ یعنی اول باپ تین ہیں۔ ایک آدم (انسانوں کے باپ) وہ مومن پیدا ہوئے تھے۔ دوسرے جان (جنوں کے باپ) کافر پیدا ہوا تھا تیسرے ابلیس یہ بھی کافر پیدا تھا۔ یہ بچے نہیں جنتے۔ بلکہ انڈا دے کر بچے نکالتے ہیں (خصال ابن بابویہ)

امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے۔ حضرت نے اپنے آبائے کرام سے روایت فرمائی ہے کہ ایک شامی نے جناب امیر المومنین علیہ السلام سے جن کے باپ دادا کا نام پوچھا آپ نے فرمایا شومان اس کا نام تھا اور وہی آگ سے پیدا کیا گیا تھا۔ (بحار الانوار

السماء والعالم)

تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام میں مذکور ہے کہ ابلیس کی بابت دریافت کیا گیا۔ کیا وہ ملائکہ میں سے نہ تھا؟ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ وہ جن کی قوم میں سے تھا کیا تم خدا کے اس قول کو نہیں دیکھتے کہ فرماتا ہے۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ۔ یہی وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ۔ اور جن کو ہم نے پہلے ہی آتش سموم سے پیدا کیا۔"

اصول کافی میں ایک حدیث مروی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔ ناگاہ ایک مرتبہ امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے ایک اژدہا آیا دروازہ مسجد کی طرف۔ پس لوگوں نے ارادہ کیا کہ اس کو قتل کریں۔ آپ نے آدمی بھیج کر لوگوں کو اس فعل سے منع کیا۔ پس لوگ باز رہے۔ وہ اژدہا کھسکتا ہوا منبر تک آیا اور آگے بڑھ کر سلام کیا۔ حضرت نے اس کو اشارہ کیا کہ ٹھہر جا۔ یہاں تک کہ میں خطبہ سے فارغ ہو جاؤں۔ جب آپ اپنے خطبہ سے فارغ ہوئے تو اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تو کون ہے۔ اس نے کہا میں عمرو بن عثمان ہوں۔ جسے آپ نے اپنا خلیفہ جنوں کی قوم پر بنایا تھا۔ اب میرا باپ مر گیا۔ اور مجھے وصیت کر گیا تھا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں تاکہ آپ کی رائے معلوم کروں۔ اب حاضر ہوا ہوں۔ پس آپ کی رائے میری بابت کیا ہے۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا۔ میں تجھے تقوائے خدا کی وصیت کرتا ہوں۔ اور تو اب جا اور اپنے باپ کے قائم مقام ہو اب تو میرا خلیفہ ہے جنوں کی قوم پر۔" (بحار الانوار)

شہاب لغت میں شعلہ آتش کو کہتے ہیں۔ اور ستارے پر بھی اطلاق ہوا ہے اور یہاں مراد ان ستاروں سے ہے جو آسمان سے ٹوٹتے ہوئے اور ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی نسبت حکمائے اسلام اور ان کے تابعین کا تو یہ خیال ہے کہ زمین کی طرف سے جو دھواں بلند ہوتا اور کرہ نار

تک پہنچتا ہے تو وہاں جاکر مشتعل ہوتا اور ٹوٹتے ہوئے ستارے کی صورت دکھائی دیتا ہے۔

چنانچہ عموماً کتب فلسفیہ میں یہی مذکور ہے۔ اور انہیں کی نقل ملا فضل الحق خیرآبادی نے بھی کی ہے۔ فرماتے ہیں۔ واذا تصعد الدخان ووصل الی کرۃ النار یشتعل کما تراہ فیما اذا اطفأت سراجاً ووضعتہ تحت سراج مشتعل یتصل دخان السراج المطفیٔ بالمشتعل فیشتعل ذلک الدخان ویتحدر اشتعالہ الی فتیل۔ المنطفی فیشتعل ذلک السراج مما کان منہ لطیفاصار مشتعلاو نفذ فیہ النار بسرعۃ فیری کانہ کوکب ینقض ویقذف بہ وھو الشھاب۔ یعنی کہ دھواں جب صعود کرتا اور کرۂ نار تک پہنچتا ہے تو مشتعل ہوجاتا ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ جب کسی چراغ کو گل کردو۔ اور اسی وقت اس کو کسی روشن چراغ کے نیچے رکھو اور اس گل شدہ چراغ کا دھواں روشن چراغ کی لَو تک پہنچے، تو یہ دھواں مشتعل ہوجائے گا اور اس کا اشتعال بڑھتا آئے گا۔ یہاں تک کہ گل شدہ چراغ کی بتّی تک پہنچ کر اُسے بھی مشتعل کردے گا۔ پس جو حصہ دخان متصاعد کا لطیف ہوتا ہے۔ تو وہ مشتعل ہوجاتا۔ اور اُس میں آگ (کرہ نار کی) سرعت سے نفوذ کرجاتی ہے۔ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ستارہ ٹوٹا۔ یا پھینکا گیا اور وہی شہاب ہے۔

اور محقق طوسی علیہ الرحمۃ نے شرح اشارات میں اسی اجزاء ناریہ کی نسبت لکھا ہے۔ اذا بلغ الجو الاقصی الحار بالفعل لبعدہ عن مجاورۃ الماء والارض ومخالطۃ ابخرتھما وقربھما من الاثیر اشتعل طرفہ العالی اولاً ثم ذھب الاشتعال فیہ الی آخرہ فرأی الاشتعال ممتداً علی سمت الدخان الی طرفہ الآخر وھو المسمی بالشھاب۔ جب کہ یہ اجزائے ناریہ یا بسہ متصورہ جو اقصی تک پہنچتے ہیں۔ جو بسبب بعد مجاورۃ آب و خاک و بعد مخالطت ابخرۂ آب و خاک کے اور قرب آسمان کے بالفعل حار ہے۔ تو اس کا ظرف عالی پہلے مشتعل ہو

جاتا ہے۔ پھر اشتعال آخر تک بڑھتا ہُوا چلا آتا ہے۔ تو وہ اشتعال دھوئیں کی سمت میں لمبا دکھائی دیتا ہے۔ اُس کے آخری کنارے تک اور اسی کا نام شہاب ہے۔

زبان شریعت یہ بیان کرتی ہے کہ شہاب اُن شعلوں اور روشن نما چیزوں کا نام ہے۔ جو شیاطین کو آسمان تک پہنچنے سے روکنے کے لئے خدا کے حکم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان دونوں قولوں میں کچھ تضاد نہیں ہے۔ صرف فہم نتیجہ کا فرق ہے۔ حکما بسبب اپنی عدم واقفیت کے احوال غیر مرئیات سے صرف یہی سمجھ سکے کہ یہ ادخنہ مشتعلہ ہیں جو محض قرب نار کی وجہ سے مشتعل ہو گئے ہیں حالانکہ واقعی ان کا اشتعال شیطانوں کے بھگانے کے لئے ہُوا ہے۔ ملاحظہ ہو لسان شریعت کا بیان جناب صادق علیہ السلام سے مروی کان ابلیس یخرق السمٰوٰت السبع فلما ولد عیسٰی حجب عن ثلث سماوات وکان یخرق اربع سماوات فلما ولد رسول اللہ حجب عن السبع کلھا ورمیت الشیاطین بالنجوم۔ (تفسیر صافی سورہ حجر) ابلیس ساتوں آسمانوں کے پار چلا جایا کرتا تھا۔ پس جب سے حضرت عیسٰی پیدا ہوئے تو تین آسمانوں سے اس کا جانا روکا گیا مگر چار آسمانوں تک جاتا تھا۔ پس جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ پیدا ہوئے تو ساتوں آسمانوں سے روکا گیا اور شیطانوں کو ستاروں سے مارا گیا (جو اوپر جانے کا ارادہ کرتے ہیں) اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شہاب کا ٹوٹنا جناب رسالتمآب کی ولادت سے پہلے نہ تھا۔ بلکہ بعد میں حادث ہُوا ہے۔ چنانچہ صاحب مجمع نے لکھا ہے کہ فالشہاب من معجزات نبینا لانہ لم یر قبل زمانہ شہاب ہمارے نبیؐ کے معجزات میں سے ہے۔ کیونکہ حضرت کے زمانے سے پہلے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ (حضرت کی ولادت کے بعد اس کا حدوث ہُوا ہے) نیز تفسیر صافی میں قمی علیہ الرحمۃ کی تفسیر سے نقل کیا ہے کان بمکۃ یھودی یقال لہ یوسف فلما رای النجوم تتحرک وتسیر فی السماء خرج الی نادی قریش فقال یا معشر قریش ھل وُلد فیکم اللیلۃ مولود فقالوا لا فقال اخطأتم والتوراۃ قد ولد فی ھذہ اللیلۃ

آخرالانبیاء وافضلهم وهو الّذی نجده فی کتبنا انه اذا ولد ذٰلك النبیّ رجمت الشیاطین وحجبوا من السّماء فرجع کل واحدٍ الی منزله فسأل اهله فقالوا قد ولد لعبد الله بن عبد المطلب بن عبد المناف الحدیث۔ مکہ میں ایک یہودی رہتا تھا۔ جس کا نام یوسف تھا۔ تو جب اس نے ستارے کو متحرک اور فضائے آسمان میں چلتے ہوئے دیکھا۔ تو مجلس قریش میں آیا۔ اور پوچھا کہ کیا تم میں کوئی اس شب میں پیدا ہوا ہے؟ سب نے کہا نہیں!! اس نے کہا توریت کی قسم تم غلط کہتے ہو۔ بے شک اس شب میں آخرانبیاء اور افضل انبیاء پیدا ہوا ہے۔ یہ وہی نبی ہے جس کی نسبت ہم اپنی کتابوں میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ کہ جب وہ نبی پیدا ہوگا تو شیاطین رجم کئے جائیں گے اور آسمان (پر جانے) سے روک دیئے جائیں گے۔ پس ہر شخص اپنے اپنے گھروں کو واپس آیا اور اپنے اہل واقارب سے دریافت کیا تو لوگوں نے کہا کہ ہاں عبداللہ بن عبدالمطلب بن عبدالمناف کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہے۔

اسی قسم کی روایت اہل سنت کے کتب میں بھی مذکور ہے۔ چنانچہ تفسیر درمنثور میں ابن عباس۔ قال کان الشیاطین لهم مقاعد فی السماء یسمعون الوحی فیها فاذا سمعوا الکلمة زادوا فاما الکلمة فیکون حقا۔ واما ما زاد فیکون باطلاً فلما بعث رسول الله منعوا مقاعدهم فذکروا۔ ذٰلك لابلیس ولم تکن النجوم رُمی بها قبل ذلك فقال لهم ما هذا الامر۔ امر حدث فی الارض فبعث جنوده فوجدوا رسول الله قائمًا یصلی بین جبلین بمکه فاخبروه فقال هذا الحادث الّذی حدث فی الارض۔ یعنی شیاطین آسمان پر گھات لگا کر بیٹھتے۔ اور باتیں سنتے تھے۔ ایک بات سنتے تو نو بات اور بڑھا دیتے۔ وہ ایک بات تو سچ ہوتی باقی جھوٹ۔ پس جب رسولِ خدا مبعوث ہوئے۔ تو وہ شیاطین وہاں بیٹھنے سے روکے گئے۔ اس کا ذکر شیطانوں نے ابلیس سے کیا اس سے پہلے شہاب نہ ٹوٹتا تھا۔ تو ابلیس نے ان شیطانوں سے کہا کہ زمین میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ (جس کی وجہ سے یہ شہاب ٹوٹ رہے ہیں)، اب جو تفتیش کی تو رسولِ خدا کو مکہ میں دو پہاڑوں

کے درمیان نماز پڑھتے پایا۔ ابلیس کو اس کی خبر کی۔ اس نے کہا یہی وہ حادثہ ہے۔ جو زمین پر حادث ہُوا جس سے یہ ستارے ٹوٹتے ہیں۔

بُرجوں کی روشن ستاروں سے زینت

ولقد جعلنا فی السماء بروجا وزینٰھا للنظرین۔ اور بے شک

بیان دوم: ہم نے آسمان میں بُرج پیدا کئے اور زینت دی اُن کو دیکھنے والوں کے واسطے یعنی ستاروں کے لئے ایسی منزلیں قرار دیں۔ جن کے مقابل میں اُن کی رفتار ہوتی ہے اور اُن برجوں کو روشن ستاروں سے زینت دی۔ کیوں کہ جس قدر برج ہیں وہ ستاروں ہی سے حساب کئے اور سمجھے گئے ہیں۔ اور اب جو لوگوں نے اُن کے بارہ نام رکھ لئے ہیں۔ وُہ اسی وجہ سے ہیں کہ ان ستاروں کے اجتماع وافتراق سے جو صورت موہومہ پیدا ہوتی ہے۔ اس صورت کے نام سے اس حصہ فلکیہ کا نام قرار دیا ہے کوئی شیر کی صورت میں ہو گیا ہے۔ تو اسے بُرج اسد کہہ دیا کوئی مچھلی کی صورت میں ہو گیا ہے۔ تو اس کو بُرج حوت کہہ دیا۔ کوئی ایسی صورت میں ہو گیا کہ ایک عورت ہے جو خوشۂ انگور ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ اس کا نام سنبلہ رکھ لیا۔ اور علیٰ ہٰذا القیاس۔ ورنہ دراصل وہ سب ستارے ہی ہیں۔ جو اتنے اتنے حصۂ فلک میں واقع ہوئے ہیں اور شمار سے معلوم ہُوا ہے کہ تیرہ ستارے برج حمل کے ہیں۔ جو بھیڑ کی صورت میں واقع ہوئے ہیں۔ جس کے دو سینگ ہیں۔ مقدم اس کا مغرب کو ہے اور موخر مشرق کی طرف کو پشت شمال کی طرف کو ہے۔ اور دونوں پاؤں جنوب کی طرف۔ اور گویا وہ اپنے پیچھے مڑ کر دیکھ رہی ہے (اس صورت سے وہ ستارے واقع ہیں) اور برج ثور کے ۳۲۔ ستارے ہیں۔ مگر ایسی شکل ہے کہ گویا ایک بیل ناف کے پاس سے کٹا ہُوا ہے۔ صرف اُس کا اگلا دھڑ موجود ہے اور وہ اپنا سر جھکائے ہوئے ہے۔ مقدم اس کا مشرق کی طرف ہے اور موخر مغرب کی طرف۔ اس کے ستاروں میں سے ثریا اور دبران بھی ہیں۔ اور برج جوزا کے (۱۸) ستارے ہیں ایسے دو لڑکوں

کی صورت میں جو آپس میں معانقہ کر رہے ہیں مگر برہنہ ہیں۔ اُن کے سر شمال و مشرق کی طرف ہیں اور پاؤں جنوب و مغرب کی طرف۔ اور برج سرطان کے نو ستارے ہیں۔ کیکڑے کی صورت پر اگلا حصہ اس کا مشرق و شمال کی طرف ہے اور پچھلا مغرب و جنوب کی طرف۔ برج اسد کے (۲۷) ستارے ہیں۔ شیر کی صورت پر جس کا منہ مغرب کی طرف ہے۔ اور پشت شمال کی طرف۔ سنبلہ کے چھبیس ستارے ہیں۔ یہ ایک نوجوان لڑکی کی صورت پر ہے۔ جس کا سر مغرب و شمال کی طرف ہے۔ اور قدم مشرق و جنوب کی طرف اور اس کے داہنے ہاتھ میں خوشہ ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ پر جو چمکتا ہُوا ستارہ ہے اس کا نام سماک اعزل ہے۔ اور میزان کے آٹھ ستارے ہیں۔ ترازو کی صورت میں۔ دونوں پلے اس کے تو مغرب کی طرف ہیں اور عمود اس کی مشرق کی طرف۔ اور برج عقرب کے اکیس ستارے ہیں۔ بچھو کی صورت میں۔ سر اس کا شمال و مغرب کی طرف کو ہے اور ڈنک اس کا جنوب و مشرق کی طرف کو۔ برج قوس کے اکتیس ۳۱ ستارے ہیں اور یہ ایک ایسے شخص کی صورت پر ہے جس کے ہاتھ میں تیر و کمان ہے اور چلّہ چڑھائے ہوئے ہے۔ اور خود ایک جانور کی گردن پر گویا سوار ہے اور برج جدی کے ۲۸ ستارے ہیں۔ بکری کے بچے کی صورت میں جس کے دو سینگ بھی ہیں۔ سر اور دونوں اگلے پاؤں اس کے مغرب کی طرف کو ہیں اور پشت اس کی شمال کی طرف کو۔ اور پچھلا حصہ اس کا مچھلی کا سا ہے۔ برج دلو کے (۴۲) ستارے ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کی صورت میں ہے کہ گویا اس کے ہاتھ میں ڈول ہے۔ جسے اوندھا کئے ہُوئے ہے۔ سر اس کا شمال کی طرف ہے اور پاؤں جنوب کی طرف اور خود مشرق کی طرف متوجہ ہے۔ برج حوت کے ۳۴ ستارے ہیں۔ یہ ستارے دو مچھلیوں کی صورت پر ہو گئے ہیں جن کی دُمیں آپس میں ایک ڈورے کے ذریعے سے جو باریک ستاروں سے پیدا ہوتا ہے ملی ہوئی ہیں۔ ایک کا سر تو مغرب کی طرف کو ہے اور دم مشرق کی طرف اور دوسری کا سر شمال کی طرف کو ہے اور دُم جنوب کی طرف۔ اور جا کر برج حمل کی صورت حمل کے سینگ سے مل گئی ہے۔

اُن بروج سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جب آفتاب و ماہتاب وغیرہ ستارے اُن کے مقابل میں آتے ہیں۔ تو عجیب و غریب ان سے تاثیریں ہوتی ہیں۔ مثلاً تبدیل فصل ہے کہ جب آفتاب حمل۔ ثور۔ جوزا میں رہتا ہے تو یہ بہار کا موسم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان تین برجوں کو بروج ربیعیہ کہتے ہیں۔ اور جب برج سرطان۔ اسد اور سنبلہ میں رہتا ہے تو گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اُن کو بروج صیفیہ کہتے ہیں۔ اور جب میزان۔ عقرب اور قوس میں ہوتا ہے تو موسم خریف ہوتا ہے۔ تو یہ بروج بروج خریفیہ کہے گئے ہیں۔ اور جب جدی۔ دلو اور حوت میں آتا ہے تو جاڑے کا موسم ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ بروج شتویہ کہلائے۔ نیز اُن کے علاوہ جو ستارے اُن میں متفرق متفرق یا یکجا جمع ہو جاتے ہیں۔ تو بہت سے آثار ان سے ظہور میں آتے ہیں۔ مینہ کا برسنا۔ غلہ کی ارزانی۔ بیماریوں کا پیدا ہونا۔ بیماریوں کا دفع ہونا۔ مولود کی سعادت۔ مولود کی نحوست۔ کام کا بننا۔ یا کام کا بگڑنا۔ وغیر ذالک جو علم نجوم پر اطلاع حاصل کرنے سے معلوم ہو سکے گا۔ میں انہیں بخوف تطویل نہیں لکھ سکتا۔

دوسرے ان بروج کا یہ بھی فائدہ ہے کہ حرکات کواکب اور نظرات سیارات کا حساب ان کے ذریعے سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے۔ اگر یہ بروج اس صورت پر نہ ہوتے تو ستارہ شناس لوگ نہایت مشکل سے کوئی حساب مرتب کر سکتے۔

تیسرے یہ کہ یہ بروج آسمان کی زینت بھی ہیں۔ جس وقت انسان تاریک شب میں آسمان کی طرف نظر کرتا۔ اور اُس کے چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتا ہے تو اسے ایک عجیب کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ خصوصاً جب کہ تنہا ہو۔ تو بے ساختہ اس کھلے ہوئے باغ کو دیکھ کر بول اٹھتا ہے۔ ربنا ما خلقت هذا باطلاً سبحانك فقنا عذاب النار۔

واضح ہو کہ یہ بروج جن ستاروں سے پیدا ہوئے ہیں وہ آٹھویں آسمان پر ہیں۔ اور دائرہ منطقۃ البروج کے مطابق واقع ہوئے ہیں۔ جو دائرہ معدل النہار سے تقاطع کرتا ہوا شمالی اور جنوبی ہو گیا ہے اور اسی کے مقابل سیارات کی خصوصاً چاند اور سورج

کی گردش ہوتی ہے۔

وحفظناھا من شیطان رجیم۔ اور ہم نے اس آسمان کی حفاظت کی شیطان رجیم سے جسے شہابوں سے مارا گیا ہے یا یہ کہ رجیم کے معنی ملعون و مشئوم کے ہیں۔ یعنی بدبخت اور ملعون شیطان سے ہم نے آسمانوں کی حفاظت کی۔ تاکہ اوپر نہ جا سکیں۔ حفاظت سے یہ مراد ہے کہ اس تک شیطانوں کی رفتار کو روکا۔ کیونکہ حفاظت ہر شے کی مختلف ہوتی ہے کسی کی لکھ کر حفاظت کی جاتی ہے۔ مثلاً مضمون اور کسی کی یاد کر کے حفاظت کی جاتی ہے۔ مثلاً الفاظِ قرآن۔ اور کسی کی قفل میں بند کر کے حفاظت کی جاتی ہے مثلاً مال اور کسی کی روک کر حفاظت ہوتی ہے مثلاً لڑکے کی حفاظت لہو ولعب سے روک کر۔ اور مثلاً آسمان کی حفاظت شیطانوں کو وہاں تک جانے سے روک کر۔ الا من استرق السمع فاتبعہ شہاب مبین۔ مگر جو شیطان کہ باتیں چرانے جائے۔ کہ دیکھیں آسمان پر فرشتے کیا باتیں کر رہے ہیں۔ اور ان باتوں کو معلوم کر کے انسانوں کو بہکاوے اور مغالطے میں ڈالے۔ تو اس کے پیچھے ایک روشن شعلہ جاتا ہے تاکہ اسے مار کر ہٹا دے جو دیکھنے والوں کو دکھائی دیتا ہے۔ ابن عباس سے منقول ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو کاہن ہوتے تھے۔ اُن کے تابع ایک نہ ایک شیطان ضرور ہوا کرتا تھا۔ جو آسمان پر گھات لگا کر بیٹھتا۔ اور فرشتوں سے باتیں سن کر زمین پر آتا۔ اور اس کاہن سے وہ باتیں بیان کرتا تو وہ کاہن لوگوں پر اُس کا افشا کرتا۔ لیکن بعد جناب عیسٰی کے تین آسمانوں اور بعد جناب مصطفٰی کے ساتوں آسمانوں سے ان کا جانا روکا گیا" اور ان کے لئے یہ عذاب قرار دیا گیا۔ کہ جب وہاں جانے کا ارادہ کریں تو شعلہ آتش ان کو جلانے کے لئے دوڑے۔ والارض مددناھا والقینا فیھا رواسی اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اسے طویل و عریض کیا اور اس میں ثابت و قائم پہاڑ ڈالے یعنی گاڑے (اور نصب کرے) تاکہ زمین متحرک ہو کر امور معاش حیوانات و انسان میں خلل انداز نہ ہو۔ اور تاکہ یہ پہاڑ انسانوں کے لئے نہروں اور دریاؤں کا منبع بنیں۔ اور تاکہ ان سے ضرورت کے موقعوں پر

انسان فائدہ اٹھا سکے۔ دشمنوں سے بچنے کے لئے ان کی بلندی پر جاکر پناہ لے سکے
انہیں تراش کر اپنے مصالح میں صرف کرے۔ مثلاً تعمیرات یا اثاث خانہ داری وغیرہ۔
اور تاکہ اُن پر مختلف الاقسام نباتات پیدا ہو سکیں۔ جو دوا و غذا کا فائدہ دے
سکیں اور تاکہ بلاد حارہ کی اذیت کو اُن کے ذریعے سے انسان موسم صیف میں دفع کر
سکے وغیر ذلک وانبتنا فیھا من کل شیئ موزون۔ اور ہم نے اگائیں اس زمین پر
قابل وزن چیزیں۔ یا بقدر و انداز معین۔ پس اگر یہ معنی ہوں کہ ہر چیز قابل وزن ہم
نے پیدا کی تو مطلب یہ ہوگا کہ جتنی چیزیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ایسی ہیں
کہ کیل و وزن میں آتی ہیں۔ ...... اور تم لوگ اُس سے بذریعہ وزن و پیمانہ
فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ اور اگر یہ معنی ہوں کہ ہر شے یہ اندازہ معین اُگائی۔ تو مطلب
یہ ہوگا کہ جس قدر چیزیں اس میں اگائی گئی ہیں۔ وہ ایک خاص مقدار پر ہیں اور نہ
زیادہ نہ کم اور جو ضرورت مخلوقات کے لئے کافی ہو سکتی ہیں۔ پھر اس صورت میں
آیت کے معنی بہت وسیع ہو جائیں گے۔ کیوں کہ موزوں بمعنی مقدور معین بہت
سے پہلوؤں سے یہاں پر درست ہو سکے گا۔ مثلاً ہر شے ہم نے اس زمین میں موزوں
اگائی۔ یعنی حالت خاصہ اور کیفیت خاصہ۔ اور مزاج و وزن معین۔ اور مقدار معین
اور عدد معین۔ ومساحت معینہ اور اوقات معینہ خاصہ اور منافع معینہ خاصہ پر۔
اور اس وقت اگر ہم کسی ایک نبات ارضی کی موزونیت سے بحث کرنے لگیں۔ تو
اسی کے لئے ایک بڑا دفتر درکار ہوگا کہ کیسی اس کی شکل ہے۔ کیسی اس کی جسامت
ہے کیا اس کا وزن ہے۔ کیا اُس کی قیمت ہے کیا اُس کا نفع ہے۔ کہاں وہ
پیدا ہوتی ہے۔ کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ مفرداً استعمال ہوتی ہے یا مرکباً۔
بسیط القویٰ ہے یا مرکب القویٰ۔ کس درجے کی اس کی حرارت ہے کس درجے کی
برودت کس نمبر کی یبوست و رطوبت ہے وغیر ذلک۔ اور پھر بھی اس کی پوری
حقیقت بیان نہ ہو سکے گی۔ کیوں کہ اصل امر و حقیقت کو وہی جانے جس نے اسے
پیدا کیا اور جو فرماتا ہے۔ وانبتنا فیھا من کل شیئ موزون۔ میں کہتا ہوں کہ

اس لفظ موزوں نے وہ خوبی اس موقع پر پیدا کی ہے کہ جس طرح اسے سمجھو ہر صورت سے صحیح ہو سکتا ہے اور اگر دونوں معنوں میں مثل مشترک معنوی یا مجاز مشترک کے مستعمل سمجھو تب بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہر شے کائنات ارضیہ سے علاوہ اس کے کہ باندازہ معین پیدا کی گئی ہے۔ وزن میں بھی آسکتی ہے۔ خواہ جمادی ہو یا نباتی۔ تو اس صورت میں لفظ موزوں کا استعمال ایسے معنی میں ہوا جو دونوں ہی معنوں کو حاوی ہے۔

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے لفظ کل شئے کہہ کر تعدید افراد نباتیہ کی حاجت کو رفع کر دیا۔ کیونکہ اگر تمام اُن چیزوں کا نام لیتا جو زمین پر پیدا ہوتی ہیں مثلاً نباتات باقسامہا اور جمادات بہ انواعہا اور جمادات میں بھی۔ وہ جو منطرقہ ہیں۔ اور وہ جو منطرقہ نہیں ہیں۔ اور غیر منطرقہ میں سے بھی وہ جو محترقہ ہیں اور وہ جو محترقہ نہیں ہیں۔ تو بے شمار چیزیں بیان کرنی پڑتیں۔ لہٰذا صرف لفظ کل فرما کر سب کو داخل کر دیا اور لاریب کہ تمام چیزیں اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اور اسی کے حکم سے ظہور میں آئی ہیں۔

ایک لطیف بحث۔ بعض لوگ اس آیت سے اور نیز ایسی ہی دو ایک اور آیتوں سے مثلاً خلق کل شیء فقدرہٗ تقدیراً۔ (سورہ فرقان آیت ۲) وکل شیء عندہ بمقدار (سورہ رعد آیت ۱۹) انا کل شیء خلقناہ بقدر (سورہ قمر آیت ۴۹) قل کل یعمل علیٰ شاکلتہ (سورہ اسریٰ آیت ۸۶) یہ سمجھے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نیچر کا پابند ہے۔ اور جو کچھ اس نے بنا دیا یا پیدا کر دیا یا جس کے لئے جو رفتار مقرر کر دی اس کے برخلاف نہیں کر سکتا۔ یہاں صرف لفظ کرنا۔ کر سکنا۔ ہونا، اور ہو سکنا میں بحث ہے۔ ورنہ اُن لوگوں کے معلم یورپین طبیعیین تو خدا تعالیٰ ہی کے وجود کو نہیں مانتے۔ یہ کر سکنے اور کرنے میں کیا بحث کریں گے ان سے تو ثبت العرش ثم النقش میں بحث ہو گی۔ جس کے متعلق ان آیات قرآنیہ کی شرح کی جاتی ہے۔ خلاصہ دعویٰ یہ ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیتیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ہر شے کو اللہ تعالیٰ نے ایک حد معین اور اندازہ مقرر پر خلق فرما دیا ہے۔ یا

ایک حد پر قائم کر دیا ہے۔ یا ہر شے اپنی فطرت و قانون قدرت کے مطابق عمل کرتی ہے یا ہر شے کا اندازہ خدا تعالیٰ کو معلوم ہے اور جو چیز باندازہ معین و بقانون مقرر وضع کر دی گئی۔ وہ بدل نہیں سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شے اپنے قانون معین سے بدل نہیں سکتی۔ اس دعوے کے مقدمہ صغریٰ میں تو کسی کو بھی کلام نہیں ہو سکتا کیوں کہ واقعی ہر شے کو خدا تعالیٰ نے بقانون مقرر پیدا کیا ہے جس کے لئے جو مقدار خواہ وزناً ہو یا مساحۃً طولاً ہو خواہ عرضاً خواہ عمقاً مقرر کر دی۔ جو وقت اس کے لئے قائم کر دیا ہے جو ہیئت و شکل اس کے لئے پسند فرما دی ہے جو کیفیت و نفع اس کے لئے تجویز کر دیا ہے۔ جو مقام اس کے لئے معین کر دیا ہے جس ساعت میں پھلنا اور جب پھولنا اس کے لئے قرار دے لیا ہے۔ وغیر ذالک۔ وہ اسی طرح پر واقع ہوتا ہے اور اس میں فرق نہیں آتا مگر اس دعویٰ کا مقدمہ کبریٰ مخدوش ہے کیونکہ اس میں بے شک بحث کا موقع ہے کہ جو شے باندازہ معین وضع کر دی گئی ہے۔ وہ کیوں کہ بدل نہیں سکتی۔ یا بطبعہ و مزاجہ اور یا بقدرت و حکم خدا اگر کہئے کہ بطبعہ وہ بدل نہیں سکتی۔ تو بے شک تسلیم کرنے قابل ہے اس لئے کہ خدا تعالیٰ کے معین کردہ قانون کو سوائے اس کے کوئی نہیں توڑ سکتا اور اگر یہ غرض ہے کہ خود اُسے بھی امکان تبدیل نہیں ہے تو غلط ہے اور نا قابل تسلیم۔ اس وجہ سے کہ جس نے جس مصلحت سے قانون بنایا ہے۔ اس کو اسی مصلحت کے بدل جانے پر اپنے قانون کو تبدیل کرنا بھی ممکن ہے۔ البتہ بلا مصلحت بدلنا ضرور خلاف عقل ہے لیکن بضرورت و مصلحت تبدیل کرنا تو عین حکمت ہے۔ پس نہ تو مصلحت کے بدل جانے میں کوئی استحالہ ہے اور نہ اس کے امکان تبدیل میں۔ کیونکہ مصلحتیں تو بحسب اختلاف زمانہ و اختلاف اشخاص و اختلاف واقعات بدلتی ہی رہتی ہیں اس میں کیا محال لازم آتا ہے۔ رہا امکان اختیار تبدیل تو وہ ایسا امر ہے کہ جو اتنا بڑا اقدالقادرین ہے۔ جس کے مثل کوئی نہیں اُسے کسی ممکن چیز کے بدل دینے پر کب دشواری پیش آئے گی۔ بلکہ عدم سے وجود میں لانا البتہ دشوار تھا۔ نہ یہ کہ وجود

میں آنے کے بعد کسی قدر تبدیل و نسخ کرنا۔ یہ تو عقلی بات ہے۔ اور اگر اس کے علاوہ مشاہدات کو دیکھیے تو وہ بھی اسی پر شاہد ہیں کہ قانون کی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ مگر نہ خود اس شے کے اختیار سے بلکہ خالق عالم کے حکم سے۔ دیکھیے پہلے زمانہ میں عمریں زیادہ ہوتی تھیں مثلاً حضرت نوح کو ملاحظہ کیجیے کہ ساڑھے نو سو برس تک رہے۔ دعا شوفیھم الف سنۃ الاخمسین عاماً۔ کلام خدا شاہد ہے مگر اب سو برس بھی مشکل سے گذرتے ہیں کہ انسان داعی اجل کو لبیک کہہ دیتا ہے۔ چنانچہ اب یہ کہنا کہ سو برس عمر طبعی کی مدت ہے۔ نہایت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ نیز پھلوں، پتیوں، پھولوں کو دیکھیے حیوانات کی حالتوں کو ملاحظہ کیجیے۔ کہ ان سب میں زمانہ سابق کے مطابق بہت کچھ تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ جن درختوں کے پتے بڑے ہوتے تھے۔ اب وہ نہایت چھوٹے ہوتے ہیں۔ مجھے خود بیس برس کی حالت یاد ہے کہ میرے وطن میں جو پیپل اور قدم کے درخت ہیں اُن کی پتیاں ایک بالشت سے بھی بڑی ہوتی تھیں لیکن اب کئی برس سے دیکھتا ہوں کہ تین چار انچ سے زیادہ لمبی نہیں ہوتیں۔ حالانکہ زمین وہی درخت وہی ہوا وہی۔ فضا وہی چاند سورج وہی۔ آسمان کی گردش وہی۔ تو کیوں ایسا ہُوا؟ اسی وجہ سے تو کہ جس نے اُس کے لئے وہ قانون بنایا تھا۔ اسی نے کسی مصلحت سے اب اس کے لئے اور قانون پاس کر دیا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ دواؤں کے آثار ہیں۔ اور مزاجوں کی کیفیت۔ قدیم طب کی کتابوں میں دیکھیے کہ نسخوں کے اوزان میں بیس بیس مثقال۔ اور بیس بیس درہم دوائیں لکھی ہیں۔ لیکن اب کوئی طبیب اس دوا کو اس مقدار پر نہیں دے سکتا اور نہ دیتا ہے۔ بلکہ بجائے بیس کے پانچ مثقال بھی مشکل سے لکھے جاتے ہیں۔ آخر کیوں ایسا ہُوا؟ اسی وجہ سے تو یہ طبیعتیں بدل گئیں۔ قوی کمزور ہو گئے وغیر ذالک من الاسباب پیدا ہو گئے۔ تو آخر وہ قدیم قانون ٹوٹا یا نہیں؟ ضرور ٹوٹا۔ اور نیا حادث ہوا پس معلوم ہُوا کہ تبدیل قانون کا انکار عقل اور مشاہدہ ظاہرہ دونوں کے برخلاف ہے۔ لہذا دعویٰ باطل ہوا اور جو غرض انکار تھی وہ فوت ہو گئی۔

انبیاء علیہم السلام کے معجزوں سے انکار

یعنی انبیاء علیہم السلام کے معجزوں سے انکار اور امکان معجزہ ظاہر ہو گیا۔ کیوں کہ معجزہ کے موقع پر جو قانون قدرت میں تبدیلی ہوتی ہے وہ بھی ایک مصلحت پر مبنی ہے یعنی تصدیق کلام نبیؐ جو خدا تعالیٰ پر لازم ہے۔ اور وہ نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ نبیؐ ایسے خوارق عادات اور مبطلات قوانین قدرت نہ دکھائے جس سے لوگوں کو یقین کلی حاصل ہو۔ تو جب کہ مصلحت بھی موجود ہوئی اور قدرت بھی خدا تعالیٰ میں موجود ہے۔ جو بدل دینے پر اُسے مدد دے سکتی ہے۔ تو کیوں کسی خلاف عادت امر کا ظہور میں آنا محال سمجھا جاتا ہے۔ خصوصاً جب کہ خود ہی اپنے کام میں اس تبدیلی کے جواز کو ارشاد فرماتا ہو۔ فلما عتوا عما نھوا عنه قلنا لھم کونوا قردۃ خاسئین۔ جب انہوں نے نافرمانی کی اُس سے جس سے وہ منع کئے گئے تھے تو ہم نے اُن سے اُن کی نافرمانی کی وجہ سے کہہ دیا کہ تم دھتکارے ہوئے بندر ہو جاؤ پھر کیا آدمی کا بندر کی صورت میں کر دینا تبدیل قانون قدرت نہیں ہے؟ ادخل یدك فی جیبك تخرج بیضاء اے موسیٰ تم اپنا ہاتھ گریبان میں داخل کرو تو وہ سفید نکلے گا۔ ہاتھ کا سفید و روشن ہو جانا اور معمولی حالت مستمرہ انسانیہ سے تغیر ہو جانا ایک آن میں کیا تبدیل قانون قدرت نہیں ہے؟ نیز فرمایا ہے۔ القی عصاہٗ فاذا ھی ثعبان مبین موسیٰ نے اپنے عصا کو زمین پر ڈال دیا تو ظاہر بظاہر اژدہا بن گیا۔ یا بیّن اژدہا ہو گیا۔ کیا بے حس لکڑی کا جاندار اژدہا بن جانا خرق عادت نہیں ہے؟ نیز فرمایا ہے یبرئ الاکمه والابرص ویحیی الموتیٰ۔ عیسیٰ مادرزاد اندھوں اور مبروص کو اچھا کرتا اور مُردوں کو جلاتا تھا۔ کیوں اہل اسلام کیا مُردے کو زندہ کرنا مادر زاد اندھوں کو بینا کرنا خرق عادت نہیں ہے؟

حضرت موسیٰ سے فرمایا ہے فاضرب بعصاك الحجر فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم۔ کیا عصا سے دریا کو مارنا اور اس کا شگافتہ ہو کر بارہ

رستے پیدا ہو جانے خرق عادت اور تبدیل قانون قدرت نہیں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس حضرت موسیٰ کے عصا کا جادوگروں کے سانپوں کو کھا جانا جو قرآن مجید میں مذکور ہے کیا یہ مثال تبدیل قانون قدرت نہیں ہے؟ بے شک ایسی بے شمار مثالیں قرآن مجید میں اور نیز احادیث صحیحہ و متواترہ میں ملیں گی جو بتا سکیں گی کہ ہزاروں مرتبہ قانون قدرت کو مقنن قانون قدرت یعنی خالق عالم نے اوقات مخصوصہ کے موقعہ پر بدل دیا ہے۔ پس اس کا انکار اصل قرآن سے انکار ہے اور نہ ماننا عقل سے جنگ زرگری کرنی ہے۔ فافہم وتنبہ ولا تکن من الجاہلین۔

وجعلنا لکم فیہا معایش ومن لستم لہٗ برازقین۔ اور ہم نے تمہارے لئے اس زمین میں زندگی بسر کرنے کی چیزیں مثل نباتات اور زراعت کی چیزیں اور کھانے پینے کی اشیاء پیدا کیں اور نیز ان لوگوں کے لئے بھی جن کو تم روزی نہیں پہنچاتے۔ مثل غلاموں اور چوپاؤں کے۔ یعنی باوجودیکہ تمہیں کسی کو روزی پہنچانے کی قدرت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اپنے تئیں بھی۔ کیونکہ نہ تو تم زمین پیدا کر سکتے ہو۔ اور نہ اس میں قوت انبات ڈال سکتے ہو۔ نہ آسمان سے مینہ برسا سکتے ہو۔ جو زراعت و نباتات کو اُگائے اور نہ اس کے اسباب مہیا کر سکتے ہو۔ پھر بھی ہم نے تمہارے لئے اور نیز اُن کے لئے جن کے رزق رساں ہم ہیں۔ عیش و آرام کی اور کھانے پینے کی چیزیں پیدا کیں۔ وان من شیء الا عندنا خزائنہٗ اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں یعنی ہم ہی اس کے مالک اور اس پر قادر ہیں اور جس چیز کو چاہتے ہیں خواہ وہ کسی قسم کی ہو اور کتنی ہی ہو۔ نہ ہماری قدرت کی انتہا ہے اور نہ ان اشیاء کی جن کو ہم پیدا کر سکتے ہیں!! اور ممکن ہے کہ خزائن سے مراد پانی ہو۔ تو اب معنی یہ ہوں گے کہ ہر چیز کا خزانہ جو پانی ہے وہ ہمارے ہی پاس ہے اور پانی کو خزانہ اس وجہ سے کہا گیا کہ اسی سے تمام عالم کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ جیسا کہ سابقاً بیان ہُوا اور خدا تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے کہ وجعلنا من الماء کل شیءٍ حیّ افلا تعقلون۔ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی ہی

سے پیدا کیا ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟ اور غرض اس کلام کی یہ ہے کہ وہ پانی جس سے تمہاری اکل و شرب کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ہمارے ہی اختیار و قبضہ قدرت میں ہے اگر چاہیں بند کر دیں اور اگر چاہیں جاری رکھیں۔ تم کو اس پر بالکل اختیار نہیں ہے۔ پھر بھی تم ہمارے وجود و قدرت و حکمت کا اقرار نہیں کرتے وما ننزلہ الا بقدر معلوم اور ہم اسے نہیں اتارتے مگر بقدر معلوم یعنی ہر شئے کو جن کے خزانے ہمارے پاس ہیں۔ ایک مقدار معین ہی پر پیدا کرتے ہیں۔ نہ زیادہ ہوتی ہیں۔ جو بیکار اور ضائع ہوں اور نہ کم ہوتی ہیں۔ جو بقدر ضرورت کے لئے کافی نہ ہو سکیں اور اگر اس سے مراد مینہ لی جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم اسے ایک اندازہ معین ہی پر برساتے ہیں جو حکمت کے مقتضا کے موافق ہوتا ہے۔ نہ اس میں حد سے زیادتی کرتے ہیں اور نہ کمی تاکہ تمہارے لئے مفید ہو سکے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا ہے کہ جو قطرہ زمین پر گرتا ہے۔ اُس کے ساتھ ایک فرشتہ کو مقرر کر دیا ہے کہ اُسے اُسی مقام پر پہنچا دے جہاں مصلحت الٰہیہ مقتضی ہوئی ہے۔ کافی میں ایک حدیث ہے جس کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ فلیس من القطرۃ تقطر الا ومعہا ملک حتی یضعہا موضعہا ولم ینزل من السمآء قطرۃ الا بعدد معلوم ووزن معلوم الا ما کان من یوم الطوفان علی نوح الخ یعنی کوئی قطرہ زمین پر نہیں گرتا مگر یہ کہ اُس کے ساتھ ایک فرشتہ ہوتا ہے جو اُسے اس کے مقام پر رکھتا ہے۔ اور کبھی آسمان سے مینہ نہیں برسا۔ مگر بقدر عدد معلوم وزن معین۔ الّا بروز طوفان نوح علیہ السلام۔ فانزل من ماء منہمر بلا وزن ولا عدد۔ کہ اُس دن بہت زور سے مینہ برسا بے شمار اور بے وزن مقرر (کیونکہ وہ بغرض عذاب تھا)

وارسلنا الریاح لواقح۔ اور ہم نے ایسی ہوائیں چلائیں جو درختوں کو بارور کرتی ہیں یا ایسی ہوائیں جو ابر کو اٹھائے ہوئے رہتی ہیں (جناب رسالت مآب سے مروی ہے کہ تم لوگ ہوا کو بُرا بھلا نہ کہو۔ اس لئے کہ بعض ہوائیں باعث بشارت ہوتی ہیں۔ اور بعض ڈرانے والی اور بعض لواقح یعنی درختوں کو بارور کرنے والی

ہوتی ہیں۔ تو تم لوگ خدا تعالیٰ سے اچھی ہوا کا سوال کرو۔ اور بُری ہوا سے اس کے ذریعے سے پناہ مانگو) فانزلنا من السماء ماءً فاسقیناکموہ وما انتم له بخازنین پھر ہم نے آسمان سے مینہ برسایا یعنی بلندی سے اُسے نیچے کی طرف گرایا۔ پس اس سے تم کو سیراب کیا۔ حالانکہ تم اُس کے خزانہ دار نہ تھے۔ یعنی کہ اس کا برسانا اور اس کے اسباب کا مہیا کرنا تمہارے اختیار میں نہ تھا۔ وانا لنحن نحیی ونمیت ونحن الوارثون۔ اور بے شک ضرور ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور مار ڈالتے ہیں اور ہم ہی زمین کے وارث و مالک ہیں۔

اس جملہ میں اس امر کا بیان ہے کہ حیات و موت کسی چیز کی ہو وہ سب ہمارے قبضہ میں ہے اور جب کہ قریب قیامت تمام ہی لوگ مرجائیں گے۔ تو کل زمین بلکہ تمام عالم کی اشیاء ہماری ہی طرف رجوع کریں گی۔ آج تو ہر شخص کہتا ہے کہ اس چیز کا میں مالک اور اس کا ہیں۔ مگر اس وقت کوئی کہنے والا نہ ہوگا۔ بلکہ سب کی رجوع خدا تعالیٰ ہی کی طرف ہوگی۔ لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار۔ آج کس کے لئے ملک ہے (بس) اسی معبود حقیقی کے لئے ہے۔ جو اکیلا اور سب پر غالب ہے۔

واضح ہو کہ حیات و موت کا اطلاق بہت سے معنوں پر ہوا ہے۔ منجملہ اُن کے ایک معنی ہدایت و ضلالت کے بھی ہیں اس کی شاہد یہ آیہ ہے۔ لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحیی من حی عن بینۃ اور نیز یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی۔ علم و جہل کے معنی میں بھی آتا ہے الناس موتی واھل العلم احیاء۔ اس پر دلیل ہے یہ مصرع جناب امیر المومنین علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام آدمی جو جاہل ہیں وہ مُردہ ہیں۔ اور اہل علم زندہ ہیں۔ تو جہالت موت ٹھیری۔ اور علم حیات ٹھیرا۔ خشکی و تری و زندگی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس مثال میں خدا تعالیٰ کا یہ کلام ہے وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا۔ اور جو خدا تعالیٰ نے آسمان سے مینہ برسایا۔

تو زمین کو بعد اس کے مرجانے یعنی خشک ہو جانے کے زندہ یعنی تر و تازہ اور قابل انبات کیا اور کون و فساد جسم پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس پر خدا تعالیٰ کا یہ کلام شاہد ہے۔ الذی خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً۔ وہی معبود ایسا ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا ہے۔ تاکہ تمہارا امتحان لے کہ تم میں سے کون نیکوکار ہے!! بقائے نام و عدم بقائے نام پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ اس پر جناب امیر المومنین علیہ السلام کا کلام شاہد ہے۔ ھلک خزان الاموال و العلماء باقون اعیانھم مفقودۃ و آثارھم فی القلوب موجودۃ کیونکہ ھلک بمعنی مات ہے اور باقون بمعنی احیاء ہے۔ اور مطلق بقا و فنا پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے وھو حی لا یموت اس کی دلیل ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ باقی ہے۔ اس کے لئے فنا نہیں۔

لیکن جس معنی سے عام طور پر دونوں لفظ ہمارے استعمال میں ہیں۔ وہ البتہ معرض بحث میں ہے۔ کچھ لوگوں کا تو خیال ہے کہ حیٰوۃ اس حالت کا نام ہے جو کسی موجود خارجی کو حرارت عزیزی کی صورت میں حاصل ہے۔ اور موت اس حالت کا نام ہے جو فنائے حرارت عزیزی سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ حیٰوۃ اس حالت کا نام ہے جو نفس حیوانی کے جسم میں باقی رہنے سے پیدا ہوتی ہے اور موت نام ہے اس حالت کا جو اس کے جسم سے جدا ہو جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اس کے معنی میں فنا اور عدم فنا کو کوئی دخل نہیں ہے۔ البتہ اگر اس کو کون و فساد سے تعبیر کیا جائے۔ تو مضائقہ نہیں۔ یا حرکت و سکون سے یعنی حیات نام حرکت کا ہے اور موت نام سکون کا۔ وھھنا دقائق ابحاث لا یسعھا المقام۔

بیان سوم: مطلب اس بیان و ارشاد کا یہ ہوا کہ آسمانوں میں برجوں کا پیدا کرنا اور انہیں ستاروں سے زینت دینی۔ اور آسمانوں کو شیطان

ف مسئلہ موت و حیات کو انوار نعمانیہ میں دیکھنا چاہیئے۔ ۱۲

رجیم کے وہاں جانے سے محفوظ رکھنا اور اس پر شہاب ثاقب کو دلیل قرار دینا جسے ہر شخص دیکھتا ہے۔ اور زمین کو دراز و وسیع پیدا کرنا اور اس میں مستحکم پہاڑوں کا قائم کرنا اور زمین میں ہر چیز کا باندازہ مقرر پیدا کرنا۔ اور نیز ہر قسم کی مخلوقات کے لئے معاش کے اسباب اس سے نکالنے اور بقدر معین اُن کو نازل کرنا اور بارآور ہواؤں کا چلانا اور آسمان سے مینہ برسا کر انسانوں اور باقی مخلوقات کو اس سے سیراب کرنا اور زندوں کو مردہ اور مُردوں کو زندہ کرنا سوائے خدائے واحد قیوم دیموم صمد حکیم قدیر کے کسی کا کام نہیں۔ پس باوجود اتنی نشانیوں کے دیکھنے کے پھر تم بھٹکتے پھرتے۔ اور وجود صانع عالم کے منکر ہوتے ہو توبو الی اللہ توبۃً نصوحًا۔

سورۂ نحل رکوع ۱۔ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيۡمٌ مُّبِيۡنٌ۔ وَالۡاَنۡعَامَ خَلَقَهَا لَـكُمۡ فِيۡهَا دِفۡءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ وَلَـكُمۡ فِيۡهَا جَمَالٌ حِيۡنَ تُرِيۡحُوۡنَ وَحِيۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ وَتَحۡمِلُ اَثۡقَالَـكُمۡ اِلٰى بَلَدٍ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا بٰلِغِيۡهِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ‌ اِنَّ رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ۔ وَّالۡخَيۡلَ وَالۡبِغَالَ وَالۡحَمِيۡرَ لِتَرۡكَبُوۡهَا وَزِيۡنَةً‌ وَيَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ۔

یہ پانچ آیتیں ہیں۔ جن میں قرآن مجید خدا تعالیٰ کے وجود کے دلائل بیان کرتا ہے۔

پہلی دلیل: اس میں یہ ہے خلق الانسان من نطفة۔ انسان کو اس نے نطفے سے پیدا کیا۔ یہ بھی ایک بہت بڑی دلیل قدرت خداتعالیٰ کی ہے۔ کیونکہ ایک قطرہ منی کو انسان مجسم بناتا۔ جس میں پچاسوں کلیں قائم کی گئی ہیں۔ مثلاً دونوں ہاتھ دونوں پاؤں دو آنکھیں دو کان ایک زبان بتیس دانت دو ہونٹ ایک ناک ایک دل ایک جگر ایک طحال ایک مرارہ دو ریہ بیس انگلیاں اور اُن کے بیسیوں جوڑ اور پھر دماغ اور اس کے چھ خانے اور ان سب کے ساتھ مختلف الاقسام قوتوں کا ہونا۔ اور وقت واحد میں مختلف کام دینے۔

پھر اعصاب الحس کا اعصاب الحرکت سے علاوہ ہونا۔ اور اُن کا مختلف القوے ہونا اور عروق کا رباطات سے جُداگانہ افعال پیدا کرنا۔ پھر اس میں تولید مثل بلکہ امثال کا موجود ہونا۔ اور اس کے سلسلہ کو غیر متناہی بنانا۔ ایک ایسا عجیب حیرت خیز خیال ہے کہ اگر انسان اس معاملہ میں غور کرنے لگے۔ تو اسے سوائے متعجب رہ جانے کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ بات کسی طرح ممکن ہے کہ کوئی آدمی جو نہایت اعلیٰ درجہ کا حکیم اور سائنٹفک بھی ہو اس بات کی کوشش کرے کہ میں اپنی تدابیر حکمیہ سے ایک ہی ایسا بنالوں تو بالکل ناممکن اور محال ہے۔ اور اگر مادہ لاشعوریہ کی طرف اس کی نسبت کی جائے تو کسی طرح عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی۔ کیوں کہ یہ افعال ایسے حکم و مصالح و تدابیر و منافع پر مبنی ہیں کہ جس کی نسبت غیر مدرک چیز کی طرف ہرگز نہیں کی جاسکتی (اگر ان حکمتوں کی تفصیل دیکھنی ہو تو دیکھو کتاب توحید الائمہ) پس لامحالہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا خالق ضرور کوئی نہ کوئی بڑا حکیم و مدبر ہے جس سے بڑھ کر کوئی حکیم نہیں ہو سکتا۔ جس نے کوئی ضروری اور ممکن الحصول چیز ایسی نہیں چھوڑی جو اس کے لئے مہیا نہ کر دی ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے جا بجا اس جلیل الشان دلیل کا ذکر فرمایا ہے۔ سورۂ نحل میں فرماتا ہے وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّ جَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا (اس وقت) تم کچھ نہیں جانتے تھے (اور نہ تم کو کچھ عقل تھی) اور اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل پیدا کئے تاکہ تم لوگ شکریہ ادا کرو۔ پھر ایک مقام پر فرمایا ہے۔ وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا۔ اللہ نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو وفات دیتا ہے۔ اور بعض تم میں سے وہ بھی ہیں جو ارذل عمر تک لوٹا دیئے جاتے ہیں (یعنی ان کی زندگی طولانی کر دی جاتی ہے) تاکہ بعد جاننے کے کچھ بھی نہ جانیں (یعنی بعض آدمی اتنے سن کے بھی ہو جاتے ہیں کہ بسبب بڑھاپے کے تمام چیزوں کو بھول جاتے ہیں۔ سہو و نسیان

ان پر غالب آجاتا ہے رطوبت دماغیہ قوت حافظہ کو خراب کر دیتی ہے۔) اور سورۂ مومن میں فرمایا ہے۔ وصورکم فاحسن صورکم ورزقکم من الطیبات ۔ اس نے تمہاری صورت بنائی تو اچھی صورت تمہاری بنائی۔ اور تمہیں پاک وطیب چیزوں سے روزی دی۔ پھر دوسرے مقام پر فرمایا۔ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ من تراب ثم من نُّطْفَةٍ ثم من علقة ثم یخرجکم طفلا ثم لتبلغوا اشدکم ثم لتکونوا شیوخا ومنکم من یتوفی من قبل ولتبلغوا اجلاً مسمی ولعلکم تعقلون۔ اور سورۂ مومنون میں فرمایا وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ۔ بے شک ہم نے آدمی کو پیدا کیا اُس نطفہ سے جو مٹی سے بنا تھا۔ پھر اُس کو ہم نے نطفہ قرار دیا ایک محفوظ و مستحکم قرار گاہ میں پھر نطفہ کو ہم نے علقہ بنا دیا۔ پھر علقہ کو مضغہ بنا دیا۔ پھر مضغہ (پارہ گوشت) کو ہڈی بنا دیا پھر ہڈی کو ہم نے گوشت اوڑھا یا (یعنی ہڈیوں پر گوشت چڑھایا) پھر ہم نے اس کو دوسری خلقت میں پیدا کر دیا۔ یعنی اس میں روح ڈال کر جمادی صورت سے حیوانی کیفیت میں داخل کر دیا۔ پس مبارک ہے اللہ جو سب سے اچھا پیدا کرنے والا ہے۔

واضح ہو کہ لغت میں نطفہ کے معنے آب خالص اور خلاصۂ آب کے ہیں۔ چونکہ وہ مادہ غلیظہ دافقہ مہینہ جس کو خدا تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے فضلہ ہضم رابع ہے اور خلاصہ ہے تمام رطوبات جسم کا اس لئے اس کو نطفہ کہا گیا۔ جناب امیر المومنین علیہ السلام کے ایک کلام میں بھی پانی کے معنی میں نطفہ کا استعمال ہوا ہے۔

اور منی بھی اسی آب خالص کو کہتے ہیں بسبیل دفق وقوت دفع ہوتا ہے۔ پس کلام خدا تعالیٰ صاف اس امر پہ دلیل ہے کہ خلقت انسان اسی خالص پانی

سے ہے اور اس امر کا ثبوت قرآن مجید کی بہت سی آیات سے ہوتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ فلینظر الانسان مما خلق۔ خلق من ماء دافق یخرج من بین الصلب والترائب۔ پس چاہئے کہ دیکھے انسان کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ پیدا کیا گیا ہے اچھلنے والے پانی سے جو صلب ترائب کے درمیان سے نکلتا ہے۔ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ انا خلقنا الانسان من نطفۃ امشاج۔ بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو آب مخلوط سے۔ اور ایک مقام پر فرماتا ہے۔ قتل الانسان ما اکفرہ من ای شیٔ خلقہ من نطفۃ خلقہ فقدرہ۔ مارا جائے انسان کیسا ناشکرا ہے (خدا تعالیٰ نے) اس کو کس چیز سے پیدا کیا ہے۔ نطفہ سے (پیدا کیا ہے) اس کو پیدا کیا۔ پھر اندازہ رکھا۔ پھر فرماتا ہے وانہ خلق الزوجین الذکر والانثیٰ من نطفۃ اذا تمنیٰ۔ اور یہ کہ اس نے جوڑے مذکر و مونث کو نطفہ سے پیدا کیا۔ جب کہ ٹپکایا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس اور بہت سی آیتیں ہیں۔ جو اس امر کی شاہد ہیں۔ مثل آیہ الم نخلقکم من ماء مھین وھو الذی خلق من الماء بشرا واللّٰہ خلق کل دابۃ من ماء فمنھم من یمشی علی بطنہ ومنھم من یمشی علی رجلین ومنھم من یمشی علی اربع۔ مگر اس کے برخلاف زمانہ حال کے بعض وہ لوگ جو اپنے تئیں محقق کہتے ہیں۔ مدعی ہیں کہ انسان کیڑے سے پیدا ہوتا ہے۔ منی کے ساتھ بہت سے کیڑے جن کی تعداد معلوم نہیں ہو سکتی۔ رحم میں پہنچتے ہیں اور وہاں نمو پاکر بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شیشہ خوردبین سے دیکھا گیا ہے کہ منی میں بندر کی صورت کے کیڑے نظر آتے ہیں۔ اسی قول کی تبعیت سے بعض ہندوستانی متفلسفین نے بھی بسبب ناواقفیت حق کے اس امر کا دعویٰ کر دیا اور فرمایا کہ انسان جونک سے پیدا ہوا ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے خلق الانسان من علق۔ اور علق جونک کو کہتے ہیں۔ دیکھو رسالہ خلق الانسان علی ما فی القرآن۔

لیکن اس بے ہودہ خیال کا جواب یہ ہے کہ خوردبین شیشے سے محسوس کرنا

کوئی برہانی دلیل یا مشاہدی ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جب صحیح نظر میں خطا واقع ہوتی ہے تو اس آلہ کے ذریعے سے محسوس کرنے میں بھی خطا کا واقع ہونا ممکن ہے۔ وہ جو تمہیں خوردبین سے کیڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اور جن کی تعداد بیشمار ہے وہ دراصل خطائے نظری ہے۔ نگاہ جب خوردبین کو توڑ کر پار جاتی ہے۔ تو وہ ذرات جو خوردبین اور کسی ایسی چیز کے درمیان اڑتے رہتے ہیں جس کو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس خوردبین کے ذریعے سے متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ ذرات ادنیٰ حرکت ہوا یا تنفس سے بھی متحرک ہو جاتے ہیں انہیں ذرات کو یہ حضرات کیڑے تجویز فرماتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب وہ کیڑے اتنے چھوٹے ہیں کہ بغیر خوردبین کے نظر نہیں آتے تو یہ کیونکر معلوم ہو گیا کہ ان کی صورتیں بندر کی سی ہیں اور ان میں دُم بھی ہے اس لئے کہ اس قدر تمیز کا ہونا اس امر کو مقتضی ہے کہ ان کے اجزائے مجسم میں تمایز ہو۔ سر۔ دھڑ۔ منہ۔ آنکھ۔ ناک۔ کان۔ دُم وغیرہ اجزا الگ معلوم ہوں۔ اور یہ بات ناممکن ہے جب تک کم از کم وہ جانور چھوٹی چیونٹی کے برابر نہ ہو۔ اور جب اتنا بڑا ہو گا تو بغیر خوردبین کے بھی دکھائی دے گا۔ خوردبین کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ بے شمار کیڑے جو منی کے قطرہ میں دکھائی دیتے ہیں۔ کیا وجہ کہ سب مر جاتے ہیں اور صرف ایک زندہ رہ کر بڑا ہوتا اور آدمی بن جاتا ہے۔ اور کبھی دو۔ مگر کم اور کبھی اس سے دو چار زیادہ مگر وہ النادر کالمعدوم میں داخل ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ہر عورت کے بطن سے عموماً پچاس پچاس سو سو بچے چوہوں کے برابر پیدا ہُوا کرتے۔ اور شاذونادر دو چار۔ حالانکہ یہاں اُس کے برخلاف ہے۔ اور اگر یہ کہو کہ تاکل واقع ہوتا ہے۔ اور ایک کیڑا دوسرے کیڑے کو کھا جاتا ہے اس وجہ سے ایک ہی بڑا ہو کر باقی رہ جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کیڑوں کا ایک دوسرے کو کھا جانا اس وقت ہوتا ہے جب کہ کوئی دوسری چیز اُن کی غذا کے لئے نہ ہو لیکن رحم میں تو آپ رطوبت ہوتی ہے۔ اور اس کثرت سے ہوتی ہے جو ایسے ایسے

لاکھوں کیڑوں کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ خصوصاً جب کہ خون حیض بھی جذب ہو کر رحم میں آجاتا ہے تو تاکل ایسے وقت میں بالکل خلاف مشاہدہ و تجربہ ہے۔ چوتھے یہ کہ خورد بین سے کیڑوں کے نظر آنے کا تب اعتبار ہو سکتا ہے۔ جب کہ ثابت ہو جائے کہ نطفہ کا قطرہ بالکل صاف شفاف ہوتا ہے اور اس میں رسوب نہیں ہوتے۔ حالاں کہ واقعی ایسا ہی ہے کہ نطفہ کے اندر باریک باریک ریزے رسوب کے ہوتے ہیں۔ اور وہی اس میں متحرک نظر آتے ہیں۔ جنہیں یہ خوش فطر کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں۔

رہا یہ خیال کہ خدا تعالیٰ کی کتاب سے بھی اس کا ثبوت ہوتا ہے۔ تو یہ بخیر ہے۔ خلق الانسان من علق۔ میں علق سے مراد جونک ہو تو بھلا اس کو بندر نما کیڑوں سے کیا تعلق ہے کہاں جونک اور کہاں بندر۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ انہیں بزرگوار کے لئے مثل تجویز کی گئی ہے علاوہ بریں اصل تو یہ ہے۔ علق کے معنی خون بستہ کے ہیں۔ جو نطفہ کے استحالہ سے حادث ہوتا ہے۔ پہلے نطفہ بصورت خون مستحیل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ خون بستہ ہو کر لختۂ دم بن جاتا ہے جیسے کئی مقام پر خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ سورۂ مومنون میں ہے۔ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا۔ پھر ہم نے اُسے نطفہ قرار دیا۔ ایک مقام قرارگاہ محفوظ میں۔ پھر ہم نے نطفہ کو خون بستہ کر دیا۔ پھر خون بستہ کو گوشت کے لختہ کی صورت میں پیدا کیا پھر پارہ گوشت کو ہڈی بنا دیا۔ پھر ہڈی پر گوشت چڑھایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اوّل امر انسانی نطفہ ہے۔ پھر وہی نطفہ یعنی آب لزج دفاق علقہ بن جاتا ہے۔ دیکھو علقہ کے معنی لغت میں خون بستہ کے ہیں نہ جونک کے۔ یہ محض تخیل ہے جو برہان کے مقابلہ میں ہرگز تسلیم نہیں ہو سکتا۔

دوسری دلیل: ان آیتوں میں یہ ہے۔ والانعام خلقھا لکم فیھا دفء

ومنافع ومنھا تاکلون ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون و تحمل اثقالکم الی بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس ان ربکم لرؤف رحیم۔ انعام جمع نعم کی ہے اور نعم اونٹ۔ گائے۔ بیل اور بھیڑ... کو کہتے ہیں (مجمع) اور قاموس میں لکھتے ہیں:۔

دِفؔءُ۔ اس لباس کو کہتے ہیں جس سے گرمی کی تکلیف دفع کی جائے۔ اراحۃ۔ انعام کا شام کے وقت چراگاہ سے گھروں پر واپس لانا۔ سرح۔ صبح کے وقت مویشی کا چراگاہ کی طرف لے جانا۔ شق بفتح شین وکسر شین مشقت کو کہتے ہیں۔ معنی آیت یہ ہوئے کہ بھیڑ۔ بکریوں۔ گائے۔ بیلوں اور اونٹوں کو خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ جس میں تمہارے لئے دف ہے (یعنی اُن کی اُون سے ایسے لباس بنا سکتے ہو جو گرمی کو دفع کر سکیں) اور منفعتیں ہیں اور اس سے تم لوگ کھاتے ہو اور تمہارے لئے اس میں جمال ہے۔ جب کہ انہیں چراگاہ سے واپس لاتے یا صبح چرانے کے لئے جاتے ہو۔ اور وہ تمہارے بھاری بوجھوں کو ایسے شہر تک لے جاتے ہیں۔ جہاں تک تم بغیر مشقت نفس کے نہیں پہنچ سکتے۔ بے شک تمہارا پروردگار رافت ورحمت والا ہے۔

ان تین آیتوں میں ہستی پروردگار عالم کی دلیل یہ ہے کہ اولاً تو ان انعام کو ہزاروں تدبیروں اور حکمتوں پر مبنی پیدا کرنا اور ان کے آلات جسم کا باقاعدہ ومترتب ومتناسب واقع ہونا جن میں نہ ان کی ضرورت کی کوئی شے کم ہے اور نہ قدر حاجت سے کوئی شے زائد ہے اور پھر اُن کا منافع انسانیہ کے لئے خاص ہونا ایسے امور ہیں جن کو بغیر خالق حکیم کی طرف نسبت دیئے ہوئے چارہ نہیں۔ اگر بارد ملکوں میں اس قسم کے حیوانات نہ پیدا کئے جاتے۔ جن کے جسم کی اُون قابلِ لباس بنانے کے ہوں۔ تو آدمی کیا کر سکتا جب کہ اس کا بدن اس طرح کا چکنا اور صاف بنایا گیا ہے کہ اس میں کوئی چیز حفاظت بدن کی نہیں ہے آخر ابہی کے ذریعے سے اپنے لیے جاڑے اور گرمی سے بچنے کی حفاظت

کرتا ہے اور دیکھ کر اس قسم کے حیوانات بھی انہیں ملکوں میں زیادہ پیدا ہوتے ہیں
جہاں ان کی ضرورت ہو۔ دیکھ لو کہ ان حیوانات دراز مُو کے مقامات پیدائش زیادہ
وہی ہیں۔ جہاں سردی زیادہ واقع ہوتی ہے۔ بخلاف گرم ملکوں کے۔ اور علاوہ اس
فائدہ کے اور بھی فوائد ہیں۔ مثلاً اُن پر سوار ہونا۔ اُن کو اپنی گاڑیوں میں جوتنا۔
ان سے حرث و دیاست کرنا۔ اُن پر اپنے بوجھوں کا لادنا۔ ومنها تاکلون۔ اور
انہی کو تم کھاتے ہو۔ یعنی انہیں اس مصلحت پر بھی مبنی پیدا کیا گیا ہے کہ اُن سے
تمہاری غذا بھی ہو سکے۔ چنانچہ عموماً یہ حیوانات انسانی غذا میں داخل ہیں اور جن
سے بہت سے جسمانی فائدے اسے پہنچتے ہیں۔ تو اگر یہ حیوانات نہ ہوتے۔ تو انسان
کیا چیز کھا کر اپنے جسم میں وہ قوت پیدا کر سکتا اور وہ ہمت و جرأت لا سکتا جو اُن
کے کھانے سے حاصل ہے۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں ہے بلکہ بطور دوا کے بھی کھایا جاتا
ہے بہت سے اُن میں سے ایسے گوشت ہیں جو دوائے انسان کو استعمال کرائے جاتے
ہیں تو کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اس سلسلہ کا قائم کرنے والا صرف مادہ لاشعوریہ
ہے یا ان حیوانات کی طبیعت۔ حاشا وکلا۔

ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون۔ اور جب یہ جانور
چراگاہ سے دودھ بھرے اپنے پستانوں میں۔ اور سبزہ زار کو چر کر موٹے تازے بنے
ہوئے واپس آتے ہیں۔ یا جب گردنیں اٹھائے دوڑتے ہوئے چراگاہ کی طرف جھنڈ
کے جھنڈ جاتے ہیں۔ تو اس میں تمہارے لئے زینت اور حسن منظر ہے کہ لوگ دیکھ کر
کہتے ہیں ھذا جمال فلان۔ یہ فلاں شخص کا جمال ہے اور اس میں تمہاری عزت ہوتی
ہے کہ تم اتنے جانوروں کے مالک ہو۔ جن کی قیمتیں تمہیں مستغنی کر دینے والی ہیں وتحمل
اثقالکم الخ اور وہ تمہارے بھاری بوجھوں کو ایسے ایسے شہروں تک پہنچا دیتے ہیں۔
جہاں تک تم بغیر سخت مشقت کے پہنچ نہیں سکتے اگر تم اپنی پیٹھوں پر ان بوجھوں
کو لادتے اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے جاتے تو کیا تم کو سخت تکلیف اور
زحمت نہ پہنچتی۔ آج تمہیں بغیر زحمت یہ بات حاصل ہے۔ آخر کس نے ان حیوانات

کو اس طرح تمہارا مسخر بنایا کہ جس طرح چاہو۔ اُن سے فائدہ اٹھالو۔ چاہو ان کے بال کتر کر لباس بناؤ۔ چاہو انہیں ذبح کر کے کھاؤ۔ چاہو اُن پر بوجھ لاد دو اور جہاں چاہو لے جاؤ۔ آخر کس نے اُن کے پیدا کرتے وقت یہ مصلحت مدنظر رکھی تھی۔ جس سبب سے اُن کی پشتیں ایسی سطح بنائی گئیں جن پہ بآسانی اسباب تجارت رکھا جا سکے اور جس پر سواری ممکن ہو سکے۔ بے شک وہی ان مصلحتوں کا سمجھنے والا ہے۔ جو واحد و قہار ہے۔

تیسری دلیل: یہ ہے وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۔ اور تمہارے لئے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ تم اُن پر سوار رہو اور وُہ تمہارے لئے باعث زینت بنیں۔ اور ایسی بھی چیزیں پیدا کرتا ہے۔ جسے تم لوگ نہیں جانتے۔

یہ تینوں حیوانات انسان کے لئے جس قدر فائدہ رساں ہیں۔ اُسے حضرت انسان ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ گھوڑے اگر نہ ہوتے۔ تو انسان کو دشمن کو گرفتار کرنا دشوار ہوتا اسی کے ذریعے سے لاکھوں کوس آدمی جا سکتا ہے اور تکلیف پیادہ روی سے محفوظ رہتا ہے۔ ان پر اپنے بوجھ بھی لاد سکتا ہے۔ اُن سے ایسے بھی فائدے ہیں جو ایک خاصے مصاحب سے ہو سکتے ہیں۔ دشمن کو اندھیری رات میں دیکھ پہچان لیتے اور اپنے سوار کو خبر کر دیتے ہیں۔ تاریکی شب میں ان کو راہیں نظر آتی ہیں۔ کوئی چیز ان کو روک نہیں سکتی۔ سوتے جاگتے ہر حال میں یہ اپنے مالک کا خیر خواہ رہتا ہے۔ یہاں تک کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرما دیا کہ الخیر معقود بنواصیھا الی یوم القیامۃ والمنفق علیھا فی سبیل اللہ کالباسط یدہ بالصدقۃ لایقبضھا فاذا اعددت شیئاً فاعدہ اقرح ارثم محجل الثلثۃ طلق الیمین کمیتا ثم اغر تسلم وتغنم۔ یعنی تمام بھلائیاں گھوڑوں کی پیشانی میں بندھی ہوئی ہیں (مطلب یہ ہے کہ گھوڑے ہمہ تن خیر و خوبی ہیں) اور جو کوئی ان پر اپنا مال صرف کرتا ہے راہ خدا میں وہ ایسا ہے کہ گویا صدقہ و خیرات کے دینے میں ہاتھ کھولے

ہوئے ہیں جسے وہ بند نہیں کرتا۔ پس جب تم کوئی چیز مہیا کرنی چاہو تو گھوڑے کو مہیا کرو۔ جس کی ناک سفید ہو اور تیز اوپر کا ہونٹھ اور جس کی پیشانی پر تھوڑی سی سفیدی ہو۔ مگر غرہ سے کم ہو۔ اور تینوں پاؤں اس کے سفید ہوں مگر گھٹنوں سے زیادہ سفیدی نہ ہو۔ اور اگلا دہنا پاؤں اس کا سفید نہ ہو۔ گھوڑا سرخ رنگ ہو پھر اس کے بعد اغر گھوڑے کا درجہ ہے۔ تو اس کے مہیا کرنے میں تم کو سلامتی رہے گی اور غنیمت حاصل کرو گے"۔ نیز رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ حضرت نے فرمایا ارکبوا الخیل فانہا میراث ابیکم۔ اسماعیل گھوڑوں پر ہو کیونکہ یہ تمہارے باپ حضرت اسماعیل کی میراث ہے اور اس کا سبب ہے جو خود حضرت اور ان کے اوصیاء سے مروی ہے کہ اول من رکبہا اسماعیل پہلے پہل جو گھوڑے پر سوار ہوئے تو وہ حضرت اسماعیل تھے۔ اسی وجہ سے گھوڑوں کو عراب کہتے ہیں۔ پہلے یہ بھی مثل اور جانوروں کے وحشی تھے۔ پس جب کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ خانہ کعبہ کی دیواریں بنائیں۔ تو فرمایا کہ میں تم کو ایک ایسا خزانہ دوں گا۔ جسے میں نے تمہارے لئے ذخیرہ کر رکھا ہے۔ پھر خدا تعالیٰ نے اسماعیل کو وحی کی۔ باہر نکلو اور اس خزانہ کو دعا کرو۔ نکلے تو گھوڑوں کو دیکھا۔ مگر انہیں کچھ خبر نہ تھی کہ دعا کیا ہے اور خزانہ سے کیا مراد ہے۔ اس وقت پروردگار عالم نے ان کو دعا الہام کی۔ پھر تو روئے زمین پر جتنے ہی گھوڑے تھے۔ وہ سب سرزمین عرب پر آگئے۔ اور اُن کو اپنا مالک بنا دیا اور ان کے مطیع ہو گئے (حیوٰۃ الحیوان) اور کتاب قرب الاسناد میں مروی ہے کہ علی بن جعفر صادقؑ نے اپنے بھائی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے سوال کیا کہ گھوڑوں کو جیاد کیوں کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ گھوڑے پہلے وحشی تھے۔ پس حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو اُن کی ضرورت پڑی۔ تو خدا تعالےٰ سے انہوں نے دعا کی کہ ان گھوڑوں کو ان کے لئے مسخر کر دے۔ تو پروردگار عالم نے اُن کو حکم دیا کہ بوقبیس پہاڑ پر جاؤ اور الاھلا الاھلم کر کے پکارو۔ پس وہ گھوڑے ان کی طرف متوجہ اور جیاد میں آکے ٹھہر گئے اس سے اُن کا نام جیاد پڑ گیا۔

کتاب حیوۃ الحیوان میں دمیری نے تاریخ نیشا پوری سے نقل کیا ہے کہ علی بن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا رسولِ خداؐ نے بیان کیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ گھوڑوں کو پیدا کرے تو ہوائے جنوب سے فرمایا کہ انی خالق منك خلقاً اجعلہ عزا لاولیائی ومذلۃ لاعدائی وجمالا لاھل طاعتی۔ میں تجھ سے ایک مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہوں جسے میں اپنے دوستوں کے لئے عزت قرار دوں گا اور اپنے دشمنوں (یعنی کافروں وغیرہ) کے لئے ذلت اور اپنے فرمانبردار کے لئے جمال وحسن۔ تو ہوا نے کہا کہ پیدا کر اے میرے پروردگار۔ پس خدا تعالیٰ نے اس میں سے ایک مٹھی بھر ہوا لی اور اس سے ایک فرس پیدا کیا (یعنی اس ہوا کے ایک جزو کو حکم دیا کہ فرس بن جائے وہ جزو فرس بن گیا) اور فرمایا کہ (اے فرس) میں نے تجھ کو عربی پیدا کیا ہے اور تمام جزو خوبیاں تیری پیشانی میں باندھ دی ہیں اور غنیمتیں تیری پشت پر اختیار کی ہیں اور تجھے وسیع روزی میں ٹھہرایا ہے اور تجھے تیرے غیر چار پاؤں پر مدد دی ہے اور تجھ پر تیرے مالک کو مہربان کیا ہے اور میں نے تجھ کو ایسا بنایا ہے کہ بے پروں کے اڑے۔ فانت للطلب وانت للھرب۔ پس تجھ سے کسی چیز کی طلب کرنے کا بھی کام لیا جا سکتا ہے اور تجھی سے بھاگنے کا بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ اور عنقریب میں تیری پشت پر ایسے لوگوں کو جگہ دوں گا۔ جو میری تسبیح کریں گے اور تحمید کریں گے اور تہلیل وتکبیر کریں گے وہ جو تسبیح وتہلیل کریں گے۔ اور تو اُسے سنے گا۔ تو تو بھی ویسی تسبیح وتہلیل کرے گا۔ پس جب فرشتوں نے سُنا کہ خدا تعالیٰ نے گھوڑے پیدا کئے۔ عرض کی کہ خدایا ہم تیری تسبیح وتہلیل وحمد کرتے ہیں پھر ہمارے لئے تو نے کیا پیدا کیا۔ تو پروردگار عالم نے اُن کے لئے بھی گھوڑے پیدا کئے۔ جن کی گردنیں مثل اونٹوں کی گردنوں کے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے اپنے جس نبی یا رسول کی مدد کرنی چاہتا ہے مدد کرتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ پس جب خدا تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے سامنے دنیا کی تمام چیزیں پیش کیں تو اُن سے فرمایا کہ ان میں سے جس چیز کو چاہو پسند کر لو۔ تو حضرت آدمؑ نے گھوڑوں کو پسند کیا تو خدا تعالیٰ نے فرمایا اخترت عزك

وعن ولدك خالدا ما خلد وباقيا ما بقوا۔ ابد الابدین ودھرالداھرین۔

اور کتاب علل الشرائع میں مروی ہے۔ عن علان باسنادہ رفعہ قال قال امیرالمؤمنین فی جواب ماسأل الیھودی انما قال للفرس اجد لان اول من رکب الخیل قابیل یوم قتل اخاہ ھابیل وانشا یقول اجد الیوم وما ترک الناس دمًا فقیل للفرس اجد لذالک وانما قیل للبغل عدلان اول من رکب البغل آدم وذلک کان لہ ابن یقال لہ معد وکان عشوقا للدواب وکان یسوق بآدم فاذا تقاعس البغل نادیٰ یامعد سقھا فالفت البغلۃ اسم معد فترک الناس معد وقالوا عد وانما قیل للحمار حرلان اول من رکب الحمار حواء ذلک انہ کان لھا حمارۃ وکان ترکبھا لزیارۃ قبر ولدھا ھابیل فکانت تقول فی مسیرھا واحراہ فاذا قالت ھذہ الکلمۃ سارت الحمار واذا اسکت تقاعست فترک الناس ذلک وقالوا حر۔ ترجمہ: باسنادِ مرفوع علان سے مروی ہے اس نے کہا کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام نے ایک یہودی کے سوالات کے جوابات میں فرمایا کہ فرس کو اجد اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اول اول جو کوئی گھوڑے پر سوار ہُوا وہ قابیل تھا۔ جب کہ اس نے ہابیل کو قتل کیا اور یہ کہتا تھا کہ اجد الیوم وما ترک الناس دمًا۔ میں ایسا دیکھتا ہوں کہ لوگ اب کوئی خون نہ چھوڑیں گے (یعنی آج سے میں نے سلسلہ خونریزی کا نکال دیا جس سے برابر خونریزی کیا کریں گے) اسی وجہ سے گھوڑے کو اجد کہتے ہیں اور خچر کو عد اس وجہ سے کہتے ہیں کہ پہلے پہل حضرت آدمؑ اس پر سوار ہوئے ان کا ایک فرزند تھا جس کا نام معد تھا۔ وہ چوپاؤں کا بڑا شیدا تھا اور جناب آدمؑ کو سوار کرکے لے جاتا تھا۔ پس جب خچر چلنے میں کوتاہی کرتا تو آپ فرماتے تھے اے معد اسے کھینچ کے لے چلو۔ اس وقت سے خچر معد کے نام کو پہچاننے لگا۔ کثرتِ استعمال سے لوگوں نے معد چھوڑ کر عد کہنا شروع کر دیا۔ اور حمار (گدھے) کو حر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ابتداً اس پر حوّا سوار ہوئیں اس پر اپنے فرزند ہابیل کی قبر کی زیارت کو جایا کرتی

تھیں۔ اور چلتے وقت واحرہ کہتی تھیں۔ اس آواز سے گدھا چلتا تھا اور جب چپ ہو جاتیں تو ٹھیر جاتا۔ اس سبب سے اس کا نام حر ہو گیا۔

جناب صادقؑ سے مروی ہے تسعۃ اعشار الرزق مع صاحب الدابۃ روزی کے نو حصے اس شخص کے ساتھ ہوتے ہیں، جو گھوڑا پالتا ہے۔ اور از بسکہ یہ جانور انسانوں کے لئے فائدہ مند ہیں۔ اس لئے ان کو شوق دلایا گیا اور ایسے ثوابات اُن کے واسطے مقرر کئے گئے۔ جن سے ان لوگوں کو ان حیوانات کے پالنے کا شوق ہو چنانچہ ایک اور حدیث میں ہے من اشتری دابۃ کان لہ ظہرھا وعلی اللہ رزقھا۔ جو کوئی گھوڑا خریدتا ہے۔ سواری تو وہ خود کرتا ہے۔ مگر روزی اس گھوڑے کی خدا کے ذمے لازم ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اُس کی علف و خوراک کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ نیز کافی میں مروی ہے کہ حضرت نے یونس بن یعقوب سے فرمایا اتخذ حمارا یحمل رحلک فان رزقہ علی اللہ تو اپنے اسباب لادنے کے واسطے گدھا خرید کر اس کی روزی کا ذمہ دار تو خدا تعالیٰ ہے نیز ثواب الاعمال میں جناب ابوالحسنؑ سے مروی ہے کہ من ارتبط فرسا اشقر اغرا واقرح فان کان اغر سائل الغرۃ بہ وضح فی قوائمہ فھو احب الی لم یدخل بیتہ فقرا دام ذلک الفرس فیہ وما دام ایمانا فی ملکہ لا یدخل فی بیتہ حنق۔ جو کوئی گھوڑا پالے (سُرخ رنگ کا۔ اغر یا اقرح ہو جس کی پیشانی کی سفیدی لمبی ہو۔ اور اگر پاؤں میں بھی سفیدی ہو۔ تو وہ مجھے زیادہ پسند ہے) تو اس کے گھر میں مفلسی نہ داخل ہو گی۔ جب تک وہ گھوڑا رہے گا۔ اور نہ لڑائی جھگڑا اس کے گھر میں ہو گا۔ (حنق معنے کینہ و عداوت)

نیز حضرت سے مروی ہے کہ فرماتے تھے کرھنا البھیم من الدواب الا الجمل والبغل یعنی ہمیں اور چوپائے بہائم مکروہ معلوم ہوتے ہیں سوائے اونٹ اور خچر کے۔ بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں قسم کے مخلوق الٰہی بڑے زحمت کش کم خوراک اور حد سے زیادہ فائدہ رساں ہیں۔ نیز جناب محمد باقرؑ سے مروی ہے ان احب المطایا

الی الحمر کان رسول اللّٰہ یرکب الحمار اسمہ یعفور۔ تمام سواریوں سے زیادہ پسند مجھ کو گدھے ہیں۔ کیوں رسول خداؐ یعفور نامی گدھی پر سوار ہوا کرتے تھے۔ نیز کتاب حیوۃ الحیوان دمیری میں منقول ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا۔ ان الشیطان لا یخیل احداً فی دار فیہا فرس عتیق۔ شیطان کسی ایسے شخص کے سامنے نہیں آتا جس کے گھر میں اصل عربی گھوڑا ہو۔

دمیری نے حیوۃ الحیوان میں خچر کے بیان میں لکھا ہے۔ البغل مرکب من الفرس والحمار ولذلک صار لہ صلابۃ الحمار وعظم الات الخیل وکذلک شحیحہا ای صوت۔ تولد من صہیل الفرس ونہیق الحمار وھو عقیم لا یولد لہ لکن فی تاریخ ابن بطریق فی حوادث سنۃ اربع واربعین واربعمأۃ ان بغلۃ نبابلس ولدت وشر الطباع ما تجاذبتہ الاعراق المتضادۃ والاخلاق المتباینۃ والعناصر المتباعدۃ واذا کان الذکر حمارا یکون شدید الشبہ بالفرس واذا کان الذکر فرسا یکون شدید الشبہ بالحمار ومن العجب ان کل عضو فرضۃ منہ یکون بین الفرس والحمار وکذلک اخلاقہ لیس لہ ذکاء الفرس ولا بلادۃ الحمار وفی ان اول انتجہا قارون ولہ صبر الحمار وقوۃ الفرس ویوصف برداءتہ الاخلاق والتلون لاجل الترکیب لکنہ یوصف مع ذلک بالھدایۃ فی کل طریق یسلکہ مرۃ واحدۃ وھو مع ذلک مرکب الملوک فی اسفارھا وقعیدۃ الصعالک فی قضاء اوطارھا مع احتمالہ الاثقال وصبرہ علی طول الاثقال وروی عساکر فی تاریخ دمشق عن علی بن ابی طالبؑ ان البغال کانت تتناسل وکانت اسرع الدواب فی نقل الحطب لنار ابراھیم خلیل الرحمٰن فدعا علیہا فقطع اللّٰہ نسلہا وعن ابی اسحٰق ابن حماد بن ابی حنیفۃ انہ قال کان عندنا طحان رافضی لہ بغلان سمی احدھما ابا بکر والآخر عمر فرمحہ احدھما فقتلہ فاخبر جدی ابوحنیفۃ بذلک فقال انظروا الذی رمحہ فہو الذی سماہ عمر فوجدہ کک وفی مجمع الطبرانی الاوسط من حدیث

انس قال لما انهزم المسلمون یوم حنین و رسول اللہ علی بغلتہ الشہباء التی یقال لہا دلدل فقال لہا رسول اللہ دلدل اسدی فالصقت بطنہا بالارض حتی اخذ النبیؐ حفنۃ من تراب فرمی بہا وجوہہم قال ہم لا ینصرون قال فانہزم القوم وما رمیناہم بسہم ولا طعناہم برمح ولا ضربناہم بسیف"

وقال فی الحمار لیس فی الحیوان ما ینزو علی غیر جنسہ ویلقح الا الحمار والفرس وہو ینزو واذا حمل لہ ثلثون شہراً ومنہ نوع یصلح لحمل الاثقال ونوع لین الاعطاف سریع العدو ویسبق براذین الخیل ومن عجیب امرہ اذا شم رائحۃ الاسد رمی نفسہ علیہ من شدۃ الخوف منہ یرید بذلک الفرار ویوصف بالہدایۃ الی سلوک الطرقات التی مشی فیہا ولو مرۃ واحدۃ وحدۃ السمع وللناس فی مدحہ وذمہ اقوال متباینۃ بحسب الاغراض فمن ذلک ان خالد بن صفوان والفضل بن عیسی الرقاشی کانا یختاران رکوب الحمیر علی رکوب البراذین فاما خالد فلقیہ بعض الاشراف بالبصرۃ علی حمار فقال ما ھذا یا بن صفوان فقال ھذا عیر من نسل الکدر یحمل الرحلۃ ویبلغ العقبۃ ویقل داؤہ ویخف دواؤہ ویمنعنی من ان اکون جبار فی الارض وان اکون من المفسدین واما الفضل فانہ سئل عن رکوبہ فقال انہ اقل الدواب مؤنۃ واکثرہا معونۃ واخفضہا مہوی واقربہا مرتقا۔ الخ (بحار السماروالعالم)

خچر مرکب ہے گھوڑے اور گدھے سے۔ اسی وجہ سے اس میں مضبوطی وسختی تو گدھے کی سی ہے۔ اور ہاتھ پاؤں کا بڑا ہونا گھوڑے کا سا ہے۔ اسی طرح اس کی آواز گدھے اور گھوڑے کی آواز سے مرکب ہے۔ اس کی نسل نہیں ہوتی۔ لیکن ابن بطریق کی کتاب میں واقعات ۴۴۴ھ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ نابلس میں ایک خچری کے بچہ پیدا ہوا اور بدترین طبائع وہ طبیعت ہے۔ جس میں متضاد نسلیں اور متخالف طبیعتیں اور متنافر عناصر داخل ہو گئے ہوں۔ جب کہ نر گدھا ہو تو بچہ جو خچر پیدا ہو گا۔ وہ گھوڑے

سے زیادہ مشابہ ہوگا۔ اور اگر نر گھوڑا ہو تو بچہ جو اس سے خچر پیدا ہوگا۔ وہ گدھے سے زیادہ مشابہ ہوگا۔ عجائبات میں تو یہ بات ہے کہ اس خچر کے جس عضو کو دیکھو۔ وُہ گھوڑے اور گدھے دونوں کے درمیان ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس اس کے اخلاق بھی ان دونوں کے اخلاق کے درمیان ہوں گے۔ نہ تو اس میں گھوڑے کی سی ذکاوت ہے اور نہ گدھی کی سی بلادت ہے۔ کہتے ہیں کہ پہلے پہل قارون نے اس قسم کا بچہ پیدا کرایا تھا۔ اس میں گدھے کا سا تو صبر و تحمل ہے اور گھوڑے کی سی طاقت ہے اور بد اخلاق مشہور ہے۔ اپنی بد ترکیبی کی وجہ سے۔ لیکن باوجود اس کے اس کی یہ صفت بھی ہے کہ جس راہ میں ایک مرتبہ چلا ہے۔ اُسے خوب پہچانتا ہے اور باوجود اس کے یہ بھی ہے سفروں میں یہ بادشاہوں کی سواری ہے اور فقیروں کی سواری ہے۔ حاجتوں کے پورا کرنے میں (یعنی امیر و غریب سب اس پر سوار ہوتے ہیں) با ایں ہمہ بوجھ بھی بہت اُٹھاتا ہے۔ دُور تک لے جانے میں بوجھ کا بھی تحمل کرتا ہے۔ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ خچروں کی بھی نسل ہوتی تھی۔ مگر چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے جلانے کے لئے جو لکڑیاں لائی جاتی تھیں انہیں بہت جلد جلد لاتا تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے بددعا کی تھی۔ اس وجہ سے خدا نے اس کی نسل کو قطع کر دیا۔ ابو اسحاق ابن حماد ابن ابو حنیفہ سے مروی ہے اس نے کہا کہ ہمارے مکان کے پاس ایک رافضی خراسی رہتا تھا۔ اس کے دو خچر تھے۔ ایک کا نام ابوبکر رکھا تھا۔ دوسرے کا عمر۔ اُن میں سے ایک نے دوسرے کو لات ماری۔ وُہ مر گیا۔ اس نے میرے دادا ابو حنیفہ سے بیان کیا۔ اس نے کہا کہ جس نے مارا ہے اس کا نام عمر ہوگا۔ اب دیکھا تو ایسا ہی پایا کہ عمر نامی خچر نے ابوبکر نامی خچر کو مار ڈالا تھا۔ اور طبرانی کے مجمع اوسط میں انس سے مروی ہے کہ جب حنین کے دن مسلمانوں نے شکست کھائی اور رسول اللہ اپنی سُرخ بغلی پر سوار تھے۔ جس کا دلدل نام تھا اسے فرمایا کہ اسدی اس نے اپنا پیٹ زمین سے ملا دیا۔ یہاں تک کہ حضرت نے ایک مٹھی مٹی زمین سے اٹھائی اور کفار کی طرف پھینکی اور فرمایا ھُمْ لَا یُنْصَرُوْنَ

انس کہتے ہیں کہ تمام فوج کفار بھاگ گئی بغیر لڑے۔ حالانکہ ہم نے نہ انہیں تیر مارا نہ نیزہ مارا۔ نہ تلوار ماری۔ نیز دمیری نے گدھے کے بیان میں یہ بھی لکھا ہے کہ حیوانوں میں سے کوئی جانور اپنی غیر جنس سے نہ جفتی کرتا ہے اور نہ اسے بچہ جنوا تا ہے۔ مگر گدھے اور گھوڑے کہ یہ غیر جنس سے بھی جفتی کرتے ہیں اور کوئی تیس مہینہ کے بعد جفتی کرتے ہیں۔ ان گھوڑوں میں سے وہ بھی ایک ہے جو صرف بوجھ لادنے کے کام میں آتا ہے۔ اور ایک قسم ایسے ہی نیک مزاج اور تیز رفتار ہوتی ہے اور بربول گھوڑوں سے بھی تیز رفتار ہوتی ہے۔ اس میں عجیب بات یہ ہے کہ شیر کی بو سونگھ کر اپنے تئیں اس پر گرا دیتا ہے۔ شدت خوف سے حالانکہ وہ بھاگنا چاہتا ہے۔ جن راہوں میں یہ چل چکا ہے اگرچہ ایک ہی مرتبہ ہو۔ تب بھی اس راہ کو خوب پہچانتا ہے اس کی قوت سامعہ بہت زیادہ ہے اور آدمی کی رائے اس کی مدح وذم میں مختلف ہے۔ مثلاً خالد ابن صفوان اور فضل ابن عیسیٰ رقاشی گدھے کی سواری کو گھوڑے کی سواری پر ترجیح دیتے تھے۔ خالد کی یہ نقل ہے کہ اس کی بصرہ میں کسی شریف آدمی سے ملاقات ہوئی اور یہ گدھے پر سوار تھا۔ اس نے پوچھا کہ اے فرزند ابن صفوان یہ کیا۔ اس نے جواب دیا کہ یہ گدھا نسل سے کدار کے ہے بوجھ اٹھاتا ہے ناہموار رستوں میں مجھے پہنچاتا ہے۔ مرض اس کا کم ہے اور دوا اس کی خفیف ہے۔ نیز یہ کہ مجھ کو جابر اور مفسد ہونے سے روکتا ہے۔ اور فضل سے جو پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ گدھا تمام جانوروں سے مشقت میں کم ہے اور مدد میں بڑھا ہوا ہے۔ اترنے میں پست ہے اور چڑھنے میں نزدیک ہے۔ اس کے پالنے میں بہ نسبت اور جانوروں کے مشقت کم ہے اور سفر میں یہ آدمی کا بہت معین ہوتا ہے۔ یہی کہ بسبب پست قد ہونے کے اس پر چڑھنا اور اترنا بہت آسان معلوم ہوتا ہے۔ بخلاف گھوڑے کے۔ (بحار السمار والعالم)

(سورہ نحل رکوع ۲) هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ۝ یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ النَّخِیْلَ وَ

الْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ
لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ
لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ
وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ
وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝

یہ مجموعی سات آیتیں ہیں۔ جن میں خالق تعالیٰ شانہٗ نے۔ اٹھارہ نشانیاں اپنے وجود قدرت کی بتائی ہیں۔ جن میں بالاجمال ارضی اور سماوی کثیر نشانیاں آگئیں بحیثیت موقوف اور موقوف علیہ ہونے کے۔ تبصرۃً خدا تعالیٰ نے ان نشانیوں کو اور نیز ان ہی کے امثال اور آیات قدرت و بینات حکمت کو قرآن مجید میں بہت سے مقامات اور مختلف مواقع پر بیان کیا ہے اور علیٰ ہذا القیاس قصص وغیرہ کو بھی مکرر ارشاد کیا ہے، اس کے کئی سبب ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ قاعدہ کی بات ہے الکلام اذا تکرر تقرر جب کوئی کلام مکرر کسی پر وارد کیا جاتا ہے تو وہ اس کے ذہن میں راسخ ہوجاتا ہے۔ چونکہ مقصود خدا تعالیٰ یہ تھا کہ اپنے وجود کی دلیلیں اور قدرت کے آثار کو منکرین و کفار و مشرکین کے دلوں میں ثابت و مستقر کرے۔ اس لئے کئی کئی مرتبہ ایک ہی بات کو بیان کیا گیا ہے تاکہ سنتے سنتے کچھ تو اثر ہوگا۔ اور علیٰ ہذا القیاس سابقین کے قصے جو لاحقین کے لئے عبرت ہوتے ہیں اور ان سے پچھلے لوگ سبق حاصل کرکے راہِ راست اختیار کرتے ہیں۔ مکرر بیان فرمائے خصوصاً جن قصوں میں زیادہ عبرت ہے انہیں کئی کئی مرتبہ ارشاد فرمایا ہے۔ دوسرے یہ کہ عموماً یہ بات اہل زبان کو معلوم ہے کہ کسی ایک بات کو دو چار مرتبہ بیان کرنا فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے کیونکہ سننے والا اسے سنتے سنتے اور دیکھتے دیکھتے اکتا اور گھبرا جاتا ہے تو اس تکرار سے ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کی یہ غرض ہو کہ دیکھو ہم اپنے چھوٹے سے کلام میں

ایک ہی بات کو مکرر بیان کرتے اور مختلف لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی بات کو آٹھ آٹھ دس دس مرتبہ دہراتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مخالف فصاحت و بلاغت نہیں اور نہ ان کا پڑھنا اور سننا اور دیکھنا کسی کو ناگوار معلوم ہوتا ہے بلکہ جس قدر اسے زیادہ پڑھے اسی قدر کیفیت زیادہ آتی جاتی ہے اور حظ زیادہ بڑھتا جاتا ہے۔ تیسرا سبب یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن مجید مجموعاً ایک مرتبہ نہیں نازل ہوا بلکہ ضرورت کے وقت پر ایک ایک دو دو یا اس سے زیادہ آیتیں نازل ہوا کرتی تھیں۔ جب کوئی موقع پیش آیا تب ہی چند آیتیں بذریعہ جبرئیل آگئیں اور اس وقت جب کہ عہد رسول تھا۔ بہت ایسے مواقع مختلف اشخاص کے آنے جانے سے ایسے پیش آتے تھے۔ جنہیں اسی بات کو دوہرانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ مثلاً ہم آدمیوں ہی کو اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ اختلاف جلسہ اور اختلاف اشخاص واردین و سائلین کی وجہ سے ایک ہی بات کو کئی مرتبہ دہرانا پڑتا ہے۔ اور یہ بات خلاف فصاحت بھی نہیں ہے گو اگر جمع کر کے لکھنے میں یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے مگر قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ تب بھی اس میں تکرار سے کوئی خرابی نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ اس کی تکرار ہی کچھ دل کو بھلی لگتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان آیتوں کے بیان کرنے سے خدا تعالیٰ کی دو غرضیں ہیں۔ ایک یہ کہ آثار دلیل موثر ہیں کیونکہ حوادث کا وجود عدم پر راجح نہیں ہو سکتا۔ جب تک کوئی مرجح نہ ہو۔ لامحالہ کسی نہ کسی مرجح کا مان لینا لازم ہو جاتا ہے اور چونکہ یہ حوادث حکمت و مصلحت کثیرہ پر مبنی ہیں۔ اس لئے یہ بھی ماننا لازم ہوتا ہے کہ ان کا حادث کرنے والا حکیم و مدبر و عالم و خبیر بھی ہے۔ تو اس ترکیب سے یہ آیات برہانی دلیلیں وجود صانع عالم کی ہو جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہی آیات خدا تعالیٰ کی قدم و وجوب کو بھی ثابت کرتی ہیں۔ اس لئے کہ جب یہ حادث بغیر محدث کے اور یہ آثار بغیر موثر کے موجود نہیں ہو سکتے تو ضروری ہے کہ وہ موثر واجب الوجود بھی ہو۔ کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ان حادث چیزوں کا

حادث کرنے والا بھی اگر حادث ہی ہو۔ تو ضروری ہوتا ہے کہ اس کا بھی کوئی اور حادث کرنے والا ہو۔ اور اگر یہ بھی حادث ہو۔ تو اس کا بھی حادث کرنے والا ضرور ہی ہو گا۔ پس اگر یہی سلسلہ قائم رہے تو تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے لہذا ضرور ہوا کہ اسے واجب الوجود تسلیم کیا جائے۔ ورنہ اس سلسلہ میں کوئی ایسا نہ ملے گا۔ جس سے ابتدائے عالم ہو سکے کیونکہ کوئی حادث اول نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ وہ بھی کسی کا پیدا کیا ہوا ہو گا۔

پس چونکہ ان آیات و آثار کا بیان کرنا عمدہ اغراض کو پورا کرتا ہے۔ اس لئے ان کا مکرر بیان کرنا نہایت مستحسن ہوا۔ الغرض پہلی آیت ان آیتوں میں هو الذی انزل من السّمآء ماء منه شراب ومنه شجر فیه تسیمون ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہی معبود وہ ہے۔ جس نے آسمان سے مینہ برسایا۔ اسی سے تمہارے پینے کا پانی ہے اور اسی سے اشجار پیدا ہوتے ہیں۔ جس میں تم آزادی سے اپنے جانوروں کو چراتے ہو۔ اس ایک نشانی میں تین نشانیاں خدا تعالیٰ نے بیان کی ہیں۔ ایک آسمان سے مینہ برسانا جو بہت سے اسباب پیدا کرنے پر موقوف ہے۔ مثلاً دریا۔ ہوائے تند۔ بخارات۔ حرارت آفتاب۔ برودت کرۂ زمہریر وغیرہ اور یہ تمام امور بجائے خود ایسے ہیں جو صانع حکیم کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتے کیونکہ اس طرح کا عجیب سلسلہ تدبیر مدبر کے سوا ناممکن ہے۔ دوسرے اس کو ایسا بنانا جو ہر صورت سے ہمارے پینے میں استعمال ہو سکے۔ اور اُسے ایسا لطیف بنانا جو ہماری غذا کو قابل ہضم بنا دے۔ اور عروق میں اخلاط بدن کے ساتھ رہ کر انہیں ہر مقام پر پہنچا دے۔ جہاں جہاں اُن کا پہنچنا ضروری ہے اور پھر خود جزو بدن نہ ہو کر گردہ و مثانہ کی راہ سے باہر نکل جانا اور کچھ سمیت امواد فاسدہ بدن کو اپنے ساتھ دفع کر دینا۔ تیسرے اُسی سے اشجار و نباتات کا پیدا کرنا جو ہزاروں ہی حکم و مصالح پر مبتنی ہے۔ منجملہ اُن کے اس سے نباتات کا پیدا ہونا جن سے حیوانات کا علف ہو سکے اور انسان اُس سے فائدہ اٹھا سکے۔

چونکہ یہ نشانی اعظم نعمات الٰہیہ سے ہے۔ بار بار خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی یاد دہانی فرمائی ہے۔ چنانچہ سورہ بقر میں فرمایا وانزل من السمآء ماءً فاخرج به من الثمرات رزقا لکم۔ پھر فرمایا۔ وما انزل اللّٰہ من السمآء من ماءٍ فاحیی به الارض بعد موتها۔ پھر سورہ ابراہیم میں فرمایا وانزل من السمآء ماءً فاخرج به من الثمراتِ رزقا لکم۔ پھر سورہ حجر میں فرمایا فانزلنا من السمآء ماءً فاسقیناکموه۔ پھر سورہ نحل میں فرمایا جو ابھی آیت مذکور ہوئی۔ پھر اسی سورہ میں فرمایا واللّٰہ انزل من السمآء ماءً فاحیا به الارض بعد موتها۔ پھر سورت طٰہٰ میں فرمایا۔ وانزل من السمآءِ ماءً فاخرجنا به ازواجا من نباتٍ شتّیٰ۔ پھر سورہ انبیاء میں فرمایا وجعلنا من الماء کل شيءٍ حیٍّ افلا یومنون۔ پھر سورہ مومنون میں فرمایا وانزلنا من السمآء ماءً بقدرٍ فاسکناه فی الارض وانا علی ذهاب به لقادرون۔ پھر سورہ نور میں فرمایا واللّٰہ خلق کلّ دابّةٍ من ماءٍ فمنهم من یمشی علی بطنه ومنهم من یمشی علی رجلین ومنهم من یمشی علی اربع۔ پھر سورہ فرقان میں فرمایا وانزلنا من السمآء ماءً طهوراً لنحیی به بلدةً میتا ونسقیه مما خلقنا انعامًا واناسی کثیراً۔ پھر سورہ عنکبوت میں فرمایا۔ ولئن سألتهم من انزل من السمآء ماءً فاحیا به الارض من بعد موتها لیقولنّ اللّٰہ۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے مینہ برسا کر مردہ زمین کو زندہ کیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے۔ پھر سورہ روم میں فرماتا ہے وینزل من السمآء ماءً فیحیی به الارض بعد موتها۔ اور نازل کرتا ہے (اللہ) آسمان سے پانی تو اس سے زمین کو بعد اس کے مردہ ہونے کے زندہ کرتا ہے۔ پھر سورہ لقمان میں فرمایا وانزلنا من السمآء ماءً فانبتنا فیها من کل زوج کریم اور ہم نے آسمان سے مینہ برسایا تو زمین میں ہر کریم جوڑا پیدا کیا (جس سے حیوانات و نباتات مراد ہیں) پھر سورہ تنزیل میں فرمایا ہے اولم یروا انا نسوق الماء الی الارض الجرز فنخرج به زرعا تاکل منه انعامهم وانفسهم افلا یبصرون۔ کیا ان

لوگوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو زمین خشک کی طرف کھینچتے ہیں۔ تو اس سے ہم زراعت کو نکالتے (پیدا کرتے) ہیں جس سے اُن کے چوپائے اور وُہ خود کھاتے ہیں۔ پھر اسی سورہ میں فرمایا ہے۔ الم تر ان اللہ انزل من السماء ماءً فاخرجنا بہ ثمرات مختلفا الوانہا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے مینہ برسایا تو ہم نے اس سے مختلف رنگ کے پھل پیدا کئے۔ پھر سورہ زمر میں فرمایا۔ الم تر ان اللہ انزل من السماء ماءً فسلکہ ینابیع فی الارض ثم یخرج بہ زرعًا مختلفا الوانہ۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے مینہ برسایا۔ پھر اس کو زمین میں چشمے بنا کر چلایا۔ پھر اس سے مختلف رنگ کی زراعت پیدا کرتا ہے۔ پھر سورہ زخرف میں فرمایا ہے۔ والذی نزل من السماء ماء بقدر فانشرنا بہ بلدۃً میتا کذلک تخرجون۔ اور جس نے آسمان سے بہ اندازہ مینہ برسایا۔ پھر ہم نے اس سے مُردہ شہر کو زندہ کیا۔ اسی طرح (مرنے کے بعد) تم بھی نکالے (زندہ کئے) جاؤ گے (یعنی قیامت کے قریب) پھر سورہ جاثیہ میں فرمایا وما انزل اللہ من السماء من رزقٍ فاحیابہ الارض بعد موتہا اور جو اللہ نے آسمان سے روزی (مینہ) برسائی۔ پس اُس سے زمین کو بعد مُردہ ہونے کے جلایا۔ پھر سورہ واقعہ میں فرمایا۔ افرأیتم الماء الذی تشربون ءانتم انزلتمہ من المزن ام نحن المنزلون۔ کیا تم نے دیکھا اس پانی کو جسے تم پیتے ہو؟ کیا تم نے اسے برسایا؟ بادل سے یا ہم (اس کے) برسانے والے ہیں۔ پھر سورہ ملک میں فرمایا قل ارایتم ان اصبح ماءکم غورًا فمن یاتیکم بماءٍ معین۔ اے ہمارے رسول (لوگوں سے) کہہ دو کہ تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر تمہارا پانی گہرائی میں چلا جائے۔ تو کون تمہارے پاس آب شیریں لائے گا۔ (سوائے خدا کے کوئی نہیں) پھر سورہ نبا میں فرمایا وانزلنا من المعصرات ماءً ثجاجا۔ پھر سورہ عبس میں فرمایا فلینظر الانسان الی طعامہ انا صببنا الماء صبا۔ الخ پس چاہیئے کہ آدمی اپنے طعام کی طرف دیکھے کہ ہم نے پانی جاری کیا حق جاری کرنے کا۔ اور غرض پروردگار عالم کی اس تکرار سے یہی ہے۔

کہ دیکھو ہم نے تم کو اتنی بڑی نعمت مرحمت فرمائی۔ کہ اگر ہم اسے نہ پیدا کرتے یا اب اسے خشک کر دیں۔ تو تم اس کی مانند پیدا کر لینے پر ہرگز قادر نہیں ہو۔ پھر بھی تم وجود خالق و منعم تعالیٰ شانہ کے منکر ہی رہو گے۔

دوسری آیت۔ ینبت لکم بہ الزرع والزیتون والنخیل والاعناب من کل الثمرات ان فی ذالک لآیۃ لقوم یتفکرون۔" ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے لئے اس (مینہ) سے زراعت اور زیتون اور درخت ہائے خرما۔ اور انگور۔ اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ بے شک اس میں ضرور دلیل ہے۔ اُس قوم کے واسطے جو غور و فکر کرے"۔ یہ نشانی اگرچہ ایک ہی عمل کے تحت میں ہے۔ لیکن اگر غور کرو تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ دراصل اس آیت میں پانچ نشانیاں ہیں۔ ۱ زراعت کا پیدا کرنا جس سے انسان کو زیادہ تعلق ہے۔ اور قدرے حیوانات کو بھی۔ اس زراعت کے تحت میں تمام وہ چیزیں آگئیں۔ جن کی کاشت کی جاتی ہے۔ خواہ وہ ایسی ہوں جن کے تخم پیس کر بصورت آرد استعمال میں آتے ہوں۔ جیسے جو۔ گیہوں وغیرہ اور خواہ وہ ایسی ہوں۔ جو بغیر آرد کئے ہوئے استعمال میں آتی ہوں۔ پختہ کھائی جاتی ہوں۔ یا خام یا نمک کے ساتھ مستعمل ہوں۔ یا بے نمک کے۔ الغرض اس کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ اور اس کی ہر قسم انسان کے لئے اعظم نعمات سے ہے کہ اسے کس کس صورت میں کیسے کیسے موقعوں پر استعمال میں لاتا ہے۔ ۲ زیتون کا پیدا کرنا۔ جو بہت سے اغراض و فوائد پر مشتمل ہے۔ منجملہ اُن کے یہ ہے کہ اس کے کھانے والے کے شیطان قریب نہیں آتا۔ چنانچہ امام رضاؑ سے مروی ہے کہ رسول خدا نے امیر المومنینؑ سے فرمایا علیک بالزیت کلہ وادھن بہ فان من اکلہ وادھن بہ لم یقربہ الشیطان اربعین۔ تم کو لازم ہے کہ زیت کھایا کرو اور اس سے تدہین کرو کیونکہ جو کوئی اُسے کھاتا ہے۔ یا اُس سے تدہین کرتا ہے۔ تو شیطان چالیس روز تک اس کے قریب نہیں آتا۔ دوسرے یہ صفرا کا قاطع ہے اور بلغم کو دفع کرتا ہے۔ پٹھوں کو مضبوط کرتا ہے۔ صورت پر رونق لاتا ہے۔ سانس کو خوشبودار کر دیتا ہے۔

غم کو زائل کرتا ہے۔ چنانچہ عیون الاخبار میں جناب امام رضاؑ سے مروی ہے کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ علیکم بالزیت فانہ یکشف المرۃ ویذھب البلغم ویشد العصب ویحسن الخلق ویطیب النفس ویذھب بالغمۃ تیسرے یہ اس سے ریاح بھی دفع ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسحٰق بن عمار کہتے ہیں۔ کہ میں نے جناب صادقؑ سے عرض کی انھم یقولون الزیتون یھیج الریاح۔ لوگ کہتے ہیں کہ زیتون ریاح پیدا کرتا ہے۔ اور اُسے ہیجان میں لاتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ان الزیتون یطرد الریاح۔ زیتون تو بے شبہ ریاح کو دفع کرتا ہے۔ چوتھے یہ کہ اس کے کھانے میں انبیاء کے کھانے سے مشابہت ہے چنانچہ منقول ہے۔ کہ جناب امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ ما اقفر بیت یا تدمون بالخل والزیت و ذلک ادام الانبیاء۔ وہ گھر ہمیشہ آباد رہے۔ جس کے رہنے والے سرکہ اور روغن زیتون کو استعمال میں لاتے ہیں اور یہ سالن ہے انبیاء علیہم السلام کا۔ نیز مروی ہے کہ امام رضاؑ نے دریافت فرمایا زیت خوشبو پیدا کرتا ہے۔ بلغم کو دفع کرتا ہے۔ رنگ کو صاف کرتا ہے۔ پٹھوں کو مضبوط کرتا ہے۔ درد کو دفع کرتا ہے۔ غصہ کو بجھاتا ہے۔ اور حضرت صادقؑ سے مروی ہے کہ زیت ابرار لوگوں کا تیل ہے۔ اور اخیار لوگوں کا کھانا ہے۔ اطباء کے نزدیک بھی یہ نہایت عمدہ چیز ہے۔ چنانچہ بحار میں نقل کیا ہے کہ قال البغدادی الزیت اسم الدھن المعتصر من الزیتون ویعتصر من فضیجہ ویسمی زیتا عذبا۔ ومن خامہ ویسمی زیت انفاق و زیت رکابی والاول حار باعتدال والثانی بارد یابس فیہ قبض والثانی اوفق للاصحاء وجید للمعدۃ ویشد اللثۃ وتقوی الاسنان اذا امسک فی الفم ویمنع من دود العرق والعتیق من الزیت العذاب صالح للادویۃ ولا یکون فیہ حرارۃ ظاھرۃ یحلل ویلین البشرۃ یمنع من الجمود ویلین الطبیعۃ ویضعف قوۃ الادویۃ ویکتحل بالعتیق منہ لحدۃ البصر وانکحل بالمعزل المبیض تزیل بیاض العین الرقیق وھو دواء شریف للعین اذا ادیم استعمالہ حتی انہ یقوم مقام القدح فی العین عند نزول الماء خصوصًا

اذا قطر فی العین وحکت العین بطرف المیل انتہی۔ اس میں اور کتاب بحر الجواہر میں ہے کہ الزیت بارد فی الدرجۃ الاولی وقیل فیہ رطوبۃ یقوی الاعضاء ویعین علی جبرما انکسر منہا حتی انہ مثل دھن الورد فی کثیر من افعالہ ویقاوم السموم ویقتل الدیدان ویقوی الاسنان والمعدۃ ویحفظ الشعر ویمنع سرعۃ الشیب وینفع من الجرب والقروح کلہا واللثۃ الدامیۃ ویشد الاسنان۔ انتہی

۳ درختہائے خرما کا پیدا کرنا۔ جس کا طول قامت واستقامت واستحکام اور پھول اور پھل سب کے سب عجائب قدرت پروردگار عالم کا نمونہ ہیں اور جو ایسے ملکوں کے واسطے نہایت ہی عظیم دولت ہیں۔ جہاں اُن کو خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ یعنی ملک عرب کے واسطے ۴ انگوروں کا پیدا کرنا۔ جو اپنی بیل۔ اور برگ وبار اور منافع وخواص کے لحاظ سے بہت بڑی آیت آیات الٰہیہ اور بہت بڑی نعمت نعمات ربانیہ سے ہے۔ پانچویں مرتبہ یہ فرمایا کہ ومن کل الثمرات۔ یعنی دنیا کے تمام ہی پھل تو ہمارے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ جن کو نہ تم حصر کر سکتے ہو۔ اور نہ شمار اور نہ اُن کے فوائد کا جو برابر تمہیں پہنچتے رہتے ہیں کسی طرح کا شکریہ ادا کر سکتے ہو۔ ان فی ذالک لآیۃ لقوم یتفکرون۔ بے شک اس میں دلیل ہے اس قوم کے لئے جو غور وفکر کرے۔

چونکہ ان تمام چیزوں کی خلقت صرف ایک مینہ برسانے سے ہوئی ہے اس وجہ سے خدا تعالیٰ نے ان تمام اشیاء کو ایک ہی نشانی اور دلیل فرمایا ہے۔ اگرچہ ہر ایک ان میں سے بجائے خود اکبر دلائل۔ اور اعظم براہین سے ہے۔

ازبسکہ انسان کی زندگی بغیر کھانے اور پینے کے ناممکن ہے۔ اور یہ چیزیں زیادہ اس سے قریب ہیں۔ اور ان سے اس کی محبت بہت ہے۔ اس لئے خدا تعالےٰ نے اقرب الی الفہم ہونے کی وجہ سے جا بجا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ پانی کا ذکر تو سابق میں ہوا اور ان امور کو بھی مکرر ارشاد فرمایا ہے۔ سورہ رعد میں فرماتا ہے ومن کل الثمرات جعل فیہا زوجین اثنین۔ سورہ ابراہیم میں فرماتا ہے فاخرج بہ من الثمرا

رزقا لکم۔ سورہ حجر میں فرمایا ہے۔ وانبتنا فیھا من کل شیئ موزون۔ سورہ نحل میں وُہ ہے جو ابھی مذکور ہوا۔ نیز فرمایا۔ ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منہ سکرا ورزقا۔ کھجوروں کے پھلوں اور انگور کو پیدا کیا۔ اس سے تم شراب اور روزی بناتے ہو۔ سورہ طہٰ میں فرمایا فاخرجنا بہ ازواجا من نبات شتی کلوا وارعوا انعامکم۔ پھر ہم نے پانی کے ذریعہ سے مختلف قسم کی نباتات کے جوڑے پیدا کئے تم بھی کھاؤ اور اپنے چوپاؤں کو بھی چراؤ۔ سورہ مومنون میں فرمایا فانشانا لکم بہ جنات من نخیل واعناب لکم فیھا فواکہ کثیرۃ ومنھا تاکلون۔ پھر ہم نے تمہارے لئے اس (پانی) سے چھوارے اور انگوروں کے باغ لگائے جن میں تمہارے واسطے بہت سے میوے ہیں۔ اور اس کو تم کھاتے ہو۔" سورہ شعراء میں فرمایا۔ اولم یروا الی الارض کم انبتنا فیھا من کل زوج کریم۔ ان فی ذالک لآیۃ۔ کیا لوگوں نے دیکھا نہیں زمین کو کہ ہم نے اس میں ہر کریم جوڑے (نباتات کے) اگائے۔ بے شک اس میں ضرور دلیل ہے (وجودِ خدا کی) سورہ فاطر میں فرمایا۔ فاخرجنا بہ ثمرات مختلفا الوانھاؕ۔ ہم نے پانی کے ذریعے سے مختلف الالوان پھل پیدا کئے۔ سورہ یٰسین میں فرمایا وآیۃ لھم الارض المیتۃ احییناھا واخرجنا منھا حبا فمنہ یاکلون وجعلنا فیھا جنّٰت من نخیل واعناب وفجرنا فیھا من العیون لیاکلوا من ثمرہ وما عملتہ ایدیھم افلا یشکرون۔ سبحان الذی خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض ومن انفسھم ومما لا یعلمون۔ اور ان (آدمیوں) کے واسطے ایک دلیل (وجود خالق عالم کی) مردہ زمین ہے۔ ہم نے اسے زندہ کیا اور اس سے دانہ نکالا تو یہ لوگ اس کو کھاتے ہیں۔ اور ہم نے اس زمین میں باغ لگائے۔ خرما اور انگوروں سے اور اس میں چشمے جاری کئے تا کہ لوگ اس کے پھل کھائیں۔ حالانکہ اُن کے ہاتھوں نے (ان پھلوں اور باغوں کو) نہیں بنایا ہے۔ کیا یہ لوگ شکر نہیں کرتے (یعنی ان کا تو فرض ہے کہ ہمارا شکریہ ادا کریں۔ نہ یہ کہ ہماری نعمتوں کا انکار کر دیں اور

اپنے خالق ہی کو بھول جائیں) پاک ہے وہ جس نے تمام جوڑے زمین کی نباتات اور ان کے نفسوں اور اُن چیزوں سے پیدا کیے۔ جنہیں وہ جانتے بھی نہیں۔ سورہ زمر میں فرمایا ثم یخرج بہ زرعًا مختلفا الوانہ۔ پھر اس سے پیدا کرتا ہے مختلف رنگ کی زراعت" سورہ واقعہ میں فرمایا۔ افرأیتم ما تحرثون ءانتم تزرعون ام نحن الزارعون۔ تم نے دیکھا۔ جسے بوتے ہو؟ کیا تم اس کی زراعت کرتے ہو یا ہم زراعت کرنے والے ہیں؟ (یعنی دراصل تو ہم ہی اُس کے اُگانے اور پیدا کرنے والے ہیں۔ سورہ نباء میں فرمایا لنخرج بہ حبًّا و نباتا و جنات الفافا۔ (ہم نے بادلوں سے مینہ برسایا) تاکہ اس سے دانہ اور نباتات اور گھنے گھنے باغ پیدا کریں پھر سورہ عبس میں فرمایا فانبتنا فیھا حبًّا و عنبًا و قضبًا و زیتونًا و حدائق غلبًا وفاکھۃ وابا متاعا لکم ولانعامکم" پس ہم نے اس (زمین) میں دانہ اُگائے اور انگور، تازہ ثمراخ، زیتون، درخت خرما گھنے گھنے باغ میوہ اور چارا تمہارے فائدے اور تمہارے چوپاؤں کے واسطے" تو کیا اس پر بھی منکر ہی رہو گے اور وجود صانع عالم کا اب بھی تم کو یقین نہ ہوگا"

تیسری آیت۔ وسخر لکم الیل والنہار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ ان فی ذالک لآیات لقوم یعقلون ہے۔ جس کے معنی یہ ہے کہ اور مسخر کیا تمہارے واسطے رات اور دن۔ آفتاب اور ماہتاب کو اور تمام ستارے اس کے حکم کے تابع ہیں۔ بے شک ان میں نشانیاں (یا دلیلیں) ہیں۔ عقل والی قوم کے واسطے" خدا تعالیٰ نے اس آیت میں چھ نشانیوں کا ذکر کیا۔ ایک رات دوسرے دن۔ تیسرے آفتاب۔ چوتھے ماہتاب۔ پانچویں تمام ستارے۔ چھٹے ان سب کا مسخر لامرہ ہونا۔ کیا غیر خدا تعالیٰ میں یہ طاقت ہے کہ رات۔ دن۔ چاند سورج اور ستارے پیدا کردے؟ ان میں سے کسی ایک کا پیدا کرنا تو ممکن ہی نہیں۔ چہ جائے کہ اتنی چیزوں کا پیدا کرنا اور پھر ان کو اس طرح مسخر رکھنا کہ جب چاہے اور جس قدر چاہے۔ اسی وقت اور اسی قدر ان کی حرکت ہو سکے۔ نہ زیادہ

نہ کم۔ جس کے لئے جو مقدار حرکت مقدر کر دی ہے۔ اسی قدر حرکت کر سکتے ہیں اور جو وقت مقدر کر دیا ہے اسی وقت پر اپنے مقام معہودہ پر آجاتے ہیں۔ علاوہ اس کے ان میں ہزاروں قسم کے فوائد کا ہونا۔ جن میں کا کچھ حصہ پہلے بیان ہو چکا ہے، سوائے واحد ازلی قادر مطلق کے کس سے ہو سکتا ہے۔

ازبسکہ یہ علامتیں بہت روشن دلیلیں حکمت وصنعت وقدرت وعلم باری تعالیٰ کی ہیں۔ اور جنہیں دیکھ کر انسان اپنے خالق کے وجود پر نہایت ایقان کے ساتھ ایمان لا سکتا ہے۔ اس لئے بطور یاد دہانی کے ان آثار و آیات علامات کو بھی خدا تعالیٰ نے مکرر قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ سورہ اسرے میں فرماتا ہے۔ وجعلنا اللیل والنہار آیتین فمحونا أیۃ اللیل وجعلنا آیۃ النہار مبصرۃ لتبتغوا فضلا من ربکم ولتعلموا عدد السنین والحساب۔ ہم نے رات اور دن کی دو نشانیاں قرار دیں۔ پس رات کی نشانی کو تو مٹا دیا۔ اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا (یا تو رات کی نشانی سے چاند اور دن کی نشانی سے آفتاب مراد ہے۔ تو مطلب یہ ہوگا۔ کہ ہم نے چاند کو سیاہ پیدا کیا۔ جس میں بذاتہ روشنی نہیں ہے۔ بلکہ آفتاب سے روشنی حاصل کرتا ہے اور آفتاب کو بذاتہ روشن بنایا اور یا رات اور دن کی نشانی سے خود یہی شب و روز مراد ہوں۔ تو اس صورت میں یہ مطلب ہوگا۔ کہ ہم نے رات کو تاریک اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم لوگ فضل خدا کو حاصل کرو۔ اور برسوں کے عدد اور حساب کو معلوم کرو) اور سورہ نور میں فرمایا یقلب اللہ اللیل والنہار ان فی ذالک لعبرۃ لاولی الابصار۔ اللہ تعالیٰ رات اور دن کو الٹتا رہتا ہے۔ بے شک اس میں آنکھ والو کے لئے عبرت ہے (کہ سمجھیں اور غور کریں۔ اپنے معبود کو ان کے ذریعے سے پہچانیں۔ اور انکار سے درگزر کریں) سورہ فرقان میں ارشاد فرمایا۔ الم تر الی ربک کیف مد الظل ولو شاء لجعلہ ساکنا ثم جعلنا الشمس علیہ دلیلا۔ ثم قبضناہ الینا قبضا یسیرا وھو الذی جعل اللیل لباسا والنو

سباتاً وجعل النہار منشورًا۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے پروردگار نے کیونکر سایہ کو دراز کیا (بڑھایا) اور اگر وہ چاہتا تو اسے ٹھیرا دیتا۔ پھر ہم نے اس پر آفتاب کو دلیل قرار دیا (ابن عباس کہتے ہیں کہ آفتاب کا سایہ پر دلیل ہونا اس معنی سے ہے۔ کہ اگر آفتاب نہ ہوتا تو سایہ کی شناخت نہ ہوتی۔ اور اگر روشنی نہ ہوتی تو تاریکی کی شناخت نہ ہوسکتی تعرف الاشیاء باضدادھا) پھر ہم نے اس (سایہ) کو تھوڑا تھوڑا سمیٹا۔ (کیونکہ جس قدر آفتاب بلند ہوتا رہتا ہے۔ اتنا ہی سایہ گھٹتا جاتا ہے۔) اور وہی وہ (معبود برحق) ہے جس نے رات کو لباس بنایا اور نیند کو بدنوں کی راحت اور دن کو روحوں کے پھیلنے کا یا آدمیوں کے اپنی ضرورتوں کے لئے پھیلنے کا وقت بنایا۔ پھر فرمایا۔ تبارك الذی جعل فی السماء بروجًا وجعل فیہا سراجًا وقمرًا منیرا۔ وھو الذی جعل اللیل والنہار خلفة لمن اراد ان یذکر او اراد شکورًا۔ مبارک ہے وہ (معبود برحق) جس نے آسمان میں بُرج قائم کئے۔ اور اس میں چراغ (آفتاب) اور روشن چاند قرار دیا اور اسی نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا خلیفہ بنایا۔ کہ دن کے فوت شدہ کام کو رات میں کرلو۔ اور رات کے فوت شدہ کام کو دن میں کرلو۔ یا خلفہ سے یہ مراد ہو کہ ایک دوسرے کا مخالف بنایا کہ ایک تاریک ہے اور ایک روشن ان لوگوں کے لئے جو یاد کریں یا شکریہ بجالانے کا ارادہ کریں" اور سورہ قصص میں فرمایا۔ ومن رحمته جعل لکم اللیل والنہار لتسکنوا فیہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون۔ اور اپنی رحمت سے اس نے تمہارے لئے رات اور دن بنائے۔ تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور تاکہ اس (خالق) کا فضل حاصل کرو۔ اور تاکہ تم شکر بجا لاؤ اور سورہ لقمان میں فرمایا۔ الم تر ان اللہ یولج اللیل فی النہار و یولج النہار فی اللیل وسخر الشمس والقمر کل یجری الی اجل مسمّٰی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ بے شک خدا تعالیٰ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور اسی نے آفتاب اور ماہتاب کو مسخر کیا ہے کہ ہر ایک چلتا رہے گا۔

ایک مدت مقررہ تک"۔ سورہ یٰسین میں فرمایا۔ وآیۃ لھم اللیل نسلخ منہ النھار فاذا ھم مظلمون والشمس تجری لمستقر لھا ذالک تقدیر العزیز العلیم والقمر قدرناہ منازل حتّٰی عاد کالعرجون القدیم لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النھار وکلٌّ فی فلک یسبحون۔ اور ایک نشانی ہے اُن کے (آدمیوں کے) واسطے رات جس سے ہم دن کو نکال لیتے ہیں۔ تو ناگاہ وہ تاریکی میں پڑ جاتے ہیں۔ اور آفتاب چلتا ہے اپنے اندازہ معین پر (جو رفتار اُس کی گرمی وسردی، ربیع وخریف وغیرہ کے لئے مقرر ہے) یہ ہے غالب اور علم رکھنے والے کی تقدیر۔ اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں (اٹھائیس) مقرر کیں۔ یہاں تک کہ وہ ہوگیا۔ مثل پرانی ٹہنی کے (جو خشک ہوکر خم ہو جاتی ہے) نہ سورج سے ممکن ہے کہ وہ چاند تک پہنچ جائے (کیونکہ سورج کی رفتار بہ نسبت چاند کے بہت سست ہے) اور نہ رات سابق ہوتی ہے دن پر۔ اور ہر ایک آسمان میں تیرتے (چلتے ہیں جیسے ملاح پانی میں) اور سورہ مومن میں فرمایا اللّٰہ الذی جعل لکم اللیل لتسکنوا فیہ والنھار مبصرا۔ معبود برحق وہ ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا۔ پھر سورہ زمر میں فرمایا۔ خلق السمٰوٰت والارض بالحق یکوّر اللیل علی النھار ویکوّر النھار علی اللیل وسخر الشمس والقمر کلٌّ یجری لاجل مسمّٰی۔ پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پھراتا ہے رات کو دن پر اور دن کو رات پر یعنی یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کو لاتا ہے اور چاند سورج کو مسخر کیا کہ ہر ایک اُن میں سے اندازِ مقرر کے مطابق رفتار کرتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس اور بھی اس مضمون کی آیتیں ہیں اور اُن کے تکرار سے صرف یاددہانی مقصود ہے۔ تاکہ باربار سنتے رہنے سے وہ غفلت جو لازمہ انسانی ہے۔ دور ہوتی ہے۔ نعمات خالق کا خیال دماغ میں پختہ ہو۔ اور ایمان میں تازگی ہوتی رہے۔

چوتھی آیت۔ وما ذرا لکم فی الارض مختلفا الوانه ان فی ذالک لاٰیة لقوم یذکرون۔ اور نیز تمہارے لئے مسخر کر دیا تمام اُن چیزوں کو جنہیں اس نے زمین میں پیدا کیا ہے۔ دراں حالانکہ وہ مختلف رنگوں کی ہیں۔ خواہ از قسم لباس ہوں یا از قسم طعام۔ یا از قسم منکوحات۔ اور خواہ از قسم نباتات ہوں یا جمادات یا حیوانات ان سب کو مختلف رنگوں، صورتوں اور ہیئتوں پر پیدا کر کے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے بے شک اس میں اُن لوگوں کے لئے دلیل اور نشانی ہے جو یاد کریں اور عبرت و نصیحت پکڑیں۔

پانچویں آیت۔ وهو الذی سخر البحر لتاکلوا منه لحما طریا وتستخرجوا منه حلیة تلبسونها وتری الفلک مواخر فیه ولتبتغوا من فضله ولعلکم تشکرون۔ اور وہی وہ ہے جس نے دریا کو مسخر کیا تاکہ تم لوگ اُس سے تازہ گوشت (مچھلیوں کا) کھاؤ۔ اور اُس سے زینت کی چیز (موتی مونگا وغیرہ) نکالو۔ اور تم اے رسول کشتی کو اس میں چلتے ہوئے دیکھتے ہو (کیسی عجیب حکمت خدا تعالیٰ نے اس میں قرار دی ہے۔ اور کیونکر لکڑی میں پانی پر ٹھیرے رہنے کی طاقت دی ہے۔ اور پانی کو اس کے اٹھائے رہنے کی) اور تاکہ تم لوگ اُس کا فضل حاصل کرو اور تاکہ تم لوگ اُس کا شکریہ ادا کرو۔"

اس آیت میں جس نشانی کا ذکر خدا تعالیٰ نے کیا ہے۔ وہ بھی ایسی عظیم الشان نشانی ہے۔ جس میں اور ویسی ہی لاکھوں نشانیاں موجود ہیں نہ اس کے اندر جو مخلوقات پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کے اقسام کا حصر و شمار ہو سکتا ہے۔ اور نہ اُن کے فوائد کی انتہا دریافت ہو سکتی ہے۔ اسی دریا میں وہ جانور خدا تعالیٰ نے مخلوق فرمایا ہے جس میں یہ طاقت ودیعت کی گئی ہے کہ قطرہ نیساں کو بقول مشہور چند دنوں تک اپنے پیٹ میں رکھ کر لولو لا کر دیتا ہے۔ اور گوہر شاہوار۔ اسی کو اتنا بڑا بنا دیتا ہے کہ کبوتر کے انڈے کے برابر ہو جائے اور اسی کو اتنا چھوڑ کر دیتا ہے جو رائی کے دانے سے مل جائے۔ اسی کی قیمت میں لاکھوں دینار بھی کبھی کافی نہیں ہوتے

اور یہی کبھی چند پیسوں میں بھی آجاتا ہے۔ اور اگر اس کے فوائد پر نظر کیجئے۔ تو وہ بھی بے شمار ہیں۔ جو کتب طبیہ کے دیکھنے سے معلوم ہوسکیں گے۔ اسی دریا سے عنبر پیدا ہوتا ہے۔ جو اپنی خوشبو کی حیثیت سے ترویح روح بھی کرتا ہے۔ اور اپنے خواص و منافع کے لحاظ سے دوائے امراض بھی ہے۔ اسی سے مونگا پیدا ہوتا ہے۔ جو کس قدر عجیب مصنوع باری تعالٰی ہے کہ اس میں جمادیت اور نباتیہ دونوں ہی صفتیں ہیں۔ یہی وہ پتھر ہے جو مثل نباتات کے شاخ و بیخ رکھتا ہے اور نمو کرتا ہے اور یہی وہ نباتات ہے جو پانی سے نکلتے ہی پتھر کی طرح سخت ہو جاتی ہے مرج البحرین یلتقیٰن بینھما برزخ لا یبغیان ۔ فبای الاء ربکما تکذبٰن ۔ یخرج منھما اللؤلؤ والمرجان ۔ فبای الاء ربکما تکذبٰن ۔ کو یاد کیجئے اور اسی سے ہزاروں مچھلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جن میں ہر ایک عجائب قدرت الٰہیہ کا نمونہ ہے اور بعض تو اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ ایک انگل سے بھی قد ان کا کم ہوتا ہے۔ اور بعض اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ پہاڑ بھی ان کے جسم سے مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ مستطرف میں اس قسم کی چند حکایتیں نقل کی ہیں۔

علاوہ اس کے اس قدر عجیب الخلقت ہونے کے جو اکبر دلائل وحدانیت باری تعالٰی سے ہے اگر ان مچھلیوں کے خواص و منافع پر نظر ڈالی جائے تو اور بھی حیرت ہوتی ہے اور بے تامل کہنا پڑتا ہے کہ بے شک ان کا خالق بڑا حکیم اور توانا ہے۔

یہی وہ دریا ہے جس میں تمام وہ چیزیں تقریباً پیدا ہوتی ہیں جن کی خلقت روئے زمین پر ہوتی ہے۔ مثلاً گھوڑا کہ جس طرح زمین پر پیدا ہوتا ہے اسی طرح پانی میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ طاؤس زمین پر بھی پیدا ہوتا ہے۔ پانی میں بھی۔ انسان زمین پر پیدا ہوتا ہے اور پانی میں بھی۔ اگرچہ ان میں کسی قدر اختلاف صورت و خواص و حالات ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اکثر یہ مشابہت کی وجہ سے ان پر بھی اسی نام کا اطلاق ہوتا ہے۔ جو بری حیوانات پر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ

انسان بحری جسے ایک سیاح ۱۹۱۰ء میں شہر دہلی میں بطور نمائش کے لایا تھا۔ اور دو آنہ کے ٹکٹ کے ذریعے سے ہزاروں ہی آدمیوں نے اُسے دیکھا۔ اس کی صورت ایک عورت کی تھی جس کے دونوں ہاتھ۔ ناک۔ دونوں کان۔ دہانہ اور منہ۔ چہرہ۔ سینہ۔ غرض کمر تک عورت سے مشابہ تھی۔ شرمگاہ بھی مثل عورتوں کے تھی۔ البتہ اس سے نیچے کا حصہ مچھلی سے مشابہ تھا۔ اس سیاح کا بیان تھا کہ میں نے جس دریا سے اسے گرفتار کیا ہے۔ اس میں مجھ کو ایک مرد۔ ایک عورت اور ایک بچہ دکھائی دیئے تھے۔ جال میں پھنساتے وقت دو تو نکل گئے۔ مگر یہ پھنس کر رہ گئی"۔ لیکن چونکہ اس کی زندگی پانی سے تھی۔ اس لئے باہر آکر مر گئی!! یہ سیاح اسے دواؤں کی قوت سے محفوظ کر کے ہندوستان تک لایا تھا۔

غرض اور اسی قسم کے عجائب بحر ہیں جو کسی طرح عجائب بر سے کم نہیں ہیں اگر ان میں چند قسموں کے عجائب پر اطلاع حاصل کرنی ہو تو کتاب عجائب المخلوقات یا حیوۃ الحیوان دمیری کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یا جن کتابوں کو اب یورپ کے نئے سیاح فلسفہ دانوں نے ترتیب دیا ہے۔

اسی میں وہ کشتی بھی چلتی ہے۔ جس سے انسان ہزاروں ہی قسم کے فوائد تجارت و سیاحت وغیرہ حاصل کر سکتا بلکہ کرتا رہتا ہے اور چونکہ یہ نشانی بھی اکبر آیات الٰہیہ سے تھی تو جا بجا قرآن مجید میں اس کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ بقر میں فرمایا ہے۔ والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس۔ اور (دلیل وجود خدا تعالیٰ ہے) اس کشتی میں جو انسان کے فائدے کے واسطے دریاؤں میں چلتی ہے اور سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا۔ ربکم الذی یزجی لکم الفلک فی البحر لتبتغوا من فضلہ۔ تمہارا رب وہ ہے جو کشتی کو دریا میں ہنکاتا ہے۔ تاکہ تم اس کا فضل حاصل کرو" اور سورہ فرقان میں فرمایا۔ وھو الذی مرج البحرین ھذا عذب فرات وھذا ملح اجاج۔ وہی (معبود) وہ ہے جس نے دونوں دریاؤں کو ایک دوسرے میں داخل کر دیا۔ یہ تو میٹھا اور شیریں ہے۔ اور یہ کھاری کڑوا ہے" کس قدر

عجیب بات ہے کہ ایک ہی ساتھ دو دریا ملے ہوئے بہتے ہوں۔ ایک کا تو پانی میٹھا ہو اور دوسرے کا کھاری۔ نہ میٹھا کھاری کو میٹھا بنا سکے۔ نہ کھاری میٹھے کو کھاری کر سکے۔ حالانکہ دونوں ایک ہی خطہ پر بہتے ہیں۔ اگر اس میں کچھ شک ہو تو دیکھ لو دجلہ اور سمندر کے اتصال اور دونوں کی ملوحۃ و عذوبۃ کو۔ اور سورۂ روم میں فرمایا۔ ومن ایاتہ ان یرسل الریاح مبشرات ولیذیقکم من رحمتہ ولتجری الفلک بامرہ۔ اسی کی نشانیوں میں سے ہے ہواؤں کا یہ بشارت بھیجنا۔ اور تاکہ (اس کے ذریعے سے) کشتی اس کے حکم سے جاری ہوئی اور تاکہ تم اس کا فضل حاصل کرو" اور سورہ لقمان میں فرمایا۔ الم تر ان الفلک تجری فی البحر بنعمۃ اللہ لیریکم من ایاتہ۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ کشتی دریا میں اللہ تعالیٰ کی نعمت سے چلتی ہے۔ تاکہ وہ تمہیں (اپنے وجود و قدرت کی) نشانیاں دکھائے۔ کیونکہ بغیر کسی خالق حکیم کے ایسے امور کا صدور ناممکن ہے۔

چھٹی آیت۔ والقی فی الارض رواسی ان تمید بکم وانہاراً وسبلا لعلکم تھتدون۔ اور ڈالے اس نے زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ۔ اور بنائیں نہریں اور راہیں تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔ یعنی ہم نے تم کو یہ دلیلیں سنائیں اور یہ علامتیں دکھائیں۔ تاکہ اب بھی ہدایت یافتہ ہو۔ اور جہالت سے بھٹکتے نہ پھرو۔

پہاڑوں کے خواص

بنا بر بیان صاحب مستطرف کے اس وقت تک جتنے پہاڑ روئے زمین پر شمار میں آسکے ہیں۔ ان کی تعداد ایک سو اٹھانوے ہے جن میں سے بعض کا طول ساٹھ میل کا ہے اور بعض کا طول تین سو میل کا ہے مثلاً کوہ سراندیپ ہے کہ اس کا طول دو سو کچھ اوپر ساٹھ میل ہے۔ اور یہی وہ پہاڑ ہے۔ جس پر نشان قدم حضرت آدمؑ بتایا جاتا ہے۔ اس میں یاقوت اور ہیرا بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی پہاڑ پر عود اور سیاہ مرچ اور آہوئے مشکی پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا کوہ روم ہے جس میں سد سکندری

واقع ہے۔ اس کا طول دو ہزار ایک میل کا ہے اور یہ بحر ظلمات تک ختم ہوتا ہے تیسرا کوہ ابو قبیس ہے یہ اس وجہ سے مشہور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کا یہ نام رکھا ہے۔ کیونکہ اسی سے انہوں نے قبس یعنی آگ حاصل کی تھی۔ چوتھا جبل القدیس ہے جو رات کے وقت بغیر چراغ کے روشنی دیتا ہے۔ پانچواں جبل اروند ہے جو ہمدان میں واقع ہے۔ اس کی چوٹی سے چشمہ بہتا ہے۔ مگر سال میں صرف چند روز اور ہر طرف سے اس کا پانی جاری ہوتا ہے۔ اور لوگ اس سے زراعت کو سیراب کرتے ہیں۔ چھٹا جبل شام ہے۔ جس کا رنگ کوئلہ کا سا سیاہ ہے۔ مگر اس کی مٹی ایسی سفید ہے کہ جس سے کپڑے سفید کئے جاتے ہیں۔ ساتواں کوہ ہرمز ہے۔ اس میں یہ عجیب بات ہے کہ اس میں سے ایک گڑھے میں پانی ٹپکتا رہتا ہے مگر جب آدمی اس کے قریب پہنچتا ہے تو پانی رک جاتا ہے اور اگر دوبارہ پہنچے تو پھر جاری ہو جاتا ہے۔ آٹھواں کوہ ارجان ہے۔ اس میں یہ عجیب بات ہے کہ اس پر سے جو پانی کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ تو وہ زمین پر گر کر مسدس یا مثمن پتھر کی صورت میں ہو جاتے ہیں۔ نواں کوہ صور ہے جو کرمان میں واقع ہے۔ اس میں یہ عجیب بات ہے کہ جب اس کے پتھر کو توڑیئے تو اس کے اندر سے آدمی کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ بعضے کھڑے۔ بعضے بیٹھے۔ بعضے لیٹے ہوئے۔ انتہیٰ بقدر الضرورۃ۔

اس نشانی کو بھی خدا تعالیٰ نے جابجا قرآن مجید میں یاد دلایا ہے چنانچہ سورہ رعد میں ارشاد ہوا ہے۔ وجعل فیھا رواسی وانھارا۔ اس (معبود) نے زمین میں مضبوط گڑے ہوئے پہاڑ اور نہریں بنائیں۔ اور سورہ لقمان میں فرمایا۔ والقیٰ فی الارض رواسی ان تمید بکم۔ اور اس (خالق حقیقی) نے گاڑے زمین میں پہاڑ تا کہ تم کو متحرک نہ کرے دیا تمہیں لئے ہوئے جھکولے نہ کھائے) اور سورہ فاطر میں فرمایا ومن الجبال جُدد بیض وحمر مختلف الوانھا وغرابیب سود۔ اور پیدا کیں پہاڑوں میں سخت زمین ہموار روشن اور سرخ مختلف رنگ کی اور نہایت سیاہ بھورا ئی۔ اور سورہ یٰسین میں نہروں کی نسبت فرمایا۔

وفجرنا فیها من العیون لیاکلوا من ثمرہ - اور ہم نے زمین میں چشمے جاری کردیئے تاکہ لوگ خدا تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے پھل کو کھائیں۔" پھر سورہ زمر میں فرمایا - الم تران اللہ انزل من السماء ماء فسلکہ ینابیع فی الارض۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے بلندی سے مینہ برسایا۔ تو اس کو زمین میں چشمے بنا کر جاری کیا؟"

اور سورہ سجدہ میں زمین اور پہاڑ دونوں کی نسبت یوں فرمایا۔ قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین وتجعلون لہ انداداً ذالک رب العالمین وجعل فیہا رواسی من فوقہا وبارک فیہا وقدر فیہا اقواتہا فی اربعۃ ایام۔ کہہ دے اے ہمارے رسول کہ تم لوگ اس (معبود برحق) کا انکار کرتے ہو۔ جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔ اور اس کے لئے شرکاء قرار دیتے ہو یعنی بتوں کی پرستش کرتے ہو۔ آگ کو سجدہ کرتے ہو۔ ستاروں کو معبود سمجھتے ہو) وہ (معبود برحق) تمام جہاں کا پالنے والا ہے۔ اور اس نے زمین میں مضبوط گڑے ہوئے پہاڑ قائم کئے اور اس میں برکت دی اور معین کیں۔ اس (زمین) میں اس کی غذائیں (جو اس میں سے پیدا ہوتی ہیں)، چار دن میں۔

ساتویں آیت۔ وعلامات وبالنجم ھم یھتدون۔ اور ہم نے علامتیں قائم کیں۔ اور لوگ ستارے سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں نے یہ علامتیں اور ستارے بنائے ہیں۔ جن سے لوگ شب تاریک میں راہیں معلوم کرتے ہیں۔ سمتوں کا پتہ لگاتے ہیں۔ اور اگر ہم نے اُن کو نہ پیدا کیا ہوتا۔ تو کس میں یہ قدرت تھی کہ ایسی ایسی علامات و نجوم پیدا کرسکتا ہے روشنی کا بھی کام دیں۔ آثار بھی اُن پر مرتب ہوں راہبر بھی بنیں۔ سمتیں بھی بتائیں۔ تو کس قدر افسوس ہے کہ باوجود ان دلائل کے موجود ہونے کے لوگ منکر وجود خالق ہوتے ہیں۔

سورہ روم۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْہَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذَالِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ۔ وَمِنْ
اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِیْ ذَالِكَ لَاٰیٰتٍ
لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ۔ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً فَیُحْیِ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِیْ ذَالِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ وَمِنْ
اٰیٰتِهٖ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ
اِذَا اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ۔ وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ۔

پیدائش انسان

یہ سات آیتیں ہیں۔ جن میں قرآن مجید نے خدا تعالیٰ عزاسمہ و جل قدسہ کی ہستی و حکمت و قدرت کے دلائل بیان فرمائے ہیں یہ پہلی آیت ومن ایاتہ ان خلقکم الخ ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں۔ کہ اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر ناگاہ تم آدمی ہوگئے۔ جو زمین پر پھیلتے ہو" کیسا عجیب امر ہے کہ وہ مٹی جو بالکل بے جان ہے اس کو ایسی صورت میں مستحیل کر دینا کہ اصلی حالت کو اپنی چھوڑ کر ایک نرالا دفتر حکمت بن جائے۔ جب آدمی اس مرحلہ میں غور کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارا پیدا کرنے والا کس قدر حکمت اور تدبیر والا ہے۔ خصوصاً جب کہ اس کی ابتدا اور انداز تغیرات و استحالات پر نظر کرتا ہے تو اور بھی اس کو جناب باری کے ساتھ ایمان و اذعان بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس وقت جان لیتا ہے کہ اتنی تدبیروں کے ساتھ مٹی سے انسان کا بن جانا کسی طرح آپ سے آپ ممکن نہیں، دیکھئے کہ کس طرح ایک نطفہ مخلوط آدمی بنتا ہے جناب امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ نطفہ (جو صلب مرد سے جدا ہو کر رحم زن میں پہنچتا ہے وہ رحم میں تیس دن تک اسی صورت میں رہتا ہے اور تیس روز تک خون بستہ کی صورت میں رہتا ہے۔ اور تیس دن تک مضغہ (پارہ گوشت) کی صورت میں رہتا ہے۔ اور تیس روز تک مخلقہ رہتا ہے۔ پس جب چار مہینے اس

طرح تغیرات و تبدلات کو گذر جاتے ہیں تو خدا تعالیٰ دو خلاق فرشتوں کو بھیجتا ہے۔ جو اس کی صورت بناتے (بظاہر اس سے مراد اچھی یا بُری صورت ہے) اور اس کی روزی اور مدت عمر۔ اور اس کا شقی و سعید ہونا لکھتے ہیں (غالباً اس حدیث میں تیس تیس روز کی تعداد اس لئے بیان کی گئی ہے کہ اتنے دن گذرتے پر نطفہ میں علقہ بن جاتے کی قوت آجاتی ہے اور علقہ کو تیس دن گذرنے پر مضغہ بن جانے کی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور تیس روز مضغہ رہنے پر اس میں مخلقہ ہو جانے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پوری مدت چالیس روز ہے۔ جیسا کہ آئندہ روایتوں سے معلوم ہو گا۔ جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ نطفہ رحم میں سفید مثل نخامہ غلیظ کے رہتا ہے۔ جب اس پر چالیس دن گزر جاتے ہیں۔ تو علقہ ہو جاتا ہے (گویا مطلب یہ ہے کہ تیس روز تک نطفہ کی صورت میں رہ کر متغیر ہونے لگتا ہے۔ جب چالیس روز ختم ہو جاتے ہیں تو علقہ ہو جاتا ہے) آپ نے فرمایا کہ یہ علقہ مثل علقہ خون نشتر کے ہوتا ہے۔ جب کہ خشک ہو جائے تو رحم میں علقہ بننے کے بعد چالیس روز تک رہتا ہے۔ پھر مضغہ ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اور یہ سرخ گوشت کا لخنہ ہوتا ہے۔ جس میں سبز سبز جالدار مشتبکہ رگیں ہوتی ہیں۔ پھر اس کا استحالہ ہڈی کی طرف ہوتا ہے اور اس میں کان۔ آنکھ بنتی ہے اور جوارح و اعضا ترتیب پاتے ہیں۔

نیز بحار میں جناب عبد صالح (امام موسیٰ کاظم علیہ السلام) سے مروی ہے "قال انہ یخلق فی بطن امّہ خلقا من بعد خلق یکون نطفۃً اربعین یومًا ثم یکون علقۃ اربعین یومًا ثم مضغۃ اربعین یومًا" کہ فرمایا "انسان اپنی ماں کے بطن میں ایک خلقت سے دوسری خلقت میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ چالیس روز تک نطفہ رہتا ہے۔ پھر چالیس روز تک علقہ رہتا ہے۔ پھر چالیس روز تک مضغہ رہتا ہے۔

جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ خدا تعالیٰ کے اس ارشاد لقد خلقنا

الانسان فی کبد۔ ہم نے انسان کو کبد میں پیدا کیا۔" کا مطلب یہ ہے کہ سیدھا اپنی ماں کے شکم میں رہتا ہے۔ اُس کے مقادیم بدن ماں کے مقادیم بدن کی طرف رہتے ہیں اور اُس کے مواخیر بدن ماں کے مواخیر بدن کی طرف اس کی غذا اسی سے ہوتی ہے جو اس کی ماں کھاتی اور پیتی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ پس جب ولادت کا وقت آتا ہے۔ تو اس کے پاس ایک فرشتہ مسمی زاجر آتا اور اس کو زجر کرتا ہے تو وہ منقلب ہو جاتا ہے اور اس کے مقادیم بدن ماں کے مؤخر بدن کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور اُس کے مواخیر بدن ماں کے مقدم بدن کی طرف۔ تاکہ خدا تعالیٰ عورت اور بچے پر امر ولادت کو آسان کر دے اور یہ بات تمام آدمیوں کو پیش آتی ہے۔ مگر جو سرکش ہوتا ہے تو جب اس کو فرشتہ مسمی زاجر زجر کرتا ہے تو وہ ڈر کر منقلب ہو جاتا ہے اور زجر زاجر سے زمین پر روتا ہوا گر پڑتا ہے۔ اور میثاق کو بھول جاتا ہے۔

مخفی نہ رہے کہ انسان اپنی بدو خلقت سے اس وقت تک جب کہ اس کے جسم میں رُوح داخل ہوتی ہے۔ سات عظیم التدبیر والحکمۃ درجات طے کرتا ہے۔ اُن میں سے پہلا درجہ مٹی ہے۔ کیونکہ نطفہ کی خلقت خون سے ہے اور خون کی غذا سے اور غذا کی نباتات سے اور نباتات کی پانی اور مٹی سے۔ لہٰذا نطفہ بھی دراصل مٹی اور پانی سے پیدا ہوا جس میں اصل مٹی ہے۔ اور پانی اس کے ساتھ مخلوط ہو کر اسے لزج دلازب بناتا ہے۔ جس طرح کمہار مٹی میں پانی ملا کر اسے چکنے والی اور طاقتور بنا کر ظروف گلی اُس سے تیار کرتا ہے اور دوسرا درجہ نطفہ ہے۔ تیسرا درجہ علقہ ہے۔ چوتھا درجہ مضغہ ہے پانچواں درجہ ہڈی ہے چھٹا درجہ ہڈی پہ گوشت کا چڑھنا ہے۔ ساتواں درجہ اس میں رُوح کا داخل ہونا ہے۔ یہ ساتوں درجے ایسی عجیب عجیب حکمتوں اور دلائل ربوبیہ پر مشتمل ہیں کہ انسان ان کی حقیقتوں اور رموز کو کما حقہا ہرگز بیان نہیں کر سکتا۔ اور یہی وہ سات درجے ہیں۔ جن کو خدا تعالیٰ نے سورہ مومنون میں ارشاد فرمایا ہے۔ جو سابق میں نقل ہو چکا۔ یعنی آیۂ ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین الخ

لیکن پہلا مرتبہ پس جب اس میں غور کیا جاتا ہے۔ ایک عجیب تدبیر و صناعی کا میدان وسیع نظر آنے لگتا ہے۔ کہاں ایک مُردہ خاک اور کہاں اس کا نطفہ بن جانا آخر اس کام کے لئے کتنے آلات عمل درکار ہونے ضروری ہیں۔ مگر صانع عالم نے محض اپنے حکم سے بغیر مدد آلات و زحمت عمل کے سب کچھ کر دیا۔ اسی مُردہ مٹی پر مینہ برسایا اور اس میں جان تازہ داخل کی۔ پھر اس سے انواع و اقسام کے نباتات و اغذیہ و فواکہ پیدا کئے۔ پھر انسان کو ان کے کھانے کی تعلیم دی۔ اور ان میں وہ طاقت پیدا کی کہ خون بن سکیں اور معدہ و جگر انسان میں وہ طاقت خلق فرمائی کہ ان کو ہضم کرکے خون کی طرف مستحیل کرلیں۔ اور پھر عروق میں اس کے جذب کرنے کی قوت پیدا کی۔ یہاں تک کہ جب وہ باریک رگوں سے نکل کر اعضاء پر مثل شبنم کے جم جم کر اُن میں جذب ہو جاتا ہے۔ تو بعض اعضا میں یہ قوت پیدا کی کہ اسے نطفہ کی صورت میں مستحیل کرلے۔ پھر جب نطفہ بن گیا تو آخر اس کے لئے کوئی ظرف ایسا ہونا چاہیئے تھا۔ جس میں اس کی پرورش ہو۔ لہذا عورت کے باطن جسم میں ایک ظرف جسے رحم کہتے ہیں بنا دیا۔ لیکن چونکہ نطفہ کا وہاں تک پہنچنا بلا مدد دشوار تھا اس لئے اس میں اچھلنے کی طاقت پیدا کی۔ تا کہ آلہ منتشرہ کے ذریعہ سے رحم تک پہنچ جائے اور جب رحم میں پہنچ لیا۔ تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ سے آپ وہ آدمی بن گیا جب کہ اس میں ایسی حکمتیں صرف کی ہوئی پاتا ہے۔ جو کبھی انسانی امکان میں نہیں۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے خود اپنے نفس میں عمل کیا؟ اگر کوئی یہ کہے تو اس سے پوچھا جائے گا۔ کہ آیا اس نے اپنی موجودگی میں یہ اثر کیا یا عدم موجودگی میں؟ حالانکہ دونوں صورتوں میں تاثیر شے فی نفسہ ناممکن ہے عدم موجودگی میں تو اس وجہ سے کہ تاثیر فرع وجود ہے جب ایک چیز موجود ہی نہیں۔ تو تاثیر کیونکر کرے گی۔ اور موجودگی میں اس وجہ سے محال ہے کہ تاثیر کی ضرورت تو صرف وجود ہونے کے واسطے تھی۔ جب اس میں آپ وجود آ چکا تو موجود ہونے کا اپنے آپ میں اثر ایجاد کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ علاوہ بریں انسان جب کہ کامل ہو

جاتا ہے ہر طرح سے عقل و ہوش اس کے درست ہو لیتے ہیں۔ اُس وقت بھی اس سے ممکن نہیں۔ کہ بال برابر اپنے میں تاثیر کی ہو۔ اور ایسے اعضاء جوارح و قوٰے و حرکات پیدا کر سکا ہو۔

یہی وہ درجہ ہے۔ جس میں نقطۂ القلب اور نقطۂ سر و جگر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد تیسرا درجہ یعنی علقہ کا شروع ہوتا ہے۔ جس میں یہ نطفہ بالکل سرخ مثل خون کے ہو جاتا ہے۔ اور اس میں نقش و نگار جسم بننے شروع ہوتے ہیں۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ عموماً نقاشی کسی سخت چیز پر ہُوا کرتی ہے۔ نہ تر چیز پر۔ اگر پانی پر نقوش بناؤ تو مٹ جاتا ہے۔ لیکن یہ کیسی عجیب نقاشی ہے کہ تر علقہ پہ کی گئی ہے۔ کیا امکانِ انسانی سے یہ بات باہر نہیں؟ دوسرے یہ کہ عموماً نقاشی کے واسطے ایک وسیع جگہ درکار ہے جہاں بیٹھ کر یہ گل کاری کی جائے۔ لیکن یہاں دیکھئے تو وہ تنگ جگہ ہے کہ جس کی وسعت اس وقت میں ہرگز ایک فٹ کی مقدار میں بھی نہیں مگر صناعی ہو رہی ہے۔ ہاتھ پاؤں۔ آنکھ۔ ناک وغیرہ اعضا کی صورتیں اس میں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ نقاشی کے واسطے یہ بھی لازم ہے کہ روشن مقام میں بیٹھنا چاہیئے۔ لیکن یہاں ایک تاریکی کیسی تین تین تاریکیاں موجود ہیں ایک رحم کی۔ دوسرے مشیمہ کی۔ تیسرے پیٹ کی۔ یاد کیجئے۔ یخلقکم فی بطون امہاتکم خلقاً من بعد خلق فی ظلمٰت ثلٰث کو۔ چوتھے یہ کہ نقاشی کے واسطے یہ بھی لازم ہے کہ اس کو مٹی سے۔ پانی سے۔ ہوا سے۔ آگ سے محفوظ رکھا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ مٹی پڑ کر نقش خراب ہو جائے اور پانی سے کہیں دُھل نہ جائے۔ آگ سے کہیں جل نہ جائے۔ ہوا سے کہیں اس کی تازگی جاتی نہ رہے۔ مگر یہاں خلقت انسانی میں سب ہی برخلاف ہے۔ نطفہ خود مٹی سے ترتیب پایا اور حضرت آدمؑ بھی مٹی ہی سے بنے ان مثل عیسیٰ عند اللہ مثل آدم خلقہ من تراب۔ اس پر شاہد ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو ہوا سے پیدا کیا۔ فنفخنا فیہا من روحنا۔ اس کی دلیل ہے اور باقی حیوانات کو پانی سے پیدا کیا۔ واللہ خلق کل دابۃ من ماءٍ اس مطلب کو ثابت کر رہا

ہے اور نیز انا خلقنا الانسان من نطفۃ امشاج۔ اس کی بیّن دلیل ہے۔ اور آگ سے جنوں کو پیدا کر دیا۔ والجان خلقناہ من قبل من نار السموم۔ اس کی برہان ہے۔ اور یہ چاروں ہی چیزیں خود نطفہ میں بھی ہیں۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ پانچویں یہ کہ عموماً نقاشی پہلے ظاہر جسم مثلاً کاغذ پر کی جاتی ہے اس کے بعد اس کا اثر باطن میں پہنچایا جاتا ہے۔ مگر یہاں اس کے بھی برخلاف کارروائی ہے کہ پہلے نطفہ میں سر، دل اور جگر کے نقطے تیار ہوتے ہیں وہ نقش علقہ میں اوپر کو ابھار دیئے گئے۔ جس میں تکمیل کے اور اسباب مہیا کئے گئے۔ چھٹے یہ کہ گوشت ابتدا میں سُرخ ہوتا ہے اور جب اس کو حرارت پہنچائی جاتی ہے تو رنگ اس کا بدل کر سفیدی مائل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ ہے کہ نطفہ پہلے سفید ہے اور جتنی حرارت بدنی اور رحمی اس میں پہنچتی جاتی ہے اور جس قدر حرارت غریزیہ اس میں بڑھتی جاتی ہے۔ اُسی قدر سُرخ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خون بستہ کی صورت میں آجاتا ہے اور آخر کار گوشت بن جاتا ہے۔ جو چوتھا درجہ ترقی انسانی کا ہے اور اسی درجے میں ہیئت انسانیہ کسی قدر اور زیادہ مرتب ہو جاتی ہے مگر قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ چونکہ نطفہ یا علقہ بالکل تر چیز ہے اور ہڈی بالکل خشک چیز اور گوشت ان دونوں کے درمیان متوسط واقع ہوا ہے۔ نہ زیادہ خشک ہے نہ بہت تر۔ تو چاہئے تھا کہ علقہ سے پہلے جسم کے گوشت کی ساخت ہوتی اس کے بعد ہڈیوں کی۔ لیکن یہاں اس کے بھی برخلاف ہے کہ پہلے ہڈیاں بنتی ہیں اور ان کے بعد گوشت دیکھو فخلقنا المضغۃ عظاماً فکسونا العظام لحماً۔ پھر ہم نے مضغہ کو ہڈیاں بنا دیا۔ پھر ہڈیوں کو گوشت کا لباس دیا۔ جو پانچواں اور چھٹا درجہ ترقی انسان کا ہے۔ تو آخر اس میں حکمت کیا ہے؟ یہی نہ کہ دیکھو جس چیز کو تم محال یا دشوار سمجھتے ہو۔ ہم اسے کیسا آسان جانتے ہیں۔ اور تمہارے سارے قاعدوں کو توڑ پھوڑ کر دکھلا دیتے ہیں کہ قدرت اس کا نام ہے اور قادر ایسے خالق کو کہہ سکتے ہیں جو اس طرح خلق فرمائے۔

غرض جب چھٹوں درجے طے ہو جاتے ہیں تو ساتواں درجہ ترقی شروع ہوتا ہے۔ یعنی روح کا داخل ہوتا جس سے بالکل بے حس و ادراک چیز ایسی مدرک دعاقل ہو جاتی ہے جو اپنی آپ نظیر ہے۔ فجعلناہ سمیعًا بصیرا۔ اور جب اس حد ترقی پر آجاتا ہے تو ارادہ کرتا ہے کہ باہر آئے اور عالم کے موجودات کی سیر کرے۔ تو کبھی صرف چھ مہینے میں پیدا ہوتا ہے۔ کبھی سات میں۔ کبھی نو اور کبھی دس مہینے میں۔ اور یہ اختلاف ازمان ولادت بہت سے اسباب سے واقع ہوتا ہے جن کی تفصیل باعثِ طول ہے۔

خطاباتِ انسانی

حضرت انسان کو بدو خلقت سے آخر عمر تک بہت سے تغیرات اور انہیں کے لحاظ سے متعدد خطابات حاصل ہوئے ہیں کچھ تو خود خالق کی طرف سے اور کچھ مخلوق کی جانب سے جو خطابات اور اسماء کہ ان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملے ہیں۔ وہ تو یہی سات تھے۔ جو مذکور ہوئے ۱ سلالۃ الطین ۲ نطفہ ۳ علقہ ۴ مضغہ۔ ۵ عظم ۶ لحم ۷ خلق آخر۔ اور اس کے بعد جو ان کے نام خلق نے مقرر کئے ہیں وہ یہ ہیں۔ ۸ جنین جب تک شکم مادر میں رہیں ۹ ولید جب آپ کی ولادت ہو ۱۰ رضیع جب آپ دودھ پیتے ہوں ۱۱ فطیم جب آپ کی دودھ بڑھائی ہو ۱۲ طفل ۱۳ صبی ۱۴ یافع ۱۵ ناشی ۱۶ مترعرع ۱۷ اخرور ۱۸ مراہق ۱۹ محتلم ۲۰ بالغ ۲۱ امرد ۲۲ طار ۲۳ باقل ۲۴ مسیطر ۲۵ مطرخم ۲۶ مختط ۲۷ صتل ۲۸ ملتحی ۲۹ مستوی ۳۰ مصعد ۳۱ مجتمع (اور لفظ شاب ان سب کا جامع ہے۔ یعنی یافع سے لے کر مجتمع تک لفظ شاب کا اطلاق ہوتا ہے) ۳۲ کہل ۳۳ ملہوز ۳۴ اشمط ۳۵ شیخ ۳۶ اشیب ۳۷ حوقل ۳۸ صفتان ۳۹ ہم ۴۰ ہرم ۴۱ میت یہ تمام نام بحسب ازدیاد زمانہ عمر بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً مراہق قریب بلوغ پہنچے ہوئے کو کہتے ہیں۔ طار سبزہ آغاز کو مختط کسی قدر مونچھ ڈاڑھی نکلنے پر آپ کا نام قرار پاتا ہے اور جب ڈاڑھی پورے طور پر نکل آئے تو ملتحی اور

اشمط جب بال کھچڑی ہو جائیں اور علیٰ ہذا القیاس۔

دوسری آیت: ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔ ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون۔
اور اس (معبود برحق کے وجود) کی نشانیوں میں یہ ہے کہ اس نے پیدا کیا تمہارے واسطے خود تمہارے نفسوں سے جوڑا (بیوی) تاکہ تم ان کی طرف مائل و راغب ہو۔ اور تم کو ان سے راحت و آرام ملے اور اس نے تم لوگوں (زن و شوہر) کے درمیان محبت اور شفقت پیدا کی۔ بے شک اس میں نشانیاں (دلیلیں) ہیں اس قوم کے لئے جو فکر و غور کرے۔

یہ ایک آیت بھی کئی نشانیوں اور دلیلوں پر مشتمل ہے۔ منجملہ ان کے ایک یہ کہ چونکہ مقدر ہوا تھا۔ کہ نسل انسانی کا سلسلہ بذریعہ توالد بڑھتا رہے۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ اس کے واسطے ایک جوڑا بھی پیدا کیا جائے۔ مگر چونکہ جوڑے کے واسطے اتفاق و انس و محبت بھی ضروری ہے، ورنہ ایک دوسرے کے پاس جاوے ہی کیوں؟ اور اتفاق ہی کیونکر ہو۔ اس لئے اُن کو انسان ہی سے پیدا کیا۔ کیونکہ عورتیں بھی عموماً مرد و زن کے اجتماع اور اختلاط نطفتین ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ پھر اُن میں انس و محبت پیدا کی۔ تاکہ ایک کو دوسرے کی طرف رغبت ہو۔ اور ایک کو بغیر دوسرے کے چین نہ ملے جس سے بقائے نسل انسانی میں مدد مل سکے۔

واضح ہو۔ خلق لکم من انفسکم ازواجاً" کی تفسیر میں اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ تمہارے نفسوں سے تمہارے لئے جوڑے کے پیدا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ انسانوں ہی کے نطفے سے (جو خلاصہ رطوبات جسم اور اصل قوت بدن انسان ہے) تمہارا جوڑا یعنی عورت پیدا کی۔ اور بعض کا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد اصل خلقت حضرت حوّا اُمّ البشر ہے کہ نفس انسانی یعنی حضرت آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی تھیں۔ اور پھر اس میں اختلاف ہے کہ پسلی سے پیدا کرنے کے کیا معنی ہیں۔ کوئی تو کہتا ہے کہ سونے کی حالت میں حضرت آدم کی پسلیوں میں

سے ایک پسلی نکال لی۔ اور اس کو مادہ حضرت حوا قرار دے کر اس سے انہیں پیدا کیا اور کسی کا یہ خیال ہے کہ وہ حضرت آدم کے اسفل اضلاع سے پیدا کی گئی ہیں جیسا کہ علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔ مگر تفسیر اہل بیت اس کے برخلاف نظر آتی ہے۔ وہ یہ بتاتی ہے کہ حضرت حوا اُس مٹی سے خلق کی گئی تھیں۔ جو حضرت آدمؑ کے بنانے سے بچ رہی یا بچالی گئی تھی۔ اس لئے پروردگار عالم نے من انفسھم فرمایا ہے کہ تمہارے لئے بیوی تمہارے ہی نفسوں سے پیدا کی گئی ہے۔ چنانچہ جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ انہ سئل من ای شیئ خلق اللہ حوا فقال ای شیئ یقولون ھذا الخلق قلت یقولون خلقھا من ضلع من اضلاع آدم فقال کذبوا کان یعجز ان یخلقھا من غیر ضلعہ ثم قال اخبرنی ابی عن اٰبائہ قال قال رسول اللہ ان اللہ تبارک و تعالیٰ قبض قبضۃ من طین فخالطھا بیمینہ وکلتا یدیہ یمین فخلق منھا آدم وفضل فضلۃ من الطین فخلق منھا حوا۔ یعنی امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ حوا کس چیز سے پیدا کی گئیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ میں (راوی) نے عرض کی لوگ کہتے ہیں کہ آدم کی پسلیوں میں سے ایک پسلی سے پیدا کی گئیں۔ تو آپ نے فرمایا وہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ کیا خدا تعالیٰ عاجز تھا کہ پسلی کے علاوہ کسی اور چیز سے پیدا نہ کرے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ مجھ کو میرے باپ (امام زین العابدین) نے خبر دی اپنے آبائے طاہرین سے کہ رسول خدا نے فرمایا۔ بے شک خدائے تبارک و تعالیٰ نے ایک مٹھی مٹی لی۔ اور اسے مخلوط کیا اپنے یمین (دست قدرت) سے اور دونوں ہاتھ (دست قدرت) اس کے یمین ہیں۔ پس اُس سے آدم کو پیدا کیا۔ اور تھوڑی بچ رہی تو اس سے حوا کو خلق فرمایا۔

اور علل الشرائع۔ میں جناب صادق آل محمد علیہم السلام سے منقول ہے۔ جس کا محصل یہ ہے کہ حضرتؑ سے سوال کیا گیا۔ خلقت حضرت حوا کی نسبت اور بیان کیا گیا کہ لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ خدائے عزوجل نے حوا کو آدم کی بائیں نیچے کی پسلی سے پیدا

کیا ہے آپ نے فرمایا سبحان اللہ وتعالیٰ عن ذالک علواً کبیراً (خدا تعالیٰ اس سے
زیادہ بالا و برتر ہے) جو جس کا جی چاہے کہے۔ کیا پروردگار عالم کو یہ قدرت نہ تھی
کہ آدم کے واسطے بیوی اُن کی پسلی سے علاوہ کسی اور چیز سے پیدا کرتا اور طعن و
تشنیع کرنے والوں کو گفتگو کا موقع دیتا کہ وہ کہیں کہ "انسان تو اپنے جزوی بدن
سے نکاح کرتا ہے" جب کہ حوا اُن کی پسلی سے پیدا کی گئی ہوتیں۔ (یعنی اگر ایسا
ہوتا تو لوگوں کو اعتراض کا موقع ملتا۔ اور وہ یہ کہتے کہ یہ کیسا انتظام ہے کہ
ایک جزو بدن کو دوسرے کا زوج قرار دے کر باہم اُن میں مناکحت قائم کی ہے)
کیا ہو گیا اُن (کہنے والوں) کو خدا تعالیٰ ہمارے اور اُن کے درمیان فیصلہ کرے
(کہ ہمارا منصب انہوں نے غصب کر لیا اور جو چاہتے ہیں۔ تفسیر قرآن میں بک
دیتے ہیں) پھر آپ نے فرمایا کہ جب خدائے تعالیٰ نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا۔
اور فرشتوں کو حکم دیا ہے تو انہوں نے (آدم کو سجدہ کیا۔ (پھر) ان پر نیند غالب
کی (یعنی حضرت آدم کو سلا دیا) پھر حوا کو پیدا کیا۔ اور انہیں آدم کے پیچھے رکھا۔
اور یہ اس وجہ سے کیا تاکہ عورت مرد کے تابع رہے۔ پس حضرت حوا نے حرکت کی۔
تو حضرت آدمؑ بیدار ہو گئے۔ پس حوا کو آواز آئی کہ تم ان سے دُور رہو۔ جب آدمؑ
نے انہیں دیکھا۔ اور ایک حسین شکل میں اپنی صورت پہ پایا۔ البتہ اتنا فرق تھا
کہ وہ عورت تھیں۔ تو اُن سے اپنی زبان میں باتیں کیں اور کہا کہ تم کون ہو۔ حوا
نے کہا۔ میں بھی خدا تعالیٰ کی ایک مخلوق ہوں۔ پس اس وقت حضرت آدمؑ نے
عرض کی، خدایا یہ کون حسین وخوبصورت ہے۔ جس کے قرب سے مجھے اُنس پیدا ہوا
جواب ملا کہ یہ میری کنیز حوا ہے کیا تم پسند کرتے ہو کہ یہ تمہارے ساتھ رہے۔
تمہاری دلچسپی کرے اور تم سے باتیں کیا کرے اور تمہارے حکم کی عامل رہے۔ عرض
کی ہاں، اے پروردگار۔ میں تیرا شکریہ ادا کرتا ہوں اور حمد بجا لاتا رہوں۔ جب تک
زندہ رہوں گا۔ تو خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ تم اس کی مجھ سے درخواست کرو۔ کیونکہ یہ میری
ہی کنیز ہے اور تمہاری زوجہ ہونے کے بھی قابل ہے۔ اس وقت اُن کو خواہش نفسانی

بھی عطا کی۔ اور اس سے پہلے اُن کو ہر چیز کی معرفت بھی حاصل کرا دی تھی۔ تو آدمؑ نے عرض کی "میں تجھ سے اے پروردگار حوّا کا مطالبہ کرتا ہوں۔ پس تیری کیا خوشی ہے۔ خطاب ہُوا کہ میری رضا یہ ہے کہ تم ان کو میرے دین کے احکام سکھاؤ۔ عرض کی تیری خوشی کے لئے ایسا کروں گا۔ اس امر پر کہ تو میرے لئے اس امر (نکاح حوّا) کو چاہے۔ خطاب ہوا کہ میں نے اسے چاہا اور میں نے اُن کا تم سے نکاح کر دیا۔ تم انہیں اپنے پاس رکھو۔ پھر حضرت آدمؑ نے کہا اے حوّا) تم میری طرف آؤ۔ انہوں نے کہا نہیں۔ بلکہ تم میری طرف بڑھو۔ اور خدا تعالیٰ نے بھی حضرت آدم کو یہی حکم دیا کہ تم حوّا کی طرف بڑھو۔ پس حضرت آدمؑ کھڑے ہوئے۔ (اور حوّا کی طرف متوجہ ہوئے) اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو (آج دنیا میں) عورتیں ہی مردوں سے درخواست کرتیں۔

جناب صدوق علیہ الرحمہ نے کتاب من لایحضرہ الفقیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ اما قول اللہ عز وجل یا ایہا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منہا زوجہا والخبر الذی روی ان حوا خلقت من ضلع الا یسر صحیح ومعناہ من الطینۃ التی فضلت من الایسر فلذٰلک صارت اضلاع الرجال انقص من اضلاع النساء بضلع۔ یعنی خدا تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کہ ایہا الناس ڈرو اپنے پروردگار سے جس نے تم کو نفسِ واحدہ (آدم) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا (حوّا کو) پیدا کیا۔ اور وہ حدیث جس میں یہ مروی ہے کہ حوا حضرت آدمؑ کی بائیں طرف کی پسلی سے پیدا ہُوئی ہیں۔ دونوں ہی صحیح ہیں مگر مطلب اس کا یہ ہے کہ حوا اس مٹی سے پیدا کی گئی ہیں۔ جو حضرت آدمؑ کی بائیں طرف کی پسلی سے بچ رہی تھی یا بچائی گئی تھی۔ اسی وجہ سے عورتوں کی پسلیوں سے مردوں کی پسلیاں ایک کم ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جس صورت سے بھی اس جوڑے کو خدا تعالیٰ نے خلق فرمایا۔ نہایت ہی عجیب نشانِ صنعت وحکمت خالق کی ہے۔ فتعالی اللہ عما یشرکون۔ (اگر اس مضمون کی تفصیل دیکھنی ہو تو میری کتاب توحید الائمہ دیکھو)۔

تیسری آیت - ومن آیاتہ خلق السمٰوٰت والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذالک لآیات للعالمین ۔ ہے ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اور منجملہ اُس کی نشانیوں کے (جو وجود وقدرت وحکمت پر اس کی دلالت کرتی ہیں) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا ہے ۔ اور تمہاری زبانوں کا مختلف ہونا ۔ بے شک اس میں کئی دلیلیں ہیں جاننے والوں کے واسطے ۔ اس آیت میں خدائے واحد نے تین علامتیں اور دلیلیں اپنی قدرت کی بلکہ چار ارشاد فرمائیں ۔ جن میں سے ہر ایک ہزاروں حکمتوں اور صنعتوں پر مشتمل ہے ۔

ایک آسمانوں کا پیدا کرنا مع ان تمام ثوابت ۔ سیارات ۔ بروج ۔ حرکات ۔ مدارات ۔ اقطاب و اوتاد کے جو واضح ترین دلائل سے ہے ۔

دوسرے زمین کا پیدا کرنا مع قوت منبتہ ۔ وسکون ۔ وحیاۃ بعد الموت ۔ اور لا تعد و لا تحصیٰ نباتات کے اپنے سے پیدا کرنے کے جن کے حکم و مصالح کو کوئی شمار نہیں کر سکتا اور مع قابلیت استحصال فوائد کے جو اس سے مل سکتے ہیں کسی قدر ان کا بیان سابق میں بھی آ چکا ہے) تیسرے زبانوں کا اختلاف کہ جس ملک میں دیکھو نئی زبان ۔ جس شہر میں جاؤ نیا لہجہ ۔ جس بستی میں پہنچو نیا طرز کلام ۔ کسی شخص کو دیکھو نئی آواز کوئی ایک دوسرے سے ملتا ہی نہیں ۔ آخر یہ کس نے تدبیر کی اور کیوں یہ تدبیر ہوئی ۔ اسی لئے نہ کہ خالق کی قدرت کا کمال ظاہر ہو ۔ چوتھے رنگوں کا اختلاف ۔ کہ کوئی کالا ہے کوئی گورا ۔ کوئی گندمی رنگ کا ہے ۔ کوئی سبزی مائل کوئی سرخی مائل ۔ اور پھر ہر شخص کا رنگ علیحدہ اور جداگانہ ہے ۔ کیا یہ امور کمال حکمت وقدرت صناع ازل کی دلیلیں نہیں ہیں ۔

مخفی نہ رہے ۔ کہ اکثر لوگوں کا اہل اسلام میں یہ خیال ہے کہ اسماء ولغات اور زبانیں توفیقی ہیں ۔ یعنی یہ سب زبانیں جو اول خلقت سے اس وقت انسانوں میں رائج رہی یا ہیں ۔ مثلاً عربی ۔ فارسی ۔ ترکی ۔ سنسکرت وغیرہ سب خدا تعالیٰ نے حضرت آدم کو تعلیم کر دی تھیں ۔ یہ خیال اس سے پیدا ہوا کہ خدا تعالیٰ سورہ بقر

میں فرماتا ہے وعلم آدم الاسماء کلھا۔ یعنی خدا تعالیٰ نے آدم کو تمام نام تعلیم کر دیئے تھے۔ اور انہیں سے اُن کی اولاد نے یہ نام اخذ کئے اور لغات سیکھے۔ لیکن جب متفرق ہُوئے تو ہر گروہ ایک علیحدہ زبان میں گفتگو کرنے لگا۔ یعنی اُن زبانوں میں سے اُس زبان کو اختیار کر لیا۔ جو انہیں پسند آ گئی۔ مثلاً کسی کو عربی پسند آئی۔ کسی کو سنسکرت کسی کو عبرانی اور علیٰ ہذا القیاس۔ اور اسی زبان کے عادی ہو گئے۔ یا طول زمانہ کے سبب سے اور زبانوں کو بھُول گئے تو ممکن ہے کہ جناب نوحؑ کے زمانے تک تمام آدمی تمام لغتوں اور زبانوں کو جانتے رہے ہوں۔ لیکن جب سب کے سب طوفان میں تباہ ہو گئے اور چند متنفس باقی رہے۔ جن سے سلسلہ آدمیوں کا چلتا ہے۔ تو وہی چند آدمی ان زبانوں کے حافظ رہے ہوں گے۔ مگر کثرت تعداد اور افتراق بلاد کی وجہ سے کوئی ایک زبان انہیں یاد رہ گئی اور باقی سہو ہو گئی۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ علم آدم الاسمار کے یہ معنی نہیں ہیں۔ بلکہ مراد اس سے یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو اشیار عالم کے لغات ومعانی اور خواص ومنافع بتا دیئے تھے۔ نہ یہ کہ دنیا بھر کی زبانیں۔ بلکہ یہ زبانیں تو آپس کی قرارداد سے پیدا ہوئی ہیں اور غالباً یہی رائے صحیح ہو۔ مگر بہرصورت حکمت وقدرت خدا تعالیٰ اس سے بھی ظاہر ہے کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ تمام زبانیں اول روز خدا تعالےٰ نے حضرت آدم کو سکھا دی تھیں اور اُن سے اُن کی اولاد کو حاصل ہوئیں۔ تب بھی کمال قدرت خدا تعالیٰ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اتنے الفاظ۔ اتنے معانی۔ اتنے لہجے۔ اتنے محاورات۔ جن کا شمار کسی طرح ممکن نہیں۔ ایک وقت میں آدمی کو سکھا دیئے۔ جس پر کوئی سوائے اس کے قادر نہیں۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ لغات کا پیدا ہونا آپس کی قرارداد سے ہُوا ہے۔ تب بھی کمال صنعت خدائی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کس طرح کا دماغ اور حافظہ اور زبان۔ انسان کو عطا ہوئی جس سے وہ اس بات پر قادر ہو سکا کہ جس طرح کے لفظ چاہے بنا لے اور جس زبان میں چاہے گفتگو کر لے۔ کیا یہ آسان بات ہے کہ ایک ہی آدمی میں وہ قوت ہو کہ اس کی زبان عبرانی

میں بھی گفتگو کر سکے۔ سریانی میں بھی اور لیٹن۔ گریک۔ انگلش اور عربی فارسی۔ اردو سنسکرت اور بھاشا میں بھی۔ کس طرح ایک چھوٹے سے دماغ میں جس کا پورا قطر کبھی ایک بالشت سے زیادہ نہ ہوگا۔ لاکھوں الفاظ۔ کروڑوں معانی اور بیسیوں لغات آسکے اور کس طرح ایک دو انگشت کے گوشت میں یہ طاقت پیدا ہوئی کہ وہ ان سب کو علیحدہ علیحدہ صورتوں اور لہجوں میں ادا کر سکے۔

ممکن تھا کہ تمام عالم کے آدمیوں کی ایک ہی زبان ہوتی۔ لیکن اس اختلاف میں یہ حکمت رکھی گئی کہ اگر آدمی غور کرے گا۔ تو اسے معلوم ہو سکے گا کہ یہ اختلاف کسی طرح خود اس کی ذات سے نہیں پیدا ہوا ہے۔ بلکہ ایک بہت بڑے قادر کے اعطائے قوت سے ہوا ہے۔ جس کو یہ بھی طاقت ہے کہ بے جان چیزوں سے بھی گفتگو پیدا کر دے۔

یہ تو اس بناء پر بیان ہوا کہ السنتکم سے مراد لغات اور مروّج زبانیں ہوں جو مختلف ملکوں میں بولی جاتی ہیں۔ ورنہ محتمل ہے کہ اس سے خاص یہ جارحہ مخصوصہ مراد ہو جو منہ میں ہے اور جس کی حرکت سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ تو اس بناء پر یہ معنی ہوں گے کہ منجملہ آیات وجود خالق کے تمہاری یہ مختلف زبانیں ہیں جو تمہارے منہ میں موجود ہیں کہ باوجود ایک قسم کے مادہ سے پیدا ہونے کے کیسی شکل ہیئت اور ترکیب میں مختلف ہیں۔ کسی سے تو باریک آواز پیدا ہوتی ہے۔ کسی سے موٹی آواز کوئی سریلی ہے کوئی بے سُری۔ یہاں تک کہ دنیا میں جتنے آدمیوں کو آپ دیکھیں گے کبھی ایک طرح کی آواز دو آدمیوں کی نہ پائیں گے اور نہ ایک طرح کا لب و لہجہ بلکہ ہر ایک اپنی حالت میں مختلف ہوگا۔ پس باوجود بے شمار آدمیوں کے جو آج تک دنیا میں پیدا ہوتے رہے اور ہیں اور ہوں گے۔ کسی کا ایک سا ن گفتگو میں نہ ہونا صاف دلیل اس بات کی ہے کہ کسی قادر مطلق نے اپنی قدرت نمائی کے لئے یہ کرشمہ کیا ہے۔ تاکہ اسے سمجھ کر اہل علم غفلت و جہالت سے نکلیں اور راہ ہدایت پر چلیں۔

علاوہ اس کے رنگوں اور زبانوں کا اختلاف اور بھی بہت سی حکمتوں پر مشتمل ہے۔ منجملہ ان کے یہ بھی کہ اگر ایک طرح کی آوازیں اور زبانیں ہوتیں تو کبھی اشتباہ بھی واقع ہو جاتا ہے ایک آدمی بعض موقعوں پر دوسرے کو پہچان نہ سکتا مثلاً فرض کیجئے شب تاریک میں ایک شخص دوسرے سے ملنے کے لئے جاتا۔ اگر اُس کی آواز کسی اور کی آواز سے یا دس بیس آدمیوں کی آواز سے مشابہ ہوتی۔ تو سننے والا کسی طرح تمیز نہیں کر سکتا کہ یہ فلاں شخص ہے اور پھر نہ تمیز کرنے سے بہت سے امور میں خلل واقع ہوتا۔ اور بہت سے فسادات قائم ہوتے۔ فرض کیجئے اگر صرف پچاس ہی آدمی کسی ایک شہر میں ایک آواز ایک زبان و لہجہ اور ایک رنگ روپ کے ہوتے۔ تو اہل شہر کو اُن سے کس قدر زحمتیں پہنچتیں۔ نہ تو معاملات میں تفرقہ کر سکتے کہ ہمارا صاحب معاملہ یہ ہے یا وہ۔ اور نہ وُہ خود آپس میں ایک دوسرے کی شناخت کر سکتے اور نہ یہ سمجھا جا سکتا کہ ان میں کون ہمارا ملاقاتی اور رازدار ہے اور کون دشمن ہے۔ کون کس عورت کا شوہر ہے اور کون کس کا۔ کون کس کا باپ ہے اور کون کس کا۔ اگر ایک دوسرے کی زوجہ سے ہم صحبت ہو جاتا تو وہ عورت کسی طرح اس کو پہچان نہ سکتی کہ آیا یہی میرا شوہر ہے یا کوئی اور۔ اور نہ قرض خواہ یہ سمجھ سکتا کہ میرا قرضدار کون ہے۔ نہ صاحب راز جان سکتا کہ ان میں سے میرا رازدار کون ہے۔ غرض ہزاروں ہی قسم کی خرابیاں عالم میں پیدا ہو جاتیں۔ اس لئے مبدء فیاض نے ان سب کے رنگوں اور زبانوں کو ایسا مختلف کر دیا کہ کوئی ایک دوسرے سے مشابہت ہی نہ رکھے تا کہ نظام عالم میں خلل نہ پڑے (اس کی تفصیل کتاب توحید الائمہ میں ملاحظہ ہو)

چوتھی آیت۔ ومن ایاتہ منامکم باللیل والنہار وابتغاءکم من فضلہ ان فی ذالک لآیات لقوم یسمعون ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ منجملہ اس کی نشانیوں کے تمہارا رات اور دن کو سونا اور اس کے فضل کو تمہارا حاصل کرنا ہے بے شک اس میں نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو سنے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے

تمہارے نفع کے لئے نیند بنائی۔ جو تمہیں تعب کے دفع کرنے کی غرض سے دن کو یا رات کو آتی ہے۔ اگر یہ نیند تمہارے لئے مقرر نہ ہوتی جو کام کی مشقت اور تعب جسمانی کو جو چلنے پھرنے سے اور کام کرنے سے حاصل ہوا ہے۔ دفع کرتی تو کبھی تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ بہت بڑی نشانی ہماری حکمت و قدرت و وجود کی ہے کیونکہ از بسکہ ہمیں یہ معلوم تھا کہ انسان کی بسر برد زندگی بغیر چلنے پھرنے اور حرکات بدنی کے نہ ہو گی۔ اس کو زمین کھودنی پڑے گی۔ اسے پتھر تراشنے ہوں گے۔ اسے عمارت بنانی ہو گی۔ اُسے لباس بننے ہوں گے۔ اس سبب سے اسے تعب بھی لاحق ہو گا۔ اور اگر برابر اس کو تعب ہی ہوتا رہا اور کوئی ذریعہ اس کی راحت کا نہ ہوا تو بہت جلد تحلیل ہو کر فنا ہو جائے گا۔

نیند یا خواب

لہذا نیند کو پیدا کیا۔ تاکہ اس کا بدل ہو سکے اور نیز حریص آدمی جو کبھی کام کو ترک کرنا نہیں چاہتے۔ وہ بھی ایک خاص وقت میں مجبور ہو کر سو رہیں گے۔ تاکہ اُن کا تعب دفع ہو۔ اس نیند میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ کھانا بہت اچھی طرح ہضم ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ سونے کے وقت حرارت باطن جسم کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اس سبب سے وہ معین ہضم ہوتی ہے۔ اطبار اور طبیعین کی رائے ہے کہ بخارات جو رطوبات بدن سے پیدا ہوتے اور دماغ کی طرف صعود کرتے ہیں۔ تو حواس ظاہرہ اور ادراکات محسوسات میں مشتغل رہنے کے تعب سے معطل ہو جاتے ہیں اور طبیعت آرام لینے اور فراغ حاصل کرنے کی طرف رغبت کرتی ہے۔ روح حیوانی ظاہر بدن سے باطن کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور اس سبب سے تمام اعضائے ظاہرہ میں سستی پیدا ہو کر غفلت حادث ہوتی ہے اسی کا نام منام ہے۔

دوسرا فائدہ نیند میں یہ بھی ہے کہ انسان پر بہت سے ایسے امور اس حالت میں منکشف ہو جاتے ہیں جو حالت بیداری میں کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ مثلاً

وہ آئندہ کے واقعات جو مثلاً دس یا بیس برس بعد ہونے والے ہیں۔ حالت نوم میں انسان کو معلوم ہو جاتے ہیں۔ یا اکثر سوالوں کا جواب جو دل میں ہوتا ہے یا بیماری کا علاج یا دشمن کے دفاع کی تدبیر یا تحصیل دنیا کے طریقے وغیرہ جس کو لوگ اُردو میں خواب دیکھنا کہتے ہیں اور عربی میں رُویا۔ اگرچہ ہر خواب اس طرح کا نہیں ہوتا لیکن اگر نفس انسان صاف ہو غواشی مادہ سے علیحدہ ہو۔ پردۂ اشتغال یہ دنیا سامنے نہ پڑا ہو تو اکثر یہ خواب سچے ہوتے ہیں۔ جن سے آدمی بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے اور عجیب نہیں کہ وابتغاء کم من فضلہ سے یہی مراد ہو۔ جو آیت میں مذکور ہے۔ اگرچہ اور اور احتمال بھی ہیں۔ بہر صورت انسان اگر تین قسموں کے خواب میں سے جنہیں لسان شریعت میں ۱۔ رویائے بشریٰ ۲۔ رویائے تحزین ۳۔ رُویا بحدث بہ الانسان نفسہ فیراھا فی المنام کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ اور کبھی اس تیسری قسم کی اضغاث احلام سے بھی تعبیر کی گئی ہے اور جنہیں فلاسفہ کی زبان میں بھی ۱۔ صادقہ ۲۔ معبّرہ ۳۔ اضغاث احلام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلی قسم کا خواب دیکھے یعنی رویائے بشریٰ۔ یا اسی کو صادقہ کہہ لیجئے۔ تو فوراً اس پر بہت سے فوائد مرتب ہوں گے۔ چنانچہ جناب امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ رسولِ خدا نے فرمایا۔ الرّؤیا الصادقۃ جزء من سبعین جزءً من النبوۃ۔ اور بعض میں بجائے الصادقہ کے الصالحۃ ہے یعنی سچا خواب نبوت کے ستّر جزوں میں سے ایک جزو ہے کیا معنی کہ جس طرح نبی پر وحی آتی ہے۔ اور وہ وحی اگلے اور پچھلے حالات کو صحیح طور پر نبی کے نزدیک واضح کر دیتی ہے۔ اسی طرح یہ خواب بھی انسان پر پچھلے اور اگلے حالات سچے طور پر منکشف کر دیتا ہے اس کی صحت کی صورت بھی معصوم نے ایک حدیث میں یوں بیان فرمادی ہے۔ الرویا صدقۃ والکاذبۃ مخرجھما من موضع واحد (یعنی القلب) فالرویۃ الکاذبۃ المختلفۃ ھی التی یراھا الرجل فی اوّل لیلۃ فی سلطان المردۃ الفسقۃ وانما ھی شیءٌ یخیل الیہ وھی کاذبۃ لاخیر فیھا واما الصادقۃ فیراھا بعد الثلثین من اللیل مع

حلول الملٰئکۃ وذالک قبل السحر فھی صادقۃ لا تختلف الا ان یکون جنبا او ینام علیٰ غیر طھر ولم یذکر اللّٰہ تعالیٰ فانھا یختلف وتبطی علی صاحبھا۔"

(مجمع البحرین) سچا اور جھوٹا خواب ایک مخرج سے خارج ہوتا ہے (یعنی دل سے) پس جھوٹا خواب جو مختلف ہوتا ہے وُہ تو وُہ خواب ہے جسے آدمی اوّل شب میں سرکش اور فاسق (شیطانوں) کے غلبہ کے وقت دیکھتا ہے اور وہ محض خیالی چیز ہوتی ہے جو جھوٹی ہے اور اُس میں کوئی خیر نہیں ہے۔ لیکن سچا خواب تو اُسے انسان دو تہائی رات گزرنے کے بعد دیکھتا ہے جو فرشتوں کے آنے کا وقت ہے اور یہ خواب صبح سے پہلے پہلے ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف نہیں ہوتا۔ مگر یہ کہ آدمی جنب ہو یا بلا طہارت اور بغیر ذکر خدا کے سو گیا ہو۔ تو اس میں اختلاف بھی ہوتا ہے اور اس کے وقوع میں دیر بھی لگتی ہے۔

لسان فلسفہ میں جو لسان شریعت سے مطابق ہی ہے۔ یوں بیان کیا گیا ہے کہ موجوداتِ عالم اور حوادث کی صورتیں تو جواہر عقلیہ اور عالم عقول میں موجود رہتی ہی ہیں (اس عالم عقول کو عالم روحانی اور جواہرِ روحانیہ بھی کہتے ہیں (یعنی فرشتے) یا اس کو لوح محفوظ سے تعبیر کر لو) پس جس وقت نفس انسان کا حواس ظاہریہ میں مشتغل رہنے سے فراغت پالیتا ہے (یعنی سونے کے وقت) اور اسے تجرد حاصل ہو جاتا ہے تو بہ سبب اس کے کہ نفس انسان بھی مجردات اور روحانیات میں سے ہے اس کو تعلق ان روحانیات (فرشتوں یا لوح محفوظ) سے ہو جاتا ہے۔ اور جس قدر امور ان میں موجود ہیں ان میں سے بعض امور بحسب قوت نفس اس نفس میں منقش ہو جاتے ہیں۔ مثلاً فرض کیجئے کہ ایک آئینہ کے سامنے دوسرا آئینہ رکھا جائے تو جس قدر صورتیں اس آئینہ میں نظر آتی ہیں۔ اس کا عکس اس دوسرے آئینے میں دکھائی دے گا۔ بشرطیکہ یہ آئینہ صاف ہو۔ اور گرد و غبار سے پاک ہو۔ پھر وہی صورتیں نفس سے اگر حس مشترک پر پہنچتی ہیں اور وہاں حافظہ اُن کو لے لیتا ہے تاکہ بیداری کے وقت تک اُسے محفوظ رکھے۔ بغیر اس کے کہ قوت متخیلہ اس میں کوئی تصرف کرے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعینہٖ وہی صورت تو نفس میں بسبب اس کی کمزوری کے نہیں چھپتی بلکہ اس کے مشابہ یا اس کے ضد چھپ جاتی ہے تو اس طرح کا خواب سچا سمجھا جاتا ہے اور جسے خواب معتبر یعنی قابل تعبیر کہتے ہیں۔ وہ اس قسم کا خواب ہوتا ہے کہ حالت بیداری اور خارج میں جس طرح چیزیں محسوس و مبصر ہوتی ہیں اس طرح سونے میں نظر نہ آئے بلکہ اس کی مثل یا اس کی ضد دکھائی دے۔ تو اس خواب کی تعبیر دی جاتی ہے۔ مگر تعبیر دینے والا بہت بافہم اور لائق شخص ہونا چاہیئے۔ جو اس شخص کی حالت اور وقت اور عادت کو سمجھ کر تعبیر دے اور جس خواب کو اضغاث احلام کہتے ہیں۔ وہ اس قسم کا خواب ہوتا ہے۔ جو اکثر بد نفس۔ یا بیمار آدمی۔ یا وہ لوگ جو آلائش دنیا میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دیکھتے ہیں۔ یا زیادتی اخلاط بدنیہ یا ہیجان اخلاط کی وجہ سے دکھائی دیتا ہے۔ اس کا کچھ اعتبار نہیں اور نہ اس کی تعبیر ہے۔

خواب معتبر جسے حکماء نے بھی مانا ہے اور اس کی تعبیر کی نسبت اہتمام کرنے کو فرمایا ہے۔ اس کی نسبت ہمارے حکمائے اسلامیین یعنی ائمہ طاہرین علیہم السلام کی یہ ہدایت ہے کہ الرویا علی رجل طائر مالم تعبر فاذا عبرت وقعت۔ یعنی خواب معتبر دیکھنے والے کے سر پر اڑتا رہتا ہے (یعنی اس وقت تک کوئی اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا) پس جب اس کی تعبیر (خواہ اچھی یا بُری) دیدی جاتی ہے۔ تو بیٹھ جاتا ہے۔ (یعنی ویسا ہی واقع ہوتا ہے جیسی تعبیر بیان کی گئی ہے) چنانچہ مجلسی علیہ الرحمہ نے ایک حدیث کتاب السماء والعالم میں نقل فرمائی ہے۔ جس کا محصل یہ ہے کہ ایک عورت نے خواب میں دیکھا کہ اُس کے مکان کا ستون گر گیا ہے۔ وہ عورت خدمت جناب رسالت مآبؐ میں حاضر ہوئی اور اپنے خواب کو حضرت سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا۔ تیرا شوہر سفر سے آئے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس کا شوہر سفر سے آ گیا۔ پھر اس نے یہی خواب دیکھا اور حضرت سے بیان کیا۔ آپ نے وہی تعبیر دی چنانچہ پھر ویسا ہی ہوا۔ تیسری دفعہ پھر اس نے یہی خواب دیکھا اور اپنے گھر سے تعبیر دریافت کرنے کے لئے چلی۔ راہ میں حضرت ثانی سے ملاقات ہو گئی۔ پوچھا کہاں

جاتی ہے۔ کہا ایک خواب کی تعبیر کے لئے خدمت جناب رسول خدا میں جاتی ہوں۔ پوچھا وہ خواب کیا ہے۔ اس نے بیان نہ کیا۔ مگر آپ نے اس قدر اصرار کیا کہ اس بیچاری کو بیان کرنا پڑا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر بیان نہ کروں گی۔ تو یہ بزرگ کسی طرح بخشنے کے نہیں۔ غصہ آئے گا تو ضرور دانت کاٹیں گے۔ جیسی کہ ان کی عادت ہے جھٹ آپ نے بغیر اس کی مرضی کے یہ تعبیر دے دی کہ تیرا شوہر مر گیا۔ ستانی اس کی آئے گی۔ یہ خبر جناب رسالت مآب کو پہنچی۔ حضرت کو تاسف ہوا۔ آخر کو اثر اس کا ویسا ہی ظاہر ہوا۔ کہ خبر موت اُس کے شوہر کی آئی۔

ایک لطیف حکمت خواب کے صادق و کاذب ہونے کی جو جناب صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمائی ہے۔ حدیث مفضل میں حضرت سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا فکر یامفضل فی الاحلام کیف دبر الامر فیھا فمزج صادقھا بکاذبھا فانھا لو کانت کلھا تصدق لکان الناس کلھم انبیاء ولو کانت کلھا تکذب لم یکن فیھا منفعۃ بل کانت فضلاً لا معنی لہ فصارت تصدق احیانا فینتفع بھا الناس فی مصلحۃ یھتدی لھا او مضرۃ یتحذر منھا و تکذب کثیرا لئلا یعتمد علیھا کل الاعتماد" اے مفضل ان خوابوں کے معاملے میں غور کرو کہ کیوں کر اس میں تدبیر امر کی گئی ہے۔ اور سچے خواب کو جھوٹے خواب سے ممزوج کر دیا گیا ہے کیونکہ اگر سب کے سب خواب سچے ہی ہوتے۔ تو تمام نبی ہی ہو جاتے اور اگر تمام جھوٹے ہی ہوتے۔ تو فضول بے معنی ہوتے۔ اُن میں کوئی نفع نہ ہوتا۔ لہٰذا کبھی کبھی خواب سچے ہوتے تھے۔ تاکہ اُن سے آدمی کسی مصلحت میں فائدہ اُٹھا سکے جس کی طرف اس کو راہ ملی ہے۔ یا مضرت سے بچے اور اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ تاکہ آدمی اسی پر پورا بھروسہ نہ کرے۔

تیسرا فائدہ۔ اس نیند میں یہ بھی ہے کہ اس حالت کے طاری ہونے اور اس کے زائل ہونے سے انسان کو بہت بڑا سبق حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ نیند کی حالت موت کی حالت سے بہت مشابہ ہے۔ جس طرح نیند کی حالت میں انسان بالکل بے حس و

حرکت ہوتا ہے۔ اس کا تعلق ظاہر سے قطع ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اس کو ذبح کر ڈالے تب بھی اس کو خبر نہیں ہوتی۔ اسی طرح موت کی حالت ہے کہ روح حیوانی اور نفس ناطقہ کا تعلق بدن سے علیحدہ ہو جاتا ہے صرف اتنا فرق ہے کہ نیند سے اکثر جاگنے کا بھی موقع ملتا ہے اور موت کے بعد عموماً جاگنے اور جی اٹھنے کا موقع نہیں ملتا (الّا ماشذ ونذر) اور اسی کو خدا تعالیٰ نے ایک موقع پر قرآن مجید میں فرمایا ہے (جزو ۲۴ رکوع ۱)

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔

یعنی خدا تعالیٰ نفسوں کو اُن کی موت کے وقت اپنی طرف قبض کر لیتا ہے (جب کہ اُن کے ابدان کے فساد و موت کا وقت آتا ہے) اور نیز اُس نفس (روح) کو بھی قبض کر لیتا ہے۔ جو سونے کی حالت میں نہیں مرتی (یعنی قبض نہیں کی جاتی) پس روک لیتا ہے (خدا تعالیٰ) اُس نفس (روح) کو جس پر موت مقرر کی ہے۔ اور پھر اسے دنیا کی طرف نہیں لوٹاتا۔ اور جس پر موت مقرر نہیں کی ہے۔ اُسے چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ سونے والے کے جسم میں پھر واپس آئے۔ ایک وقت معین تک کے لئے بے شک اس میں نشانیاں ہیں۔ اُن لوگوں کے لئے جو سوچیں۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ بدن انسان میں دو روحیں ہیں۔ ایک روح حیات اور دوسری روح تمیز و عقل۔ پس جو روح کہ سونے کی حالت میں قبض ہوتی ہے وہ روح عقل و تمیز ہے۔ جس کے جدا ہو جانے سے سونے والے کو کچھ خبر ظاہر کی نہیں رہتی۔ اور روح حیات کے جدا ہو جانے پر آدمی کو مُردہ کہنے لگتے ہیں۔ جس کے جدا ہو جانے پر پھر روح تمیز واپس نہیں آتی۔ تو موت اور نیند میں یہ فرق ٹھیرا۔ کہ قبض النوم بیداری کے مخالف ہے اور قبض الموت حیات کے۔ قبض النوم کے ساتھ روح الحیات جسم میں رہتی ہے۔ اور قبض الموت کے ساتھ الگ ہو جاتی ہے۔ اور اس میں دلیلیں سوچنے والوں کے لئے یہ ہیں۔ کہ کس طرح سونے کی حالت میں دو روحوں میں سے صرف ایک روح علیحدہ کر لی جاتی ہے۔ جس کا تعلق روحانیات سے پیدا ہو جاتا ہے

اور دوسری روح اسی طرح قائم رہتی ہے اور مرنے کے وقت دونوں روحیں علیحدہ ہو جاتی ہیں کیا اس فعل پر خود انسان یا اور کوئی قادر ہے۔ سوائے خدا تعالیٰ جل مجدہٗ وعز قدسہ کے؟

اسی آیت کی تفسیر میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے تفسیر صافی ومجمع میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کوئی ایسا شخص نہیں جو سوتا ہو۔ مگر یہ کہ اس کا نفس (روح التمیز) آسمان کی طرف چلی جاتی ہے اور اس کی روح (روح الحیات) بدن میں رہتی ہے اور ان دونوں میں مثل شعاع آفتاب کے تعلق باقی رہتا ہے۔ پس اگر خدا تعالیٰ قبض روح کا حکم دیتا ہے۔ تو روح (روح الحیوٰۃ) نفس (روح التمیز) کی اجابت کرتی ہے۔ اور اگر روح کے واپس کر دینے کا حکم دیتا ہے۔ تو نفس روح کی اجابت کرتا ہے۔ یہی مطلب ہے خدا تعالیٰ کے اس قول کا اللہ یتوفی الانفس حین موتہا الخ

خلاصہ یہ کہ نیند اور موت کی حالت بظاہر ایک سی معلوم ہوتی ہے۔ تو گویا اس میں یہ بھی تنبیہ ہے کہ جس طرح تم سونے کے بعد روزانہ جاگ اٹھتے ہو۔ اسی طرح مرنے کے بعد جب حکم خدا ہوگا، تو بھی اٹھو گے۔ کیونکہ جس طرح روح کا لوٹا دینا نیند کے بعد اس کو ممکن ہے اسی طرح مرنے کے بعد بھی جسم میں اس کا واپس کر دینا ممکن ہے۔ پس کیوں انبیاء علیہم السلام کے اس قول کی تکذیب کی جاتی ہے جو وہ معاملہ بعث وحشر ونشر کو بیان کرتے ہیں اور کیوں یہ کہا جاتا ہے۔ کیف یحی العظام وہی رمیم۔

چوتھا فائدہ۔ اس نیند اور نیند کی حالت میں خواب دیکھنے سے یہ ہے جیسے حدیث میں فرمایا ہے کہ لم تکن الاحلام قبل وانما حدثت والعلۃ فی ذالک ان اللہ تعالیٰ بعث رسولا الی اہل زمانہ فدعاہم الی عبادۃ اللہ و طاعتہ فقالوا ان فعلنا ذالک فما لنا فقال ان اطعتمونی ادخلکم اللہ الجنۃ وان عصیتم ادخلکم النار فقالوا وما الجنۃ وما النار فوصف لہم ذالک فقالوا متی نصیرا الی ذالک فقال اذا متم فقالوا لقد رأینا امواتنا صاروا عظاما

ورفاتادوا زدادوا تکذیبا وبہ استخفافا فاحدثت الاحلام فیھم فاتوہ واخبروا بمارادوما انکروا من ذلک فقال ان اللّٰہ تعالیٰ اراد ان یحتج علیکم بھذا ھکذا تکون ارواحکم اذا متم وان بلیت ابدانکم تصیر الارواح الی عقاب حتی تبعث الابدان۔" (مجمع البحرین لغت حلم) خواب پہلے نہیں ہُوا کرتے تھے بلکہ یہ حادث ہُوئے ہیں۔ اور سبب اس کا یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ نے ایک رسولؐ کو ان کے اہل زمانہ کی طرف بھیجا تو انہوں نے اپنے اہل زمانہ کو عبادت وطاعت خدا تعالیٰ کی طرف دعوت کی۔ وہ کہنے لگے۔ کہ اگر ہم یہ (عبادت) کریں تو ہمیں کیا ملے گا۔ رسول نے کہا کہ اگر تم میری اطاعت کرو گے تو خدا تعالیٰ تم کو جنت میں داخل کرے گا۔ اور اگر تم میری مخالفت کرو گے۔ تو دوزخ میں ڈالے گا۔ وہ کہنے لگے کہ جنت اور دوزخ کیا چیز ہے؟ تو اس (رسول مبعوث) نے اُن سے اُسے بیان فرمایا۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم کب وہاں جائیں گے۔ رسول نے کہا۔ جب مرو گے۔ کہنے لگے ہم نے تو اپنے مردوں کو دیکھا کہ وہ ہڈیاں بن کر ریزہ ریزہ ہو گئے۔ (اب کیونکر جنت یا دوزخ میں جائیں گے۔) پھر تو اور زیادہ جھٹلاتے اور ان رسول کا استخفاف کرتے لگے۔ اس وقت ان میں خواب پیدا کیا گیا۔ تو رسول کے پاس آئے اور جو کچھ خواب میں دیکھا تھا اسے بیان کیا۔ پس رسول نے فرمایا۔ کہ خدا تعالیٰ نے چاہا ہے کہ اس سے تمہارے اوپر دلیل قائم کرے (یعنی جو تم جنت و دوزخ و عذاب و ثواب کا انکار کرتے ہو اسے تمہیں ثابت کر کے دکھا دے) اسی طرح تمہاری روحیں مرنے کے بعد ہوں گی۔ جب کہ بدن زائل ہو جائیں گے تو روحوں پر عذاب ہو گا۔ یہاں تک کہ بدن دوبارہ پیدا کیا جائے۔

حاصل یہ ہُوا کہ جس طرح انسان خواب میں دیکھتا ہے کہ مثلاً میں باغ میں ٹہل رہا ہُوں اور اس کے پھلوں اور پھولوں کو سونگھ سونگھ کر لذت لے رہا ہوں۔ یا کسی بُرے مقام میں ہوں۔ وہاں لوگ مجھ کو مار رہے ہیں یا ڈرا رہے ہیں۔ اور اس سے رنج کو سرور یا الم سونے کی حالت میں پہنچتا ہے جس کی کیفیت کو آدمی

جاگنے کے بعد اپنی روح میں محسوس کرتا ہے۔ حالانکہ بدن کو اس سے کوئی ایذار بظاہر نہیں پہنچتی۔ گو اس تعلق کی وجہ سے ایک عضو جسمی یعنی قلب پر اس کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ اسی طرح مرنے کے بعد بھی روح پہ عذاب ہوگا۔ یا اس کو ثواب ملے گا۔ جس کی لذت یا جس کی تکلیف اُسے محسوس ہوگی۔ پس یہ نیند اور خواب دلیل ہیں اُن بیانات کی اور تصدیق ہیں اُن دعووں کی جو انبیاء اور اُن کے اوصیاء نے کئے علیہم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

لا یخفیٰ کہ آیت مذکورہ کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے وجود کی نشانیوں میں سے تمہارا سونا ہے رات اور دن میں اور پھر نیند سے اٹھ کر اس کے فضل یعنی رزق کو حاصل کرنا ہے۔ یعنی تم کو نیند میں بھی ہم لے جاتے ہیں اور پھر جگاتے بھی ہیں کہ تم ہمارے فضل وعطایا کو حاصل کرو اور سمجھو کہ یہ بات بغیر خالق حکیم کے ہرگز نہیں ہو سکتی!! واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

پانچویں آیت۔ ومن اٰیاتہ یریکم البرق خوفاً وطمعاً وینزل من السمآء ماءً فیحیی بہ الارض بعد موتہا ان فی ذالک لاٰیات لقوم یعقلون ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ اور خدا تعالیٰ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تم کو دکھلاتا ہے بجلی جس سے تمہیں خوف وطمع دونوں عارض ہوتے ہیں۔ کبھی تو بجلی کی چمک دیکھ کر ڈر جاتے ہو اور کبھی تمہیں یہ طمع ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے سے مینہ برسے گا۔ (چنانچہ عرب میں مشہور ہے کہ جب سو مرتبہ بجلی چمکتی ہے تو ضرور مینہ برستا ہے) اور وہ آسمان سے مینہ برساتا ہے۔ پس اس سے زمین کو بعد اس کے مر جانے کے زندہ کرتا ہے۔ بے شک اس میں عاقل لوگوں کے واسطے کئی نشانیاں ہیں۔

برق کی نسبت خواہ وہ قول تسلیم کیا جائے۔ جو محدود نظر والوں نے دریافت کر کے نہیں بلکہ محض اپنے قیاس وخیال سے بیان کیا ہے۔ یعنی بخارات آبی و خاکی جب زمین اور پانی سے اٹھ کر ہوا میں بلند ہوتے ہیں۔ اور ایک ان میں

سے یعنی بخار آبی کرہ زمہریر تک پہنچ کر ابر بن جاتا ہے۔ تو دوسرا بخار خشک جو زمین سے اٹھا ہے۔ اور اس میں اجزائے دخانیہ بھی ہیں۔ اس ابر تک پہنچنا چاہتا ہے اور وہ بہ سبب بوجھل ہونے کے نیچے کی طرف آتا ہے اور ان دونوں بخاروں یعنی بخار ابر شدہ اور بخار خشک دخانی میں تصادم اور مقاومت واقع ہوتی ہے۔ تو ہوا جو ان دونوں کے درمیان محبوس ہوتی ہے۔ بسبب شرکت اجزائے دخانی کے جل اٹھتی ہے۔ اُس کے جلنے سے بخار دخانی میں شعلہ لگ جاتا ہے۔ یا یہ کہ پہلے سے بخار دخانی اوپر متصاعد ہو گیا تھا۔ پھر نیچے اس کے ابر ہو گیا اور وہ کرہ زمہریر کی برودت سے کثیف و ثقیل ہو کر نیچے کی طرف مائل ہُوا۔ اور ابر نے اسے روکا اور اس نے قوت سے ابر کو پھاڑنا چاہا۔ اس قوت و حرکت سے اس بخار متشاقل میں آگ پیدا ہو گئی۔ اور ابر سے دکھائی دی وہ برق ہے۔ یا وہ قول تسلیم کیا جائے۔ جو آسمانی مخبروں نے بیان فرمایا ہے۔ جن پر وحی بھی آتی تھی۔ جنہیں الہام بھی ہوتا تھا اور جو واقعی موجودات و کائنات کے حالات سے قرار واقعی مطلع تھے۔ یعنی کہ البرق مخاریق الملائکۃ تضرب السحاب فتسوقہ الی الموضع الذی قدر اللہ فیہ المطر۔ بجلی فرشتوں کا کوڑا ہے۔ جس سے وہ سحاب کو مار کر اس مقام کی طرف ہنکالے جاتے ہیں۔ جہاں مینہ برسنا خدا تعالیٰ نے مقدر کیا ہے۔ نیز دوسرے لفظوں میں جناب رسولؐ خدا سے مروی ہے کہ آپ سے کسی نے پوچھا کہ رعد کیا چیز ہے۔ تو آپ نے فرمایا ملک موکل بالسحاب معہ مخارق من نار یسوق بہا السحاب رعد ایک فرشتہ ہے جو سحاب پر مؤکل ہے۔ اس کے پاس آگ کے کوڑے یا ڈنڈے ہوتے ہیں۔ جن سے وہ سحاب کو ہنکاتا ہے۔ اور ابن عباس سے مروی ہے جو شاگرد علی بن ابی طالب علیہ السلام کے تھے۔ الرعد ملک اسمہ الرعد وھو الذی یسمع صوتہ والبرق سوط من نور یزجر بہ السحاب" جس کا حاصل وہی ہے۔ جو سابق میں مذکور ہوا۔ بہر صورت اس کے آیت وجود و قدرت خداوندی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر وُہ ہے جو دنیاوی حکماء نے بیان کیا ہے۔ تب بھی یہ عجیب بات کیونکہ

پیدا ہوئی کہ ابر کے اندر آگ لگے۔ جس میں پانی ہی پانی بھرا ہوا ہے۔ بلکہ خود ہمہ تن پانی ہے۔ آگ اور پانی کا اجتماع سوائے اقدر القادرین کی قدرت کے کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟ اور اگر یہ ہے جسے الٰہی حکمار نے بیان کیا ہے۔ تو اس میں صاف دلیل موجود ہے کہ ابر کے واسطے ایک خاص قانون مقرر کرنا کہ اس پر ایک ملک موکل رہے اور اسے خاص خاص مقامات پر پہنچایا کرے۔ جہاں پانی برسنا مقدر ہو چکا ہے۔ تاکہ ہر ایک ملک و شہر کے آدمی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ سوائے ارحم الراحمین اور رؤف الجبار کے جو حکیم و قادر بھی ہو۔ کس سے ممکن ہے؟ اس آیت میں بھی خدا تعالیٰ نے کئی نشانیاں بیان فرمائیں۔ ایک برق کا پیدا کرنا ابر سے دوسرے بخارات کو پانی بنا کر برسانا۔ تیسرے مردہ زمین کو زندہ کرنا۔ جن میں سے ہر ایک نشانی دلیل ربوبیۃ ہونے کے لئے کافی ہے۔

رہی قید عاقل ہونے کی جو آیت میں مذکور ہے کہ "یہ چیزیں عاقلوں کے واسطے نشانیاں ہیں" اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی امر کا سمجھنا۔ اس میں غور کرنا۔ اپنے غور سے فائدہ اٹھانا چونکہ عاقلوں ہی کا کام ہے نہ کہ بے عقلوں کا۔ کیونکہ بسبب کم عقلی کے اس سے محروم ہیں لہٰذا ضرورت اس قید کی واقع ہوئی۔

چھٹی آیت۔ ومن ایاتہ ان تقوم السماء والارض بامرہ ثم اذا دعاکم دعوۃ من الارض اذا انتم تخرجون ٥ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا اس کے حکم سے قائم رہنا ہے۔ پھر جس وقت تم کو پکارے گا زمین سے ناگاہ تم لوگ نکل پڑو گے۔" یعنی اس کے وجود کے دلائل میں سے یہ بھی ہے کہ اتنا بڑا آسمان باوجود اس جسامت و عرض و طول کے اور اتنی بڑی وزنی زمین باوجود اس وسعت و گرانباری کے بغیر کسی ستون و عمود اور بغیر کسی بندش کے قائم ہے۔ ایک چھوٹا سا خیمہ جب نصب کیا جاتا ہے تو اس کے واسطے کتنی رسیاں۔ کتنی میخیں۔ کتنے اور بدات درکار ہوتے ہیں۔ لیکن آسمان کے خیمہ کے واسطے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ کیا بغیر کسی قادر مطلق کی صنعت کے ایسا ہو گیا ہے؟

امر سے مراد حکم ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ انما قولنا لشئ اذا اردناہ ان نقول لہ کن فیکون" ہمارا حکم کسی چیز کے لئے جب کہ ہم اس کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو یہ ہے کہ کہہ دیتے ہیں" ہو جاؤ" پس وہ ہو جاتی ہے۔ اور یا مراد امر سے فعل اور امساک ہے۔ یعنی ہمارے عمل اور ہمارے روکے رہنے سے آسمان و زمین قائم ہیں۔ اور اس صورت میں امر کا لفظ زیادہ بلیغ فی المطلب ہو گا۔ کیوں کہ اس صورت میں زیادہ اقتدار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی کہتا ہے۔ فلاں امر فکان۔ فلاں شخص نے حکم دیا اور ایسا ہو گیا۔ یا ارادہ فکان یعنی ارادہ کیا اور ایسا ہو گیا۔ تو یہ کلام بہ نسبت فعل فکان (یعنی اپنے ہاتھ سے کیا تو ایسا ہو گیا) سے زیادہ اقتدار اس کام پر ظاہر کرتا ہے۔

بارہ تک تو خدا تعالیٰ نے اپنے وجود قدرت و حکمت و کمال صنعت و علم کے دلائل بیان فرمائے۔ اس کے بعد اس آخری معاملہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا جس کا ہونا ضروری اور لابدی تھا یعنی قیامت کا دور اور اس میں بھی اپنی قدرت بیان فرمادی کہ جب بالکل سڑ گل کر بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو چکے ہو گے۔ اس وقت ہم (یعنی ہمارا فرشتہ اسرافیل) تم کو پکاریں گے۔ تو ناگاہ تم قبروں سے ہمارے حکم پر نکل ہی پڑو گے اور میدان حشر کی طرف حساب و کتاب کی غرض سے روانہ ہو جاؤ گے۔

یہ وہی عظیم الشان امر ہے جس پہ دنیا کے تمام نیک بد امور و اصلاح تمدن و بقائے تمدن اور اصلاح اخلاق اور نظام عالم موقوف ہے۔ ایک اسی دن کے ہونے کا تمام عالم کے دلوں میں مختلف صورتوں سے خیال ہے۔ جس سے ان کو اپنے اخلاق کی اصلاح اور تمدن کے ابقا پر توجہ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ اگر قیامت کے وقوع کا خیال اٹھ جائے اور کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ ہمیں نیک کاموں کا معاوضہ ملے گا اور برے کاموں کی سزا حاصل ہو گی۔ اگر ہم بد اخلاق ہوں گے تو ہمارا پیدا کرنے والا ایک روز ہمیں زندہ کر کے سخت سزا و عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اگر ہم

نیک اخلاق ہوں گے تو وہ ہم کو راحت کے اسباب دے گا۔ تو ہرگز کسی کو ضرورت نہ معلوم ہوتی۔ کہ وہ معصیتوں سے بچے۔ اور اعمال حسنہ کی طرف متوجہ ہو کیونکہ اُسے تو صرف یہی خیال ہے کہ جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لو۔ یہی ایک زندگی ہے اسی میں چاہو ثواب حاصل کر لو۔ خواہ تکلیف اٹھا لو۔ تو کیوں وہ بلا ضرورت لذات سے پرہیز کرتا۔ جس میں کوئی اخلاقی خرابی۔ یا تباہی تمدن ہے اور اسے کیا ضرورت پڑی ہوتی کہ وہ خواہ مخواہ عبادت میں اپنے جسم میں تکلیف پہنچاتا۔ اور کیوں وہ کسی سے نیکی کرتا۔ اور کیوں تنہائی میں جب کہ کسی غیر آدمی کے دیکھنے کا خیال نہ ہوتا تو وہ زنا سے یا شراب خواری یا سرقہ سے باز رہتا۔ اسی دن کا خیال تو اسے روک رہا ہے۔ اور گناہوں سے اس کو بچاتا اور نیک کاموں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

اور اس کا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ جب ثابت ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی عالم کا خالق ضرور ہے اور اُسی نے ہر عاقل کو پیدا کیا ہے۔ تو کوئی نہ کوئی غرض بھی اُس کی ضرور ہوگی۔ کیونکہ بلا فائدہ اور بلا غرض کوئی کام کرنا خلاف عقل ہے۔ حالانکہ ہم اس کے تمام کاموں کو مطابق عقل پاتے ہیں۔ تو کیونکر سمجھا جاسکتا ہے کہ عالم کا پیدا کرنا بلا فائدہ و غرض ہے۔ اور جب کوئی غرض ہوئی۔ تو ضرور اس کے پورا ہونے پہ وہ راضی ہوگا۔ اور اس کے نہ پورا ہونے پہ ناراض ہوگا۔ اور جب اس نے اتنا بڑا عالم بنایا ہے۔ تو ضرور اس کے لئے کوئی قانون بھی مقرر کیا ہوگا۔ جس کے نفاذ میں اس کی خوشی ہوگی۔ اور عدم نفاذ میں ناخوشی۔ اور جب ایسا ہوا۔ تو یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی خاص دن اس رضامندی اور ناراضی کے ظاہر ہوتے کا بھی ہو۔ تاکہ معلوم ہو کہ کس کس نے اس کے اغراض خلقت اور قوانین تمدن کو پورا کیا۔ اور کس نے نہ کیا۔ کس نے اس کی اطاعت کی اور کس نے اس کی مخالفت۔ اور تاکہ اس پہ جو سزا یا جزا مترتب ہونے والی ہو۔ اس کا اجرا اُس روز کیا جائے۔ جس سے اس کا عدل قائم رہے۔

پس لامحالہ خدا کے وجود کے ماننے اور اس کے ایجاد و خلق کے تسلیم کرنے

کے بعد اس روز کا ماننا بھی لازم ہے چونکہ اس دن کا ہونا ضروری اور لابدی ہے تو خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب مجید میں بہت سے مقامات پر اس کا تذکرہ فرمایا ہے اور لوگوں کو اس دن کے آنے سے متنبہ کیا ہے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ بے پرواہ ہو کر غرض الٰہی کو جو خلقت عالم میں ہے پورا نہ کریں اور لہو و لعب میں پڑ کر اس معنی کو کہ ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ۔ (میں نے جن و انس کو نہیں پیدا کیا ہے مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں) بھول جائیں۔ تو نظام عالم میں خلل پڑ جائے جو ہرگز اسے پسند نہیں ہے۔ تو کہیں اس طرح فرمایا و نفخ فی الصور ذالک یوم الوعید وجاءت کل نفس معھا سائق وشھید۔ اور صور پھونکا گیا۔ یہی وہ دن ہے جس سے تم کو ڈرایا گیا ہے کہ (ایک روز تم لوگوں کے لئے حساب کتاب اور سزا و جزا کا ضرور ہو گا۔) اور ہر شخص آیا (یعنی آئے گا اس طرح کہ) اس کے ساتھ ایک کھینچنے والا اور گواہ ہے (یعنی ہو گا) کہیں فرمایا۔ یوم یسمعون الصیحۃ بالحق ذالک یوم الخروج۔ جس دن لوگ سنیں گے چیخ (صور اسرافیل کی) مبعوث ہونے کی (یا یہ کہ یقیناً سنیں گے) وہی (قبروں سے) نکلنے کا دن ہے۔ انا نحن نحیی و نمیت والینا المصیر۔ بے شک ہم ہی زندہ کرتے اور مار ڈالتے ہیں۔ اور ہماری ہی طرف بازگشت ہے۔ یوم تشقق الارض عنھم سراعاً ذالک حشر علینا یسیرا۔ جس دن کہ شق ہو گی ان سے زمین۔ درحالاں کہ لوگ بھاگتے ہوئے اور جلدی کرتے ہوئے ہوں گے۔ یہی حشر ہے جو ہمارے نزدیک آسان ہے اور کہیں فرمایا ہے وما ینظرون الا صیحۃ واحدۃ تاخذھم وھم یخصمون فلا یستطیعون توصیۃ ولا الی اھلھم یرجعون قالوا یٰویلنا من بعثنا من مرقدنا ھٰذا ما وعد الرحمٰن وصدق المرسلون۔ ان کانت الا صیحۃ واحدۃ فاذا ھم جمیع لدینا محضرون۔ نہ انتظار کرتے ہیں یہ لوگ مگر ایک بلند آواز کا (صور کا پھونکنا مراد ہے) جو انہیں پکڑ لے گا ایسی حالت میں کہ وہ اپنے کاروبار میں جھگڑ رہے ہوں گے" یعنی یک بیک یہ دن آجائے گا۔ جب کہ صور پھونکا جائے گا" پس

نہ تو وصیت ہی کر سکیں گے اور نہ اپنے اہل و عیال کی طرف واپس آ سکیں گے۔ پھر فرمایا کہ جب قیامت کے دن قبروں سے زندہ ہو کر اٹھیں گے۔ تو یہ مُردے کہیں گے کہ ہمیں کس نے ہماری قبروں سے اٹھایا۔ یہ تو وہی ہے جس کا وعدہ خدا نے کیا تھا اور رسولوں نے سچ فرمایا تھا۔" ایک ہی چیخ ہو گی۔ پس سب کے سب ہمارے سامنے حاضر ہو جائیں گے۔

پھر اس کا نتیجہ بھی ظاہر کر دیا کہ اس دن کیا ہو گا کہیں یہ فرما دیا۔ ینبؤ الانسان یومئذٍ بما قدم واخر۔ اس دن آدمی کو بتا دیا جائے گا جو اس نے احکام خدا میں آگے پیچھے کیا ہے کہیں یہ فرمایا یومئذٍ یصدر الناس اشتاتا لیروا اعمالھم۔ اس دن لوگ متفرق طور پر آئیں گے۔ تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھا دیئے جائیں۔ کہیں فرمایا وجوہ یومئذٍ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ ووجوہ یومئذٍ باسرۃ تظن ان یفعل بھا فاقرۃ۔ (سورہ قیامت) کچھ لوگوں کے چہرے تو تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی رحمت کو دیکھتے ہوں گے اور کچھ لوگوں کے چہرے متغیر ہوں گے کیوں کہ انہیں اپنی بداعمالی کی وجہ سے یقین ہو گا کہ سخت سزا پائیں گے کہیں یہ فرما دیا۔ فیومئذٍ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جآن۔ فبای اٰلآء ربکما تکذبٰن۔ یعرف المجرمون بسیماھم فیؤخذ بالنواصی والاقدام۔ فبای اٰلآء ربکما تکذبٰن۔ پس اس روز اپنے گناہ سے انسان اور جن نہ پوچھے جائیں گے۔ (بلکہ بے پرسش جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔ پس اے جن و انس تم خدا تعالیٰ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ گناہ گار لوگ اپنی پیشانیوں سے پہچان لئے جائیں گے پس سر اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے۔ یعنی گلے میں طوق ہو گا۔ اور پاؤں میں زنجیریں پس اے جن و انس تم کن کن نعمتوں کو خدا کی جھٹلاتے رہو گے۔ کہیں یہ فرما دیا۔ ان المجرمین فی ضلٰلٍ وسعرٍ یوم یسحبون فی النار علی وجوھھم ذوقوا مس سقر۔ بے شک گناہ گار لوگ ہلاکی ضلالت اور دہکتی ہوئی آگ میں ہوں گے۔ جس دن کہ منہ کے بل کھینچے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا کہ) دوزخ کا مزہ چکھو

اور کہیں یہ فرمادیا۔ ان المتقین فی جنات و نھر فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر بے شک پرہیزگار لوگ باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔ یعنی اُن کے سامنے نہریں جاری ہوں گی۔ نشستگاہ صحیح میں ہوں گے۔ اپنے قادر بادشاہ (خدا تعالیٰ کے پاس) جس کا حاصل یہ ہوا کہ نافرمانوں کو سخت سزائیں ملیں گی اور فرمانبرداروں کو اس روز بہت کچھ آرام پہنچایا جائے گا۔ اور طرح طرح کی نعمتوں سے ان کو کامیاب کیا جائے گا۔

ازبسکہ یہ موقع اس مضمون کو وسعت سے لکھنے کا نہیں ہے اس لئے اسی قدر پر اکتفا کی جاتی ہے ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

ساتویں آیت۔ ولہ من فی السمٰوٰت والارض کل لہ قانتون۔ اور اسی کے لئے ہے۔ یعنی اسی کے ہیں جو لوگ از قسم ملائکہ و روحانیات و جن و انس و نجوم و کواکب و حیوانات و نباتات و جمادات ہیں۔ (بر سبیل تغلیب سب پر من کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور نیز بلحاظ قانتون کے بھی) سب کے سب اس کے مطیع و فرمانبردار ہیں کہ جو کچھ اس نے حکم دیا ہے۔ اسی کے مطابق عامل ہیں۔ اگر پیدا ہونے کا حکم دیتا ہے تو پیدا ہو جاتے ہیں۔ زندہ رہنے کا حکم دیتا ہے تو زندہ رہتے ہیں۔ مرجانے حکم دیتا ہے تو مرجاتے ہیں۔ جب محشور ہونے کا حکم دے گا تو سب کے سب اپنے اپنے مقامات سے خواہ قبروں میں ہوں یا اوکار طیور میں بطون سباع میں ہوں۔ یا شعاب جبال میں۔ اور خواہ قعور بحار میں نکل نکل کر میدان حشر کی طرف روانہ ہوں گے۔ اور سوال و جواب و حساب و کتاب کے بعد داخل جنت یا دوزخ ہوں گے۔ اللّٰھم قد سبقت رحمتک غضبک فارحمنا برحمتک وادخلنا فی جنتک مع عبادک الصالحین وصل علی محمد والہ الطاھرین ٭

دوسرا باب

توحید خدا تعالیٰ

جس طرح مذاہب عالم کی کتابیں شرک کا سبق تعلیم کرتی ہیں مثلاً کتاب انجیل محرّف حضرت عیسیٰ پیغامبر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بتاتی ہے یا پارسیوں کی کتاب نور وظلمت کو خالق العالم تسلیم کراتی ہے۔ یا ہندوؤں کے وید مادہ اور روح کو خدا تعالیٰ کے ساتھ قدیم اور واجب الوجود بتاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی کتاب مقدس یعنی قرآن اُن کتابوں کے برخلاف توحید کا سبق سکھاتی ہے اور ایسی پختہ توحید جس سے بہتر توحید بیان ہی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سورہ اخلاص میں فرماتا ہے قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔ ان آیتوں میں قرآن مجید نے ہر قسم کی توحید بیان کر دی ہے۔ یہ بھی ظاہر کر دیا ہے۔ کہ وہ ایسا احدی الذات ہے کہ اس میں کسی قسم کے اجزائے ترکیبیہ یا تحلیلیہ بھی نہیں ہیں۔ اور ایسا یکتا ہے کہ اس کو کسی معین و مددگار کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اور ایسا متفرد ہے کہ اس کی اولاد بھی نہیں ہے۔ اور ایسا یکتا ہے کہ اس کے لئے ماں باپ بھی نہیں ہیں۔ اور ایسا متوحد ہے کہ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ خواہ زوجہ ہو اور خواہ کوئی اور ہو۔

قل کہہ دے اے رسول اُن لوگوں سے جو تجھ سے کہتے ہیں کہ انسب لنا ربک اپنے رب کے نام ونسب بیان کرو۔ یا جو کہتے ہیں کہ صف لنا ام من ذھب ھو ام من فضۃ ام من حدید ام من خشب۔ ہم نے بیان کر اے محمد کہ تیرا پروردگار سونے کا ہے یا چاندی کا۔ لوہے کا ہے یا لکڑی کا۔ یا جو یہ کہتے ہیں کہ تورات میں تو صفات پروردگار مذکور ہیں۔ ذرا تم بھی تو اے محمد اپنے پروردگار کی صفات بیان

کرو تاکہ ہم ان دونوں میں تمیز کر کے ایمان لاسکیں۔

ھو اللہ احد وہ معبود برحق یکتا ہے نہ اس کا کوئی شریک ہے نہ نظیر۔
جناب محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ھُوَ اسم کنایہ کردہ شدہ ہے۔ اور اس سے ایک غائب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پس ھُوَ میں جو حرف ھا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ذات احدیہ قائم و ثابت ہے اور دسے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ وہ حواسوں سے محسوس نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ تمہارا لفظ ھذا اشارہ ہے۔ اسی کی طرف جو حاسوں سے محسوس ہو۔ اسی طرح ھو اشارہ ہے۔ اس کی طرف جو حاسوں سے محسوس نہ ہو سکے) اور اس لفظ کے اشارہ فرمانے کا سبب یہ ہے کہ کفار اپنے بتوں کو اس لفظ سے اشارہ کرتے تھے۔ جو محسوس و مشاہدہ کے واسطے بنایا گیا ہے (یعنی ہذا یا ہذہ) تو کہتے ہیں۔ ھذہ الہتنا پس یہ ہیں ہمارے معبود جو مشاہدہ میں آتے ہیں۔ اور آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں۔ فاشر انت یا محمد الیٰ الھك الذی تدعوا الیہ حتی نراہ وندرکہ ولا نالہ فیہ۔ تو اے محمد تم بھی اپنے اس معبود کو اشارہ سے بتاؤ جس کی طرف تم لوگوں کو دعوت کرتے ہو۔ تاکہ ہم اسے دیکھ لیں اور ادراک کر لیں۔ اور اس کی بابت حیران نہ رہیں۔ (جیسے اب بغیر اس کے دیکھنے کے حیران ہیں کہ آخر ہم اس کو کیسا سمجھیں) تو خدا تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا کہ قل ھو اللہ احد۔ پس حرف ہا وجود ثابت کو ظاہر کرتا ہے اور واو سے مراد غائب عن درک الابصار ولمس الحواس ہے۔ یعنی نہ اُسے آنکھیں دیکھ سکتی ہیں اور نہ اُسے حواس ظاہرہ ادراک کر سکتے ہیں۔ بلکہ وُہ خود مدرک الابصار یعنی آنکھوں کا ادراک کرنے والا۔ اور مبدع الحواس یعنی حواس کا پیدا کرنے والا ہے۔ (حضرت فرماتے ہیں کہ) میرے پدر بزرگوار نے روایت کی ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام سے کہ میں نے خضر (علیہ السلام) کو خواب میں دیکھا۔ جنگ بدر سے ایک شب پہلے تو میں نے ان سے کہا کہ کوئی چیز ایسی آپ مجھے تعلیم کریں۔ جس سے میں دشمنوں پر فتح مند ہوں۔ تو فرمایا (حضرت خضر نے) کہ کہو یا ھو یا من لا ھو الا ھو۔ پس جب صبح ہوئی تو اس قصہ

کو جناب رسالت مآب سے میں نے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا یا علی تمہیں تو اسم اعظم تعلیم کیا گیا ہے اور یہ کلمہ میری زبان پر جنگ بدر کے دن جاری ہوا تھا۔ ایک مرتبہ امیر المومنین علیہ السلام نے قل ھو اللہ احد پڑھا۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا یا ھو یا من لا ھو الا ھو اغفر لی وانصرنی علی القوم الکافرین۔ اور یہی کلام آپ جنگ صفین کے دن بھی کہتے ہیں۔ تو عمار بن یاسر نے عرض کی کہ یا امیر المومنین یہ کیا کنایات ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ اور اے عمار توحید خدا تعالیٰ ہے لا الٰہ الا ھو۔ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں پھر آپ نے آیہ شہد اللہ انہ لا الٰہ الا ہو اور سورہ حشر کے آخری آیات تلاوت فرمائے۔ پھر گھوڑے سے اتر کر قبل زوال کے چار رکعتیں پڑھیں۔" (امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ) امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے۔ اللہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسا معبود ہے کہ یالہ فیہ الخلق و یُولہ الیہ جس کے معاملہ میں مخلوق حیران ہے اور اسی طرف احتیاج لے جاتی ہے۔ اور اللہ کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ آنکھوں کی بینائی سے مستور و مخفی ہے (یعنی اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں) اور وہموں اور خطروں سے چھپا ہوا ہے یعنی وہم و خیال اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ اللہ کے معنی یہ ہیں کہ مخلوقات اس کی ماہیت کے دریافت کرنے اور اس کی کیفیت کے معلوم کرنے سے عاجز ہے۔ عرب کا مقولہ ہے کہ اَلِہَ الرجل جب کہ کوئی شخص کسی طرف پناہ لے جائے۔ کسی خوفناک شے سے (مطلب یہ ہوا کہ لفظ اللہ مشتق ہے اَلِہَ یا وَلِہَ سے جس کے معنی حیران ہونے یا محتاج ہونے کے ہیں چونکہ انسان ذات خدا تعالیٰ کی پوری پوری معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔ اور اس معاملہ میں حیران ہے۔ اس وجہ سے خدا تعالیٰ کو اللہ کہتے ہیں۔ یا اس سبب سے کہ احتیاج کے وقت اسی کے سامنے اپنی حاجت پیش کرتے ہیں۔ پس الٰہ وہ ہے جو خلق کے حواس سے مخفی ہے (یعنی اس کو انسانی حواس محسوس نہیں کر سکتے۔ نہ وہ جسم و رنگ ہے۔ جسے آنکھ سے دیکھ سکیں۔ اور نہ وہ از قسم خوشبو ہے۔ جسے ناک سے سونگھ سکیں۔

نہ وہ آواز ہے۔ جسے کان سے سن سکیں۔ اور نہ وہ مطعوم ہے جسے چکھ کر معلوم کر سکیں نہ وہ ایسی چیز ہے جسے حاسہ لامسہ سے چھُو کر محسوس کر سکیں۔)

(آپ نے فرمایا) اَحَد کے معنی فرد متفرد کے ہیں (یعنی اکیلا اور یکتا) احد اور واحد کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی وہ ایسا متفرد ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں۔

توحید صدوق اور امالی سے توحید بحار میں منقول ہے کہ مقدام بن شریح بن ہانی نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ ان اعرابیا قام یوم الجمل الی امیر المومنین علیہ السلام فقال یا امیر المومنین اتقول ان اللہ واحد قال فحمل الناس علیہ وقالوا یا اعرابی اما تری ما فیہ امیر المومنین علیہ السلام من تقسم القلب۔ فقال امیر المومنین دعوہ فان الذی یریدہ الاعرابی ھو الذی تریدہ من القوم ثم قال یا اعرابی ان القول فی ان اللہ واحد علی اربعۃ اقسام فوجہان منھا لا یجوزان علی.....

..... عن ذالک واما الوجھان اللذان یثبتان فیہ فقول القائل ھو واحد لیس لہ فی الاشیاء شبہ کذلک ربنا و قول القائل انہ عزوجل احدی المعنی یعنی بہ انہ لا ینقسم فی وجود ولا عقل ولا وھم کذلک ربنا عزوجل۔ ایک اعرابی جنگ جمل کے دن امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے اُٹھ کھڑا ہُوا اور عرض کی کہ یا امیر المومنین علیہ السلام کیا آپ کہتے ہیں کہ "اللہ واحد ہے"۔ راوی کہتا ہے کہ یہ سن کر لوگوں نے اس پر حملہ کیا۔ اور کہا کہ اے اعرابی (جنگلی آدمی) کیا تو دیکھتا نہیں کہ امیر المومنین اس وقت (لڑائی کی وجہ سے) متردد ہیں؟ آپ نے فرمایا تم لوگ اس اعرابی کو چھوڑ دو۔ (جو پوچھنا چاہتا ہے اُسے پوچھنے دو) کیونکہ جو بات یہ چاہتا ہے یعنی معرفت خدا تعالیٰ حاصل کرنی۔ وہی تو ہم اس قوم (ہمراہیان بی بی عائشہ) سے چاہتے ہیں۔ (کیونکہ ابھی تک ان لوگوں کا

اسلام ہی درست نہیں ہے اور توحید خدا پر ان کو پورا یقین نہیں ہوا ہے۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو ان کو رسول کی معرفت ہوتی اور اس کے سچے جانشین کو پہچانتے اور مانتے۔ حالانکہ ابھی تک یہ لوگ راہ حق سے برگشتہ ہیں) پھر آپ نے فرمایا کہ اے اعرابی اللہ واحد (خدا ایک ہے) کہنے کے چار معنی ہو سکتے ہیں۔ اُن میں سے دو تو خدا تعالیٰ کی ذات پر صادق نہیں آتے (یعنی ان دو معنوں سے خدا کو واحد نہیں کہہ سکتے) اور دو معنی اس کی ذات کے لئے ثابت ہیں۔ لیکن وہ دو معنی جو اس کے لئے جائز نہیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی کہے اللہ واحد ہے اور اس سے مراد لے کہ وہ بہت سے خداؤں کا ایک خدا ہے (جیسے مثلاً لات جو ایک بت تھا اور عربوں کے زعم میں اُن کا خدا بھی تھا۔ اور وہ بہت سے خداؤں میں کا ایک خدا تھا۔ کیونکہ اُن کے تین سو سے زائد خدا تھے۔ جو لکڑی پتھر لوہے تانبے سونے وغیرہ کے بنے ہوئے خانہ کعبہ کی چھت پر بیٹھے رہتے تھے) پس یہ تو جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جس کا ثانی ہی نہیں۔ وہ باب اعداد میں داخل نہیں ہو سکتا۔ (یعنی کئی میں کا ایک تو اس وقت کہنا صحیح ہو سکتا ہے۔ جب کہ اُس قسم کے کئی شخص یا کئی چیزیں ہوں حالانکہ خدا تعالیٰ کے مانند کوئی دوسرا ایک بھی خدا نہیں چہ جائے کہ کئی خدا۔ تو پھر کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ اس کو واحد من الاحاد (یا کئی خداؤں میں کا ایک خدا کہا جا سکے) کیا تم دیکھتے نہیں کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کو تین میں کا تیسرا کہتے تھے۔ (جیسے عیسائی لوگ کہ ان کے نزدیک قدیم و واجب الوجود تین چیزیں ہیں۔ خدا۔ روح القدس اور عیسیٰ) وہ کافر کہے گئے۔ اور (دوسرے) کسی کا یہ کہنا کہ واحد من الناس ہے۔ جس سے مراد اس کی یہ ہو کہ وہ کسی جنس کی ایک نوع ہے (جیسے انسان ایک نوع حیوان کی) تو یہ بھی جائز نہیں کیونکہ یہ تشبیہ ہے اور خدا تعالیٰ مشابہت خلق سے برتر ہے (یعنی جب اس کو ہم یہ کہیں گے کہ وہ بھی کسی جنس کی نوع کا ایک حصّہ یا اس کی کوئی فرد ہے۔ جیسے اور ممکنات میں ہم دیکھتے ہیں تو اس کو مشابہت لازم آئے گی ممکنات سے حالانکہ واجب الوجود ہے اور وہ دو معنی جو اس کی ذات کے

لئے صحیح ہیں۔ پس ایک یہ کہ اللہ واحد (خدا ایک ہے) سے یہ مراد بھی ہے۔ وہ ایسا اکیلا اور یکتا ہے کہ کوئی شے اس کی نظیر و شبیہ نہیں (اور دوسرے) یہ کہ (واحد سے مراد) احدی المعنی ہو۔ اور اس سے مراد یہ ہو کہ نہ تو اس کی تقسیم وجود میں ہو سکتی ہے نہ عقل میں اور نہ وہم میں (یعنی واحد سے یہ مطلب لیا جائے تب بھی صحیح ہے کہ وہ ایسا یکتا ہے کہ اس میں کسی قسم کے اجزا نہیں۔ نہ اجزا عقلیہ ہیں اور نہ اجزا خارجیہ جن سے مل کے وہ مرکب ہوا ہو بلکہ وہ بسیط مطلق ہے اس میں کسی قسم کی ترکیب نہیں)، اس طرح کا ہمارا پروردگار عزوجل ہے۔

حاصل یہ کہ اللہ احد کے یہ معنی ہیں۔ کہ وہ ایسا معبود برحق بے نظیر و بے مانند ہے۔ کہ اس کی ماہیت وحقیقت کو کوئی معلوم نہیں کر سکتا۔ بلکہ خلق اس کی ماہیت کے معلوم کرنے سے حیران ہے اور اسی کی طرف حاجتوں میں پناہ لے جاتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ جب احد اور واحد کے ایک ہی معنی ہیں تو خدا تعالیٰ نے "احدٌ" کیوں فرمایا واحدٌ کیوں نہ کہا؟ اس کا سبب یہ ہے کہ لفظ واحد کبھی اعداد میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں اختلاف بھی ہے لیکن لفظ احد ایسے یکتائی کے معنی دیتا ہے جو شمار اعداد میں داخل ہی نہیں۔ تو از بسکہ خدا تعالیٰ من جمیع الوجوہ واحد ہے۔ اس میں دوئی کی بالکل بو بھی نہیں۔ اور عدد سے اس کو کوئی تعلق نہیں اس لئے اَحَد فرمایا، واحد نہ فرمایا۔ گویا اس سے کمال توحید حقیقی کا بیان مقصود ہے۔ واللہ العالم

اللہ الصمد امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے میرے پدر بزرگوار امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنے پدر بزرگوار حسین بن علی سے روایت کی کہ صَمَد اسے کہتے ہیں۔ جس میں جوف نہ ہو (اس لحاظ سے اللہ الصمد کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ بسیط حقیقی ہے۔ اس میں اجزاء ترکیبیہ اور تحلیلیہ کا وجود نہیں) اور صَمَد اُسے بھی کہتے ہیں جس کی سرداری انتہا کو پہنچی ہو۔ اور صَمَد اسے بھی کہتے ہے

ہیں جو نہ کھائے نہ پیئے۔ اور صَمد اُسے بھی کہتے ہیں جو نہ سوئے۔ اور صَمد اُسے بھی کہتے ہیں جو دائم و باقی ہو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ نیز حضرت نے فرمایا کہ محمد بن حنفیہ فرمایا کرتے تھے کہ صَمد قائم بنفسہٖ غنی عن غیرہٖ (جو بغیر کسی کی مدد یا ایجاد کے موجود و قائم ہو اور اسے کسی کی احتیاج نہ ہو) کو کہتے ہیں۔ نیز حضرت نے فرمایا:۔ الصمد السید المطاع الذی لیس فوقہ آمر ولا ناہٍ۔ صمد اس سردار اطاعت کردہ شدہ کو کہتے ہیں جس سے بالا دست کوئی حاکم نہ ہو۔ نیز آپ نے فرمایا کہ امام زین العابدین علیہ السلام سے کسی نے صمد کے معنی دریافت کئے تو آپ نے فرمایا:

الصمد الذی لا شریک لہ ولا یؤدہٗ حفظ شیءٍ ولا یعزب عنہ شیءٌ۔

صمد وہ ہے جس کا کوئی شریک نہ ہو۔ اور نہ اُسے کسی شے کی حفاظت عاجز کرتی ہو۔ اور نہ اس سے کوئی شے مخفی ہو۔

وہب بن وہب قرشی راوی ہے کہ زید بن علی علیہ السلام نے فرمایا۔ الصمد الذی اذا اراد شیئًا قال لہ کن فیکون۔ صمد وہ ہے جس نے جس وقت کسی چیز کا ارادہ کیا اس سے کہہ دیا کہ ہو جا پس وہ ہو گئی۔ اور صمد وہ بھی ہے۔ جس نے اشیاء کا ابداع فرمایا اور اُن کو مختلف المواد اور مختلف الاشکال فرد و زوج پیدا کیا۔ اور خود متفرد بالوحدہ رہا۔ کہ نہ اُس کی کوئی ضد ہو نہ شکل اور نہ کوئی مثل و ہمسر۔ نیز وہب بن وہب قرشی راوی ہے کہ مجھ سے جناب صادق آل محمدؑ نے اپنے پدر بزرگوار باقر علیہ السلام سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی۔ کہ اہل بصرہ نے امام حسین علیہ السلام کو ایک خط لکھا۔ اور معنی صمد کے دریافت کئے۔ آپ نے ان کو جواب میں لکھا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اما بعد فلا تخوضوا فی القرآن ولا تجادلوا فیہ ولا تکلموا فیہ بغیر علم فقد سمعت جدی رسول اللہ یقول من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدہ من النار وانہ سبحانہ قد فسر الصمد فقال اللہ احد اللہ الصمد ثم فسرہ فقال لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوًا احد لم یلد لم یخرج منہ شیءٌ کثیف کالولد وسائر

الاشیاء الکثیفة التی یخرج من المخلوقین ولا شیئ لطیف کالنفس ولا یتشعب منه البدوات کالسنة والنوم والخطرة والھم والحزن والبھجة والضحك والبکاء والخوف والرجاء والرغبة والسامة والجوع والشبع تعالیٰ ان یخرج منه شیئ وان یتولد منه شیئ کثیف اولطیف ولم یولد لم یتولد من شیئ ولم یخرج من شیئ کما یخرج الاشیاء الکثیفة من عناصرھا کالشیئ من الشیئ والدابة من الدابة والنبات من الارض والماء من الینابیع و الثمار من الاشجار ولا کما یخرج الاشیاء اللطیفه من مراکزھا کالبصر من العین والسمع من الاذن والشم من الانف والذوق من الفم والکلام من اللسان والمعرفة والتمیز من القلب وکالنار من الحجر۔ لا۔ بل ھو الله الصمد الذی لا من شیئ ولا فی شیئ ولا علیٰ شیئ مبدع الاشیاء وخالقھا ومنشیئ الاشیاء بقدرته یتلاشیٰ ما خلق للفناء بمشیته ویبقی ما خلق للبقاء بعلمه فذا لکم الله الصمد الذی لم یلد ولم یولد عالم الغیب والشھادة الکبیر المتعال ولم یکن له کفواً احد۔ حاصل ترجمہ بعد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے یہ ہے کہ اما بعد۔ پس تم لوگ قرآن مجید میں (خود) غور و خوض نہ کرو (بلکہ اس کے معانی اہل معرفت و علم سے دریافت کرو) اور نہ اس میں آپس میں بحث کرو۔ اور نہ بغیر علم کے اس میں گفتگو کرو۔ کیونکہ میں نے اپنے نانا رسول اللہؐ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ جو کوئی قرآن مجید میں بغیر علم کے گفتگو کرتا ہے۔ اسے چاہیئے کہ اپنی نشستگاہ جہنم میں مہیا کرے۔ اور بے شک خدائے سبحانہٗ و تعالیٰ نے لفظ صمد کی تفسیر آپ کر دی ہے پس فرمایا کہ اللہ احد الصمد پھر اس کی تفسیر کی کہ لم یلد و لم یولد و لم یکن له کفوا احد۔ لم یلد کے معنی یہ ہیں کہ اس سے کوئی شئے کثیف مثل فرزند یا اور تمام اشیائے کثیفہ کے جو مخلوقین سے خارج ہوتی ہیں نہیں نکلی اور نہ اس سے کوئی شئے لطیف مثل نفس (روح و جان) کے نکلی اور نہ اس سے اونگھ اور نیند اور خطرۂ قلب و فکر اور حزن۔ اور خوشی اور ہنسی اور رونا اور خوف اور اُمید

اور رغبت اور تھکن اور بھوک اور سیری وغیرہ ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اس سے برتر ہے کہ اس سے کوئی شے خارج ہو اور یہ کہ اس سے کوئی لطیف یا کثیف چیز پیدا ہو۔ اور لم یلد کے معنی ہیں کہ وہ کسی چیز سے نہیں پیدا ہوا اور نہ کسی شے سے نکلا۔ جیسے اشیائے کثیفہ (مثل نباتات وجمادات وغیرہ کے) اپنے عناصر سے نکلتی (پیدا ہوتی) ہیں جیسے ایک شے دوسری شے سے۔ اور ایک چوپایہ دوسرے چوپایہ سے اور نباتات زمین سے۔ اور پانی چشموں سے۔ اور پھل درخت سے (اس طرح سے خدا تعالیٰ کسی چیز سے نہیں پیدا ہوا۔) اور نہ اس طرح جس طرح کہ اشیائے لطیفہ اپنے مرکزوں سے نکلتی ہیں۔ مثلاً نظر آنکھ سے سماعت کان سے۔ سونگھنا ناک سے چکھنا منہ سے۔ گفتگو زبان سے۔ معرفت وتمیز دل سے اور مثلاً آگ پتھر سے (ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ وہی اللہ صمد ہے۔ جو نہ کسی چیز سے پیدا ہوا۔ اور نہ کسی چیز کے اندر ہے اور نہ کسی چیز کے اوپر ہے۔ اسی نے اول اول چیزوں کو پیدا کیا۔ اور وہی اُن کا خالق ہے۔ اور از سر نو اپنی قدرت سے خلق فرمانے والا ہے جس شے کو فنا ہونے کے لئے اس نے بنایا ہے وہ تتر بتر ہو جائے گی اور جسے باقی رہنے کے لئے بنایا ہے وہ اس کے علم سے باقی رہے گی!! یہ ہے تمہارا معبود برحق جو نہ جنا گیا۔ غائب وحاضر کا جاننے والا۔ بڑا۔ بڑے رتبے والا ہے اور اس کا ہمسر کوئی نہیں۔"

واضح ہو کہ ایک لفظ کے بہت سے معنی بھی ہوا کرتے ہیں۔ اور اس قسم کے لفظ کو اہل لسان ومنطق مشترک لفظی کہتے ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس لفظ کے جتنے معنی ہوں وہ سب کسی ایک چیز پر صادق آسکیں۔ پس لفظ صمد کے جو معصومین اور غیر معصومین نے بہت سے معنی بتائے ہیں۔ وہ سب ذات خدا تعالیٰ پر صادق آتے ہیں اور وہ ہر معنی کے لحاظ سے صمد ہے۔ وہی غیر ذی جوف بھی ہے۔ وہی سردار بھی ہے وہی دائم وباقی بھی ہے۔ وہی قائم بنفسہ اور مستغنی عن الغیر بھی ہے۔ وہی سید مطاع بھی ہے۔ وہی حافظ ولا شریک وغیر عاجز بھی ہے۔ وہی مبدع الاشیاء بھی

ہے۔ وہی لم یلد بھی ہے اور وہی لم یولد۔ ان معانی میں باہم کوئی منافات نہیں ہے
پس ہر لحاظ سے وہ صمد ہے۔

ایک اور لطیف معنی جو معصوم سے مروی ہے۔ نقل کرتا ہوں۔ توحید بحار میں۔
وہب بن وہب سے مروی ہے کہ میں نے جناب صادقؑ سے سنا فرماتے تھے۔ کہ
فلسطین سے کچھ لوگ امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے
چند مسئلے دریافت کئے۔ آپ نے اُن سب کے جواب دیئے۔ پھر انہوں نے صمد کے
معنی پوچھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی تفسیر اُسی میں ہے الصمد میں پانچ حرف ہیں
الف تو اس کی انیت (وجود) کی دلیل ہے۔ اور یہی مطلب ہے اس کے کلام شہد
اللہ انہ لا الہ الا ہو۔ کا اور اس میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ وہ حاسوں سے
محسوس نہیں ہو سکتا۔ اور لام دلیل ہے اس کے الہ ہونے پر کہ وہی اللہ ہے (معبود
برحق) اور الف ولام مدغم جو لکھنے میں آتے اور پڑھنے میں نہیں آتے ہیں اور نہ
سنائی دیتے ہیں اور صرف کتابہ میں ظاہر ہوتے ہیں یہ دلیل ہیں اس امر پہ کہ اس
کی الٰہیت اپنی لطافت میں ایسی ہے کہ نہ اسے حواس محسوس کر سکتے ہیں اور نہ کوئی
بیان کرنے والا زبان سے (اُس کی حقیقت) بیان کر سکتا ہے۔ اور نہ کان کسی
سننے والے کا (اسے سن سکتا ہے) کیونکہ تفسیر ہے۔ الالہ ھو الذی الہ الخلق
عن درک ماھیتہ وکیفیتہ بحس او بوھم۔ یعنی الٰہ وہ ہے جس کی ماہیت
وکیفیت دریافت کرنے سے خلق عاجز ہے خواہ بذریعہ حس ہو یا بذریعہ وہم" (ہرگز
ان قوتوں سے اس کا ادراک نہیں ہو سکتا) بلکہ وہ خود اوہام وحواس کا خالق ومبدع
ہے اور چونکہ یہ دونوں کتابت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تو اس امر کی دلیل ہیں کہ اللہ
تعالیٰ نے اپنی ربوبیۃ کو خلقت کے پیدا کرنے اور جسم کثیف کے اندر روح لطیف
کی ترکیب دینے میں ظاہر کیا ہے۔ پس جب کہ بندہ اپنے نفس کی طرف نظر کرتا ہے
تو اسے اپنی روح نظر نہیں آتی۔ جیسا کہ لام صمد کا نہیں ظاہر ہوتا۔ اور نہ حواس
خمسہ میں سے کسی حاسہ میں داخل ہوتا ہے جب کہ کتابت وتحریر کی طرف دیکھا

ہے۔ تو وہ پوشیدہ و مخفی ظاہر ہو جاتا ہے (یعنی لام جو بولنے اور سننے میں نہ آیا تھا کتابت میں ظاہر ہو گیا) پس جب کہ بندہ باری تعالیٰ کی ماہیت اور کیفیت میں تفکر و غور کرتا ہے تو اسے حیرت رہ جاتی ہے اور اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں جان سکتا۔ جس کا اسے تصور ہو سکے کیونکہ وہی عزوجل خالق صور ہے۔ اور جب اپنی خلقت اور ساخت پر نظر ڈالتا ہے تو اسے ثابت ہو جاتا ہے کہ وہی خدائے عزوجل اس کا خالق ہے اور اس کی روح کو اس کے بدن میں ترکیب دینے والا۔ اور صاد کی امر کی دلیل ہے کہ وہ عزوجل صادق ہے۔ اس کا قول صدق اور اس کا کلام صدق (سچ) اور اس نے اپنے بندوں کو صدق کے اتباع کی طرف دعوت دی ہے۔ اور وعدہ بالصدق (سچا) کیا ہے۔ دار صدق (جنت یا دوزخ) کا۔ اور میم اس کے ملک پر دلیل ہے اور اس پر کہ وہی ملک حق ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا ملک زائل نہ ہوگا۔ اور دال اس کے دوام ملک پر دلیل ہے اور اس پر کہ وہ خود دائم ہے۔ پیدا ہونے اور زوال سے برتر ہے۔ بلکہ خود ہی کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔ جس کے پیدا کئے سے سب چیزیں پیدا ہو گئیں لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد۔ یعنی فرماتا ہے کہ وہ معبود برحق کسی کو نہیں جنا کہ اس کے بیٹا یا بیٹی ہو۔ اور وہ اس کے ملک کا وارث بنے۔ نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے کہ اس کا کوئی شخص باپ ہو۔ جو ربوبیت و ملک میں اس کا شریک ہو۔ اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے کہ اس کی سلطنت میں اس پر غلبہ کرے۔

سورہ انبیاء: لو کان فیھما اٰلھۃ الا اللہ لفسدتا فسبحان اللہ رب العرش عما یصفون۔ اگر ہوتے آسمان و زمین کے درمیان کئی معبود تو ہر آئینہ یہ دونوں (آسمان و زمین) فاسد ہو جاتے۔ پس پاک ہے عرش کا مالک معبود برحق اس امر سے جسے وہ (کفار) کہتے ہیں (کہ ہمارے تو بہت سے خدا اور معبود ہیں) اس آیت شریفہ میں خدا تعالیٰ نے برہانی توحید بیان فرمائی ہے۔ اور دلیل سے ثابت کیا ہے کہ کسی طرح ایک سے زیادہ معبود و الٰہ نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ ثنویہ کا خیال

ہے کہ نور و ظلمت دو الہٰ ہیں۔ یا ہندوؤں کا مسلک ہے کہ پرمیشر اور جیو اور پرکرتی تین قدیم ہیں یا عیسائیوں کا گمان ہے کہ خدا تعالیٰ اور روح القدس اور عیسیٰ تین اقنوم ہیں۔ یا عرب کے بت پرستوں کا یہ خیال تھا۔ کہ اُن کے تین سو ساٹھ معبود ہیں۔ غرض اس قسم کے جتنے خیالات ہیں ان سب کی نفی اسی ایک آیت سے ہو جاتی ہے۔

وحدانیت

علمائے مذہب اسلام نے اس آیت کے مطلب کو اور اس دلیل کے سوق کو کئی طرح سے ادا کیا ہے۔

اوّل: کہ اگر دو الہٰ ہوں گے تو لامحالہ دونوں ہی قدیم ہوں گے۔ اور چونکہ صفت قدم اخص صفات میں سے ہے۔ تو جب اس میں دونوں کا اشتراک ہوگا۔ تو لامحالہ اور باقی صفتوں میں مثل حیوٰۃ۔ قدرت۔ عالم۔ حی ہوئے۔ اور جب ایسا ہوا تو ممکن ہوگا۔ کہ ایک خدا تو مثلاً زید کو پیدا کرنا چاہتا ہے اور دوسرا نہیں چاہتا ایک مثلاً عمرو کو مار ڈالنا چاہتا ہے۔ دوسرے کی خواہش ہے کہ عمرو جیتا رہے۔ ایک مثلاً کسی کو غنی کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا اس کو فقیر بنانا چاہتا ہے۔ وغیر ذلک من التضاد۔ پس یا تو دونوں کے ارادے پورے ہوں گے۔ یا دونوں کے ارادے نہ پورے ہوں گے۔ یا ایک کا ارادہ پورا ہوگا۔ اور دوسرا منہ دیکھتا رہ جائے گا۔ اگر یہ کہو کہ دونوں کے ارادے پورے ہوں گے۔ تو یہ بالکل ناممکن بات ہے۔ کیونکہ مثلاً ایک ہی وقت میں زید کا پیدا ہونا اور نہ بھی پیدا ہونا جمع نہیں ہو سکتا۔ عمرو کا ایک ہی وقت مرجانا اور اسی وقت میں جیتا رہنا ممکن نہیں۔ احمد کا ساڑھے دس بجے دن کے کسی خاص روز میں فقیر بھی ہونا اور مالدار بھی ہونا بالکل محال بات ہے لہذا دونوں کی مراد تو کسی طرح بر نہیں آسکتی۔ اور اگر کہو کہ دونوں کی مرادیں پوری نہ ہوں گی۔ تو یہ بھی ناممکن ہے اس لئے کہ الہٰ قدیم و قادر و عالم و حی ہو کر ایسے نقص اور

کمزور ہوئے کہ کسی کی مراد نہ بر آئے۔ بالکل مہمل بات ہے۔ آخر وہ خدا ہی کس فن کے لئے تھے۔ جو اپنے ارادے کو پورا نہ کر سکے۔ لامحالہ جب دو شخص برابر کی قوت والے کسی ایک کے ہونے اور نہ ہونے پر ضد کرتے ہیں۔ تو آخر ایک غالب آ ہی جاتا ہے۔ خواہ زور و قوت سے ہو یا حیلہ و مکر سے۔ اور اگر بالفرض یہی مان لو کہ دونوں ہی کے ارادے نہ پورے ہوں گے۔ تو ارتفاع نقیضین لازم آئے گا۔ جو یقیناً محال ہے۔ پس لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ ایک کا ارادہ پورا ہو گا اور دوسرا یوں ہی دیکھتا رہ جائے گا۔ پس جس کی مراد بر آئے اور جو اپنے ارادہ میں کامیاب ہو سکا۔ وہی الٰہ ہے اور جو اپنے ارادہ کو نافذ نہ کر سکا۔ وہ کوئی خیالی دیوتا رہا ہو گا۔ وہ ہرگز خدائی کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی کمزوری ثابت ہو گئی اور خدا کمزور نہیں ہو سکتا۔

اسی مطلب کو اور آسان کر کے یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کہ جب دونوں الٰہ معبود مانے جائیں۔ اور ان میں سے ایک کسی چیز کو پیدا کرے۔ تو آیا دوسرے کو اس کا روک دینا ممکن ہے یا نہیں۔ اگر کہو کہ ممکن ہے تو پہلا ارادہ کرنے والا الٰہ نہ رہا کیونکہ اس کا ارادہ ناتمام رہا اور اگر کہو کہ ممکن نہیں تو یہ دوسرا الٰہ مفروض الٰہ نہ رہا۔ کیونکہ اس سے نہ ممکن ہو سکا۔ کہ اُس پہلے کے ارادہ کو باطل کر سکتا لہٰذا دونوں ہی خدا و معبود نہ ہوئے۔ پس کسی اور تیسرے کو ڈھونڈو۔ جس کے ساتھ کوئی اور شریک ہی نہ ہو اور نہ کوئی اس کے ارادہ کا باطل کرنے والا ہو وھوا لا الٰہ الا ھو۔

دوئم: یہ کہ اگر دو خدا ہوں گے تو ان میں سے ایک کا وجود ضرور معطل ہو گا۔ اور جو معطل الوجود ہے وُہ خدا نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی خلق سے کچھ فائدہ مل سکتا ہے دلیل اس کی یہ ہے کہ ہم پوچھتے ہیں کہ آیا ان میں سے ایک خدا تمام عالم آسمان و زمین۔ جن و انس۔ حیوانات و نباتات و جمادات و قوٰے و ارواح و ملائکہ و نفوس کے پیدا کرنے کے لئے کافی تھا۔ یا نہ تھا۔ اگر کہو کہ کافی تھا۔ تو یا دونوں نے مل جل کر عالم کو بنایا یا ایک ہی نے بنایا۔ اگر دونوں

نے مل جل کر بنایا تو یقیناً ایک نے اپنا وقت عبث ضائع کیا اور محنت بیکار کی۔ کیونکہ پہلے مان لیا جا چکا ہے۔ کہ عالم کے پیدا کرنے کے واسطے ایک ہی کافی تھا۔ اور جو شخص عبث فعل کرے وہ حکیم نہیں ہو سکتا اور جو حکیم نہیں وہ الٰہ و معبود نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ دوسرا الٰہ نہ ہوا علاوہ بریں ایک اور محال یہ لازم آتا ہے کہ اگر دونوں نے مل کر ہر ہر شے کے ہر ہر جزو و ساخت و اندازہ و تقدیر کو ترکیب دیا ہے تو ایک معلول پر دو علت تامہ کا عمل کرنا لازم آتا ہے۔ حالانکہ یہ ناممکن ہے اور اگر کہو کہ ایک ہی نے بنایا ہے اور دوسرا معطل بیٹھا رہا تو اس دوسرے کا وجود فضول ہوا جاتا ہے۔ حالانکہ خدا کا وجود فضول نہیں ہو سکتا اور نہ سلسلہ موجودات میں آج تک کوئی شے فضول ثابت ہوئی ہے تو یہ خدا کیوں کر فضول ہو گا اور اگر کہو ان دونوں میں ایک کافی نہ تھا۔ عالم کے پیدا کرنے میں بلکہ بالاشتراک پیدا کیا ہے تو دونوں کی کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ اور کمزور عاجز خدا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کہو کہ ایک نے کام کیا اور ایک باوجود قدرت کے اس کے فعل و حکمت پر راضی رہا اور کچھ کام نہ کیا تو کم از کم اس دوسرے کی معطلیت لازم آتی ہے۔ اور تعطل وجود خدا ناممکن ہے اور اگر کہو کہ دونوں ہی نے حصہ بانٹ کر عالم کو پیدا کیا ہے کسی نے اوپر کے حصہ کو پیدا کیا اور کسی نے نیچے کے حصے کو تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے۔ جو قطعی طور پر محال ہے۔

سوئم: تقریر یہ ہو سکتی ہے کہ اگر دو خدا پائے جائیں اور کسی ایک چیز کے پیدا کرنے کا دونوں ارادہ کریں تو آیا اس کا وجود دونوں کے قدرت و فعل سے ہو گا۔ یا ایک کے اگر دونوں کے فعل و قدرت سے ہو گا۔ یا ایک کے اگر دونوں کے فعل و قدرت سے ہوا تو توارد علتین علے معلول واحد آئے گا جو محال ہے اور اگر ایک کے قدرت و عمل سے ہوا تو ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔ اور وہ بھی محال ہے لہذا دو خدا کا ہونا ہی محال ہے۔

چوتھی: تقریر یہ ہو سکتی ہے کہ اگر عالم میں ایک سے زیادہ خدا ہوں گے۔ تو آیا کائنات اور مخلوقات کا انتظام بالمصالحت کرتے ہوں گے۔ یا بالمحاربہ

اگر بالمصالحت کرتے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ آپس میں صلح کرنی اور رکھنی کمزوری کی علامت ہے کیونکہ صلح وہی کرتا ہے۔ جس کو اپنے یا اپنی رعایا کو نقصان پہنچنے کا ڈر ہو۔ اور ایسا کمزور خدا نہیں ہوسکتا اور اگر بالمحاربہ اور جنگا جنگی سے انتظام کرتے ہوں گے تو چاہیئے تھا کہ آج تک عالم میں کیا کچھ نہ اختلاف پہنچ گیا تھا نہ زمین ہی قائم رہتی اور نہ آسمان ہی۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرح سے انتظام قائم ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں دو شخصوں کا انتظام ہی نہیں ہے بلکہ صرف ایک منتظم ہے۔ جس سے نظام عالم برقرار ہے۔''

علاوہ اس کے اور بھی عقلی دلائل عدم تعدد الٰہ کے ہیں جنہیں علماء اسلام نے مبسوط طور پر کتب کلامیہ میں درج کیا ہے اور چونکہ ان کا سمجھنا دیگر مطالب عقلیہ کے سمجھنے پر موقوف ہے اور وہ عام لوگوں کو معلوم نہیں ہیں۔ اور نیز اُن کے سمجھانے میں اردو دان آدمیوں کو مشکل پیش آئے گی۔ اس لئے ان کو فروگذاشت کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں حد اعتدال سے بھی خارج ہے۔ کیونکہ ہماری بحث اس وقت صرف اُن بیانات و دلائل سے ہے جو قرآن مجید سے مستنبط ہیں۔ نہ اُن دلائل سے جو صرف عقل نے استنباط کئے ہیں۔ لیکن تاہم ایک دو دلیلیں قریب الاصول بیان کر دیتا ہوں تاکہ ناظرین کو زیادہ بصیرت حاصل ہو جائے۔

ایک یہ کہ اگر ایک سے زیادہ خدا ہوں گے۔ اور کم از کم دو۔ تو ضروری ہے کہ دونوں قدیم ہوں حالاں کہ دو خدا ہونے اور پھر اُن کا قدیم رہنا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے کہ جب دو ہوئے تو ضرور ہے کہ کسی ایک چیز کے دو فرد ہوں گے۔ جیسے دو آدمی۔ یہ انسان کی دو فردیں ہیں۔ یا مثلاً سُرخ و سبز۔ یہ دونوں رنگ کی دو فردیں ہیں یا رات اور دن۔ کہ یہ دونوں زمانے کی دو فردیں ہیں۔ اسی طرح جب دو خدا ہوں گے۔ تو مطلق خدا یا واجب الوجود کی دو فردیں ہوں گی تو اب لازم ہوا کہ ان دونوں میں کوئی ایسی شے بھی موجود ہے۔ جس سے یہ دونوں خدائی میں مشترک ہیں۔ جیسے زید اور عمرو۔ دونوں انسان کیوں ہیں؟ صرف اسی وجہ سے تو

کہ ان دونوں میں جوہر انسانیت مشترک ہے۔ پس اُن دو خداؤں میں بھی جوہر خدائی مشترک ہو گا۔ لیکن جب کسی دو چیزوں کو دو کہا جاتا ہے۔ تو ضرور ہے کہ اُن میں کوئی سبب تمیز کا ہوتا ہے۔ جیسے زید و عمرو کو دو شخص اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اُن کی صورتیں مختلف ہیں۔ پس اس طرح اُن دو خداؤں میں بھی کوئی وجہ تمیز ضرور ہو گی۔ مثلاً صورت کا اختلاف کیفیت کا اختلاف جہۃ و مکان وغیرہ کا اختلاف تو اب دونوں خداؤں میں دو چیزیں ہونی ضرور ہوئیں۔ ایک وہ جس سے دونوں مشترک ہیں۔ اور ایک وہ جس سے دونوں متفرق ہیں۔ پس دونوں ہی ان دو چیزوں سے مرکب ہو جائیں گے۔ ایک ما بہ الاشتراک اور دوسرے ما بہ الامتیاز۔ اور جب مرکب ہوں گے۔ تو قدیم نہ رہ سکیں گے۔ اور جب قدیم نہ رہیں گے تو خدا کیونکر ہوں گے؟

دوسرے یہ کہ اگر ایک سے زیادہ خدا ہوں گے تو دونوں کی امتیاز اور شناخت علیحدہ علیحدہ ہوگی یا خود اُن کی ذات سے ہو گی۔ یا کسی اور امر خارج از ذات سے ہو گی۔ تو لامحالہ مفہوم واجب الوجود ان دونوں پر حمل عرضی محمول ہو گا حالانکہ عرضی اپنے معروض کا معلول ہوتا ہے تو لازم آئے گا کہ ان دونوں کا واجب الوجود ہونا اُن کی ذات کا معلول ہے حالانکہ یہ بالکل محال ہے کہ وجوب وجود معلول ہو۔ کیونکہ وجوب قدم کو چاہتا ہے اور معلولیۃ حدوث کو اور یہ دونوں باتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر غیر ذات سے اُن دونوں کی امتیاز و علیحدگی ہے تو احتیاج الی الغیر لازم آئے گی اور محتاج خدا ہو نہیں سکتا۔

تیسرے یہ کہ دلائل عقلیہ و نقلیہ سے ایک خدا کا ہونا تو ثابت ہے۔ رہے دوسرے صاحب ان کا ثبوت کیا ہے۔ اگر کہو کہ نقلی دلیل ہے تو اسے پیش کرو۔ تاکہ اس کی صحت و غلطی پر بحث کی جائے۔ اور اگر کہو عقلی دلیل ہے تو اس میں بھی یہی گفتگو ہو گی۔ اور جب دونوں ہی قسم کی دلیلیں دوسرے خدا کے موجود ہونے پر قائم نہ ہوئیں تو محض ظن و تخمین سے وجود ثابت نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ شک

رہے گا اور وہ اصل عدم سے نفی ہو سکے گا۔
چوتھی یہ کہ آج تک جتنے انبیاء اور ہادی آتے رہے۔ سب کے سب ایک ہی خدا کی خبر دیتے رہے۔ کسی نے نہ کہا کہ دو خدا ہوتے۔ تو دوسرا خدا بھی ضرور بالضرور کچھ اپنی قدرت کے آثار دکھلاتا اور اپنی معرفت کراتا۔ جیسا کہ ہمارا معبود حقیقی اپنی دلائل وجود قدرت کو عقلاً اور حسًّا ظاہر کر رہا ہے۔ اور وہ بھی اپنے رسول وسفیر بھیجتا۔ جیسے ہمارے خدا نے اپنے رسول بھیجے۔ حالاں کہ آج تک تو کوئی نہ آیا پھر کیوں کر دوسرے خدا کا یقین کیا جا سکتا ہے۔
اس مضمون کو جناب امیر المومنین علیہ السلام نے جناب امام حسن علیہ السلام سے فرمایا کہ واعلم انہٗ لوکان لربک شریک لاتتک رسلہ ولرائیت آثار ملکہ وسلطانہ ولعرفت صفتہ وفعالہ لکنہ الٰہ واحد کما وصف نفسہ لایضادہ فی ذلک احد ولا یحاجہ وانہ خالق کل شیء" اور جانو کہ اگر تمہارے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو ضرور تمہارے پاس اس کے پیغامبر بھی آتے۔ اور اس کی سلطنت اور اس کے ملک کے آثار بھی تمہیں دکھائی دیتے اور تم اس کے اوصاف اور افعال کو بھی پہچانتے۔ لیکن وہ تو ایک ہی معبود ہے جیسا کہ خود اس نے بیان کیا ہے۔ (شھد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو۔ گواہی دیتا ہے خدا تعالیٰ کہ نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر خود وہی) نہ کوئی اس کا اس امر میں مخالف ہے اور نہ بحث کرنے والا اور وہی ہر شے کا خالق ہے۔"
اس مطلب توحید کو خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں بے شمار مقاموں میں بیان کیا ہے منجملہ اُن کے سورہ بقر میں فرمایا ہے:۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ؁	تمہارا معبود برحق ایک ہی معبود ہے۔ سوائے اس کے کوئی معبود حقیقی نہیں۔ وہی بڑا رحم والا۔ مہربان ہے یہ ہے قرآنی تعلیم جو اپنے معبود کی سچی صفتوں کو بتا کر بندوں کو اس کی

طرف مائل و راغب کرتی ہے اور نیز اس سے خوف بھی دلاتی ہے۔ اس کی وحدانیت اور یکتائی کو یاد دلا کر اس کی طرف سے امید بندھوا دی۔ تاکہ دونوں پہلو برابر رہیں جو بقائے نظام عالم کے لئے نہایت ضروری ہے +

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ (سورہ بقرہ)

بعض وہ لوگ بھی ہیں جو علاوہ خدا کے شرکا اختیار کرتے ہیں (مثلاً ستاروں کو پوجتے ہیں آگ۔ ہوا۔ پانی۔ پتھر اور اس کی مورتوں کی پرستش کرتے ہیں اور عبادت میں ان چیزوں کو اس حقیقی معبود کا شریک گردانتے ہیں) اور ان (شرکار) سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی خدا سے محبت رکھنی چاہئے۔ اور جو لوگ کہ ایمان لائے ہیں وہ خدا تعالیٰ سے بہت محبت رکھنے والے ہیں +

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ (سورہ بقر)

اللہ۔ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں۔ جو حیات والا۔ اور ہمیشہ قائم رہنے والا ہے +

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران)

کوئی بھی معبود برحق نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ +

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (آل عمران)

کہہ دو اے رسول کہ اے کتاب والو (یہود و نصاریٰ) آؤ (تم سب لوگ) اس کلمہ کی طرف جو ہمارے تمہارے درمیان کلمہ عدل ہے اور وہ یہ کہ ہم تم دونوں ہی نہ عبادت کریں مگر صرف اللہ تعالیٰ کی۔ اور اس کے ساتھ ذرا بھی شرک نہ کریں۔ اور نہ ہم میں سے کوئی

کسی کو پروردگار بنائے سوائے اللہ تعالیٰ دیہ
اس آیت کی طرف اشارہ جس میں پروردگار
عالم نے فرمایا۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم
اربابًا من دون اللہ۔ ان یہود و نصرانیوں
نے اپنے علماء اور پوجاریوں کو اپنا پروردگار
بنا لیا ہے اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ رکھا ہے۔
پس اگر دیہ یہود و نصاریٰ) تم سے (اے
رسول) منہ پھیر لیں۔ (اور تمہاری بات نہ
مانیں) تو کہہ دو (اے رسول اور اس کے ساتھیو)
کہ تم لوگ گواہ رہو کہ بے شک ہم مسلمان ہیں
(اور تمہاری طرح رہبان و احبار کو اپنا پروردگار
نہیں سمجھتے۔ اور نہ کسی آدمی کو خدا یا خدا کا
بیٹا جانتے ہیں۔ بلکہ ہم تو صرف ایک معبود
برحق کے ماننے والے ہیں ⁕

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ
وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ
وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰٓی
اِثْمًا عَظِیْمًا۔ (سورہ نساء)

بے شک خدا تعالیٰ اس گناہ کو نہ بخشے گا کہ
اس کے ساتھ کسی کو شریک سمجھا جائے یا
عبادت میں شریک کیا جائے۔ اور اس کے
علاوہ اور گناہوں کو جس کے لئے اس کی
مشیت صلاحیہ کا مقتضا ہو گا بخش دے گا
اور جو کوئی خدا تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا ہے
وہ بالکل جھوٹ بولتا ہے اور بڑے گناہ کا
مرتکب ہوتا ہے۔ یعنی ایسا جھوٹ بولتا ہے
جس کا کوئی وجود و اثر نہیں۔ کیونکہ جب کوئی

بھی خدا تعالیٰ کا ہمسر و مثل یا معین و مددگار
یا بیٹا بیٹی نہیں ہے تو پھر ان چیزوں میں
سے کسی ایک کو اس کے لئے ثابت کرنا یا
اس کے علاوہ اور چیزوں کی بھی عبادت کرنی
جو اسی کی مخلوقات میں سے ہیں۔ افترائے محض
ہے اور گناہِ عظیم۔ پس جو کوئی ایسا کرے گا
اُسے خدا تعالیٰ ہرگز نہ بخشے گا۔ اور علاوہ اس
گناہ کے اسے اختیار ہے کہ اپنی وسعتِ رحمت
سے بخش دے ؂

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ
وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۠

(سورۂ نساء)

اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ اور
ضرور تمہیں وُہ جمع کرے گا۔ یعنی مرنے کے بعد
زندہ کر کے موقف حساب میدان حشر کی طرف
لے جائے گا اور وہاں جمع کرے گا۔ اس میں
کچھ شک نہیں۔ اور کون ہے جو اللہ سے زیادہ
سچ بولتا ہو؟ (یعنی ہم سے زیادہ کوئی سچا
نہیں۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ ہو کر رہے گا۔
اور ہرگز اس میں تخلف نہ ہوگا) ؂

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ
ضَلٰلًا ۢ بَعِيْدًا ۝ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ
اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۝ لَّعَنَهُ اللّٰهُ

(سورۂ نساء)

جس نے خدا تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا۔ وہ
بہت دُور کی گمراہی میں پڑ گیا۔ یعنی حق سے
بہت دُور ہو گیا (یہ مشرکین) نہیں پکارتے
ہیں۔ اس کے سوا مگر مونثوں کو (یعنی) ایسے
بتوں کو جن کے نام مونثوں کے لئے رکھے گئے
جیسے عزیٰ کہ مونث ہے ۔اعز کا یا اللات

کہ مونث ہے اللہ کا۔ یا مثلاً منات۔ اساف نابلہ وغیرہ ہیں۔ کہ یہ سب اسمائے مونثہ ہیں اور یہ احمق ان کو خدا اور معبود سمجھتے ہیں۔ یا اناث سے یہ مطلب ہو کہ یہ مشرکین خداتعالیٰ کو چھوڑ کر فرشتوں کو پوجتے ہیں اور اُن کو خداتعالیٰ کی لڑکیاں تصور کرتے ہیں) اور نہیں پکارتے مگر سرکش شیطان کو (یعنی یہ مشرکین بالکل خدا کی عبادت نہیں کرتے اور نہ اس سے عرض کرتے ہیں۔ بلکہ یہ تو شیطان سرکش کی بندگی کرتے ہیں)، خدا اس پر لعنت کرے ❊

قُلْ اَرَاَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ غَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۔

کہہ دو اے رسول کہ اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے اور تمہارے سر پر قیامت آپہنچے تو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے (بھلا سچ بتاؤ تو) اگر تم سچے ہو۔ بلکہ اسی کو پکارو گے۔ اور وہ اس عذاب یا مصیبت کو جس کے ہٹانے کے واسطے تم نے اُسے پکارا ہے۔ دفع کرے گا اگر چاہے گا۔ اور تم (تمام اپنے) شرک کو بھول جاؤ گے۔ کیونکہ جب مصیبت پڑتی ہے تو سوائے خدا کے کوئی یاد نہیں رہتا۔ یہ پتھر کے کھلونے یونہی پڑے گوہ کھایا کرتے ہیں۔ مصیبت کے وقت اُن کو کوئی بھی نہیں پوچھتا اور

سوائے خدا کے کسی کو یاد نہیں کرتا ۔

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ شُرَكَاءَ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ

(سورہ یونس)

یہ مشرکین جو سوائے خدا کے اور شرکا کو پکارتے ہیں۔ (آخر) کس چیز کی پیروی کرتے ہیں؟ (پھر آپ ہی جواب دیا ہے کہ) وہ سوائے ظن وگمان کے کسی کی پیروی نہیں کرتے۔ (پس جو ان کے خیال نے کہہ دیا کہ اسے بھی پوجو اور اسے بھی خدا سمجھو اور اسے بھی معبود مانو فوراً اس کی اطاعت کر لی اور ان کے نام لے کر اُن سے دعائیں مانگنے لگے۔) اور بس یہ لوگ تخمینہ کرتے ہیں (یعنی اُن کی یہ بات تحقیقی نہیں ہے کہ خدا کے کئی شریک ہیں۔ بلکہ محض تخمینہ اور اندازہ سے ایک بات کہہ لی ہے۔ چاہے غلط ہو یا صحیح) ۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝

(سورہ یونس)

کہہ دو اے رسول کہ ایہا الناس اگر تم کو میرے دین میں شک ہو تو (یہ سن لو کہ) میں اُن (پتھروں اور مورتوں) کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے سوا۔ اور لیکن (یعنی بلکہ) میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی جو تمہیں موت دے گا اور مجھے حکم دیا گیا ہے (اللہ کی طرف سے) کہ میں ایمان لانے والوں میں رہوں (یعنی مومن بنوں) ۔

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللّٰهَ ۚ إِنَّنِي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ ۔ (سورہ ھود)

(یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ تمہیں بتائے کہ) نہ عبادت کرو تم لوگ مگر اللہ کی

بے شک میں تم کو اس (اللہ کے عذاب) سے ڈرانے والا اور (اس کی رحمتوں کی) بشارت دینے والا ہوں +

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔

(سورہ۔ یوسف)

(حضرت یوسفؑ کا قول نقل فرمایا ہے کہ آپ اپنے ساتھ والے دونوں قیدیوں سے کہہ رہے ہیں) اے میرے قید کے ساتھیو! کیا متفرق اور کئی پروردگار (کو ماننا اچھا ہے یا ایک یکتا اور غالب اللہ کو ماننا بہتر ہے) تم لوگ نہیں عبادت کرتے سوائے خدا کے مگر ان ناموں کی جنہیں مقرر کر لیا ہے۔ (مثلاً ود۔ سواع۔ یغوث۔ یعقوق وغیرہ) تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے اس پر اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ بس حکم اللہ ہی کے واسطے ہے۔ اس نے حکم دے دیا ہے کہ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی مذہب ٹھیک ہے (کہ ایک خدا کو مانو اور اس کی عبادت کرو) لیکن اکثر آدمی اس بات کو نہیں جانتے +

قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ

کہہ دیجئے اے رسولؐ کہ کیا تم لوگوں نے اللہ کے علاوہ اور لوگوں کو اپنا ولی بنا لیا ہے۔ جو اپنے ہی نفع و نقصان پر قادر نہیں (سچ تو ہے آخر یہ مورتیں۔ کب اپنے تئیں فائدہ پہنچا سکتی۔ یا اپنے سے نقصان کو رفع کر سکتی

تَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۚ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔

(سورہ رعد)

ہیں) کہہ دے اے رسول کہ کیا۔ اندھا اور آنکھ والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں یا اندھیرا اور اُجالا دونوں ایک سے ہو سکتے ہیں؟ (ہرگز نہیں) کیا ان مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کے ایسے شریک بنائے ہیں جنہوں نے مثل اس کی خلقت کے خلق کیا ہے اور ان لوگوں پر خلقت مشتبہ ہو گئی ہے (حالانکہ ہرگز ایسا نہیں۔ ان مورتوں نے کہاں کوئی چیز پیدا کی جس سے اشتباہ ہو سکتا۔ کہ شاید یہ بھی خدا ہوں تو پھر اُن کو کیوں خدا و معبود مانا جاتا ہے) کہہ دے اے رسولؐ کہ اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہی یکتا و غالب ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ ۚ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ۔

اے رسول کہہ دے کہ بس مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور اس کا شریک کسی کو نہ سمجھوں اسی کی طرف میں دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف واپسی ہے۔

وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ۔

(سورہ ابراہیم)

اور تاکہ لوگ جان لیں کہ وہ ایک ہی معبود برحق ہے۔

لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ

نہ اختیار کرو دو خدا۔ بس وہ تو ایک ہی خدا و معبود ہے۔ پس مجھی سے ڈرو اور اُسی کا ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں

لَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۔ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ۔ (سورہ نحل)

میں ہے اور اُسی کے لئے ہے طاعت واجبہ دائمہ تو کیا تم لوگ غیر خدا سے بھی ڈرتے ہو (حالانکہ تم کو اُسی سے تقویٰ اختیار کرنا چاہئیے) اور جو کچھ تمہارے پاس نعمت ہے وہ خدا ہی کی طرف سے ہے پس جب تم کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ تو اسی سے استغاثہ و فریاد کرتے ہو (اس وقت تم کو اور کوئی یاد نہیں رہتا) ۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۔ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ

(سورہ بنی اسرائیل)

خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو خدا نہ قرار دے ورنہ تو ملامت زدہ اور چھوڑا ہوا بیٹھے گا۔ اور حکم جاری کر دیا ہے۔ تیرے پروردگار نے کہ تم لوگ (عبادت کرو) مگر اسی کی"۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۔

(سورہ بنی اسرائیل)

اے رسول کہہ دے کہ اس (اللہ) کے ساتھ اور بھی خدا ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو وہ عرش کے مالک کی طرف جانے کا ارادہ کرتے (کیونکہ اُن کو اس پر غلبہ کرنے کا ارادہ ہوتا جیسا کہ دنیاوی بادشاہوں میں دیکھا جاتا ہے کہ ہمیشہ ایک دوسرے کی سلطنت کے چھیننے اور ضبط کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ پھر تو خوب ہی ان خداؤں میں جنگ و جدل واقع ہوتی۔ اور زمین و آسمان میں فساد پھیلتا) وہ پاک ہے اور اس سے بہت برتر ہے جو یہ لوگ (مشرکین)

کہتے ہیں ؎

فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۔ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۔

(سورہ کہف)

(نقل قول اصحاب کہف) انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ ہرگز ہم اس کے سوا اوروں کو خدا نہ کہیں گے (ورنہ) ہم نے نہایت باطل اور جھوٹ بات کہی ہوگی۔ ہماری اس قوم کے آدمیوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور بھی کئی خدا اختیار کر لئے ہیں (تو آخر) اپنے اس فعل پر کوئی ظاہر دلیل کیوں نہیں لاتے۔ پس کون زیادہ ظالم ہوگا بہ نسبت اس کے جو خدا پر بہتان اور جھوٹ باندھے ؎

لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۔

(سورہ کہف)

لیکن ہم تو یہی کہیں گے کہ وہی اللہ ہمارا پروردگار ہے اور ہرگز ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں ؎

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۔ (سورہ کہف)

اے رسول کہہ دے کہ بس میں تو تمہاری ہی مانند ایک آدمی ہوں کہ میرے طرف وحی کی جاتی ہے اس بات کی کہ بس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے پس جو اُمیدوار ہو اپنے پروردگار کی ملاقات کا اسے چاہیئے کہ نیک عمل کرے۔ اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے ؎

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۔ كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ

ان مشرکین نے اللہ کے سوا اور بہت سے معبود ٹھہرا لئے ہیں تاکہ وہ ان کے لئے باعث

بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا۔ (سورہ مریم)

عزّت ہوں۔ ہرگز ایسا نہ ہو گا (بلکہ عنقریب یہ اُن کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور کہہ دیں گے۔ کہ ہم نے تو انہیں . . . پُوجا ہی نہ تھا دیا یہ کہ وہ اصنام اس بات کا انکار کر دیں گے۔ کہ ان لوگوں نے ہماری عبادت نہیں کی تھی۔ بلکہ جنوں کی پرستش کرتے تھے۔) اور ہو جائیں گے یہ اُن کے دشمن و مخالف (جب دیکھیں گے کہ اس بت پرستی کے معاوضہ میں آتشیں طوق و زنجیر پہنائے جا رہے ہیں اور بہت تیز بھبھکتے ہوئے شعلہ ور جہنم میں ڈالے جاتے ہیں) ✤

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔

(سورہ انبیاء)

کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا اور بھی خدا قرار دیئے ہیں۔ (یعنی ہاں ایسا کیا ہے) اے رسول کہہ دے کہ (اگر بہت سے خدا ہیں تو) لاؤ اپنی دلیل یہ (قرآن) ذکر ہے اُن لوگوں کا جو مجھ سے پہلے ہو چکے ہیں۔ بلکہ اکثر ان میں کے تو حق کو جانتے ہی نہیں۔ پس وُہ حق سے منحرف ہیں (حالانکہ) ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے کوئی رسول مگر یہ کہ اس کی طرف وحی کی کہ مجھ ایک و یکتا معبود کے سوا کوئی معبود نہیں پس (ایہا الناس) تم لوگ میری عبادت کرو ✤

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ

بے شک تم لوگ اور جن کی تم پرستش کرتے

حَصَبُ جَهَنَّمَ ۗ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۔ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۗ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ۔

(سورہ الانبیاء)

ہو سب کے سب جہنم کے ایندھن ہیں، تم سب اس میں وارد ہو گے (یعنی جہنم میں جاؤ گے۔ اگر وہ (جن کی تم عبادت کرتے ہو) خدا ہوتے۔ تو جہنم میں نہ پڑتے۔ حالانکہ سب کے سب اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کے واسطے اس میں زفیر (جہنم کی آواز) ہوگی۔ اور وہ اس میں (کچھ) نہ سنیں گے (بلکہ اُن کے کان مثل بہروں کے ہو جائیں گے)۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۗ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۔ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔

(سورہ المومنون)

خدا نے نہ تو کوئی اپنا بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی معبود ہے (اگر ایسا ہوتا، تو ہر خدا اپنی مخلوق کی طرف مائل ہوتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا!! پروردگار عالم منزّہ و پاک ہے اس بات سے جسے یہ لوگ کہتے ہیں (کہ خدا کے کوئی بیٹا بھی ہے جیسے عیسےٰ) وہ پروردگار غائب و موجود چیزوں کا جاننے والا ہے۔ پس وہ ان مشرکین کی شرک کی باتوں سے بالاتر ہے (یعنی ہرگز اس کا کوئی شریک و مثل نہیں ہے)۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۔ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ

بس برتر ہے اللہ۔ جو بادشاہ برحق ہے اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ عرش کا مالک اور مکرم ہے۔ جو کوئی اللہ کے سوا کسی اور خدا کا قائل ہے اس کے پاس کوئی دلیل

عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ

(سورہ المومنون)

نہیں ہے۔ اُس کا حساب خدا کے پاس ہے (جب قیامت ہو گی۔ تو اسے خوب معلوم ہو جائے گا کہ اس شرک اور کفر کا کیا نتیجہ ہُوا) بے شک کفر کرنے والے فلاح نہ پائیں گے ٭

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا۔

(سورہ الفرقان)

لوگوں نے خدا کے علاوہ اور بہت سے خدا بنا لئے جو نہ کسی چیز کو پیدا کرتے ہیں بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں۔ (جیسی پتھروں سے مورتیں وغیرہ) اور وہ مصنوعی خدا نہ موت پر اختیار رکھتے ہیں نہ زندگی پر۔ اور نہ حشر و نشر پر (یعنی یہ بُت بالکل بے حس و بے اختیار ہیں۔ خدائی کے قابل کب ہو سکتے ہیں ٭

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

کہہ دے اے رسول ؐ۔ سب تعریفیں خدا کے لئے ہیں اور سلام اس کے برگزیدہ بندوں پہ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جسے یہ کفار خدا کا شریک بناتے ہیں کون ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کئے اور تمہارے لئے آسمان سے مینہ برسایا۔ (ہم ہی نے تو یہ سب کچھ کیا ہے) پھر اس پانی سے ہرے بھرے باغ اُگائے جس سے درخت اُگانے کی تمہیں بالکل قدرت نہ تھی۔ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور خُدا ہے۔ (ہرگز نہیں) بلکہ یہ قوم حق سے پھری ہوئی ہے!! کس نے زمین

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ
یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ
الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا
تَذَكَّرُوْنَ ۔ اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ
ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ یُّرْسِلُ
الرِّیٰحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا
یُشْرِكُوْنَ ۔ اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ
ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ
السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ
قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِیْنَ ۔ (سورہ النمل)

کو قرار گاہ بنایا۔ اور اُس کے بیچ میں نہریں جاری کیں۔ اور دو دریاؤں (کھاری اور میٹھے) کے درمیان روک قائم کی (کہ کھاری دریا میٹھے دریا سے مل کر اس کے مزے کو خراب نہ کر دے) کیا خدا کے ساتھ کوئی اور خدا ہے (ہرگز نہیں) بلکہ اکثر یہ لوگ جاہل ہیں (جو خدا کا شریک کسی دوسرے کو بتاتے ہیں) کون ہے جو مضطر کی دُعا کو اس کے دعا کرنے کے وقت قبول کرتا اور اُس کی بدحالی کو دفع کرتا ہے اور کس نے تمہیں زمین کا حاکم بنایا ہے۔ کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے؟ تم لوگ تو بہت کم یاد کرتے ہو! کون تم کو خشکی و تری کی تاریکی میں ہدایت کرتا ہے اور کون ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے بھیجتا ہے؟ کیا خُدا کے علاوہ کوئی اور ہے؟ اللہ تعالیٰ ان مشرکین کی باتوں سے برتر ہے۔ کون خلقت کی ابتدا کرتا ہے اور کون اسے دوبارہ لوٹا لائے گا۔ اور کون تم کو آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے کیا خُدا کے سوا کوئی اور ہے؟ اے رسول کہہ دو کہ اگر کسی اور خُدا کے وجود کا تمہیں دعویٰ ہو تو اس کی دلیل پیش کرو اگر سچے ہو۔

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ ۘ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔

(سورہ قصص)

تو مشرک نہ ہو اور نہ خدا کے سوا کسی اور کو معبود کہو۔ سوائے اُس معبود برحق کے کوئی خدا نہیں ہے سوائے اس کے سب فنا ہونے والے ہیں۔ اُسی کے ہاتھ میں حکم ہے اور تم سب اسی کی طرف واپس جاؤ گے ٭

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللّٰهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ ۚ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔

(سورہ العنکبوت)

جو لوگ خدا کے سوا اوروں کو اپنا مالک ٹھیراتے ہیں۔ اُن کی باتیں مثل مکڑی کے جالے کے ہیں اور مکڑی کا جالا بہت ہی بودا اور کمزور ہوتا ہے (اس کا اعتبار ہی کیا) کاش یہ لوگ سمجھتے (کہ کیسی بیہودہ بات کہہ رہے ہیں) ٭

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُم مُّنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا أَذَاقَهُم مِّنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ

(سورہ الروم)

ایہا الناس تم شرک نہ کرو۔ اور ایسے لوگوں میں داخل نہ ہو۔ جنہوں نے اپنے دین کو پراگندہ کر دیا۔ حالانکہ وہ گروہ گروہ تھے۔ ہر گروہ اپنی باتوں پر خوش ہے (آدمیوں کی حالت یہ ہے) کہ جب اُن کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ تو خدا تعالیٰ کو پکارنے لگتے ہیں پھر جب اُن پر خدا تعالیٰ رحم کر دیتا ہے۔ تو اس کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں ٭

اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ۖ هَلْ مِن شُرَكَائِكُم مَّن يَفْعَلُ مِن ذٰلِكُم مِّن شَيْءٍ ۚ سُبْحَانَهُ وَ

خدا ہی وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تمہیں روزی دی پھر تمہیں مار ڈالے گا۔ پھر جلائے گا۔ کیا تمہارے شرکاء میں سے بھی کوئی ایسا ہے جو ان باتوں پر قادر

تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔

(سورہ روم)

وہ پاک و برتر ہے خدا اُن کافروں کے شرک سے ✦

یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ۔

(سورہ لقمان)

(لقمان فرماتے ہیں) اے فرزند تو خدا کے ساتھ شرک نہ کر۔ شرک تو بے شک بڑا ظلم ہے ✦

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۚ لَا یَمْلِکُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَھُمْ فِیْھِمَا مِنْ شِرْکٍ وَّمَا لَہٗ مِنْھُمْ مِّنْ ظَھِیْرٍ۔

(سورہ سبا)

اے رسول ان کافروں سے کہہ دو کہ پکارو اُن کو جو تمہارے خیال میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ خدا ہیں۔ وہ تو آسمانوں و زمین میں ایک ذرہ برابر بھی کسی چیز کے مالک نہیں ہیں۔ اور نہ اُن کو ان چیزوں میں کچھ شرکت ہے۔ اور نہ ان جعلی خداؤں میں سے کوئی خدائے حقیقی کا مددگار ہے ✦

یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ ؕ ھَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰہِ یَرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۫ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ۔

(سورہ فاطر)

ایہا الناس یاد کرو اس نعمت کو جو خدا نے تمہیں دی ہے کیا کوئی شخص سوائے خدا کے بھی پیدا کرنے والا ایسا ہے جو تم کو آسمان و زمین دونوں سے روزی دیتا ہے سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر تم کہاں بھٹکتے پھرتے ہو ✦

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ مَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ ؕ اِنْ تَدْعُوْھُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَکُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَکُمْ ؕ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکْفُرُوْنَ بِشِرْکِکُمْ ؕ وَلَا یُنَبِّئُکَ

اے کافرو! جن جعلی خداؤں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ تم خدا کہتے ہو۔ وہ تو ذرا سی چیز کے بھی مالک مختار نہیں اگر تم انہیں پکارو تو تمہاری آواز کو سنتے نہیں اور اگر (بالفرض) سنیں بھی تو تمہاری دعا کو قبول نہیں کر

مِثْلُ خَبِيْرٍ (سورہ فاطر)

سکتے۔ اور جب قیامت ہوگی۔ وہ جعلی خدا تمہارے اس شرک سے انکار کر دیں گے۔ (اور صاف کہہ دیں گے کہ ہم تو اُن کے خالق نہ تھے) اے رسول جیسا کہ خدا تمہیں باتیں بتاتا ہے۔ ویسا کوئی نہیں بتا سکتا +

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ

(سورہ یٰسین)

ان کافروں نے اللہ کے علاوہ خدا ٹھیرائے ہیں اس خیال سے کہ شاید وہ اُن مدد کریں حالانکہ وہ مصنوعی و جعلی خدا ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ بلکہ دوزخ میں یہ اور وہ دونوں ساتھ ہی موجود ہوں گے +

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ

(سورہ صافات)

بے شک تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ اور نیز اُن تمام چیزوں کا مالک ہے جو اُن کے درمیان ہیں اور وہ مشرقوں کا بھی مالک ہے +

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ۔ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ

(سورہ زمر)

جب آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو رو رو کر خدا کو پکارتا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اپنی نعمت اُسے دیتا ہے تو وہ اپنی پہلی مصیبت کو بھول جاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے ساتھ اوروں کو شریک کرنے لگتا ہے۔ تاکہ اُس کے رستے سے لوگوں کو بھٹکائے۔ اے ہمارے رسول کہہ دو کہ اے کافر تو تھوڑے دن اپنے کفر سے فائدہ اٹھالے پھر تو تجھے

دوزخ والوں میں جانا ہی ہے۔

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ - وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ - بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ -

(سورہ زمر)

اے رسولؐ ان کافروں سے کہہ دو کہ تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ خدا کے علاوہ کسی اور کی عبادت کروں۔ اے جاہلو۔ اور بے شک وحی کی گئی ہے تم پر اے رسولؐ اور نیز تم سے پہلے آئے ہوئے رسولوں پر کہ اگر تم شرک کروگے تو تمہارے عمل حبط ہو جائیں گے۔ اور تم کو نقصان ہوگا بلکہ اللہ کی عبادت کرو۔ اور شکر گزار رہو۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ -

(حٰم سجدہ)

کہہ دو اے رسول کہ میں بھی مثل تمہارے آدمی ہی ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ بس تمہارا تو اللہ وہی ایک معبود ہے۔ پس تم استقامت و راستی کرو اس کی طرف اور اس سے مغفرت طلب کرو۔ اور مشرکین کے لئے ویل (وائے) ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِيْ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ - وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ -

(سورہ حٰم سجدہ)

اور جب ہم انہیں پکاریں گے کہ کہاں ہیں میرے شرکاء تو وہ کہیں گے کہ اے پروردگار ہم تجھے بتاتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی اس کا گواہ نہیں ہے کہ تیرا کوئی شریک ہے۔ اور یہ کفار جو کچھ اپنے بتوں سے امید رکھتے تھے وہ سب امیدیں ضائع ہو جائیں گی اور انہیں یقین ہو جائے گا کہ اب انہیں کوئی چھٹکارا نہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۔ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ ۔

(سورہ حٰم سجدہ)

خدا کی نشانیوں میں سے رات اور دن اور شمس و قمر ہیں۔ ایہا الناس تم لوگ شمس و قمر کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس معبود برحق کو سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے۔ اگر تم اس کی عبادت کرنا چاہتے ہو۔ پس اگر یہ مشرک تکبّر کریں تو خدا کو اُن کی کوئی پرواہ نہیں۔ کیونکہ جو فرشتے وغیرہ خدا کے پاس ہیں۔ وہ اس کی عبادت رات دن کرتے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے +

ام اتخذوا من دونہٖ اولیآء فاللہ ھو الولی وھو یحی الموتی وھو علی کل شیءٍ قدیر ۔

کیا ان کافروں نے خدا کے سوا اوروں کو اپنا مالک بنایا ہے۔ حالانکہ خدا ہی مالک ہے اور وُہی مُردوں کو زندہ کرے گا اور وُہ ہر شے پر قادر ہے +

وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ۔

(سورہ زخرف)

اے رسول پوچھ لو اُن رسولوں سے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں کیا ہم نے خدا کے سوا اور معبودوں کو بنایا ہے۔ جن کی عبادت کی جائے +

وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا ولا ما اتخذوا من دون اللہِ اولیاء ولھم عذابٌ عظیم ۔

(سورہ جاثیہ)

جو کچھ ان کافروں نے عمل کیا ہے نہ وہ انہیں فائدہ دے گا اور نہ وہ فائدہ دیں گے۔ جن کو خدا کے علاوہ ان کافروں نے اپنا مالک بنایا تھا۔ اور ان کافروں کے واسطے بڑا عذاب ہے +

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (سورہ محمد)

پس جان لے کہ نہیں ہے کوئی معبود برحق

مگر وہ (اللہ)۔

الَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ فَاَلْقِیٰہُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ (سورہ ق)

جس نے اللہ کے ساتھ اور بھی کوئی خدا مقرر کیا پس تم دونوں اس کو سخت عذاب میں ڈالو۔

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْہُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (ذاریات)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو خدا نہ سمجھو۔ میں تم کو اس سے کھلم کھلا ڈراتا ہوں۔

اَمْ لَھُمْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔

(سورہ طور)

آیا ان کا سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی اور بھی معبود ہے؟ (ہرگز نہیں) پاک ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے شرک سے۔

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِھِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔

(سورہ ممتحنہ)

تم لوگوں کے لئے اسوہ حسنہ ہے ابراہیم اور ان کے ساتھ والوں میں جب کہ انہوں نے کہا اپنی قوم سے کہ ہم تو تم سے اور ان (پتھر کی مورتوں) سے جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ خدا کو چھوڑ کر الگ ہیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِکُ بِہٖٓ اَحَدًا۔ (سورہ جن)

اے رسول کہہ دے کہ بس میں پکارتا ہوں اپنے پالنے والے کو (نہ کسی اور سے دعا کرتا ہوں اور نہ اس کی عبادت کرتا ہوں) اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا (یعنی ایک خدا چھوڑ کر دو خدا کا قائل نہیں ہوں)۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا۔

(سورہ مزمل)

پورب اور پچھم کا مالک اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس (ایہا الناس) تم لوگ اسی کو وکیل بناؤ (یعنی اسی کے حوالے اپنے سارے کام کردو کہ وہ بڑا رحیم و کریم و مدبر و حکیم ہے)۔

تیسرا باب

بتوں، ستاروں اور درختوں وغیرہ کی عبادت کی ممانعت

بہت قدیم زمانے سے سلسلہ ستارہ پرستی اور بت پرستی کا جاری ہے۔ اور غالباً اس کی ابتدا بیان کرنا کسی قدر دشوار ہو۔ مگر اسباب اس کے البتہ قرینے سے اس قدر معلوم ہو سکتے ہیں۔ کہ جس زمانے میں علم ریاضیات کا چرچا زیادہ ہوا ہے۔ اور بالخصوص علم نجوم میں لوگوں نے دستگاہ پیدا کی ہے۔ پھر اس کے ذریعے سے ستاروں کے افعال و خواص اور ان کی تاثیرات معلوم کیں۔ تو ان لوگوں کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا سوائے اس کے کہ ان ستاروں کو پوجنے لگیں۔ تاکہ اس پرستش کے سبب سے یہ ستارے ان کو نقصان نہ پہنچائیں۔ بعضوں نے صرف اس وجہ سے ان کو پوجنا شروع کیا کہ ان سے اکثر فوائد پہنچتے ہیں مثلاً آفتاب سے زراعت و بقول و ثمار کو بہت کچھ نفع پہنچتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس عناصر پرستی کی ابتدا بھی یوں ہی معلوم ہوتی ہے کہ جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ آگ۔ پانی۔ ہوا اپنے خواص طبیعی سے اہل عالم کے لئے مفید ہیں۔ تو ان کو پوجنے لگے۔ تاکہ اور بہت سے فائدے ان کو ان سے ملیں۔ اور بتوں کی پرستش کا آغاز یادگار تصویریں ہیں۔ جو بادشاہوں۔ حکیموں اور اولوالعزم لوگوں کی بطور یادگار کے پتھر یا لوہے یا تانبے وغیرہ سے بنائی گئی تھیں اور بسبب اس کے کہ وہ تصویریں باعزت لوگوں کی تھیں اس لئے ان تصویروں کی بھی عزت کرتے تھے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ عبادت تک نوبت پہنچ گئی۔ اور اصلی معبود کو بالکل بھول گئے۔

توحید بحار میں، جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے۔ راوی کہتا ہے۔ میں نے سنا کہ آپ مسجد نبیؐ میں فرماتے تھے "پہلا وہ شخص جس

نے ایک تصویر آدم علیہ السلام کی بنائی وہ ابلیس ملعون ہے۔ تاکہ لوگ اس سے فتنہ میں پڑ جائیں۔ اور تاکہ لوگوں کو خدا تعالیٰ کی عبادت سے بھٹکا دے۔ اور وُدّ، قابیل کی اولاد میں سے تھا۔ وُہی قابیل کا خلیفہ و جانشین تھا۔ اُن کی اولاد۔ اور نیز ان لوگوں پر جو اُن کے قریب سفح جبل میں رہتے تھے۔ لوگ اُس (وُدّ) کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ جب وُہ مر گیا تو اس کے بھائی بند اُس کی جدائی سے بے قرار ہوئے وہ بھی مرتے وقت ان پر اپنے بیٹے سواع کو خلیفہ کر گیا تھا۔ مگر وہ مثل اپنے باپ کے لوگوں کو مفید نہ ثابت ہُوا۔ پس اُن کے پاس ابلیس ایک مرد پیر کی صورت میں آیا اور کہا کہ مجھے اس مصیبت کی خبر ہوئی جو تم پر وُدّ کے مرنے سے پڑی تو کیا تمہاری خواہش ہے کہ وُدّ کی ایک مورت بنا دوں۔ کہ تم اس سے استراحت حاصل کرو۔ اور تم کو اس سے اُنس پیدا ہو۔ لوگوں نے منظور کر لیا۔ پس اس خبیث نے وُدّ کی تصویر اُس کے مکان میں بنا دی دیکھتے ہی اُس کے لوگ اس تصویر پر ٹوٹ پڑے۔ اُسے بوسہ دینے لگے۔ اور اپنے رخسار اُس پر رکھنے لگے اور (اسے) سجدہ کرنے لگے۔ سُواع یہ چاہتا تھا۔ کہ لوگ اس کی تعظیم کریا اور اس کو سجدہ کیا کریں۔ تو اس نے وُدّ کی تصویر چھیل ڈالی۔ اور اسے ذرا بھی باقی نہ رکھا۔ تب تو لوگ اس کے قتل کے درپے ہوئے۔ مگر اُس نے انہیں وعظ و نصیحت کر دی۔ اور کہا کہ (تم گھبراؤ نہیں) میں بھی تمہارے ساتھ وہی برتاؤ کروں گا۔ جو برتاؤ وُدّ کا تمہارے ساتھ تھا۔ میں اس کا فرزند ہوں۔ اگر تم لوگ مجھے مار ڈالوگے تو تمہارا کوئی سردار نہ رہے گا۔ آخر لوگ سواع کی طرف مائل ہُوئے۔ اور اس کی اطاعت و تعظیم کرنے لگے۔ تھوڑے دنوں بعد سُواع بھی مر گیا اور ایک فرزند اپنے بعد چھوڑا جس کا نام یغوث تھا۔ پس لوگ سواع کے مرنے سے بیقرار ہُوئے۔ پھر ابلیس ان کے پاس آیا۔ اور کہا۔ کہ میں وہی ہُوں جس نے تمہارے لئے وُدّ کی مورت بنا دی تھی کیا چاہتے ہو۔ کہ اب سُواع کی تصویر بھی ایسی بنا دوں جسے کوئی تغیر نہ دے سکے۔ لوگوں نے کہا ہاں ایسا کر۔ پس اس نے ایک تازی لکڑی لی۔ اُسے تراشا اور اُن کے سامنے سُواع کے مکان میں اس کو نصب کر دیا (معصوم فرماتے ہیں کہ پھر تو لوگ اس کو سجدہ

کرتے اور تعظیم دینے لگے اور یغوث سے کہا کہ ہم اس تصویر کی بابت تم سے بے خوف نہیں ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ جیسا تمہارے باپ نے کیا تھا۔ اسی طرح تم بھی کرو۔ اس لئے ان لوگوں نے اس مکان میں نگہبان اور دربان مقرر کئے۔ پھر وہ ایک دن اس بت کے پاس آئے۔ اور سواع سے زیادہ اس (تصویر سواع) کی تعظیم و توقیر کرتے جب یغوث نے ایسا دیکھا۔ تو نگہبانوں اور دربانوں کو رات کے وقت قتل کر دیا اور اس بت کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ جب ان لوگوں کو خبر ہوئی تو اس کے قتل پر متوجہ ہوئے آخر یہ اُن سے چھپ گیا۔ مگر لوگوں نے اسے تلاش کر کے پھر اسے اپنا سردار و معظم بنایا۔ پھر وہ بھی مر گیا۔ اور اپنے فرزند یعوق کو خلیفہ بنا گیا۔ تو اُن کے پاس ابلیس آیا اور کہا کہ مجھے معلوم ہوا کہ یغوث مر گیا۔ اب میں اس کی تصویر ایسی چیز میں بنا دوں گا۔ کہ کوئی اس کے تغیر دینے پر قادر نہ ہو گا۔ لوگوں نے کہا ہاں ایسا کر۔ پس اس خبیث نے ایک سفید پتھر لے کر لوہے سے اس کو تراشا۔ یہاں تک کہ ان کے لئے یغوث کی تصویر بنا دی۔ پس لوگ اوّل سے زیادہ اس کی تعظیم کرنے لگے۔ اور اس کے اوپر پتھر کا ایک مندر بنا دیا۔ اور آپس میں بیعت کر لی اس بات پر کہ اس کے دروازے کو کوئی نہ کھولے مگر ہر سال کے شروع میں ایک دن (اسی دن سے مندر کا نام بیعہ قرار دیا۔ کیونکہ لوگوں نے اس پر معاہدہ اور بیعت کی تھی)۔ (مگر) یہ بات یعوق کو ناگوار گذری۔ تو اس نے ایک پرانی چادر لی اور اس مندر کے اندر ڈال کر اس میں رات کو آگ لگا دی۔ جب صبح ہوئی۔ تو وہ مکان، بت اور نگہبان سب جل چکے تھے۔ اور بت ٹوٹ کر گر پڑا تھا۔ پس لوگ بہت بے قرار ہوئے۔ اور یعوق کے مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔ اس نے کہا کہ اگر تم اپنے رئیس (یعنی مجھ کو) مار ڈالو گے۔ تو تمہارے کام درہم برہم ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس امر سے باز آؤ۔ غرض تھوڑے دنوں بعد وہ بھی مر گیا۔ پھر ابلیس اُن کے پاس آیا اور کہا کہ مجھ کو تمہارے رئیس کے مرنے کی خبر معلوم ہوئی ہے۔ تو میں تمہارے لئے یعوق کی مورت ایسی چیز میں بنائے دیتا ہوں۔ جو بوسیدہ ہی نہ ہو۔ لوگوں نے کہا اچھا ایسا کر۔ اس نے سونا لیا اور اس پر آگ دھکائی

جب پگھل کر پانی کی مانند ہو گیا تو اس نے ایک عورت مٹی کی یعوق کی صورت پر بنا کر سونے کو اس میں ڈھال دیا پھر اُسے ان کے سامنے ان کے بت خانہ میں قائم کر دیا۔ یہ بات نسر کو ناگوار گذری اور اس سے اس دیر میں گھسنا ممکن نہ ہُوا۔ تو ان لوگوں سے تھوڑے آدمیوں کو لے کر الگ ہو گیا جو اس نسر کی عبادت کرتے تھے اور باقی لوگ بت کی پرستش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ نسر بھی مر گیا وہ زمانہ نبوت ادریس کا تھا ان کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ یہ لوگ ایک جسم کی جو یعوق کی صورت ہے عبادت کرتے ہیں۔ اور نسر بھی خدا تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرتا ہے تو ان لوگوں کے پاس اپنے اصحاب کے ساتھ گئے۔ یہاں تک کہ شہر نسر میں پہنچے اور وہ لوگ وہیں تھے۔ پس ان کو شکست دی کچھ لوگ قتل ہُوئے اور کچھ بھاگ کر اور اور شہروں میں متفرق ہو گئے۔ آپ نے حکم دیا کہ بُت کو اٹھا کر دریا میں ڈال دو۔ پس آخر ہر فرقہ نے ایک ایک بُت بنا لیا۔ اور ان کے ناموں پر نام رکھ لئے۔ پس برابر قرناً بعد قرنٍ لوگ سوائے ان ناموں کے اور کچھ نہ جانتے تھے (اور انہیں کی عبات کرتے تھے) پھر نبوت نوح علیہ السلام ظاہر ہوئی۔ حضرت نے ان لوگوں کو خدائے واحد کی عبادت کی طرف دعوت دی اور بتوں کی عبادت ترک کرنے کا حکم دیا۔ پس بعض آدمیوں نے کہا کہ اپنے خداؤں وُدّ اور سواع۔ یغوث اور یعوق اور نسر کو نہ چھوڑنا۔

علیٰ ہذا القیاس اور بھی اسباب بُت پرستی و ستارہ پرستی ہیں! اگر انسان غور کرے۔ تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں کس قدر غلطی پر ہوں۔ جب کہ ایسی چیزوں کی عبادت کرتا ہوں جو مجھ کو بالکل فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ میں نے ہی انہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا اور پھر ان کی پرستش کرتا ہوں۔ اور جو واقعی قابل پرستش ہے اس کی طرف بالکل التفات نہیں ہے۔ کس طرح کی عقلمندی ہے اگر یہ کہا جائے کہ جن کی یہ مورتیں ہیں۔ ہم دراصل ان کو سجدہ کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیں نفع پہنچائیں تو یہ بھی خیال غلط ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ اپنی مورتوں ہی کو فائدہ پہنچا نہیں سکتے۔ جو اُن سے ذاتاً تعلق رکھتی ہیں تو اوروں کو کیا نفع پہنچائیں گے ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان مورتوں کو توڑ ڈالے یا نجاسات میں لے جا کر اُن کو ڈال

دے۔ تب بھی تو صاحبان تصویر اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اور ایسا ہُوا بھی۔ اسی کو دیکھ کر ایک عرب نے بہت خوب شعر نظم کیا ہے۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ ایک بت کے اُوپر لومڑی پیشاب کر رہی ہے۔ حالانکہ وہ اُسے کچھ نہیں کہہ سکتا اور نہ اس امر ذلت کو اپنے سے رفع کر سکتا ہے تو اس نے برجستہ یہ شعر پڑھا ؎

وَرَبٌّ يَبُولُ الثُّعْلُبَانُ بِرَأْسِهِ　　لَقَدْ ذَلَّ مَنْ بَالَتْ عَلَيْهِ الثَّعَالِبُ

ہا ئیں (پروردگار مصنوعی) اور اس پر لومڑیاں موتیں! بے شک ذلیل ہے وہ جس پر لومڑیوں نے پیشاب کیا۔ (کیونکہ وہ اپنی اس ذلت کو اپنے سے رفع نہیں کر سکتا) اسی طرح ایک مرتبہ ایک اور عرب اپنے اونٹوں کو بغرض برکت حاصل کرنے کے ایک بُت کے پاس لے گیا۔ تاکہ اس سے اپنے اونٹوں کے بدن کو مس کرے اور اس فعل سے برکت حاصل کرے۔ مگر اونٹوں کو دیکھئے کہ اس مورت کو دیکھتے ہی کچھ ایسے متوحش ہوئے کہ نکیل تڑا تڑا کر بھاگ نکلے۔ اور چاروں طرف متفرق ہو گئے۔ بیچارے عرب کو ان حضرت بت صاحب پر غصہ آیا کہ آپ عجیب طرح کے خدا ہیں کہ میرے اونٹوں ہی کو بھگا دیا ہم تو آپ سے فائدہ اٹھانے آئے تھے۔ اُلٹا نقصان لے چلے جھٹ یہ دو شعر ان کی ہجو میں راست کئے ؎

اتیت الی سعد لیجمع شملنا　　فشتتنا سعدٌ فما نحن من سعد

وما سعد الا صخرة مسودة　　من الارض لا تهدی لغی و لا رشد

میں تو سعد (اس بت کا نام ہے) کے پاس آیا تھا کہ وہ ہماری پراگندگی کو جمع کرے گا۔ سعد نے لے کر ہماری زندگی ہی کو پراگندہ کر دیا۔ پس ہم سعد سے نہیں ہیں۔ سعد کیا ہے؟ زمین کا پتھر ہے جو کالا کیا ہُوا ہے۔ جسے کسی نیک و بد کی تمیز نہیں ہے" اور واقعی اس غریب نے ٹھیک کہا کہ پتھر یا لکڑی وغیرہ کی اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزیں جو فی الواقع مُردہ ہیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔ اسی سبب سے تو خدا تعالےٰ نے جا بجا اس مطلب کو نہایت بلاغت سے ادا فرمایا ہے۔ سورہ انعام میں فرماتا ہے۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا۔ اے رسول کہہ دے کہ کیا

ہم خدا تعالیٰ کے سوا اُسے پکاریں۔ جو نہ ہمیں فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان (یعنی کیا ان پتھر کی مورتوں سے حاجت طلب کریں؟)

پھر سورہ اعراف میں فرمایا ہے۔ اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ۔ وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَھُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَھُمْ یَنْصُرُوْنَ۔ وَاِنْ تَدْعُوْھُمْ اِلَی الْھُدٰی لَا یَتَّبِعُوْکُمْ۔ سَوَآءٌ عَلَیْکُمْ اَدَعَوْتُمُوْھُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ فَادْعُوْھُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ اَلَھُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِھَآ اَمْ لَھُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِھَآ اَمْ لَھُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِھَآ اَمْ لَھُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِھَا قُلِ ادْعُوْا شُرَکَآءَکُمْ ثُمَّ کِیْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ۔ اِنَّ وَلِیِّ یَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ۔ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَکُمْ وَلَآ اَنْفُسَھُمْ یَنْصُرُوْنَ وَاِنْ تَدْعُوْھُمْ اِلَی الْھُدٰی لَا یَسْمَعُوْا وَتَرٰھُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ۔

کیا یہ مشرکین خدا تعالیٰ کے ساتھ شریک کرتے ہیں اُن چیزوں کو جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے جیسے یہ پتھر کی مورتیں ہیں۔ جن میں بالکل جان و حس نہیں۔ بلکہ وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں (اگر بلحاظ اصل دیکھو۔ تو پیدا کئے ہوئے ہیں کیونکہ یا تو وہ پتھر کی ہیں یا فلزات متفرقہ کے مثل سونے چاندی تانبے وغیرہ کی اور ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں اور اجزائے ارضیہ سے اُن کی ترکیب ہوئی۔ جن میں گندھک پارہ ہڑتال وغیرہ کے اجزاء شریک ہیں اور اگر بلحاظ اب کے دیکھو تو بھی مخلوق ہیں۔ کیونکہ جب کسی آدمی نے لکڑی کو یا پتھر کو لوہے سے تراشا اور اسے خراد پر چڑھایا اور اس میں ہاتھ پاؤں آنکھ ناک کان وغیرہ کی شکلیں بنائیں۔ تب حضرت بُت صاحب تیار ہوئے۔ پس اگر ایسی ہی عبادت ضروری ہے تو زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیتے جاگتے آدمی کی عبادت کی جائے جس نے ان خوبصورت پتلیوں کو بنایا نہ کہ پتلیوں کی۔ ورنہ فی الواقع تو عبادت کا مستحق وہ ہے جس نے اشیائے مذکورہ اور حضرت انسان دونوں ہی کی خلقت فرمائی ہے) اور (یہ مشرکین ایسوں کی عباد

کرتے ہیں، جو نہ ان عبادت کرنے والوں کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اگر تم ان مشرکین کو ہدایت کی طرف دعوت دو تو تمہاری پیروی نہ کریں گے۔ برابر ہے خواہ تم ان کو حق کی طرف دعوت دو یا چپکے رہو۔ اے مشرکین جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو یعنی جن بتوں سے اپنی حاجتیں مانگتے ہو یا جن کو خدا تعالیٰ کے سوائے معبود کہتے ہو۔ وہ بھی مثل تمہارے بندے ہی ہیں۔ پس اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو انہیں اپنی حاجتوں کے بر لانے کے لئے پکارو اور یہ تمہاری دعائیں قبول کریں (تو دیکھا جائے کہ کیوں کر وہ تمہاری دعائیں مستجاب کرتے ہیں) کیا ان مورتوں کے ایسے پاؤں ہیں جن سے چل سکیں یا ایسے ہاتھ ہیں جن سے پکڑ سکیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھ سکیں یا اُن کے کان ہیں جن سے سن سکیں؟ (کچھ بھی نہیں ہے بلکہ ٹھوس مورتیں ہیں) کہہ دے۔ اے ہمارے رسول کہ اے مشرکین پکارو اپنے شرکاء (بتوں) کو پھر مجھ سے مکر کرو۔ اور مہلت (موقع مت دو (اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو) (کہہ اے رسولؐ کہ) بے شک میرا مالک و ولی وہ معبود برحق ہے۔ جس نے کتاب (قرآن مجید) نازل فرمائی۔ اور وُہ نیکوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور جن کو تم معبود کہتے ہو۔ وہ نہ تو تمہاری مدد کرنے پر قادر ہیں۔ اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں اور اگر تم ان مورتوں کو پکارو۔ دعوت دو ہدایت کی طرف تو تمہاری پکار کو نہ سنیں گے اور اے رسولؐ بظاہر تو تمہاری طرف دیکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ دیکھتے نہیں (کیونکہ اُن میں قوت باصرہ ہی نہیں۔ اس وجہ سے کہ اپنے جسموں میں روح حیوانی نہیں رکھتے اور نہ کسی قسم کی اور طاقت رکھتے ہیں۔

نیز سورہ یونس میں فرمایا ہے۔ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ کہہ اے رسولؐ ہمارے ان بت پرستوں سے کہ آیا تمہارے شرکاء میں سے یعنی جنہیں معبود کہہ کر خدا کا شریک بناتے ہو۔ کوئی ایسا بھی ہے جو پیدا کرے خلقت کو نشاء اولیٰ میں۔ پھر اسے دوبارہ لوٹا سکے۔ جیسا کہ ہمارا پروردگار حقیقی اس امر پر قادر ہے کہ پیدا بھی کرتا ہے۔ پھر مار بھی ڈالتا ہے۔ پھر دوبارہ حساب و

کتاب کی غرض سے قیامت میں زندہ کرے گا۔ قُلِ اللّٰہُ یَبْدَءُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ
کہہ دے اے رسولؐ کہ (وہ تو ابتدائے خلقت یا اعادہ خلقت نہیں کر سکتے مگر) اللہ
تعالیٰ خلقت کی ابتدا بھی کرتا ہے اور اُسے دوبارہ بھی واپس لائے گا۔ اور پھر زندہ
کرے گا۔ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ۔ پس اے مشرکین تم کدھر حق سے بھٹکے جاتے ہو۔ قُلْ ھَلْ
من شرکائکم من یھدی الی الحق قل اللّٰہ یھدی للحق کہہ دو اے رسول کہ آیا
تمہارے شرکاء میں سے بھی ایسا ہے جو راہ حق کی بھی ہدایت کر سکے۔ (وہ بے چارے
تو آپ مردہ ہیں دوسروں کو کیا ہدایت کریں گے) کہہ دو اے رسولؐ کہ اللہ تو حق
کی طرف ہدایت کرتا ہے (پس کیونکر تم خدا تعالیٰ کو اور بتوں کو برابر سمجھتے ہو)
افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع ام من لا یھدی الا ان یھدی فما
لکم کیف تحکمون۔ پس جو کہ حق کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ وہ پیروی کئے جانے
کے قابل ہے۔ یا وُہ جو بغیر ہدایت کئے ہوئے ہدایت ہی نہیں پاتا؟ پس اے مشرکین
تم کو کیا ہو گیا ہے آخر یہ کس کام کا حکم لگاتے ہو۔ (کہ تراشی ہوئی مورتیں بھی
قابل پرستش ہیں بڑے غضب کی بات ہے۔ سمجھو اپنی رائے سے واپس ہو)

اور سورہ ہود میں فرماتا ہے۔ فَلَا تَکُ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّمَّا یَعْبُدُ ھٰٓؤُلَآءِ۔
پس اے رسولؐ ہمارے تم شک میں نہ پڑو۔ اس سے جس کی یہ مشرکین عبادت
کرتے ہیں۔ کیونکہ دراصل یہ پتھروں ہی کو پوجتے ہیں۔ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا کَمَا
یَعْبُدُ اٰبَآؤُھُمْ مِّنْ قَبْلُ۔ اسی طرح یہ لوگ بھی عبادت کرتے ہیں جیسے اُن کے
باپ دادا پہلے عبادت کرتے تھے۔ یہ لوگ اُن ہی کی تقلید پر قائم ہیں وَاِنَّا لَمُوَفُّوْھُمْ
نَصِیْبَھُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ۔ اور بے شک ہم اُن کو اُن کے اس فعل کا پورا بدلہ دیں
گے۔ یعنی اُن پر خوب عذاب کریں گے۔ جیسا دوسرے مقام پر فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا
یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ۔ بے شک شرک کو خدا تعالیٰ نہ بخشے گا۔ نیز اسی سورہ میں
فرمایا ہے۔ وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمْلِکُ لَھُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ شَیْئًا وَّلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ۔ اے رسولؐ یہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر

اُن چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ طاقت رکھتی ہیں کہ آسمانوں سے مینہ برسا سکیں اور نہ یہ کہ زمین سے اُن کے لئے غلہ پیدا کر سکیں اور کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے۔

سورہ مریم میں فرمایا ہے۔ نقل قول حضرت ابراہیم جو بطور نصیحت کے آذر سے آپ نے کہا تھا۔ یَا اَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْئًا۔ اے باپ تو کیوں عبادت کرتا ہے اُس چیز کی جو نہ سُنتی ہے اور نہ دیکھتی ہے اور نہ تم کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

سُورہ حج میں فرمایا ہے۔ یَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهٗ وَلَا یَنْفَعُهٗ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ۔ بعض آدمیوں میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسوں کو خدا کہتے ہیں جو نہ اُن کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع یہی وُہ گمراہی دور و دراز ہے۔ یعنی یہی وہ ضلالت ہے جو حق سے بہت دور ہے۔

نیز فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ بے شک جن لوگوں کو تم اے مشرکین خدا کہتے ہو۔ اور اُن کی تعداد تین سو ساٹھ بتاتے ہو۔ جو مختلف دھاتوں کے بنے ہُوئے گرد خانہ کعبہ کے دھرے ہُوئے ہیں۔ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ہرگز ننھی سی مکھی بھی تو پیدا نہیں کر سکتے۔ اگرچہ سب کے سب مل کر پیدا کرنا چاہیں تو پھر کس طرح یہ مورتیں خدا ہو سکتی ہیں۔ اور کیا وجہ اُن کی عبادت کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ۔ اور اگر مکھی اُن کے جسم پر سے کچھ چھین لے جائے یعنی وہ مصالح وعطر وغیرہ جو ان پر ملے جاتے تھے تو اس کو چھوڑا نہیں سکتے اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ جناب صادق علیہ السلام سے توحید بحار میں مروی ہے کہ قریش اپنے بتوں کو جو گرداگرد خانہ کعبہ کے رکھے ہوئے تھے۔ مشک وعنبر لگاتے تھے۔ (جیسے یہاں ہندوستان میں بتوں کی پیشانی پر سیندور گیرو اور تیل وغیرہ لگا دیتے یا سرخ صندل سے اُن کو رنگین کر دیتے ہیں) اور یغوث نامی بُت دروازے

کے آگے دائیں ہاتھ پر رکھا ہوا تھا۔ اور نسر بائیں ہاتھ پر۔ جب یہ لوگ وہاں جاتے تو یغوث کے آگے سجدہ کرتے اور خم نہ ہوتے تھے۔ پھر گردش کر کے یعوق کی طرف آتے تھے پھر نسر کی طرف۔ پھر تلبیہ کرتے تھے یعنی لبیک اللھم لبیک الخ پڑھتے تھے۔ پس خدا تعالیٰ نے ایک مکھی بھیجی جس کے چار بازو تھے۔ وہ تمام مشک و عنبر جو ان بتوں کو لگا تھا چاٹ گئی۔ اس موقع پر یہ آیت نازل فرمائی۔ ضعف الطالب و المطلوب۔ طالب بھی کمزور ہے اور مطلوب بھی۔ یعنی حالانکہ یہ مکھی کیسی ننھی سی ہے اور کمزور بھی۔ پھر بھی اس سے یغوث و یعوق وغیرہ اپنی کمزوری کے سبب عطریات کو نہ بچا سکے۔ (آخر یہ کس قسم کے معبود ہیں)۔

سورہ شعراء میں فرمایا ہے۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ اِبْرٰهِيْمَ۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ۔ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ۔ بیان کر اے ہمارے رسول ان مشرکین سے ابراہیمؑ کا قصہ جب کہ انہوں نے اپنے باپ (یعنی پالنے والے چچا) سے اور اپنی قوم والوں سے کہا کہ تم لوگ کس چیز کی عبادت کرتے ہو۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہم مورتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ پس برابر اس پر جمے رہیں گے۔ کبھی ان کی پرستش نہ چھوڑیں گے۔ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ۔ کہا ابراہیم نے جب تم پکارتے ہو تو کیا یہ بت سنتے بھی ہیں۔ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ۔ یا تم کو نفع و نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ بلکہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا۔ یعنی ہمارے پاس کوئی دلیل تو اس بات کی موجود نہیں ہے کہ کیوں ان کی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ باپ داداؤں کو ایسا ہی کرتے دیکھا لہذا ہم بھی ان کی پرستش کرتے ہیں"۔ کس قدر کمزور جواب ہے کیا بھلا اس جواب سے یہ لوگ بچ سکتے ہیں؟ جب کہ دلائل بطلان واضح ہیں۔ یہی جواب اہل ہند کا بھی ہے حالاں کہ جب ان کو سمجھایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو لکیر کے فقیر ہیں۔ یعنی جو رفتار قدیم سے چلی آتی ہے خواہ

حق ہو یا باطل اسی ڈھرے پر چلے جاتے ہیں۔" ایسی عقل سے خدا پناہ میں رکھے۔
سورہ نمل میں فرماتا ہے زبانی ہُدہُد کی جو حضرت سلیمان سے حالات بلقیس کو بیان کر رہا ہے۔ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ۔ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ۔ میں نے اس (بلقیس) کو اور اس کی قوم کو پایا (دیکھا) کہ وہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر سورج کو پوجتے ہیں اور شیطان نے ان کی آنکھوں میں ان کے اعمال کو زینت دے دی ہے (پس ان کو راہِ راست سے روک دیا ہے کہ ہدایت نہ پائیں) کہ وہ اللہ کو تو سجدہ نہ کریں۔ جو آسمانوں اور زمین کے اندر کی مخفی چیزوں کو جانتا ہے اور اس کو جانتا ہے جسے تم چھپاتے ہو اور اُسے بھی جسے تم ظاہر کرتے ہو۔ پھر بھی اس کی عبادت نہیں کرتے (کیسے غضب کی بات ہے)
سورہ عنکبوت میں فرمایا ہے: اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ط اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ط اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ پس تم لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں کو پوجتے ہو۔ اور افترا پردازی کرتے ہو کہ ان بتوں کو خدا کہتے ہو۔ بے شک جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر وہ تمہیں روزی دینے پر قادر نہیں ہیں۔ پس خدا کے پاس سے روزی چاہو۔ اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (پھر جب وہ تم سے تمہارے ان بد افعال کی پرسش کرے گا تو کیا جواب دو گے)
نیز فرماتا ہے۔ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔ (اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بھی) کہا کہ تم جو خدا کے سوا بتوں کو مانتے ہو تو صرف دنیاوی محبت

باہمی کے لحاظ سے مانتے ہو۔ پھر قیامت کے دن (تو تمہارا یہ حال ہوگا کہ) ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور ایک دوسرے کو لعنت کرو گے (وہ کہے گا تو نے بت پرستی مجھ کو سکھائی وہ کہے گا تو میرے جہنم میں جانے کا باعث ہوا) اور آخری ٹھکانا جہنم ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں (یعنی قیامت کے دن پھر عذاب خدا سے تم کو کوئی بچانے والا نہ ہوگا)۔

پھر سورہ یٰسین میں فرماتا ہے۔ ءَأَتَّخِذُ مِن دُونِهِ آلِهَةً إِن يُرِدْنِ الرَّحْمَٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَلَا يُنقِذُونِ۔ إِنِّي إِذًا لَّفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ (اس شخص نے جو مسلمان تھا کہا کہ) کیا میں اس (معبود برحق) کے سوا اور بھی کئی معبود مان لوں۔ (ہرگز ایسا نہ ہوگا کیونکہ) اگر رحم والا (خدا) مجھ کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے۔ تو مجھ کو ان فرضی خداؤں کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور نہ وہ مجھے بچا سکیں گے۔ بے شک میں اس وقت (جب کہ خدا تعالیٰ کے سوا اور خداؤں کا قائل ہو جاؤں تو) صاف گمراہی میں ہوں گا (لہٰذا میں سوائے اپنے اصلی معبود کے جو ایک ہی ہے۔ دوسرے خدا کا قائل نہ ہوں گا۔

پھر سورہ صٰفّٰت میں فرماتا ہے۔ إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ۔ (یہ مشرکین جہنم میں کیوں ڈالے گئے؟ صرف اس وجہ سے کہ) بے شک جب ان سے کہا جاتا تھا کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود برحق نہیں ہے تو اکڑ بیٹھتے تھے۔ وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ اور کہتے تھے کہ کیا ہم چھوڑ دیں اپنے خداؤں کو ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے۔

نیز فرمایا ہے۔ أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ۔ (ایہا الناس) کیا تم عبادت کرتے ہو اُن کی جنہیں تم تراشتے ہو (اپنے ہاتھوں سے) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور نیز اُسے بھی جسے تم بناتے ہو (یعنی ان پتھروں کو بھی تو اسی نے پیدا کیا ہے پھر تم اُن کو کیوں پوجتے ہو اور خدا تعالیٰ کی عبادت کیوں نہیں کرتے۔ جو خالق اصل ہے)

نیز فرماتا ہے۔ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ۔ اَللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ۔ کیا تم پکارتے ہو بت کو اور اپنے پالنے والے معبود برحق (اللہ) کو جو سب سے اچھا پیدا کرنے والا ہے۔ اور تمہارے اگلے باپ داداؤں کا بھی خالق ہے چھوڑتے ہو۔ (یہ کیسا انصاف ہے اور یہ کس قسم کی عقل ہے)

اور سورہ زمر میں فرماتا ہے۔ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ۔ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ فِیْ مَا هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ۔ پس (اے رسول) عبادت کر اللہ کی درآں حالیکہ اس کے لئے دین کو خالص کرنے والا ہو۔ آگاہ ہو کہ اللہ ہی کے واسطے خالص دین ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کے سوا اوروں کو اپنا ولی مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی صرف اس وجہ سے عبادت کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ ان کے درمیان ان کے اختلاف کا قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا۔

نیز فرماتا ہے۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔ قُلْ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِیَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِیْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ۔ قُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ۔ عَلَیْهِ یَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ۔ اے رسول اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے پیدا کیا ہے۔ تو ان کافروں سے کہو کہ دیکھو تو سہی تم جو اللہ کے سوا اور معبودوں کو پکارتے ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہیے تو کیا تمہارے فرضی معبود اس کی بھیجی ہوئی تکلیف کو دفع کر سکیں گے یا وہ مجھ پر رحمت کرنی چاہے۔ تو کیا تمہارے فرضی معبود اس کی رحمت کو روک سکیں گے؟ (ہرگز نہیں۔ تو ان سے) کہدو (اے رسول کہ) اللہ میرے لئے کافی ہے (اور وہی میرا مددگار ہے) اسی پر بھروسہ کرنے والے بھروسہ کرتے ہیں۔ (نہ کہ تمہارے بنائے اور گھڑے ہوئے خداؤں پر جو نہ ہاتھ ہلا سکتے

ہیں نہ پاؤں)۔

اور سورہ مومن میں فرماتا ہے۔ قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ لَمَّا جَاءَنِيَ الْبَيِّنَاتُ مِنْ رَبِّي ۚ وَأُمِرْتُ أَنْ أُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِينَ "۔ اے ہمارے حبیب رسول" کہہ دو کہ میں اس بات سے منع کیا گیا ہوں۔ مجھے خدا تعالیٰ نے نہی فرمائی ہے کہ اُن کی پرستش کروں جن کی تم پرستش کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جب کہ دلیلیں اور حجتیں میرے پروردگار کی طرف سے آئیں تو اس امر کو مجھے بتا دیا کہ ان مورتوں کی عبادت نہ کرنی چاہیئے۔ اور مجھے خدا تعالےٰ کی طرف سے حکم ملا ہے کہ میں تمام جہان کے پالنے والے اور مالک کی اطاعت کروں۔

سورہ سجدہ میں فرماتا ہے۔ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۔ تم لوگ سورج اور چاند کو سجدہ مت کرو۔ اور اللہ کو سجدہ کرو۔ جس نے ان (سورج اور چاند وغیرہ) کو پیدا کیا ہے۔ اگر تم اسی کی عبادت کرنی چاہتے ہو یعنی اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ ان بتوں کی پرستش سے دراصل ہمارا مقصود خدا تعالیٰ کی عبادت ہے (جیسا کہ بعض اصنام پرستوں نے مشافہتً سنا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں دراصل تو ہم کو مقصود اسی کی عبادت ہے لیکن چونکہ ہمارا خیال اس پر قائم نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم نے یہ مختلف قسم کی مورتیں خیال کی یکسوئی کے واسطے قائم کرلی ہیں تا کہ اُن پر خیال پختہ کر کے ترقی دیں۔ اور خدا تعالیٰ کی عبادت تک پہنچیں) تو تمہیں لازم ہے کہ اسی اصل خالق کی طرف اپنے خیال کو متوجہ کرو۔ اور اس میں استحالہ اور دشواری ہی کیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ بے مثل و بے نظیر ہے۔ اُس کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کے لئے کوئی جسم نہیں ہے وہ جسم و جسمانیات و مکان و مکانیات سے مبرّا ہے اور اپنی قدرت سے ہر ایک چیز کی حالت اور ہر دل کے خیال اور ہر عضو بدن کے افعال سے واقف ہے اس سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے اُسی ذاتِ مقدس بے ہمتا و بے مانند کو مقصودِ اصلی ٹھیرا کر کیوں نہیں سجدہ کرتے۔ دیکھو قرآن یہ تعلیم فرماتا ہے کہ أَيْنَمَا تُوَلُّوا

فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰہِ۔ جدھر منہ پھیرو اُدھر ہی ذات خدا ہے۔ یعنی اُس سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے پس ایسے موجود کی عبادت کے واسطے کیا ضرورت کسی نمونہ قائم کرنے کی ہے اور اگر یہی ہے تو پھر تخصیص چاند، سورج ۔ پتھر کی کیا ہے۔ اُن میں کیا خدا بیٹھا ہُوا ہے یا اُن کو کوئی خاص تعلق ذات اللہ تعالیٰ سے ہے ؟ یہ تو ویسی ہی مخلوق ہیں۔ جیسے تم مخلوق ہو یہ بھی ویسے ہی مسخر ہیں جیسے تم مسخر ہو۔ یہ بھی ویسے ہی عبد خدا ہیں جیسے تم ہو۔ تو پھر اُن کو پوجنا کیا خالق عالم کی جناب میں بے ادبی نہ ہوگی ؟ بے شک یہ بہت بڑی بے ادبی ہے کہ ایسے خالق و قادر و عالم و مالک الملک و الملکوت کے ہوتے ہوئے اُسی کے سامنے اس کی مخلوقات خسیسہ کو تو سجدہ کیا جائے۔ اور باوجود استحقاق حقیقی کے خود اس کو نہ سجدہ کیا جائے۔ مورتوں اور چاند۔ سورج۔ درخت۔ پانی اور آگ وغیرہ سے رفع حاجات کے لئے دعا مانگی جائے۔ اور جو اقدر القادرین ہے اس کی طرف التفات بھی نہ کی جائے۔ فالحیف ثم الحیف۔!!

سورہ زخرف میں فرمایا ہے۔ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔ اور جن بتوں کو یہ کفار پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ہماری سفارش کریں گے اس لئے ہم اُن کو سجدہ کرتے ہیں۔ وُہ تو سفارش کرنے پر قادر ہی نہیں ہیں۔ البتہ وہ لوگ سفارش کر سکیں گے۔ جنہوں نے حق کی شہادت دی ہے یعنی توحید خدا کے قائل ہیں اور سچے موحّد ہیں (مثل حضرت عیسیٰ اور عزیر علیہما السلام اور فرشتوں کے) اور وہ علم بھی رکھتے ہیں۔ اور اے رسول اگر تم ان بت پرستوں سے پوچھو کہ تمہیں کس نے پیدا کیا ہے تو کہہ دیں گے کہ اللہ نے پیدا کیا ہے۔ پس (باوجود اس اقرار کے) کدھر بھٹکے پھرتے ہیں۔

سورہ جاثیہ میں فرمایا ہے۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ۔ اے رسول دیکھا تم نے ان لوگوں کو جنہوں نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے یہ آیت قریش کی نسبت اس موقع پر نازل ہوئی ہے۔ جب کہ اُن کی معاش اُن پر

تنگ ہو گئی تھی۔ تو مکہ سے نکلے اور متفرق ہو گئے۔ اور اُن میں سے جب کوئی شخص کسی خوبصورت درخت یا پتھر کو دیکھتا تو اس کی عبادت کرنے لگتا اور اس پر اپنی بھیڑوں کو قربانی چڑھاتا اور انہیں ان جانوروں کے خون سے رنگین کرتا۔ تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا تم نے اے رسول دیکھا ان لوگوں کو کہ کس طرح اپنی خواہش نفس کے پیرو ہیں۔ جسے ان کا دل کہتا ہے اسی کی عبادت کرنے لگتے ہیں۔ اور خدائے حقیقی کو بھولے ہوئے ہیں۔

سورۂ احقاف میں فرماتا ہے۔ قُلْ أَرَأَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ ۖ ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن قَبْلِ هَٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُو مِن دُونِ اللَّهِ مَن لَّا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَن دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ ۔ اے رسول ان مشرکین سے کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ تم جن لوگوں (جن مورتوں) کو سوائے اللہ تعالیٰ کے معبود کہتے ہو یا اُن کو اپنی حاجتوں کے وقت پکارتے ہو ذرا دکھاؤ تو سہی کہ انہوں نے کون سی زمین پیدا کر دی۔ یا آسمانوں کے بنانے میں اُن کا ساجھا ہے۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو لاؤ۔ اس سے پہلے کی کوئی کتاب جس میں لکھا ہو کہ ان مورتوں کی عبادت درست ہے یا کوئی علمی روایت میرے سامنے پیش کرو جس سے تمہارے دعوے کی تصدیق ہو سکے!! اور (اے رسول) اُس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا۔ جو اللہ کے سوا اُن کو پکارتا ہے۔ جو کبھی اُن کی دُعا قیامت تک نہ قبول کریں گے۔ اور وہ اُن کی دُعا سے غافل بھی ہیں۔ یعنی اُن کو خبر بھی نہیں۔ کہ ہم سے کوئی کچھ کہتا بھی ہے یا نہیں۔ کیوں کہ اُن میں قوت سامعہ ہی نہیں۔ اور نہ کوئی خاص ایسی طاقت ہے۔ جس سے وہ اُن کی دعاؤں کو ادراک کر سکیں۔

سورہ نجم میں فرمایا ہے۔ أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ۔ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ۔ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ۔ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ۔ إِنْ هِيَ إِلَّا

اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ط کیا تم نے دیکھا لات اور عزیٰ اور تیسرے منات کو جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ کیا انہوں نے کوئی نفع یا نقصان پہنچایا؟ یا کوئی ایسا کام کیا جس سے خدا کہے جانے کے قابل ہوئے؟ اور کیا تم انہی کو کہتے ہو کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں؟ کیا خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے تو بیٹے پیدا کئے اور اپنے لئے بیٹیاں اختیار کیں۔ (یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ کچھ لوگ کہتے تھے کہ فرشتے خدا تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں) یہ تقسیم تو اس وقت بہت ہی غلط منصفانہ ہے کہ تمہارے لئے تو بیٹا ہو اور خدا کے لئے بیٹیاں ہوں) (یہ سب غلط ہے بلکہ) یہ تو صرف نام ہیں۔ جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے قرار دے لئے ہیں۔ یہ محض فرضی ڈھکوسلے ہیں۔ ان کی بابت خدا تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں نازل فرمائی ہے۔ جس سے سمجھا جائے کہ یہ بُت قابلِ عبادت ہو سکتے ہیں۔"

سورہ جحد میں فرماتا ہے۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ۔

کہہ دے اے رسول کہ اے کافرو میں نہ عبادت کروں گا اس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ کیونکہ وُہ مخلوقات ہیں مثل تمہارے نہ اُن میں قوتِ احساس ہے اور نہ قوت ادراک اور نہ کسی اور قسم کی طاقت جس سے قابلِ پرستش ہو سکیں۔

چوتھا باب

اس بیان میں کہ اس کے نہ بیوی ہے نہ بچہ

کچھ لوگ اپنی جہالت سے اس امر کے قائل ہوگئے کہ خدا تعالیٰ کے بیوی بھی ہے۔ چنانچہ خود مجھ سے ایک عالم ہندو نے جو اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ کہ "پرمیشر اپنے اسّی برس کے کاموں کو قدرت میں حوالہ کر کے اپنی استری کو لے کر سو چیت عرش پر سوتا ہے"۔ اور مسیحی حضرات اس امر کے مدعی ہوگئے کہ خدا تعالیٰ کے بیٹا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ مسیح کو جو پیغمبر برگزیدہ تھے۔ خدا کا بیٹا کہہ دیا۔ اور غالباً یہ لوگ حضرت مریم کو نعوذ باللہ خدا کی بیوی سمجھتے ہوں گے۔ کیونکہ خدا کا بیٹا ان ہی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ ان لوگوں سے کچھ پیشتر حضرت عزیزؑ کو لوگوں نے خدا کا بیٹا کہہ دیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں قولوں کی نقل خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کی ہے۔ قَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ۔ یہود نے کہہ دیا کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصرانیوں نے کہہ دیا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ اگلے کافروں کی سی باتیں کرتے ہیں یعنی یہ محض زبانی دعویٰ ہے اس کی دلیل ان کے پاس کوئی نہیں پھر ان کے رد میں فرمایا ہے کہ انما المسیح عیسی ابن مریم رسول اللّٰہ وکلمتہ القاھا الی مریم۔ پس عیسیٰ بن مریم تو اللہ کا رسول تھا اور اس کا ایک حکم تھا جسے مریم کی طرف ڈال دیا تھا۔ پھر فرمایا۔ لن یَّستنکِفَ المسیح ان یکون عبد اللّٰہ ولا الملٰئکۃ المقربون۔ خدا کا بندہ ہونے سے مسیح نے ہرگز انکار نہیں کیا اور نہ مقرب فرشتوں نے بلکہ سب اس بات کے معترف رہے اور ہیں کہ ہم سب بندگانِ خدا ہیں اور

اس کے مخلوق ہیں علیٰ ہذا القیاس توریت بھی اس امر کی اقراری نظر آتی ہے۔ کہ خُدا کے بیٹے ہیں۔ چنانچہ کتاب پیدائش باب ۶ آیت ۲۔۳ میں مذکور ہے "جب روئے زمین پر آدمی بہت ہونے لگے۔ اور اُن سے بیٹیاں پیدا ہوئیں تو خدا کے بیٹوں نے آدمیوں کی بیٹیوں کو دیکھا کہ وُہ خوبصورت ہیں اور ان سبھوں میں جسے جو پسند آئیں اپنے لئے لے لیں۔ تب خداوند نے کہا کہ میری رُوح انسان کے ساتھ ہمیشہ مزاحمت نہ کرے گی۔ وہ تو بشر ہے۔ تو بھی اس کے دن ایک سو بیس برس اور ہوں گے" لیکن اس مقام پر ایک سوال یہ ہے کہ کسی کو خدا کا بیٹا کہنا کس معنی سے ہے؟ اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا محبوب اور پیارا ہے اور وُہ اس سے ایسی محبت کرتا ہے جیسی باپ بیٹے سے تو اس لحاظ سے کہ گذشتہ انبیاء خدا کے بیٹے ہوئے کیونکہ وہ نیک چلن اور عابد و زاہد ہونے کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے محبوب تھے۔ اور نیز وُہ لوگ بھی خُدا کے بیٹے ہوئے۔ جن کے واسطے بسبب اُن کے حسنات کے خدا تعالیٰ درجاتِ عالیہ پر فائز کرے گا۔ بلکہ اس لحاظ سے کہ وہ عام بندوں پر حد سے زیادہ مہربان ہے الرحمٰن الرحیم۔ ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین۔ تو تمام بندے اس کے بیٹے ہیں۔ کیونکہ وہ انہیں اسی طرح پالتا ہے جیسے باپ بیٹے کو بلکہ اس سے بہتر۔ لہٰذا تخصیص شخصی کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اور اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ حضرت عیسیٰ چونکہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ اس وجہ سے وہ خدا کے بیٹے ہیں۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی باپ ان کے لئے ضرور تجویز کیا جانا چاہیئے۔ تو حضرت آدمؑ بطریقِ اولیٰ خدا کے بیٹے ہوئے اور حوّا خدا کی بیٹی کیونکہ ان کا بھی کوئی باپ ظاہر میں نہ تھا۔ تو خدا تعالیٰ ہی اُن کا بھی باپ ہُوا اور یہ اس کے فرزند حالانکہ کوئی بھی آدم و حوّا کو خدا کا بیٹا بیٹی نہیں کہتا۔ اور اگر مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص خدا کا بیٹا اس وجہ سے ہے کہ اس نے کسی عورت سے اُسی طرح صحبت کی ہے۔ جیسے مرد عورت سے اور نطفہ قرار پاکر بچہ پیدا ہُوا ہے تو پناہ بخدا اس قول سے اس لئے کہ اگر ایسا مان لیا جائے تو پھر خدا تعالیٰ کا حادث ہونا لازم آئے گا۔ کیونکہ صحبت کا واقع ہونا آلاتِ جماع پر موقوف ہے

اور نطفہ کا خارج ہونا اجزائے ترکیبیہ عنصریہ پر۔ پس اگر خدا تعالیٰ کے پاس آلات جماع ہیں۔ اور اُس کے لئے ایسا کوئی جسم ہے۔ جس میں اجزائے عنصریہ کو ترکیب حاصل ہوتی ہے تو وہ خاصہ مرکب ہُوا۔ اور جو چیز مُرکب ہے۔ وہ معدوم الاصل ہے۔ پس خدا تعالیٰ معدوم الاصل ہو گا۔ اور جب ایسا ہُوا تو کسی کا پیدا کیا ہُوا ہو گا۔ پھر تو وہ ذراے واجب الوجود و قدیم نہ ہو سکے گا۔ بلکہ جو اس کا پیدا کرنے والا ہے وہ خدا ہونے کے زیادہ قابل ہو گا۔ بشرطیکہ اُس میں بھی یہی عیب نہ ہو۔ وذالك مستحیل فی جناب کبریائہ تعالی اللّٰہ عن ذٰلك علوًا کبیرًا۔ نیز بنا بر مسئلہ تولید مثل کے کہ کسی درخت کے بیج سے وُہی درخت پیدا ہوتا ہے اور کسی نبات کی شاخ سے وہی نبات اُگتی ہے۔ کسی پرندے کے انڈوں سے ویسا ہی پرندہ پیدا ہوتا ہے اور کسی حیوان کے نطفہ سے ویسا ہی حیوان۔ اگر خدا تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہو۔ تو یقیناً جنس و نوع میں مغائر ہو گا۔ کیونکہ وہ واجب الوجود اور قدیم ہے اور اس کے نورِ چشم ممکن الوجود اور حادث ہوں گے پس قاعدہ تولید مثل برہم ہو جائے گا۔

اور چونکہ یہ بات بالکل ناممکن۔ بلکہ بے معنی تھی کہ خدا تعالیٰ کے لئے کوئی جورو یا بچہ ہو۔ اس لئے قرآن مجید میں اکثر مقام پر اس کی نفی فرمائی ہے۔ سورہ نساء میں فرماتا ہے۔ اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَہٗٓ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ بس اللہ تو ایک ہی معبود برحق ہے۔ پاک ہے اس سے کہ اس کے کوئی بیٹا ہو (البتہ یہ بات ضرور ہے کہ) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ سب اسی کی (پیدا کی ہوئی) ہے۔

اور سورہ مائدہ میں فرمایا۔ لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ قُلْ فَمَنْ یَّمْلِكُ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّھْلِكَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّہٗ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَلِلّٰہِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ اس آیت شریفہ میں خدا تعالیٰ نے اُن نصرانیوں کی رد فرمائی ہے جو اس سے متجاوز ہو کر کہ عیسیٰ

کو خدا کا بیٹا کہیں۔ یعنی خدا تعالیٰ کہنے لگے تھے چنانچہ شہرستانی نے ملل ونحل میں لکھا ہے وقالت الملکانیۃ المسیح ناسوت کلی لاجزئی وھو قدیم ازلی من قدیم ازلی ولقد ولدت مریم الٰھًا ازلیًا الخ فرقہ ملکانیہ قائل ہے کہ مسیح ناسوت کلی تھے۔ ناسوت جزئی نہ تھے اور قدیم ازلی تھے۔ قدیم ازلی سے پیدا ہوئے تھے اور مریم نے خدائے ازلی کو جنا تھا" (صـ۶۲ ج ۲)۔

تو خدا تعالیٰ اُن کی رد میں فرماتا ہے کہ کافر ہو گئے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ مسیح خدا ہے۔ اے رسول کہہ دو کہ کون اس بات پر قادر ہے کہ مسیح کو مرنے نہ دے۔ اگر اللہ چاہے کہ اُن کو مار ڈالے اور نیز اُن کی ماں کو بھی اور تمام ان لوگوں کو بھی جو روئے زمین پر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مسیح خدا ہوتے تو کیونکر مر سکتے اور کیوں نہ اپنے نفس سے اس ہلاکت کو دفع کر سکتے۔ حالانکہ ان میں نہ کسی اور میں یہ طاقت ہے کہ اپنے مرنے کو اور قضائے الٰہی کو روک سکے۔ وللّٰہ الخ یعنی اور خدا ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین اور ما بینہما کا ملک جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے نہ کوئی اور۔ تو جس طرح تمام زمین اور آسمان اور اُن کے درمیان کی چیزیں مملوک خدا ہیں۔ اسی طرح مسیح بن مریم بھی مملوک خدا ہیں نہ یہ کہ خود وہ خدا ہو۔

اسی مطلب کو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ادا فرمایا ہے۔ لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلثۃ ۔ کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تین میں کا تیسرا ہے۔ یعنی تین خداؤں میں کا ایک خدا ہے۔ اور وہ تین یہ ہیں ۱۔ خود خدا تعالیٰ ۲۔ روح القدس ۳۔ عیسیٰ مسیح ۔ جنہیں اقانیم ثلثہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور تینوں کو قدیم ازلی جانتے ہیں۔ غالباً یہ یعقوبیہ فرقہ عیسوی کا اعتقاد ہے۔ جو اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ ذات مسیح سے متحد ہو گیا اور دونوں مل کر ایک ہو گئے۔ پس ناسوت لاہوت بن گیا اور لاہوت ناسوت ہو گیا۔ وما من الٰہ الا الٰہ واحد حالانکہ ایک معبود کے سوا دوسرا کوئی معبود نہیں ہے۔ وان لم ینتھوا عما یقولون لیمسن الذین کفروا منھم عذاب الیم۔ اور اگر اپنے اس قول سے

باز نہ آئے تو یہ عیسائی جو اس قول کے قائل ہیں اور اس کی وجہ سے کافر ہو گئے ہیں۔ عذاب دردناک میں مبتلا ہو گئے۔

پھر اسی سورہ میں اُن کی رد میں جو کہتے تھے کہ ہم بھی خدا کے بیٹے ہیں۔ فرماتا ہے۔ وقالت الیھود والنصاریٰ نحن ابناء اللّٰہ واحباءہ قل فلم یعذبکم بذنوبکم بل انتم بشر ممن خلق یغفر لمن یشآء ویعذب من یشآء۔ یہود ونصاریٰ نے کہا کہ ہم خُدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔ اے رسول کہہ دو کہ پھر کیوں تم پر خدا تعالیٰ تمہارے گناہوں کے سبب سے عذاب کرے گا۔ کیا کوئی باپ بیٹے پر یا کوئی دوست اپنے دوست پر بھی عذاب کرتا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ تم کو کافر بتاتا ہے اور تم پر ضرور عذاب کرے گا (اور اگر یعذبکم کے معنی عذبکم کے ہوں) تو یہ مطلب ہو گا کہ اگر تم خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہو تو پھر تم کو گوسالہ پرستی کے عوض میں کیوں معذب کیا اور تمہاری بدافعالیوں کی وجہ سے تم کو بندر اور سور کی صورت میں کیوں مسخ کر دیا۔ کیا کوئی باپ اپنے بیٹے پر یا دوست اپنے دوست پر اس طرح کا بھی عذاب کرتا ہے۔ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ الخ بلکہ تم بھی منجملہ اور مخلوق آدمیوں کے آدمی ہی ہو۔ نہ کہ خدا کے بیٹے یا دوست ہو۔ اللہ جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے معذب کرتا ہے (جب کہ اس میں بخشے جانے یا عذاب کئے جانے کے قابل افعال دیکھتا ہے!!)۔

سورہ یونس میں فرماتا ہے۔ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ ھُوَ الْغَنِیُّ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنْ عِنْدَکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِھٰذَا اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ ان لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے تو بیٹا اختیار کیا (یعنی اپنا ایک بیٹا پیدا کیا) پاک ہے وُہ اس سے جو یہ ناسمجھ لوگ کہتے ہیں اُسے کیا ضرورت ہے بیٹا پیدا کرنے کی کیا اُسے یہ ڈر ہے کہ اگر میرا کوئی بیٹا نہ ہو گا تو میری نسل قطع ہو جائے گی یا اسے یہ ضرورت ہے کہ بیٹا ہو گا تو ضعیفی کا سہارا ہو گا۔ یا کمزوری کے وقت مدد دے گا یا کسب معاش کر کے روزی بہم پہنچائے گا۔

یہ تو کچھ ضرورت ہے ہی نہیں۔ بلکہ وہ ان سب باتوں سے مستغنی ہے۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے خواہ وہ ملائکہ ہوں یا ستارے ہوں یا آفتاب و ماہتاب ہوں سب اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور نیز جو کچھ زمین میں ہے خواہ نباتات ہوں یا جمادات ہوں یا حیوانات۔ اے کفار تم جو خدا کے لئے بیٹا تجویز کرتے ہو۔ کیا تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل ہے؟ کیا تم لوگ خدا پر اس بات کی تہمت لگاتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں؟

سورہ اسرے میں فرمایا۔ اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا۔ یہ آیت رد میں ان لوگوں کے ہے جو کہتے تھے کہ فرشتے خدا تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور ہم انہیں کی عبادت کرتے ہیں تا کہ وہ ہماری سفارش خدا کے نزدیک کریں۔ تو پروردگار عالم فرماتا ہے کہ کیا تم کو تو پروردگار نے بیٹے دیئے ہیں اور فرشتوں کو اپنی بیٹیاں بنایا ہے۔ بے شک تم بڑی بات کہتے ہو۔ جو کہنے کے قابل نہیں ہے۔

سورہ کہف میں فرماتا ہے۔ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب اس لئے نازل فرمائی ہے کہ ڈرائے ان لوگوں کو یعنی قریش کو جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹے اختیار کئے یعنی فرشتے اس کی بیٹیاں ہیں۔ یا وہ یہود و نصاریٰ جو اپنے تئیں خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ یا عزیر اور مسیح کو خدا کا بیٹا بتاتے ہیں۔ ان لوگوں کو اس بات کا علم نہیں ہے اور نہ اُن کے باپ دادا اُسے جانتے تھے کہ خدا کی اولاد ہے یا نہیں۔ بلکہ محض ظن و تخمین سے یہ تجویز صحیح مان لی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب اولاد ہے۔ بڑی بات اُن کے منہ سے نکلی۔ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں جھوٹ ہی کہتے ہیں۔ یعنی اس معاملے میں اُن کی گفتگو محض جھوٹ ہے۔

سورہ مریم مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا

فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ " کیا ہے اللہ کے لئے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے وہ اس سے پاک ومنزہ ہے کہ اس کی اولاد ہو۔ کیونکہ اس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور نہ اس کے لئے کوئی جسم ہے۔ جس میں آلات جماع ہوں۔ اور نہ اس میں خواہش نفسانی ہے جسے پورا کرنے کی اسے ضرورت ہو۔ (بلکہ) جس وقت وُہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے پس اتنا ہی ہوتا ہے کہ اسے کہہ دے کہ ہو جا پس ہو جاتا ہے۔ نہ یہ کہ اُن آلات کی اُسے ضرورت پڑتی ہو۔ جو بچہ پیدا ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ تو کیوں کر اُس کو کوئی بیٹا اصطلاحی ہو گا۔ (ہاں ان معنوں سے تو سب اس کے فرزند ہیں کہ اُن کا رازق ومنعم ہے اور اُن پر ایسی مہربانی فرماتا ہے جیسی باپ بیٹے پر)۔

نیز فرماتا ہے۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْئًا اِدًّا۔ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْہُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ ھَدًّا۔ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا۔ وَمَا یَنْبَغِیْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا۔ اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا۔ یہودیوں۔ عیسائیوں اور مشرکین عرب نے یہ کہہ دیا کہ عزیر خُدا کا بیٹا ہے۔ مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ بڑے رحم والے خدا نے اپنے لئے اولاد اختیار کی ہے (اے محمد ان سے کہو کہ) بے شک تم نے نہایت نامناسب منکر اور شنیع بات کہی۔ جس سے قریب ہے آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں۔ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے خدا کے لئے اولاد تجویز کی۔ بڑے رحم والے خدا کو سزاوار نہیں ہے یعنی یہ اس کی صفت نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے اولاد اختیار کرے (بلکہ) تمام وُہ مخلوقات جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس کے سامنے بندے ہی ہو کر آئیں گے۔ خواہ آدمی ہوں یا جن ہوں یا فرشتے۔ کوئی ان میں سے اس کا بیٹا یا اس کی بیٹی نہیں ہے!!

سورہ انبیاء میں فرمایا ہے۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ۔ لَا یَسْبِقُوْنَہٗ بِالْقَوْلِ وَھُمْ بِاَمْرِہٖ یَعْمَلُوْنَ۔ ان

مشرکوں نے کہہ دیا ہے کہ رحمان (خداوند کریم) نے (فرشتوں کو) اپنی اولاد بنایا ہے (ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ) وہ پاک و مقدس ہے (کسی کو بیٹا یا بیٹی بنانے سے) بلکہ وہ فرشتے تو باعزت بندے ہیں۔ جیسے آدمی اور جن وغیرہ۔ نہیں سبقت کرتے ہیں اُس سے بات میں یعنی نہیں کہتے مگر وہی بات جو خدا تعالیٰ اُن سے کہتا ہے۔ اور نہیں کلام کرتے مگر وہی جوان کو حکم ملتا ہے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ فرزند ہونے اور بندہ ہونے میں فرق ہے۔ فرزند ہونے کی تو صرف دو صورتیں ہیں۔ ۱۔ یا تو بذریعہ توالد تناسل کے ہوگا۔ یعنی نطفہ کو رحم میں داخل کرنا اور اس سے بچہ ہونا۔ تو یہ بات اللہ تعالیٰ کی جناب میں بالکل ناممکن ہے۔ کیونکہ توالد و تناسل کے واسطے جسمیت لازم ہے۔ اور وہ جسم و جسمانیات سے منزہ و مقدس ہے۔ ورنہ اس کا حدوث لازم آئے گا۔ جو محال ہے۔ ۲۔ اور یا بذریعہ تبنیہ کے ہوگا یعنی منہ بولا بیٹا بنانا جس کی ضرورت اس وجہ سے پڑتی ہے کہ کسی کے اولاد نہ ہو۔ اور وہ کسی کے بچے کو لے کر پرورش کرلے اور اسے بیٹا بنائے یہ بھی باری تعالیٰ کی جناب میں محال ہے کیونکہ اُسے مرنے کا ڈر نہیں کہ یہ فرضی بیٹا اس کی قائم مقامی کرے گا اور نہ اس میں کمزوری ہے کہ کسی وقت یہ اس کی مدد کرے گا اور نہ اس کو اپنے ملک و جائداد کے تلف ہو جانے کا ڈر ہے۔ جسے یہ فرزند اس کے بعد سنبھالے گا۔ بلکہ وہ ان تمام باتوں سے مستغنی ہے۔ پس اس کے لئے بیٹے یا بیٹی کا ہونا بھی ناممکن ہے۔ اور بندہ مخلوق ہونے میں کسی کے اس کے لئے کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔ جیسے خصوصیت و محبت کی وجہ سے کسی کا دوست ہونا جیسا کہ حضرت ابراہیم کو خلیل اللہ کا خطاب دیا۔ یا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حبیب اللہ کا خطاب مرحمت فرمایا اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور نہ کوئی استحالہ عقلی اس پر لازم آتا ہے۔

سورہ صٰفّٰت میں ارشاد فرمایا ہے۔ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ۔ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ۔ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ

اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ - وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ - اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ - مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ - اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ - اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ - فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ - وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ط وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ - پس اے رسول ان مشرکین عرب سے پوچھو کہ کیا میرے پروردگار کے تو بیٹیاں ہیں اور ان مشرکین کے لئے بیٹے ہیں۔ آخر کیوں کر انہوں نے یہ بات کہی کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ کیا ہم نے فرشتوں کو مونث (عورتوں کی علامتوں والی) پیدا کیا۔ اور یہ مشرکین دیکھ رہے تھے اور وہاں موجود تھے۔ (یعنی ان کو کس طرح علم ہو گیا کہ فرشتے مونث ہیں۔ کیا پیدا ہوتے وقت یہ لوگ وہاں موجود تھے اور اُن کی علامات انوثہ کو دیکھا ہے مانا بے شک یہ لوگ (مشرکین عرب) اپنے جھوٹ کی وجہ سے کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کے اولاد ہے (یا وُہ جنا ہے۔ اُس سے بچے لڑکے یا لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں۔) اور بے شک یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹوں پہ بیٹیوں کو ترجیح دی ہے اس لئے اپنے واسطے بیٹیاں پیدا کیں (اے مشرکو) کیا ہو گیا ہے۔ تم کو کیوں کر یہ حکم لگاتے ہو کہ اللہ تعالیٰ صاحب اولاد ہے) کیا تم نصیحت حاصل کرو گے؟ کیا تمہارے پاس کوئی واضح دلیل ہے؟ تو لاؤ اپنی کتاب اگر تم سچ کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے اور ان کافروں نے (فرشتے تو فرشتے) جنوں اور خدا تعالیٰ کے درمیان بھی رشتہ قرار دے دیا ہے یعنی کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اور ابلیس بھائی بھائی ہیں یا یہ کہ جنات کی عورتوں سے خدا تعالیٰ نے بیاہ کر لیا تھا۔ اُن سے فرشتے ہوئے یا یہ کہ جن بھی خدا تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں (باختلاف اقوال) حالانکہ جن اس امر کو جانتے ہیں کہ وہ بھی (قیامت کے دن) خدا تعالیٰ کے حضور میں حاضر کئے جائیں گے اور اُن سے بھی نیک و بد اعمال کی پرسش کی جائے گی۔ اور ان کو بھی سزا و جزا دی جائے گی۔ یا یہ کہ جن بھی اس امر کو جانتے ہیں کہ یہ مشرکین اپنے اس قول کی وجہ سے

جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ کیوں کہ جن کو وہ خدا تعالیٰ کی اولاد کہتے ہیں۔ وہ تو بندے ہیں نہ کہ اولاد!!۔

اور سورہ زمر میں فرمایا ہے۔ لَوْ اَرَادَ اللّٰہُ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰی مِمَّا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ سُبْحٰنَہٗ ھُوَ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ۔ اگر ارادہ کرتا اللہ کہ کسی کو بیٹا یا بیٹی بنائے۔ تو اپنی مخلوقات میں سے جسے چاہتا منتخب کر لیتا۔ اس کی کیا تخصیص ہے کہ جن یا فرشتوں ہی کو اپنی اولاد قرار دیا۔ پاک ہے وہ (اس سے کہ وہ اپنا فرزند پسری یا دختری بنائے) وہی معبود برحق یکتا ہے غالب ہے"۔

اور سورہ زخرف میں فرمایا ہے۔ وَجَعَلُوْا لَہٗ مِنْ عِبَادِہٖ جُزْءًا۔ اور ان مشرکین نے کہا کہ بعض اس (معبود برحق) کے بندے اس کے جزء ہیں۔ یعنی اولاد ہیں جیسے فرشتے یا جن۔ ان الانسان لکفور۔ بے شک آدمی ناشکرا ہے (کچھ بھی خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتا اور کفر و شرک کی باتیں کئے جاتا ہے)

ام اتخذ مما یخلق بنات و اصفاکم بالبنین۔ کیا اس نے تو اپنی مخلوقات میں سے اپنے لئے بیٹیاں اختیار کی ہیں اور تمہیں بیٹے دے دیئے ہیں (ہرگز ایسا نہیں ہے۔) واذا بشر احدھم بما ضرب للرحمٰن مثلاً ظل وجھہ مسودًا و ھو کظیم۔ یعنی خود ان کی تو یہ حالت ہے کہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی بشارت دی جاتی ہے جس کی مثل یہ لوگ خدا کو دیتے ہیں۔ تو اس کا منہ مارے غصے کے سیاہ ہو جاتا ہے۔

عرب ایک زمانہ دراز تک بیٹیوں کے نام سے چڑتے تھے۔ بلکہ زندہ لڑکیوں کو زمین میں دفن کر دیا کرتے اور اگر کوئی یہ کہہ دیتا کہ تمہارے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو مارے غصے کے چہرہ تمتما جاتا تھا تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اپنی تو یہ حالت کہ بیٹیوں کا نام سنتے ہی جل جاتے ہو اور خدا تعالیٰ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہو؟ یہ کیسا انصاف ہے اور کیا عقل ہے؟

نیز فرمایا ہے"قُلْ اِنْ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ۔ کہہ

دو اے رسول کہ اگر خدا تعالیٰ کے کوئی بیٹا ہوتا تو میں پہلا وہ شخص ہوتا۔ جو اس کی عبادت سے نفرت کرتا۔ حالاں کہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں اور اس کا موحد ہوں جس سے معلوم ہوا کہ اُس کا کوئی فرزند نہیں ہے اور یہ بھی معنی بیان کئے گئے ہیں کہ اگر خدا کا کوئی فرزند ہوتا تو۔ میں پہلا وہ شخص ہوتا جو اس فرزند کی عبادت کرتا حالاں کہ سوائے خدائے واحد و یکتا کے میں کسی کی پرستش نہیں کرتا۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس کا کوئی فرزند نہیں ہے اور یہ بھی معنی بیان کئے گئے ہیں کہ ان بمعنی ماۓ نافیہ ہے یعنی نہیں ہے خدا تعالیٰ کا کوئی فرزند۔ پس میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں اور اُسی معبود یکتا کی عبادت کرتا ہوں جس کا کوئی فرزند نہیں۔

اسی آیت کے تتمہ میں فرمایا ہے۔ سبحان رب السموٰت والارض رب العرش عما یصفون۔ پاک ہے آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ اُس امر سے جو یہ مشرکین بیان کرتے ہیں۔ یعنی اولاد سے منزہ و مقدس ہے۔ اُس کے لئے اولاد کا ہونا محال عقلی ہے۔

سورہ طور میں فرمایا۔ اَمْ لَہُ الْبَنَاتُ وَلَکُمُ الْبَنُوْنَ۔ کیا اس کے تو بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے بیٹے ہیں؟ یہ کیسی تقسیم تم نے سوچی۔ اور یہ کیا مہمل بات تم نے کہہ دی۔ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ (ہرگز نہیں)

سورہ نجم میں فرمایا اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَہُ الْاُنْثٰی۔ تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی۔ کیا تمہارے لئے تو لڑکے ہیں۔ اور اُس (معبود) کے لئے لڑکیاں ہیں؟ (جو تم فرشتوں کو اس کی بیٹیاں کہتے ہو۔) یہ تو اس وقت تقسیم ناجائز و غیر صحیح ہے کہ اپنے لئے تو بیٹے پسند کرو اور خدا تعالیٰ کی نسبت کہو کہ اس کی بیٹیاں ہیں۔

اور سورہ جن میں۔ جن کی زبانی فرمایا ہے۔ وَاَنَّہٗ تَعَالٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَۃً وَّلَا وَلَدًا۔ اور بے شک جلال ہمارے پروردگار کا برتر اور ارفع ہے۔ اُس نے نہ اپنے لئے کوئی جورو قرار دی ہے اور نہ فرزند۔ کیونکہ جورو کی احتیاج اُسے ہوتی ہے۔ جسے خواہش نفسانی ہو۔ اور مادہ منویہ گدگدی پیدا کرتا ہو۔ جس

کے دفع کی ضرورت پڑے اور وہاں (یعنی خدا تعالیٰ کے لیے) نہ جسم ہے نہ خواہش نفسانی اور نہ اُسے کسی ایسی چیز کی احتیاج ہے۔ لہذا اس کے لئے بیوی کہاں ہوسکتی ہے اور جب بیوی نہ ہوئی تو بیٹا بیٹی کس کے پیدا ہوں گے۔ پس بمعنی معروف عام اس کے لئے فرزند کی تجویز سفاہت و حماقت ہے۔

پانچواں باب

ذاتِ خدا تعالیٰ کے بارے میں غور کرنا کچھ مفید نہیں

مطلب اس کا یہ ہے کہ اس امر میں غور کرنا کہ خدا تعالیٰ کیا چیز ہے۔ کس طرح کا۔ کس کیفیت کا ہے۔ کب سے ہے۔ کب تک رہے گا۔ کہاں ہے۔ کس جگہ ہے۔ بالکل بیکار اور غیر مفید بات ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عالم میں جتنی چیزیں از قسم موجودات پائی جاتی ہیں۔ خواہ وہ علوی ہوں یا سفلی۔ نورانی ہوں یا ظلمانی جسمانی ہوں یا روحانی۔ جنسی ہوں یا نوعی۔ فردی ہوں یا شخصی۔ جوہر ہوں یا عرضی۔ غرض بالائے آسمان سے لے کر زیر زمین تک جتنی چیزیں موجود ہیں۔ وہ سب کی سب مخلوق باری تعالیٰ ہیں تو لامحالہ وہ خود ان سب سے علیحدہ اور غیر قسم کا ہوگا۔ کیوں کہ یہ سب چیزیں حادث ہیں۔ اور خود وہ واجب الوجود ہے اور ممکن نہیں کہ دونوں قسموں میں کسی طرح کی باہم شباہت ہو۔ پس جتنے اوصاف اور حالات ان ممکنات کے لئے لازم یا عرضی مفارق ہیں۔ وہ ہرگز اس کی ذات میں نہ پائے جاتے ہوں گے۔ یہ تمام ممکنات اپنے وجود خاص میں محتاج مکان و حیز ہیں۔ تو لامحالہ اس کے لئے کوئی مکان نہ ہوگا۔ پس یہ کہنا کہ وہ کہاں ہیں کیا معنی رکھتا ہے یا یہ کہ تمام ممکنات لازم التشکل ہیں تو لامحالہ وہ اُن سے مغائر ہونے کے سبب سے کوئی شکل وصورت نہ رکھتا ہوگا۔ پس یہ کہنا کہ وہ کس شکل کا ہے کیا معنی رکھتا ہے۔ یا یہ کہ تمام ممکنات ایک خاص زمانے سے وجود میں آئی ہیں تو ان کو کہا جا سکتا ہے کہ فلاں وقت سے موجود ہیں۔ پس لامحالہ خالق الکل کے واسطے کوئی زمانہ ابتدائے وجود نہ ہوگا۔ ورنہ وہ بھی مثل ان کے حادث ہوگا۔ یا یہ کہ جتنے ممکنات ہیں ان میں کوئی نہ کوئی کیفیت ضرور پائی جاتی ہے اور کوئی نہ کوئی عرض ان

میں ضرور موجود ہوگا۔ مثلاً نرمی سختی۔ گرمی سردی۔ ثقل و خفت۔ رنگ و بو۔ این و وضع وغیرہ وغیرہ۔ پس لامحالہ اُس میں یہ اعراض قائم نہ ہوں گے۔ ورنہ وہ محل حوادث ہوگا۔ اور پھر حادث ٹھیرے گا۔ حالانکہ وہ واجب الوجود ہے۔ ہم جو کسی موجود چیز کی حقیقت معلوم کرتے ہیں تو ہمارے پاس اس کے معلوم کرنے کے صرف چھ آلے ہیں۔ یا مس کرکے معلوم کریں گے۔ تو لازم ہے کہ وہ جسم ہو۔ حالاں کہ خدا تعالیٰ جسم نہیں پس مس کیوں کر ہو سکے گا۔ یا سونگھ کر معلوم کریں گے۔ تو لازم ہے کہ وہ خوشبو یا بدبو ہو حالاں کہ خدا تعالیٰ کوئی عرض نہیں۔ خوشبو اور بدبو اعراض میں ہے۔ جو اپنے وجود میں غیر کے محتاج ہیں۔ جس میں اُن کا قیام ہو۔ یا چکھ کر معلوم کریں گے۔ تو ضرور ہے۔ وہ ذائقہ دار چیز ہو۔ حالاں کہ خدا تعالیٰ کوئی کھانے یا پینے کی چیز نہیں۔ جیسے چکھ کر معلوم کیا جا سکے۔ یا دیکھ کر معلوم کریں گے۔ تو لازم ہے کہ اس میں رنگ ہو۔ کیونکہ بغیر رنگ کے کوئی چیز دکھائی نہیں دے سکتی۔ حالاں کہ خدا تعالیٰ کے لئے جسم نہیں۔ جس میں رنگ قائم ہو۔ ورنہ لازم آئے گا کہ وہ مرکب ہے اور پھر حادث ہو۔ یا سن کر معلوم کریں گے۔ تو ضرور ہے وہ آواز ہو حالانکہ خدا تعالیٰ میں آواز کا نام نہیں ہے۔ کیونکہ آواز ایک حادث شے ہے۔ جو ہوا کے تصادم و دو جسموں کے تصاک سے پیدا ہوتی ہے۔ جب ان پانچوں حواس سے اس کا محسوس ہونا ناممکن ہے۔ تو اس کی حقیقت کوئی شخص کس ذریعے سے معلوم کر سکتا ہے۔ رہی قوت ممیزہ وہ صرف اسی وقت کام کرتی ہے۔ جب کہ کوئی شے ان حواس خمسہ ظاہریہ کے ذریعے سے بطور مادہ یا صورت یا اثر کے اس تک پہنچتی ہے۔ پس چونکہ حواس ظاہرہ آج تک خدا تعالیٰ کا مادہ اور نہ صورت معلوم کر سکے۔ لہٰذا اس کی حقیقت کا معلوم ہونا قوت مفکرہ سے بھی ناممکن ہے۔ باقی رہا اثر سے موثر کا پتہ چلانا سو وہ بحمدللہ ہم کو اور نیز ہر با عقل و تمیز شخص کو معلوم ہے۔ دیکھتے ہیں کہ اس کے آثار قوت کروڑ در کروڑ عالم میں موجود ہیں۔ اس وجہ سے ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ان کا موثر ضرور ہے اور وہی خالق الکل اور مبدع الکل ہے۔ مگر اتنا

جاننے سے اس کی حقیقت تک پہنچ جانا ناممکن ہے اس وجہ سے سخت حماقت ہے کہ اس کی ذات کے معاملہ میں غور کیا جائے بلکہ صرف ہم کو اس قدر معلوم کر لینا کافی ہے کہ وہ ایک ذات واجب الوجود و قدیم ازلی ہے۔ جو خالق کل موجوداتِ ممکنہ ہے اور اس میں وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں۔ جو بحیثیت کمال لازم ہوتی ہیں۔ مگر یہ کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے؟ اس میں غور کرنا نہ مفید ہے اور نہ اس سے اس کی حقیقت کا معلوم ہونا امکان بشری میں ہے۔

اسی مطلب کو خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب مجید میں ظاہر فرمایا ہے۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ۔ (سورہ زمر رکوع ۷) نہیں عظمت کی ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جو حق عظمت ہے۔ کیونکہ اس کے لئے ایسے اوصاف بیان کئے جو اس کی شانِ عظیم کے لئے زیبا نہیں ہیں۔ کسی نے تو کہہ دیا کہ وہ اولاد والا ہے۔ کسی نے کہہ دیا اس کے لئے جسم ہے۔ کسی نے کہا وہ بخیل ہے۔ کسی نے کہا وہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ وہ عرش پر بیٹھا ہے۔ کسی نے اس کے لئے شرکا ہی تجویز کر دیئے۔ جن کی یہ عبادت کرتے ہیں۔ کسی نے کچھ کہا۔ اور کسی نے کچھ، غرض حق تعظیم خدا تعالیٰ کسی نے ادا نہ کیا!! اور وجہ اس کی صرف یہی ہے کہ اس کو پہچان تو سکے نہیں، لہذا تخمین و ظن سے جو جی میں آیا وہی اس کے لئے تجویز کر دیا۔ جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ان اللہ لا یوصف وکیف یوصف وقد قال فی کتابہ وما قدروا اللہ حق قدرہ فلا یوصف بقدرہ الا کان اعظم من ذٰلک۔

بے شک خدا تعالیٰ کا وصف حقیقی بیان نہیں ہو سکتا اور کیوں کر بیان ہو سکے، حالاں کہ اس نے خود اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ ما قدروا اللہ حق قدرہ پس جس قدر و انداز سے اس کا وصف بیان کیا جائے گا، یقیناً وہ اس سے اعظم و برتر ہوگا! کیونکہ ہم جو بیان کر سکیں گے وہ محسوسات ہی سے قیاس کر کے کہہ سکیں گے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ تمام محسوسات اور ان کے اوصاف

سے بالا تر ہے۔ (تفسیر صافی)

توحید بحار میں مروی ہے کہ جناب امیرالمومنین علیہ السلام سے کسی نے اس معاملہ میں عرض کی تھی تو آپ نے ایک خطبہ فرما کر یہ ارشاد فرمایا کہ علیک یا عبد اللہ بما دلک علیہ القرآن من صفتہ وتقدمک فیہ الرسول من معرفتہ فاتم بہ استضئ بنور ھدایتہ فانما ھی نعمۃ وحکمۃ اوتیتھا فخذ ما اوتیت وکن من الشاکرین۔ اے بندہ خدا تجھ کو اسی قدر اوصاف خدا تعالیٰ کا جاننا لازم ہے جس قدر قرآن نے تجھ کو بتایا ہے اور اس سے پہلے رسول نے اس کی معرفت کے معاملہ میں ارشاد فرما دیا ہے۔ پس تو اسی کی اقتدا کر اور اسی کے نور ہدایت سے روشنی حاصل کر بس یہی نعمت و حکمت ہے جو تجھے دی گئی ہے بس لے جو تجھے دیا گیا ہے اور شکر کر۔ کیونکہ اگر قرآن کے بیانات اور رسول کے ارشادات سے زیادہ تو غور و خوض کرنا چاہے گا۔ تو بالکل لا حاصل ثابت ہوگا۔ جب کہ خود رسول خدا سے مروی ہے کہ ما عرفناک حق معرفتک (اے معبود جو تیرا حق معرفت ہے ویسی معرفت اور شناخت تو مجھ کو حاصل نہیں ہوئی) تو دوسرا کوئی کیا جان سکتا ہے اور اس کی حقیقت کو کیا پہچان سکتا ہے۔ تمام انبیأ اور بڑے بڑے فلاسفر جو عموماً توحید خدا تعالیٰ کے قائل تھے۔ سوائے چند مجنون سائنٹفک فلسفیوں کے جو غرور ہمہ دانی ہی کی وجہ سے محض نادان ثابت ہوئے) سب اس معاملہ میں ساکت رہے۔ اتنا سب نے بتایا کہ وہ قدیم ہے ازلی ہے۔ حکیم ہے۔ قادر ہے عالم ہے۔ خبیر ہے مدرک ہے۔ حی ہے۔ متکلم ہے اور تمام ممکنات کے اوصاف سے بالا تر ہے لیکن یہ کہ وہ کیا چیز ہے کوئی نہ بتا سکا۔ تو تو بے چارہ اس میں غور کر کے کیا پا سکتا ہے۔ زیادہ بریں نیست کہ جب تیری سمجھ میں اس کی حقیقت نہ آئے گی۔ تو اصل ہی کا انکار کر دے گا اور کافر ہو جائے گا) پھر آپ فرماتے ہیں۔ وما کلفک الشیطان علمہ مما لیس علیک فی الکتاب فرضہ ولا فی سنۃ الرسول والائمۃ الھداۃ اثرہ فکل علمہ الی اللہ ولا تقدہ

علیہ عظمۃ اللہ۔ اور جس امر کے جاننے کی تکلیف شیطان نے تجھ کو دی ہے یعنی تجھے یہ کہا ہے کہ خدا تعالیٰ کی حقیقت معلوم کر) جو نہ تجھ پر کتاب خدا کے ذریعہ سے فرض ہے اور نہ حدیث رسولؐ اور احادیث ائمہ ہداۃ میں اس کا اثر ہے۔ تو اس کا علم خدا ہی کے حوالہ کر دو اور اس کے معلوم کرنے کے درپے نہ ہو) اور (جان لے کہ) اس پر اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا" نیز توحید بحار میں جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے سلیمان بن خالد کہتے ہیں کہ ابو عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا اِیاکُم وا لتفکر فی اللہ فان التفکر فی اللہ لایزید الا تیھا۔ ان اللہ تبارک و تعالیٰ لا تدرکہ الابصار ولا یوصف بمقدار" یعنی ڈرو تم لوگ ذات خدا تعالیٰ میں غور و خوض کرنے سے کیونکہ خدا تعالیٰ کے معاملہ میں فکر کرنا سوائے حیرانی و سرگردانی کے اور کچھ زیادہ نہیں کرتا۔ بے شک کہ خداوند تبارک و تعالیٰ کو نہ آنکھیں محسوس کر سکتی ہیں اور نہ کسی مقدار و اندازے سے اس کا وصف بیان کیا جا سکتا ہے (تو کیونکر اس کی حقیقت کسی کو معلوم ہو سکتی ہے)

ہشام سے مروی ہے کہ جناب صادق علیہ السلام سے ایک زندیق (منکر وجود خداوند تعالیٰ) نے سوال کیا کہ ان اللہ تعالیٰ ما ھو۔ خدا تعالیٰ کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا ھو شیئٌ بخلاف الاشیاء۔ وہ بخلاف تمام چیزوں کے ایک شئے ہے (یعنی اس کے مثل کوئی شے نہیں) ارجع بقولی شیٌ الی انہ شیٌ بحقیقۃ الشیئیۃ غیر انہ لا جسم ولا صورۃ ولا یحس ولا یجس ولا یدرک بالحواس الخمس لا تدرکہ الاوھام ولا تنقصہ الدھور ولا تغیرہ الازمان۔ اور میرا مطلب شے سے یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ایک شے ہے۔ جس کے لئے وجود اور شیئیۃ فی حد ذاتہ ثابت ہے۔ البتہ یہ بات ہے کہ نہ تو وہ جسم ہے نہ صورت ہے نہ محسوس ہو سکتا ہے اور نہ ٹٹول کر دریافت کیا جا سکتا ہے اور نہ حواس خمسہ سے ادراک کیا جا سکتا ہے۔ وہم و خیال اسے معلوم نہیں کر سکتے (کیونکہ ان میں اتنی طاقت ہی نہیں) اور نہ دہر اسے گھٹا سکتے اور نہ زمانے اس میں تغیر پیدا کر سکتے

(کیونکہ جتنی چیزیں عالم کی زمانے کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہیں۔ وہ سب حادث ہیں۔ اور پروردگار عالم حدوث سے بری ہے۔ پس کیوں کر اس کی ذات میں تغیر کو دخل ہو گا)۔

نیز توحید بحار میں سہل سے مروی ہے کہ میں نے ابو محمد علیہ السلام کی خدمت میں ۲۵۵ھ میں ایک عریضہ لکھا کہ اے میرے سید ہمارے اصحاب معاملہ توحید میں اختلاف رکھتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ جسم ہے کوئی کہتا ہے وہ صورت ہے پس آپ کی رائے ہو کہ اس معاملہ میں کچھ تعلیم فرمادیں۔ جس سے مجھ کو واقفیت ہو جائے۔ (معاملہ توحید میں) اور میں اس سے تجاوز نہ کروں۔ تو اپنے بندہ پر کرم کر کے ضرور ایسا فرمائیے تو آپ نے اپنے دستخط خاص سے یہ تحریر فرمایا کہ سألت عن التوحید وھذا عنکم معزول اللہ تبارک وتعالیٰ واحدٌ اَحَدٌ صمدٌ لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احدٌ۔ خالق لیس بمخلوق یخلق تبارک وتعالیٰ مایشاء من الاجسام وغیر ذالک ویصوّر مایشاء ولیس بمصور جل ثنائہ وتقدست اسمائہ وتعالیٰ ان یکون لہ شبہ ھو لاغیرہ۔ لیس کمثلہ شیءٌ وھو السمیع العلیم۔ تو نے توحید کے معاملہ میں سوال کیا حالاں کہ یہ بات تم لوگوں سے اٹھالی گئی ہے یعنی اس قسم کے سوال کی تم کو تکلیف نہیں دی گئی ہے۔ اللہ ایک ہے یکتا ہے بے نیاز ہے نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔ خالق ہے مخلوق نہیں ہے۔ جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ خواہ جسم والی چیز ہو یا بے جسم۔ جس قسم کی چاہتا ہے صورت بناتا ہے اس کی کسی نے صورت نہیں بنائی۔ اس کی تعریفیں بزرگ ہیں اور اس کے نام مقدس ہیں اور اس سے برتر ہے کہ اس کی کوئی شبیہ ہو سکے۔ پس وہی وہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں۔ اس کی مثل کوئی شے نہیں اور وہی سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ بعض روایات میں مروی ہے کہ فکر ساعۃ خیر من

عبادة سنة (یا) سبعین سنة اور ایک حدیث میں مروی ہے کہ انما العبادة فی التفکر فی اللہ تعالیٰ۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عظمت و قدرت و حکمت خدا تعالیٰ میں غور کرنا اس کی نعمتوں میں خوض و فکر کرنا کہ کس قدر اس نے ہمیں اپنی نعمتیں مرحمت فرمائی ہیں جس سے اس کی محبت دل میں پیدا ہو۔ اور شوق عبادت زیادہ ہو۔ بہت بہتر بلکہ عمدۂ عبادات یہی ہے۔ چنانچہ حدیث میں مروی ہے کہ جناب امام زین العابدین علیہ السلام نماز تہجد کے لئے اٹھے۔ اور مطہرہ وضو کے واسطے طلب کیا۔ جب پانی لینے کے لئے ظرف آب میں ہاتھ ڈالا تو آپ کی نظر آسمان پر پڑ گئی۔ اس وقت ستاروں کا جگمگانا اور ان کا ایک دوسرے سے متباعد متقارب نسبتیں رکھنا کچھ ایسا آپ کو بھلا معلوم ہوا کہ اسی حالت سے ان ستاروں پر نظر فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح صادق ہو گئی اور اذان کی آواز آئی۔ تو اس سے مقصد صرف یہی تھا کہ آپ غور فرما رہے تھے۔ کہ سبحان اللہ کیسا وہ اقدر القادرین ہے۔ جس نے ایسے ایسے روشن اور مضی بنفسہ ستارے پیدا کئے اور جن کو نہایت عمدہ اور با اثر نسبتوں کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابل میں قائم فرمایا۔ اور کیا کیا آثار ان پر مترتب فرمائے اور کیا کیا عجائب حکمت ان سے ظاہر کئے اور چونکہ یہ فعل اعظم عبادات سے تھا۔ اس لئے اس میں غور فرماتے رہے اور نماز تہجد کا بدل اس عبادت کو قرار دیا" فصلوات اللہ علیہ وعلی آبائہ الطاہرین و ابنائہ المعصومین۔

چھٹا باب

دین حنیف اور فطرت اللہ اور صبغۃ اللہ کے بیان میں

سورہ بقرہ میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (چونکہ یہود و نصاریٰ نے اپنے مذہب میں داخل کرنے کا ایک طریقہ نکالا تھا۔ اور جسے وہ اپنے پیغمبر علیہ السلام کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں۔ جیسا کہ انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی نے یوحنا کو بپتسما دیا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پانی لے کر اس شخص پر چھڑکتے ہیں۔ جسے یہودی یا نصرانی بنانا چاہتے ہیں اور کچھ کلمات پڑھتے ہیں۔ گویا اس سے وہ پاک و طاہر ہو کر اُن کے دین میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور یہ طریقہ بنام بپتسما اب بھی عیسائیوں میں رائج ہے۔ اور تفسیر بیضاوی میں مذکور ہے کہ ان النصاریٰ کانوا یغمسون اولادھم فی ماء اصفر یسمونہ المعودیہ ویقولون ھو تطھیر ھم الخ یعنی نصاریٰ اپنے بچوں کو زرد پانی میں غوطہ دیتے تھے۔ اور اس فعل کا نام عمودیہ رکھا تھا اور کہتے تھے کہ یہی اُن کی تطہیر ہے اور اسی سے ان پر نصرانیت حقہ صادق آتی ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایہا الناس تم کو اس صبغ کی تبعیت و پیروی نہیں کرنی چاہئیے بلکہ) پیروی کرو تم لوگ صبغۃ اللہ کی یعنی دین خدا کی اور کون اچھا ہے اللہ سے دین میں۔ یعنی خدا کے دین کے سوا کس کا دین اچھا ہے پس تم کو اس دین کی تبعیت لازم ہے۔ جو ہمارا رسول تمہیں تعلیم کرتا ہے۔ نہ اوروں کے دین کی جو منسوخ ہو چکے یا اُن میں بہت سے تغیرات واقع کر دیئے گئے۔ جس سے وہ ادیان اب دین خدا نہ رہے۔

محمد بن مسلم نے جناب امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ

نے فرمایا۔ عروۃ اللہ الوثقی التوحید والصبغۃ الاسلام۔ یعنی قرآن مجید میں جو عروہ وثقیٰ کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مراد توحید ہے اور صبغۃ سے مراد اسلام ہے!! پس اس بناء پر معنی آیت یہ ہوں گے کہ ایہا الناس تم لوگ دین اسلام کی پیروی کرو۔ اور خدا تعالیٰ کا یہی دین اسلام سب دینوں سے احسن وبہتر ہے۔

اس آیت کی تفسیر یوں بھی کی گئی ہے کہ صبغنا اللہ صبغۃ وھی فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ یعنی اے ایمان والو تم لوگ ان عیسائیوں سے کہو کہ ہم کو اللہ نے اپنے رنگ سے رنگا ہے۔ یعنی ہمیں اس فطرت پر پیدا کیا ہے۔ جس پر تمام آدمیوں کو خلق فرمایا ہے اور وہ دین اسلام ہے (پس ہم کو تمہارے رنگ کی ضرورت نہیں جس میں رنگ دے کر تم دین نصاریٰ میں لوگوں کو داخل کرتے ہو۔ یا اپنے بچوں کو اس میں رنگ دے کر نصرانی بناتے ہو)۔

اور تفسیر صافی میں جناب صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ ھی صبغ المومنین بالولایۃ فی المیثاق قیل سمی صبغۃً لانہ ظھر علیھم اثرہ ظھور الصبغ علی المصبوغ وتداخل الصبغ الثوب وللمشاکلۃ فان النصاریٰ کانوا یغمسون اولادھم فی ماء اصفر یسمونہ المعمودیۃ و یقولون ھو تطھیر لھم۔ یعنی صبغۃ اللہ سے مراد اس آیت میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے مومنین کو رنگ ولایت علی بن ابی طالب علیہ السلام میں بروز میثاق رنگا ہے بعض علماء نے اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ چونکہ مومنین پر محبت علی بن ابی طالب علیہ السلام کا اثر اسی طرح ظاہر ہوتا ہے جیسے کپڑے کے رنگ کا اثر اس وجہ سے اس محبت وولایت کو رنگ سے تعبیر کی۔ نیز یہ وجہ ہے کہ جس طرح نصاریٰ اپنے بچوں کو زرد پانی میں رنگ کر پاک کرتے تھے۔ اسی طرح یہ ولایت مومنین کی پاک کرنے والی ہے۔ خلاصہ یہ کہ صبغۃ اللہ سے مراد خواہ دین اسلام ہو خواہ ولایت اہلبیتؑ دونوں کا مرجع ایک ہی ہے کیونکہ مطلق اسلام بھی بغیر ولایت اہلبیتؑ کے مفید نہیں ہے اگر کوئی شخص شہادتین کہتا ہو اور

اہلبیت کا دشمن ہو تو ویسا ہی مستحق جہنم ہے۔ جیسے ایک مشرک جیسا کہ کتب کلامیہ میں ظاہر و مبرہن کیا گیا ہے۔

سورہ روم میں فرماتا ہے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (حنیف کے معنی مائل الی الاسلام اور ثابت و قائم علی الاسلام کے ہیں یعنی حنیف وہ شخص ہے جو اسلام کی طرف مائل ہو۔ اور اس پر ثابت و قائم ہو اور نیز حنیف کے معنی طاہر کے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ عرب جناب ابراہیم علیہ السلام کے دین پر قائم رہنے والے کو حنیف کہتے تھے) معنی آیت یہ ہوئے کہ اے ہمارے حبیب رسولؐ قائم کر اپنے رُخ کو یعنی قائم کر اپنے قصد کو دین کے لئے۔ درحالیکہ تو پاک ہو یا یہ کہ میل و رغبت اور ثبات و استقلال کے ساتھ دین کا معتقد رہ (اور وہ دین کون سا ہے اور کس دین کی پیروی کر؟) فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا۔ اس فطرت اللہ (دین خُدا) کی پیروی کر جس پر تمام آدمیوں کو اس نے پیدا کیا ہے۔ جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ فطرت اللہ سے مراد توحید ہے اور دوسری حدیث میں مروی ہے کہ فطرۃ اللہ سے مراد توحید اور محمد رسول اللہ اور علی امیر المومنین کا اقرار ہے (اسی پر تمام آدمیوں کو خدا تعالیٰ نے خلق فرمایا ہے۔ حاصل یہ کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس دین اسلام پر تمام آدمیوں کو ہم نے پیدا کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کی توحید کے قائل ہوں اور محمد مصطفےٰ کو رسول خدا جانیں۔ اور علی ابن ابی طالب کو امیر المومنین۔ اس دین کی تم پیروی کرو۔ اگرچہ اس آیت میں حکم صریح جناب رسول خُدا کو ہے لیکن مراد اس سے تمام وہ لوگ ہیں۔ جن کی طرف آنحضرتؐ مبعوث ہوئے تھے۔ حسب مذاق ایاک اعنی واسمعی یا جارہ۔ یعنی خطاب تو کس سے ہے اور مراد اس سے کوئی اور ہے یعنی اے امت محمدیہ دین اسلام کی پیروی کرو۔ جو کہ وہ فطرۃ اور طریقہ ہے۔ جس پر تمام آدمیوں کو خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اللہ کے خلق فرمانے میں تبدیلی نہیں

ہے کہ کسی کو اسلام پر پیدا کیا ہو اور کسی کو دین مجوس پر کسی کو دین نصرانیہ پر اور کسی کو یہودیہ وغیر ذالک پر۔ بلکہ سب کو اسی اقرار توحید و اسلام پر خلق فرمایا ہے یہی دین قیم و مستقیم ہے۔ لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے۔

واضح ہو کہ دین حنیف بطور علم خاص کے اُس مذہب کا نام قرار پا گیا ہے جو جناب ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب تھا اور وہ توحید خدا تعالیٰ ہے۔ چنانچہ جناب امام محمد باقر علیہ السلام نے حنفاء للہ غیر المشرکین بہ کی تفسیر میں (جب کہ ایک شخص نے حضرت سے پوچھا کہ حنیفیۃ کیا ہے؟) یہ فرمایا کہ ھی فطرۃ التی فطر الناس علیھا فطر اللہ الخلق علی معرفتہ" حنیفیۃ سے مراد وہ فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے تمام خلق کو اپنی معرفت پر پیدا کیا ہے یعنی اس اقرار پر پیدا کیا ہے کہ سب لوگ اُس کی معرفت حاصل کریں اور موحّد رہیں اور چونکہ یہی مسلک دین اسلام اور مذہب محمدی کا بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کو واحد و یکتا سمجھا جائے اور اسی کی خالص عبادت کی جائے اس لئے کئی مقام پر قرآن مجید میں اس امر کو بیان کیا گیا ہے۔ سورہ بقر میں فرمایا قَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصاریٰ ہو جاؤ۔ تو ہدایت پاؤ گے۔ اے رسول تم کہہ دو بلکہ تم لوگ مذہب ابراہیم کی پیروی کرو۔ جو ایک خدا کے ہو رہے تھے۔" پھر سورہ آل عمران میں فرمایا ہے۔ مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا۔ ابراہیم یہودی یا نصرانی نہ تھے۔ لیکن موحّد صاحب اسلام تھے۔ نیز سورہ آل عمران میں فرمایا قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔ اے رسول کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے۔ پس تم لوگ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو ایک خُدا کے ہو رہے تھے۔ اور سورہ نساء میں فرمایا ہے۔ مَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔ کون اچھا ہو سکتا ہے از روئے دین و مذہب کے اُس شخص سے جو اللہ کے آگے سر تسلیم خم

کرے۔ اور وہ نیکو کار بھی ہو اور ملت ابراہیم کی باستقامت پیروی کرتا ہو" سورہ انعام میں حضرت ابراہیم کا قول نقل فرمایا ہے۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا۔ میں نے اپنے رُخ کو اُس خالق کی طرف پھیرا ہے۔ یعنی اس کا مطیع و فرمانبردار بنا ہوں۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور یہ میری توجیہ وجہ یا اطاعت و اسلام مضبوطی اور استقامت کے ساتھ ہے۔ نیز سورہ انعام میں فرمایا قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰنِیْ رَبِّیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ اے رسول کہہ دو کہ مجھ کو میرے پروردگار نے سیدھی راہ کی ہدایت کر دی۔ اس نے ایسے دین کی طرف ہدایت کی ہے جو ٹھیک ہے اور مذہب ابراہیم ہے جو موحد تھے۔ اور مذہب اسلام و توحید پر باستقامت و استحکام قائم تھے اور وہ مشرک نہ تھے۔ سورہ یونس میں فرمایا۔ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ اے رسول کہہ دو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اے محمد! تو دین کی طرف متوجہ ہو۔ درحالیکہ تو اس دین پر مستقیم ہو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔ سورہ نحل میں فرمایا ہے اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا۔ بے شک ابراہیم خدا تعالیٰ کے فرمانبردار موحد تھے" نیز فرمایا ہے۔ ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا۔ پھر ہم نے تجھ کو اے ہمارے رسولؐ وحی کی کہ مذہب ابراہیم کی پیروی کر۔ جو موحد اور توحید پر قائم تھے۔ دیا یہ کہ تو اس طرح اُس مذہب کی تبعیت باستقامت کر۔

پس معلوم ہوا کہ فطرۃ اللہ اور صبغۃ اللہ اور دین حنیفیہ ان سب سے مراد ایک ہی ہے۔ یعنی اقرار توحید خدا تعالیٰ۔ اور یہی مطلب اس حدیث کا بھی ہے جو جناب رسالت مآب سے مروی ہے۔ کل مولود یولد علی الفطرۃ حتی یکون ابواہ یہودانہ وینصرانہ۔ ہر بچہ فطرت یعنی طریقہ اسلام اور اقرار توحید خدا تعالیٰ پر پیدا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے والدین اس کو یہودی و نصرانی بنا دیتے ہیں۔ اور یہی مراد اس حدیث سے بھی ہے کہ جس میں فرمایا گیا ہے۔ احبُّ

الادیان إلی اللہ الحنیفیۃ السمحۃ۔ تمام مذہبوں میں سے خدا تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ حنیفیہ سہلہ ہے۔ اور یہی مطلب اس آیت کا بھی ہے۔ جس میں ارشاد فرمایا ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ بے شک دین تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ یہی فطرۃ ہے۔ یہی صبغۃ ہے۔ یہی حنیفیہ ہے اور یہی اسلام۔

ساتواں باب

باری تعالیٰ کی قدامت کے بارے میں بیان

یعنی کہ خدا تعالیٰ قدیم ازلی ہے اور وہی ابدی ہے نہ اس کی کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ سورہ بقرہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ (آیۃ الکرسی) اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ اللہ نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر وہی۔ حی و قیوم ہے۔ یعنی وہ ایسا ہے کہ بنفس ذاتہ زندہ ہے اور اس کے لئے موت جائز نہیں۔ قائم دائم بلا زوال ہے۔ قیوم کے معنی اگرچہ یہ بھی بتائے گئے ہیں کہ القائم بتدبیر خلقہ۔ یعنی اپنی مخلوقات کی تدبیر و اصلاح کا قائم کرنے والا یا یہ کہ ان کی اصلاح و تدبیر کو قائم رکھنے والا ہے۔ مگر کفعمی اور صاحب عدہ نے تحریر فرمایا ہے کہ قیوم کے معنی قائم دائم بلا زوال کے ہیں۔ غرض اس آیت سے اس کی ازلیۃ ثابت ہوتی ہے کیونکہ جب وہ حی ہے۔ یعنی زندہ تو لامحالہ اس کی زندگی کسی اور شخص یا کسی اور چیز کے سبب سے نہ ہوگی۔ ورنہ وہ شے خدا ہوگی۔ جس نے اس کو زندہ کیا ہے اور اس میں حیات داخل کی ہے حالانکہ اس نے سب کو زندگی اور حیات دی ہے نہ یہ کہ اس کو کسی نے زندگی دی ہو۔

اور اپنے ابدی ہونے کو اس نے یوں بیان کیا ہے۔ وتوکل علی الحی الذی لا یموت۔ اے رسول اور بھروسا کر اس خدائے زندہ پر جس کے لئے موت نہیں!! دلیل اس مطلب کی یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ قدیم نہ ہوگا۔ تو لامحالہ حادث ہوگا۔ اور جب حادث ہوگا۔ تو کسی کا پیدا کیا ہوگا۔ پس یہ دوسرا شخص جس نے خدا کو پیدا کیا ہے۔ اگر وہ اسی خدا سے پیدا ہوا ہے۔ تو دور لازم آئے گا جو محال ہے کیونکہ اپنے موجود ہونے سے پہلے اپنا موجود ہونا لازم آتا ہے۔ اس لئے کہ تم نے یہ مانا ہے

کہ اس دوسرے نے تو خدا کو پیدا کیا اور خُدا نے اس دوسرے شخص کو پیدا کیا تو جب کہ اُس کو خدا نے پیدا کیا اس وقت یہ معدوم تھا۔ اور جب اس نے خدا کو پیدا کیا تو موجود تھا۔ پس جب اس کا وجود خُدا کے بعد مانا جاتا ہے تو اس سے پہلے موجود نہ رہا ہوگا۔ حالاں کہ اُسی نے خدا کو پیدا کیا ہے تو ضرور اس سے پہلے موجود رہا ہوگا اور یہی معنی اس کے ہیں کہ اپنے موجود ہونے سے پہلے موجود ہونا لازم آتا ہے۔ اور یہ محال ہے اور اگر خدا نے اس دوسرے کو نہیں پیدا کیا تو آیا وہ دوسرا قدیم ہے۔ یا نہیں اگر قدیم ہے تو اُسی کو خدا کہا جائے گا۔ اور اگر وہ بھی حادث ہے تو ضرور اس کو بھی کسی اور نے پیدا کیا ہوگا۔ اب اگر یہی سلسلہ چلا جائے تو تسلسل لازم آئے گا۔ جو محال ہے اور تسلسل کے محال ہونے کی ایک صاف اور موٹی دلیل یہ ہے کہ ابتدا ناممکن ہے اس کی توضیح یوں ہے کہ اگر سلسلہ ممکنات ہی چلا جائے اور کوئی اس سلسلہ کے درمیان میں قدیم نہ ہو۔ بلکہ جو بھی پیدا کرنے والا تسلیم کیا جائے وہ حادث ہی ہو تو کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ کسی شے کی ابتدا ہو سکے۔ اس وجہ سے کہ معدوم حادث کی ابتدا تو کسی ابتدا کرنے والے سے ہو سکتی ہے اور جب اس ابتدا کرنے والے کو بھی حادث ہی مانا گیا۔ تو اس سے پہلے بھی کوئی ہوگا جس نے اسے بنایا ہوگا۔ اور وُہ بھی حادث ہے تو اُسے بھی کسی اس سے پہلے والے نے بنایا ہو جو حادث ہوگا۔ تو کہیں سے ابتدا نہ نکلے گی۔ حالاں کہ حادثات کے سلسلہ کے واسطے ابتدا کا ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ اصل میں معدوم تھے اور عدم سے وجود میں آئے ہیں تو لامحالہ کوئی وقت ابتدا کا ہوگا۔ جس میں اُن کا عدم سے وجود میں آنا شروع ہُوا اور ضرور کوئی ایسا ہوگا۔ جس نے اُن کو عدم سے وجود میں لانا شروع کیا۔ پس لامحالہ اس کو قدیم ہونا چاہیئے۔

دوسرے یہ کہ عالم میں جس قدر موجودات ہیں۔ ان میں اگر کوئی موجود قدیم بھی ہے تو وہی خدا تعالیٰ ہے اور اگر کوئی بھی قدیم نہیں ہے تو ان موجودات ممکنہ کو عدم سے وجود میں کون لایا۔ یہ تو ہُوا نہیں کہ سب کے سب آپ سے آپ

موجود ہو گئے ہوں۔ کیوں کہ عدم میں خود صلاحیت موجود ہونے کی نہیں ہے جب تک کوئی دوسرا وجود نہ پیدا کرے۔ دیکھو مٹی سے گھڑا آپ سے نہیں پیدا ہو جاتا۔ جب تک کمہار اس مٹی کو گھڑے کی صورت میں موجود نہیں کرتا۔ تو یا یہ کہو گے کہ ان تمام ممکنات نے مل کر اپنے تمام کو پیدا کیا ہے۔ یا ایک نے دوسرے کو اگر کہو کہ تمام نے مل کر تمام کو پیدا کیا ہے تو لازم آتا ہے کہ کوئی شے اپنے وجود کی آپ علت ہو۔ حالاں کہ یہ محال ہے کیونکہ علت ہونے کے لئے موجود ہونا ضروری ہے حالاں کہ وہ ابھی آپ ہی موجود نہیں۔ اور اگر ایک نے دوسرے کو پیدا کیا ہے تو آیا اپنی حالتِ عدم میں دوسرے کو پیدا کیا یا حالتِ وجود میں۔ اگر کہو کہ حالتِ عدم میں پیدا کیا ہے تو بھلا تمہیں بتاؤ کہ معدوم شے بھی فاعل ہو سکتی ہے؟ اور اگر اپنے موجود ہونے کی حالت میں دوسرے کو پیدا کیا۔ تو آپ کیوں کر موجود ہوئے۔ جب کہ خود بھی ممکن اور معدوم تھے۔ تو لا محالہ کسی اور نے اُسے موجود کیا ہو گا۔ پس اس کا موجود کرنے والا ان ممکنات میں سے تو کوئی ہو نہیں سکتا۔ اس لئے کہ وہ خود بھی معدوم الاصل ہیں۔ پس ضروری ہوا کہ کوئی اور شخص ان کا خالق مانا جائے جو اس سلسلہ ممکنات سے علیحدہ ہو تو لا محالہ قدیم ہو گا۔ کیوں کہ سلسلہ ممکنات سے الگ ہو کر سوائے قدیم ہونے کے اور کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ لہذا معلوم ہو گا کہ وہی قدیم خدا تعالیٰ ہے وہو المراد۔

کسی نے جناب امیر المومنین علیہ السلام سے دریافت کیا تھا کہ یا امیر المومنین متی کان ربّک۔ اے امیر المومنین آپ کا پروردگار کب پیدا ہوا اور کب سے ہے؟ آپ نے فرمایا ثکلتک امّک ومتی لم یکن حتّی یقال متی کان۔ تیری ماں تجھ کو روئے۔ وہ کب نہ تھا۔ جو یہ کہا جائے کہ کب سے ہے اور کب پیدا ہوا۔ کان ربی قبل القبل بلا قبل ویکون بعد البعد بلا بعد ولا غایۃ ولا منتھیٰ لغایۃ انقطعت الغایات عنہ فھو منتھیٰ کل غایۃ۔ میرا پروردگار ہر پہلے سے پہلے تھا جس سے پہلے کچھ نہیں۔ اور ہر بعد کے بعد رہے گا۔ جس سے بعد کچھ نہیں

اور نہ کوئی حد ہے۔ اور نہ اس کی انتہا کی کوئی طاقت ہے۔ تمام انتہائیں اُس سے علیحدہ اور جدا ہیں۔ پس وہی معبود ہر انتہا کی انتہا ہے (اس کی کوئی انتہا نہیں)
نافع بن ازرق نے امام محمد باقر علیہ السلام سے عرض کی اخبرنی عن اللّٰہ تعالیٰ متیٰ کان فقال لہ ویلک اخبرنی انت متیٰ لم یکن حتیٰ اخبرک متیٰ کان سبحان من لم یزل ولا یزال فرداً صمداً لم یتخذ صاحبۃ ولا ولداً۔
مجھے آپ بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کب سے ہے؟ آپ نے اس سے فرمایا۔ تو مجھے بتا کہ وہ کب نہ تھا تاکہ میں تجھے بتاؤں کہ وہ کب سے ہے (یعنی جب کہ اس کے لئے عدم کا کوئی وقت ہی نہیں۔ بلکہ ہر وقت موجود ہی تھا۔ تو کیوں کر بتایا جا سکتا ہے کہ فلاں وقت سے اس کا وجود ہوا) پاک و منزہ ہے وہ (معبود) جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اکیلا ہے۔ بے نیاز ہے۔ نہ اس کے لئے بیوی ہے اور نہ بچہ۔" (بحار جلد توحید)

(اس سے زیادہ حدیثیں اس بارے میں دیکھنی ہوں تو دیکھو ہماری کتاب توحید الائمہ۔)

آٹھواں باب

عدمِ جسمانیت خُدا

• خدا تعالیٰ نہ جسم ہے نہ جسمانی۔ نہ مکان ہے نہ مکانی۔ نہ زمانہ ہے نہ زمانی نہ صورت ہے نہ مادہ۔ نہ اس پر حلول جائز ہے اور نہ وہ کسی شئے سے متحد ہے نہ اس میں حرکت ہے اور نہ انتقال۔ اور نہ وہ محال حوادث ہے۔

اس مطلب کے بیان کے واسطے خدا تعالیٰ نے ایک آیت ایسی ارشاد فرمادی جس کے معنی کی وسعت کا اندازہ دشوار ہے۔ البتہ بالاجمال اس کا احاطہ ممکن ہے تمام وہ دعاوی جو آغاز میں بیان ہوئے۔ وہ کل اس ایک آیت سے ثابت ہوتے ہیں۔ جو سورہ حمعسق میں فرمائی ہے۔ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَّھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔ مثل اس کے کوئی شئے نہیں اور وہی سمیع و بصیر ہے۔ یعنی جس قدر چیزیں عالم میں موجود ہیں۔ وہ اس سے خالی نہیں کہ یا جوہر ہیں یا عرض۔ اور اگر جوہر ہیں تو بسیط ہیں یا مرکب۔ اور اگر عرض ہیں۔ تو یا کم ہیں۔ یا کیف فعل ہیں یا انفعل۔ این، ہیں یا وضع۔ ملک ہیں یا اضافت۔ یا متیٰ جو بھی اُن میں سے ہیں۔ وہ حادث اور ممکن ہیں۔ کیونکہ جواہر بسیط۔ مثل عقل، نفس۔ مادہ۔ صورت اور روح سب کے سب بسبب اس کے کہ اُن میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً کمی سے زیادتی۔ زیادتی سے کمی۔ ضعف سے قوت۔ قوت سے ضعف وغیرہ وغیرہ تو کسی طرح یہ واجب الوجود نہیں ہوسکتے تو خدا تعالیٰ کے مثل کیوں کر ہو سکتے ہیں اور جواہر مرکبہ جنہیں جسم کہا جاتا ہے۔ مثلاً افلاک۔ عناصر اربعہ۔ یا موالید ثلاثہ یہ سب خود ہی معدوم الاصل ہیں اور عدم سے وجود میں آئے ہیں۔ پھر یہ کیونکر خدا تعالیٰ سے مشابہ ہو سکتے ہیں۔ یا وُہ کب اُن سے مشابہ ہوسکتا ہے کیونکہ مشابہت کے واسطے اشتراک

نوعی ضروری ہے اور جب کہ نوع ممکن نوع واجب میں داخل ہی نہیں اور دونوں غیر غیر ہیں تو مشابہت کیوں کر ہو سکتی ہے پس نہ تو وہ فرشتوں کے مثل ہے نہ روح کے مثل۔ آسمان کے مثل ہے نہ ستاروں کے مثل۔ انسان کے مثل ہے نہ حیوانات کے مثل۔ آگ کے مثل ہے نہ پانی کے مثل۔ زمین کے مثل ہے نہ ہوا کے مثل۔ کسی کیفیت سے مشابہ ہے نہ کسی کمیت سے۔ بلکہ وہ ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے۔ اور جب ان سے مشابہ نہیں تو جو اوصاف ذاتیہ اُن کے ہیں اُن سے بھی مشابہ نہ ہو گا۔ مثلاً جس قدر جواہر و اعراض ہیں، خواہ بسائط ہوں یا مرکبات اُن کو شکل کی احتیاج ہے۔ مکان کی احتیاج ہے۔ زمانہ کی احتیاج ہے۔ یہ کوئی بات اس میں نہ ہوگی۔ کیوں کہ اگر یہ مانا جائے کہ اس کی کوئی شکل ہے تو ضرور ہے کہ وہ مقدار ہو گا۔ اس لئے کہ شکل بغیر مقدار ممکن ہی نہیں۔ اور جب مقدار ہو گا۔ تو کسی نہ کسی ذوالمقدار میں قائم ہو گا۔ تو لازم آئے گا کہ ذوالمقدار اس سے پہلے موجود ہو کیونکہ عرض کا وجود بغیر جوہر کے محال ہے۔ پس اس وقت میں اس کا حدوث لازم آئے گا۔ جو ناممکن ہے اور اگر اس کے لئے کوئی مکان ہو۔ تو محتاج مکان کا ہو گا اور لازم آئے گا کہ مکان اس سے پہلے موجود ہو۔ کیونکہ متمکن کا وجود ہمیشہ مکان سے متاخر ہوتا ہے۔ پھر بھی حدوث لازم آئے گا۔ اور علیٰ ہذالقیاس زمانے میں یہی تقریر ہے کیونکہ زمانہ خود حادث ہے پس محتاج الی الحادث بطریق اولیٰ حادث ہو گا۔ حالانکہ اُسے بدلیل تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ قدیم ازلی ہے۔

اب چونکہ آیت قرآنیہ محکمہ اس مادے میں بطور نص کے قرآن مجید میں موجود ہے جس میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے اور دلیل عقل سے مطابق ہے۔ تو اگر اس کے خلاف کسی شخص کی رائے ہو گی۔ وہ تسلیم نہ ہو گی۔ اور اگر آیات قرآنیہ متشابہہ بظاہر اس کے برخلاف ہوں گی۔ تو ان کی تاویل کی جائے گی!! (تاویل سے یہ مطلب نہ سمجھ لیا جائے۔ کہ خواہ مخواہ اس کے معنی بدل کر کچھ نہ کچھ کہا جائے گا بلکہ ازبسکہ

اس میں دو قسم کے پہلو نکلتے ہیں ایک تو وہ جو آیت محکمہ قرآنیہ اور برہان عقل کے مطابق ہیں اور دوسرے وہ جو آیت محکمہ کے خلاف اور عقلی دلیل کے متضاد و مخالف ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اُن آیات سے وہی معنی مراد لیا جائے۔ جو خلاف عقل اور خلاف محکمات ہو بلکہ وہ معنی مراد ہو گا جو مطابق ہو۔ کیونکہ یہ کلام حکیم مطلق کا ہے اور حکیم کوئی بات خلاف عقل نہیں کہتا۔ خصوصاً وہ جو سب سے بڑا حکیم ہو۔ تو اگرچہ لفظوں سے احتمال معنی خلاف عقل کا ہو۔ مگر چونکہ وہ کلام حکیم ہے اس لئے اس کا وہی دوسرا معنی سمجھا جائے گا جو موافق عقل ہو۔ مثلاً یوں سمجھو کہ ایک فلاسفر آدمی تم سے یوں کہے کہ "میں دو بجے تمہارے مکان پر آؤں گا" تو اگرچہ یہ بھی احتمال ہے کہ دو بجے دن کو اس نے مراد لیا ہو یا دو بجے رات کو۔ اور مکان سے مراد خاص وہ جگہ لی ہو۔ جس میں تم اپنے جسم سے موجود ہو یا تمہارا گھر مراد لیا ہو۔ اور آؤں گا سے پیدل مراد لیا ہو یا سواری پر۔ اور چاروں ہاتھ پاؤں سے مثل بندروں کے اُچکتا ہوا مراد لیا ہو یا مثل انسان کے دو پاؤں سے چلتا ہوا۔ اور دھوپ میں چلتا ہوا مراد لیا ہو یا چھتری لگائے ہوئے دوڑتا ہوا آنا مراد لیا ہو یا سکینہ و وقار کے ساتھ آنا۔ پس اگرچہ اس کے کلام میں یہ سب احتمالات موجود ہیں۔ لیکن تم اس کے اس کلام سے کہ "آج میں تمہارے مکان پر آؤں گا" یہی سمجھو گے کہ دو بجے دن کو آئے گا اس لئے کہ دو بجے رات کو کوئی ملاقات کا وقت نہیں ہوتا۔ اور ایسے وقت ملنے میں تقریباً ملاقاتی اور ملاقات مند دونوں ہی کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور ضرور ہے کہ اگر ممکن ہو گا تو سواری پر آئے گا کیونکہ بلاوجہ کوئی تکلیف نہیں اٹھاتا اور اگر سواری ممکن نہ ہوئی تو پیدل ہی آئے گا مگر چونکہ چاروں ہاتھ پاؤں سے چلنا یا خواہ مخواہ دوڑنا یا باوجود دھوپ کی تکلیف کے چھتری نہ لگانا خلاف عقل ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ رساں رساں سکون و وقار کے ساتھ دو پاؤں پر چلتا ہوا چھتری لگائے ہوئے آئے گا۔ پس جب کہ تم ایک معمولی آدمی کے کلام کو خلاف عقل معنی پر محمول نہیں کرتے بلکہ اس سے وہی معنی مراد لیتے ہو۔ جو عقل کے مطابق ہو۔ تو خدا

تعالیٰ کے کلام حکیمانہ نے کیا قصور کیا ہے کہ اُس سے وہی معنی سمجھو جو خلاف عقل ہے۔ آخر یہ کون سا انصاف ہے اور یہ کس قسم کی عقل ہے۔ تو مطلب تاویل سے یہی کہ وہ آیات جو محکم قرآن کے معنی سے بظاہر الفاظ خلاف سمجھ میں آتے ہیں وہ معنی اُن کے مراد نہ ہوں گے بلکہ جو مطابق محکم آیات اور موافق برہان عقل ہوں گے وہ مراد لئے جائیں گے۔

پس وہ آیات جو لیس کمثلہ شے سے بظاہر مخالف معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ مخالف نہیں ہیں۔ ذیل میں ترتیب وار بیان کی جاتی ہیں۔

پہلی آیت: هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۔ (سورہ بقرہ رکوع ۳) وہی وہ معبود برحق ہے۔ جس نے پیدا کیں۔ تمہارے نفع کے واسطے تمام وہ چیزیں جو رُوئے زمین پر ہیں۔ پھر مستوی ہوا طرف آسمان پس اُن کو سات آسمان بنایا۔" استوا کے معنی اعتدال اور استقامت کے ہیں۔ اور استیلاء یعنی غلبہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

فلما علونا واستوینا علیھم ترکنٰھم صرعیٰ لنسر و کاشم

(یعنی جب ہم اپنے مخالف دشمنوں پر غالب ہو گئے۔ تو ان کو پچھڑا ہوا زمین پر چھوڑ دیا گدھوں اور درندوں کے واسطے کہ وہ آکر ان کا گوشت کھائیں) استوار بمعنی اقبال بھی آیا ہے یعنی متوجہ ہونا جو حرف علیٰ اور الیٰ دونوں سے موصول ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں کان فلانٌ مقبلاً علیٰ فلان ثم استویٰ علیّ (یا الیّ) یعنی فلاں شخص فلاں پر متوجہ تھا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ نیز استوار بمعنی قصد بھی آیا ہے۔ جیسے کہتے ہیں کان الامیر یدبر امر الشام ثم استویٰ الی الحجاز۔ امیر شام کے امور کی تدبیر کرتا تھا۔ پھر اس نے حجاز کا ارادہ کر لیا یعنی اپنی تدبیر اور اپنے ارادے کو حجاز کی طرف پھیر دیا۔ تو جب کہ استویٰ کے معنی اتنے ہیں تو اُن میں سے خاص کر اعتدال یعنی چار زانو ہو کر بیٹھنے ہی کے لئے جائیں۔

اور غلبہ۔ یا متوجہ ہونا یا قصد کرنے کے معنی نہ لیے جائیں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ خصوصاً جب کہ پہلے معنی خلافِ عقل بھی ہیں کیونکہ چار زانو تو وہ بیٹھے جو جسم بھی ہو۔ اور خدا تعالیٰ کے لئے جسم نہیں بلکہ وہ بسیط مطلق ہے اس میں ترکیب کا شائبہ بھی نہیں ورنہ واجب الوجود نہ رہے گا۔ پس معنی آیت یہ ہوئے کہ اسی معبود نے تمہارے لئے تمام روئے زمین کی چیزوں کو پیدا کیا۔ پھر وہ متوجہ ہوا۔ آسمان کے پیدا کرنے کی طرف یا یہ کہ پھر اس نے اپنے ارادے کو آسمان کی طرف پھیرا اور اس کے پیدا کرنے کا قصد کیا! اور اس معنی میں کوئی خرابی عقلی لازم نہیں آتی اور نہ مخالفت قرآن و حدیث بس یہی معنی درست ہیں اور یہی مراد خدا تعالیٰ ہے۔ انشاء اللہ۔

دوسری آیت: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (سورہ اعراف رکوع ۶)۔

بے شک تمہارا پروردگار اللہ ہے۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر مستوی ہوا عرش پر۔ اس میں بھی استواء اور عرش کے معنی کو دیکھنا چاہئے استواء کے تو وہی معانی ہیں جو اُوپر مذکور ہوئے اور عرش تخت کو بھی کہتے ہیں عرش نویں آسمان کو بھی کہتے ہیں۔ اور عرش سے مراد آئمہ معصومین علیہ السلام نے علم بھی بتایا ہے۔

پس ثم استویٰ علی العرش کے یا تو یہ معنی ہیں کہ استوی امرہٗ علی الملک۔ غالب ہو گیا امر اس کا ملک پر۔ یعنی ملک اس کا مستقر و مستقل ہوا۔ یا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کر چکا۔ تو فرشتوں پر اپنے استقرار و استقامت ملک و سلطنت اور اپنے غلبہ کو ظاہر کیا یا ان کو اپنی عبدیت اور خدا تعالےٰ کی معبودیت کا اذعان تام حاصل ہوا یا عرش کے معنی کل شے کے لئے جائیں تو مطلب یہ ہو گا کہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے کے بعد پروردگار تمام چیزوں پر غالب ہوا۔ یعنی اپنا غلبہ ہر شے پر ظاہر فرمایا۔

جناب صادق علیہ السلام سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: استوی من کل شیئٍ فلیس شیئٌ اقرب الیہ من شیئٍ۔ یعنی استوی علی العرش سے مطلب یہ ہے کہ اُس کی نسبت ہر شے سے برابر ہے۔ وہ ہر شے کا مالک اور ہر چیز پر بہ نسبت مساویہ قادر ہے۔

نیز جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے کہ استوی علی العرش سے مراد استولیٰ علی ما دق وجل ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ ہر چھوٹی بڑی چیزوں پر غالب ہے!! اور بے شک یہ معنی صحیح ہیں اور اس پر کوئی قبح عقلی یا نقلی لازم نہیں آتا بخلاف اس کے کہ اگر اس سے مراد یہ لی جائے کہ خدا تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہے۔ تو اس کا محتاج مکان ہونا لازم آئے گا جو محال ہے۔

تیسری آیت: کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (سورہ عنکبوت۔ رکوع ۹) ہر شے ہلاک ہو جائے گی مگر وجہ خدا ہلاک نہ ہوگا۔ یا وجہ اُس شے کی ہلاک نہ ہوگی۔

چوتھی آیت: وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔ اور باقی رہ جائے گا وجہ تیرے رب کا جو صاحب جلال و اکرام ہے۔ (سورۂ رحمٰن۔ رکوع ۱)

وجہ بمعنی ذات بھی لغت میں آیا ہے اور بمعنی جہت بھی اور بمعنی چہرہ بھی اور بمعنی ما یقصد بہ الی اللہ۔ (جس ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی طرف قصد کیا جائے گا) اور بمعنی عرض بھی آیا ہے اور بمعنی سبب بھی آیا ہے وبمعنی اول وصدر شے۔ وبمعنی حیلہ و احتیال۔ وبمعنی قدر و منزلت وبمعنی رئیس منظور الیہ وبمعنی یذھب

ھذا فی الدرر والغرر۔ ویدل ایضاً علی ان الوجہ یعنی بہ عن الذات قولہ تعالیٰ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ وقولہ تعالیٰ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ لانّ جمیع ما اضیف الی الوجوہ فی ظاھر الآی من النظر والظن والرضیٰ لا

یصح اضافة علی الحقیقة لها وانما یضاف الی الجملة فمعنی قوله کل شیٔ ھالک الا وجھہ ای کل شیٔ ھالک الا ایاہ وکذلک قولہ کل من علیھا فان ومما یدل علی ان المراد بوجھہ نفسہ قولہ ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام لما کان المراد بالوجہ نفسہ ولم یقل ذی الجلال کما قال تبارک اسم ربک ذی الجلال والاکرام لما کان اسمہ غیرہ ویمکن فی قولہ کل شیٔ ھالک الا وجھہ۔ وجہ اٰخر قد روی عن بعض المتقدمین وھو ان یکون المراد بالوجہ ما یقصد بہ الی اللہ تعالیٰ۔ ویوجہ نحو القربۃ جل عطیۃ الیہ فیقول لا تشرک باللہ ولا تدع مع اللہ الٰھا غیرہ۔ فان کل فعل متقرب بہ الی غیرہ ویقصد بہ سواہ فھو ھالک باطل وکیف یجوز للمشبہ ان یحمل ھذہ الاٰیۃ والتی قبلھا علی الظاھر اولیس ذلک یوجب اللہ تعالیٰ یفنی ویبقی وجھہ وھذا اکفر وجھل من قائلہ (انتہی بقدر الحاجۃ)۔ پس اتنے معنوں میں سے بالخصوص چہرہ کو لے لینا اور یہ کہنا کہ معنی آیت یہ ہے کہ ہر شے فنا ہو جائے گی مگر خدا کا چہرہ نہ فنا ہوگا اور باقی رہ جائے گا۔ چہرہ تیرے رب کا جو کہ صاحب جلال واکرام ہے (جیسا کہ بعض مدعیان اسلام کا خیال ہے) بالکل بے وجہ ہے کیونکہ اگر یہ معنی ہوگا تو دو خرابیاں لازم آئیں گی۔ اول یہ کہ اس بناء پر لازم آئے گا کہ ہر شے فنا ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ خدا بھی فنا ہو جائے گا۔ مگر اس کا چہرہ باقی رہ جائے گا۔ اس معنی کو شاید کوئی عقلمند پسند نہیں کرے گا۔ کیونکہ خدا کے چہرہ باقی رہ جانا اور باقی تمام ارکان کا اس کے فنا ہو جانا ایک مہمل بات ہے۔ پس لامحالہ یا تو مراد وجہ سے ذات ہوگی۔ تو معنی آیت یہ ہوگا کہ ہر شے فنا ہو جائے گی مگر ذاتِ خدا باقی رہ جائے گی (اور بے شک یہ صحیح ہے اور اس پر کوئی اعتراض بھی لازم نہیں آتا ۱۲) یا یہ مراد ہوگی کہ سب چیزیں فنا ہو جائیں گی۔ مگر وہ ذریعہ جس سے خدا تک پہنچ سکتے ہیں یعنی اس کے نزدیک قابل عزت ہو سکتے ہیں۔ فنا نہ ہوگا (اور وہ ذریعہ دین ومذہب ہے) چنانچہ صادق آل محمد سے

مروی ہے عن خیثمہ قال سئلت اباعبد اللہ عن قول اللہ عز وجل کل شیٔ ھالک الا وجھہ قال دینہ۔" خیثمہ کہتے ہیں کہ میں نے جناب ابو عبد اللہ الصادق سے "کل شیٔ ھالک الا وجھہ" کا معنی دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ وجہ سے مراد دین خدا ہے۔" یعنی دین خدا کبھی فنا نہ ہوگا۔ کیونکہ اسی کی موافقت و مخالفت پر ثواب وعذاب کی بنا ہے اگر وہی فنا ہوگیا تو نہ قیامت کی ضرورت ہے اور نہ عبادت کی حاجت ہے اور نہ رسول کے آنے کی احتیاج ہے حالاں کہ یہ سب باتیں ضروری ولازمی ہیں۔

پانچویں آیت: قَالَ یَا اِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ خدا تعالیٰ نے فرمایا "اے ابلیس کس چیز نے تجھ کو سجدہ کرنے سے منع کیا۔ اُسے جس کو میں نے اپنے یدین سے پیدا کیا۔ بعض مسلمان مثل ابوالحسن اشعری کے یدین سے مراد دونوں ہاتھ لیتے ہیں اور معنی یہ بتاتے ہیں کہ "میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا تھا۔ اور اسی بنا پر بعض دیگر اہل اسلام مثل داؤد خوارزمی کے قائل تھے کہ خدا تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں۔ جیسے آدمیوں کے ہوتے ہیں لیکن فی الواقع یہ ان لوگوں کی سخت غلطی ہے۔ کیونکہ تجسم پروردگار عالم اور اس کے لئے ہاتھ پاؤں ہونے ناممکن ہیں۔ تو ضروری ہے کہ غور کیا جائے کہ ید کا عرب میں کن کن معنوں کے لئے استعمال ہوا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ید ہاتھ کے معنی میں بھی آیا ہے۔ جیسا کہ خود خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَهُمَا۔ چور مرد اور چورنی عورت کے ہاتھوں کو کاٹ دو" اور نیز نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے کہتے ہیں لَهٗ عَلَیَّ یَدٌ اس کی مجھ پر نعمت ہے یعنی وہ میرا منعم ہے۔ ولہ عندی ید بیضاء۔ اس کی مجھ پر نعمت روشن ہے۔ اور قدرت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ عرب شاعر کہتا ہے۔

تحملت من ذلفاء مالیس لی بہ ۔ و لا للجبال الراسیات ید ان

میں نے ذلفاء کی طرف سے وہ مشقتیں برداشت کیں۔ کہ نہ جن کے اٹھانے کی

مجھ کو قدرت ہے اور نہ بڑے مضبوط گڑے ہوئے پہاڑوں کو۔ دوسرا شاعر کہتا ہے ؎

انا بغ انکم لم تبلغونا — وما لکم بذ لکم یدان

اے نابغہ، تم لوگ ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور نہ تم کو اس امر کی قدرت و قوت ہے۔"

پس جب کہ ید کے معنی ہاتھ، قدرت اور نعمت تینوں آئے ہیں، تو پھر کیا وجہ کہ وہی معنی بالخصوص مراد لیا جائے جو عقل کے خلاف اور شان خدائے تعالیٰ کے مخالف ہو اور کیا ضرورت ہے کہ بلا وجہ عقل کے پیچھے لکڑی لے کر پھرا جائے۔ اور کیوں نہ کہا جائے کہ اس آیت میں بھی یدین سے مراد قوت و قدرت ہے یا نعمت مراد اما الوجہ فی تثنیتہا فقد قیل فیہ ان المراد بہ نعمۃ الدنیا ونعمۃ الاخرۃ فکانہ تعالیٰ قال ما منعک ان تسجد لما خلقت نعمتی وارادبا لباء اللام انتہی بقدر الحاجۃ) کیونکہ اس صورت میں کوئی اعتراض عقلی یا نقلی عائد نہیں ہوتا بخلاف پہلی صورت کے۔ پس اس صورت میں مراد آیت سے یہ ہوگی۔ کہ اے ابلیس جس کو میں نے خاص اپنی قدرت قوت سے پیدا کیا تھا۔ اُسے سجدہ کرنے سے (باوجود میرے حکم دینے کے) کس نے منع کیا۔ یا یہ کہ جس کو میں نے اپنی نعمت سے پیدا کیا تھا۔ یعنی آدم کا پیدا کرنا عین میری نعمت و رحمت تھا۔ اُس کو سجدہ کرنے سے تجھ کو کس نے روکا۔

یہی مطلب جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔ چنانچہ محمد بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سے اس آیت کے معنی دریافت کئے۔ تو آپ نے فرمایا: الید فی کلام العرب القوۃ والنعمۃ قال اللہ واذکر عبدنا داؤد ذا الاید وقال والسماء بنیناھا باید ای بقوۃ وقال اید ھم بروح منہ ای قواھم ویقال لفلان عندی ایادی کثیرۃ ای فواضل واحسان ولہ عندی ید بیضاء ای نعمۃ" (توحید بحار) ید کلام عرب میں قوت و نعمت کے معنی میں آیا) ہے۔ خدا تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے۔ واذکر عبدنا داؤد ذا الاید۔ یاد کرو ہمارے بندے داؤد صاحب قوت کو۔ اور فرمایا ہے والسماء بنیناھا باید ہم نے آسمان کو بنایا

قوت وقدرت سے اور فرمایا ہے ایدھم بروح منہ اور ان کی مدد کی خدا نے اپنے فرشتے مسمی روح سے" یعنی اُن کو قوت دی۔ اور کہتے ہیں (عام محاورہ میں) لفلان عندی ایادی کثیرۃ۔ یعنی فلاں شخص کے مجھ پر بہت سے نعم واحسانات ہیں ولہ عندی ید بیضاء اور اس کی مجھ پہ ید بیضا یعنی نعمت ہے۔

اس امر کے متعلق جناب صادق علیہ السلام نے مختصر کیا اچھا فرمایا ہے۔ ابو بصیر حضرت سے راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ لو ان اللہ تعالیٰ خلق الخلق کُلّھم بیدہ لم تحتج فی ادم انہ خلقہ بیدہ فیقول ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدی افتری اللہ یبعث الاشیآء بیدہ" اگر خدا تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو ہاتھ سے پیدا کیا ہوتا تو خاص کر کے آدم کی بابت یہ دلیل نہ پیش کرتا کہ میں نے اُن کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے۔ اور یہ نہ کہتا کہ ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدی۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ خدا تعالیٰ اشیائے عالم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کرتا ہے" حاصل یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کے ہاتھ ہوتے۔ جیسے ہمارے تمہارے ہاتھ۔ تو لا محالہ وہ اشیائے عالم کو انہی ہاتھوں سے پیدا کرتا۔ پھر آدم میں خصوصیت کیا ہوئی کہ اُن کی نسبت فرمایا کہ میں نے اُسے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا۔ کیا شیطان اُس کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔ یا تمام اشیائے عالم اُس کے کسی اور جزو سے پیدا کی گئی ہیں۔ جو آدمؑ کی نسبت بالخصوص فرمایا کہ میں نے اس کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ پس اگر ید کا لفظ اس آیت میں ہاتھ کے معنی میں ہوتا تو تخصیص حضرت آدمؑ کی فضول تھی۔ کیونکہ سبھی اس کے ہاتھ کے پیدا کئے ہوں گے۔ اگر اس کے ہاتھ ہوں گے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں ید سے مراد ہاتھ نہیں لی ہے۔ بلکہ قوت وقدرت لی ہے۔ جس میں کوئی خرابی نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ آدم جب کہ میں نے اپنی خاص قدرت سے پیدا کیا اور وہ میرا پیدا کیا ہوا مخلوق ہے اور میں تجھ کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا ہوں تو تجھے سجدہ سے انکار کی کیا وجہ ہے۔ یا اگر ید کی معنی یہاں نعمت کے ہوں تو یہ

مطلب ہو گا۔ کہ میں نے آدم کو اپنی نعمت و رحمت سے پیدا کیا کہ جس کا فائدہ عامہ مخلوقات کو پہنچے گا۔ کیونکہ اسی آدم سے وہ بھی پیدا ہونے والا ہے جو سبب خلقت آسمان و زمین ہے اور جو باعث وجود جن وانس و ملائکہ ہے۔ جس کی فنا و بقا پر عالم کی فنا و بقا کا مدار ہے اور جو عامۂ عالم کے لئے رحمت ہے۔ تو پھر تجھے آدم کو سجدہ کرنے سے کیا چیز مانع ہے۔

عبداللہ بن قیس راوی ہیں کہ میں نے جناب ابوالحسن الرضا علیہ السلام کو سُنا کہ فرماتے تھے۔ بل یداہ مبسوطتان۔ تو میں نے عرض کی کہ کیا اس کے دونوں ہاتھ ایسے ہیں (اور میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے آپ کے دونوں ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا) تو آپ نے فرمایا لا۔ لو کان ھکذا لکان مخلوقاً۔ نہیں یہ مراد نہیں ہے اگر ایسا ہوتا۔ یعنی اُس کے دو ہاتھ ایسے ہوتے تو پھر وہ مخلوق ہوتا نہ کہ خالق" یعنی اگر اس کے ہاتھ ہوتے تو وہ مرکب ہوتا۔ اور جب مرکب ہوتا تو حادث ہوتا اور جب حادث ہوتا لامحالہ کسی کا پیدا کیا ہوا ہوتا۔ پھر تو وہ واجب الوجود ہی کیونکر ہو سکتا حالانکہ وہ بے شک واجب الوجود ہے لہذا معلوم ہوا۔ کہ یداہ مبسوطتان سے مراد یہ ہے کہ وہ جواد ہے بخل نہیں کرتا۔

چھٹی آیت: ان تقول نفسٌ یاحسرتیٰ علیٰ ما فرطت فی جنب اللہ" جنب بمعنی امر و معاملہ آیا ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے۔

اما تتقین اللہ فی جنب عاشقٍ   لہ کبدٌ حرّیٰ وعین ترقرقٗ

اے محبوبہ تو عاشق کے معاملہ میں خدا سے ڈرتی نہیں (اور اُسے اپنے ہجر کے صدمے میں جلائے ہی جاتی ہے) جس کا جگر جل رہا ہے (یا سوز غم سے گرم ہے) اور آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں" اور جناب یعنی درگاہ و حرم کے معنی میں بھی آیا ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں۔ فلان لاذ بجنب فلانٍ۔ فلاں شخص نے فلاں شخص کی جناب وحرم میں پناہ لی۔ پس یہ دو صحیح معنی جنب کے اور موجود ہیں۔ تو کیا ضروری ہے کہ وہی معنی زبردستی مراد لئے جائیں جو ناممکن و محال ہیں۔ یعنی پہلو کے معنی جو کسی

طرح خدا تعالیٰ کے لئے درست نہیں ہو سکتے۔

لہذا معنی آیت بضمیمہ آیت سابقہ واتبعوا احسن ما نزل الیکم من قبل ان یاتیکم العذاب بغتۃً وانتم لاتشعرون ان تقول نفسٌ یحسرتیٰ علیٰ ما فرطتّ فی جنب اللّٰہ۔ یہ ہوا کہ اور تمہارے پروردگار کی طرف سے جو اچھی اچھی نصیحت کی باتیں نازل ہوئی ہیں۔ ان پر چلو مگر اس سے پہلے کہ تم پر ناگہاں عذاب آجائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو (کہیں ایسا نہ ہو کہ (آخر کار) تم میں سے کوئی یہ کہنے لگے کہ ہائے افسوس ہے۔ اس پر کہ میں نے خدا تعالیٰ کے معاملہ میں تفریط اور کوتاہی کی (اور اس کو اچھی طرح پورا نہ کیا اور نہ اس کی طرف سے نازل شدہ باتوں پر عمل کیا) اور واقعی قرینہ بھی کہتا ہے کہ گناہ گار لوگ معذب ہوتے وقت یہی کہیں گے کہ افسوس ہم نے خدا کے معاملات میں اچھا برتاؤ نہ کیا۔ اس کی عبادت نہ کی۔ اس کے احکام نہ مانے۔ یہ کوئی نہ کہے گا کہ خدا کے پہلو میں میں نے کوتاہی کی۔ اگر بالفرض کہے بھی تو اس کا مطلب ہی کیا ہو گا۔ پہلو میں کوتاہی کرنا کیا؟ معاملہ میں کوتاہی اور کمی کرنا تو ایک معنی بھی رکھتا ہے!! اور اگر جناب کے معنی لو تو یہ کہو "کہ کوئی کہے گا (معذب ہوتے وقت) کہ افسوس میں نے خدا تعالیٰ کی جناب میں تفریط کی یعنی اس کی تعظیم نہ کی اس کی عبادت پوری طرح نہ ادا کی"۔ اس معنی کی بنا پر بھی کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔ بخلاف معنی پہلو کے۔

یہ بیان تو بنا بر ظاہر کے تھا۔ مگر اس کے باطنی معنی جو آئمہ معصومین علیہم السلام نے بتائے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ جنب اللّٰہ امیر المومنین علیہ السلام وکذلک ما کان بعدہ من الاوصیاء بالمکان الرفیع الی ان ینتھی الامر الی آخرھم" جنب اللہ سے مراد امیر المومنین علیہ السلام اور ان کے بعد کے اوصیاء رفیع المکان ہیں۔ آخر اوصیاء تک تو مطلب آیت کا یہ ہو گا۔ کہ ایہا الناس جو کچھ تم کو ان آئمہ ہدیٰ کی نسبت آیہ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ اور آیہ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ

اور آیہ قل لا اسئلکم علیہ اجرًا الا المودۃ وغیرہ آیات کثیرہ میں حکم دیا گیا ہے اس کی پیروی کرو۔ اور اس پر چلو ورنہ عذاب ناگہانی آجانے پر یہ کہنا پڑے گا۔ کہ ہائے افسوس میں نے جنب اللہ میں یعنی ان آئمہ ہدیٰ کی بابت بہت کوتاہی کی اُن کے حکم پر نہ چلا ان سے محبت نہ کی۔ اُن کو ناحق شہید کیا۔ اُن پر بلاوجہ ظلم کئے۔ اُن پر بے سبب مصیبتیں ڈالیں۔ اور آج حال کھلا کہ بے اُن کی محبت کے عبادت وغیرہ سب بیکار ہے۔ تو اس وقت اس افسوس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ وقت ہاتھ سے نکل گیا ہوگا اور وہ وقت سزا و جزا کا ہوگا نہ کہ افسوس و حسرت کا۔ پس اس سے پہلے ہی ان بزرگواروں کی محبت اختیار کر لو۔ اور ان کو اپنا پیشوا سمجھ کر ان کے حکم کے مطابق عمل کرو۔ کیونکہ ہم نے بہت سے مقام پر قرآن مجید میں اس معاملہ کو ظاہر کر دیا ہے۔

نیز اسی قسم کے معنی تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی مروی ہیں قال الصادق علیہ السلام نحن جنب اللہ۔ حضرت صادق نے فرمایا جنب اللہ سے مراد ہم لوگ ہیں جن کی اطاعت و محبت خدا تعالیٰ نے قرآن میں فرض کی ہے۔

یہ دو قسم کے معنی بیان کئے گئے جن میں کوئی محال لازم نہیں آتا اور نہ خلاف شانِ خدا تعالیٰ کوئی امر لازم آتا ہے پس اگر ان دونوں کو دل تسلیم کرے۔ تو فہوا المراد ورنہ جنب کے معنی طاعت کے بھی آئے ہیں۔ کہتے ہیں ھذا صغیرٌ فی جنب اللہ یہ بات طاعت خدا میں صغیر ہے۔ تو اس صورت میں معنی آیت یہ ہوں گے کہ معذب ہوتے وقت کہیں ایسا نہ کہنا کہ ہائے افسوس میں نے طاعت خدا میں کمی کی! اور جنب کے معنی قرب کے بھی آئے ہیں۔ چونکہ پروردگار عالم اپنی قدرت کی وجہ سے ہر شے سے قریب ہے اور اس کی نسبت ہر چیز سے برابر ہے۔ اس لئے اگر یہ معنی مراد لئے جائیں۔ تب بھی کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔ لیکن بہر صورت پہلو کے معنی ہرگز درست نہیں۔ اور بالکل خلاف عقل ہیں۔ پس کسی مسلم یا غیر مسلم کو یہ حق نہیں ہے کہ ان آیات سے وہی معنی خواہ مخواہ مراد لے۔ جسے عقل قبول نہیں کرتی اور

جس کا مراد ہونا امکان ہی میں نہیں ہے۔

ساتویں آیت: والارض جمیعًا قبضتہ یوم القیٰمۃ والسمٰوٰت مطویات بیمینہ۔ بعض لوگ سمجھے ہیں کہ اس آیت میں قبضہ سے مراد مٹھی ہے اور یمین سے مراد دایاں ہاتھ ہے اور کہتے ہیں کہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کی مٹھی میں زمین ہوگی اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ کہنے والے تو کہہ گئے۔ لیکن یہ نہ سمجھے کہ اس وقت خدا تعالیٰ عز مجدہ وجل قدسہ کی برزخ کیا ہوگی کہ اتنی بڑی زمین تو دبائے ہوئے ہوگا۔ اور تمام آسمانوں کو دائیں ہاتھ پر لپیٹے ہوئے جیسے جولاہے لکڑی کے گولے پر تھان لپیٹتے ہیں یہ کون قطع ہو گی اور کتنا بڑا ہاتھ ہوگا جس پر آسمان لپیٹیں گے۔ اس قسم کے معنی سمجھنے والے وہی بزرگوار ہیں۔ جو عقل کے پیچھے لکڑی لئے دوڑتے پھرتے ہیں کہ کہیں مل جائے تو بغیر مارے نہ چھوڑوں۔ صرف اس جرم میں کہ تو میرے قریب کیوں آئی۔ ورنہ عقلا ہرگز اس سے یہ معنی نہیں سمجھ سکتے۔ اوّل تو مٹھی اور دائیں ہاتھ کا ہونا خدا تعالیٰ کے لئے کیا معنی؟ کیا وہ جسم ہے مثل اور اجسام کے؟ دوسرے یہ کہ اگر بالفرض ہو بھی تو خدا تعالیٰ کو اس حرکت سے فائدہ کیا۔ کہ دائیں ہاتھ میں آسمانوں کو لپیٹے ہوئے ہیں جیسے کرشن جی گلے میں اور بازوؤں میں بہت سے سانپ لپیٹے رہتے تھے۔

لہذا قبضہ سے مراد مٹھی اور یمین سے مراد دایاں ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مطلب آیت کا یہ ہے کہ آج تو تم لوگ یہ سمجھ رہے ہو کہ زمین ہمارے قبضے اور اختیار میں ہے۔ لیکن قیامت کے دن معلوم ہوگا کہ زمین و آسمان کس کے قبضے میں ہے اس دن تو خدا تعالیٰ کے سوا یہ کہنے والا ہوگا ہی نہیں کہ میں مالک ہوں اور وہ مالک ہے بلکہ اس دن تو صرف اسی کا ملک ہوگا۔ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ اور اس دن زمین و آسمان خالص اس کے اختیار میں ہوں گے۔ پس قبضہ و یمین سے مراد اختیار و تسلط ہے۔ نہ سچ مچ کی مٹھی یا ہاتھ (سمجھو اور زیادہ نہ بہکو)۔

سلیمان بن مہران راوی ہے کہ میں نے ابو عبداللہ علیہ السلام سے سوال کیا کہ

والارض جمیعاً قبضتہ یوم القیامۃ کے کیا معنی ہیں؟ آپ نے فرمایا یعنی ملکہ لا یملکہا معہ احدٌ والقبض من اللہ تعالیٰ فی موضع آخر المنع والبسط منہ العطآء والتوسیع کما قال عزوجل واللہ یقبض ویبسط والیہ ترجعون یعطی ویوسع ویمنع ویضیق والقبض منہ عزوجل فی وجہ آخر الاخذ والاخذ فی وجہ القبول منہ کما قال ویاخذ الصدقات اے یقبلہا من اہلہا من اہلہا ویثیب علیہا قلت فقولہ، عزوجل والسمٰوٰت مطویات بیمینہ قال الیمین الید والید القدرۃ والقوۃ یقول عزوجل والسمٰوٰت مطویات بقدرۃ وقوتہ سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون۔ (توحید بحار) یعنی تمام زمین اُسی کی سلطنت میں ہوگی۔ اس کے سوا کوئی مالک اُس کا نہ ہوگا۔ اور دوسرے مقام پر قبض کے معنی قرآن میں منع کے ہیں اور بسط کے معنی عطا اور توسعہ کرنے کے جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ واللہ یقبض ویبسط اللہ روک لیتا ہے اور زیادہ عطا کرتا ہے۔ یعنی جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے یا نہیں دیتا اور جسے چاہتا ہے زیادہ عطا فرماتا ہے۔ نیز قبض کے معنی دوسرے طور پر اخذ کے ہیں۔ اور اخذ کے معنی ایک طور پر قبول کرنے کے آئے ہیں جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ ویاخذ الصدقات یعنی اللہ تعالیٰ صدقوں کو قبول کرتا ہے اہل صدقہ سے اور اس پر انہیں ثواب دیتا ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے عرض کی کہ "والسمٰوٰت مطویات بیمینہ" کے کیا معنی ہوئے؟ آپ نے فرمایا۔ یمین کے معنی ہاتھ کے بھی ہیں۔ قدرت کے بھی۔ قوت کے بھی۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمام آسمان اُس دن اس کی قدرت و قوت میں ہوں گے۔ خدا تعالیٰ پاک ہے اُس شرک سے جو مشرکین کہتے یا کرتے ہیں۔

اور جناب امام حسن عسکری علیہ السلام سے مروی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام زمین کو قیامت کے دن مٹھی میں دبائے ہو گا۔ اور آسمانوں کو داہنے ہاتھ پر لپیٹے ہو گا۔ یہ خدا تعالیٰ کو عیب لگاتا ہے کیونکہ اس میں خدا تعالیٰ کو اس کی مخلوقات سے مشابہ بناتا ہے حالانکہ وہ اپنی مخلوقات

سے مشابہ نہیں۔ الاتری انہ قال وما قدروا اللہ حق قدرہ معناہ اذا قالوا ان الارض جمیعاً قبضتہ یوم القیامۃ والسمٰوٰت مطویات بیمینہ کما قال عز وجل وما قدروا اللہ حق قدرہ اذا قالوا ما انزل اللہ علیٰ بشر من شیئٍ ثم نزّہ عز وجل نفسہ عن القبضۃ والیمین فقال سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتا۔ وَمَا قدروا اللہ حق قدرہٖ ۔ یعنی جو عظمت خدا تعالیٰ کی کرنی چاہیئے۔ ان لوگوں نے نہیں کی۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب یہود وغیرہ نے کہا کہ زمین تمام خدا تعالیٰ کی مٹھی میں قیامت کے دن ہوگی اور تمام آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے (تو یہ ایسی بات تھی کہ شان خدا تعالےٰ کے لائق نہ تھی۔ کیوں کہ اس کے لئے ہاتھ اور مٹھی کہاں) چنانچہ خدا تعالیٰ نے فرمایا وَمَا قَدَرُوا اللہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ۔ جب کہ ان لوگوں نے یہ کہا کہ اللہ نے تو انسان پر کوئی وحی وغیرہ نازل ہی نہ فرمائی۔ پھر خدائے عزوجل نے مٹھی اور داہنے ہاتھ سے اپنی تنزیہ فرمائی (یعنی کہ میرے واسطے یہ چیزیں نہیں ہیں) اور فرمایا کہ وہ پاک و برتر ہے اس سے جو یہ مشرکین شرک کی باتیں کرتے۔ (اور کہتے) ہیں (کہ خدا تعالیٰ کی مٹھی میں زمین اور داہنے ہاتھ پر لپٹا ہوا آسمان ہوگا۔)

حاصل اس حدیث کا ایک لطیف مطلب کی طرف راجع ہے جو نفس عبارت قرآن مجید سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی کہ یہ قول مشرکین کا تھا۔ جو اس کے واسطے ہاتھ اور مٹھی ثابت کرتے تھے۔ جس سے خدا تعالیٰ نے اپنی برأت آپ فرمائی۔ اور کہہ دیا کہ سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون ۔ اور حدیث سابق میں جو جناب صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ تفسیر بحسب ظاہر ہے۔ غرض یہ کہ قرآن مجید چونکہ ذو محامل ہے اور اس سے کئی کئی صحیح مطلب پیدا ہو سکتے ہیں اس لئے[1] مفسّر کو بنا برارشاد القرآن ذو محامل فاحملوہ علیٰ احسنھا۔ اس کے لئے احتمال بیان کرنے کا اختیار ہے بشرطیکہ وہ احتمالات صحیح بھی ہو سکتے ہوں۔ نہ یہ کہ ویسا احتمال جو ابوالحسن اشعری

---

[1] قال المجلسی علیہ الرحمۃ ھذا وجہ حسن لم یتعرض لہ المفسرون۔

نے بیان کیا کہ اس سے مراد مٹھی اور ہاتھ ہے۔ جس سے حدوث خدا تعالیٰ لازم آتا ہے۔ اعوذ باللہ من ہذا القول۔

آٹھویں آیت: وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (سورہ ہود رکوع ۴) عین کا لفظ مشترک ہے۔ کثیر معنوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً حقیقت۔ ذات۔ شے۔ دریا۔ آفتاب نگہبان۔ آنکھ۔ گھٹنہ وغیرہ وغیرہ پس جب کہ تقریباً ستر معنی اس لفظ کے ہیں۔ تو ان میں سے بالخصوص وہی معنی ضد کر کے مراد لینے جو اس موقع پر نہ بن سکیں اور نہ جس کا کوئی قرینہ ہو۔ سوائے جہل مرکب کے اور کچھ نہیں۔ کیونکہ ایک حکیم کا کلام جو ذو وجہین ہو کبھی اُس پہلو پر حمل نہیں کیا جاسکتا۔ جو اس کی مراد نہ ہوسکے بلکہ اس سے وہی معنی سمجھا جائے گا جو وہاں درست بھی ہوسکتا ہے تو یہ کہنا کہ مراد اس آیت کی یہ ہے کہ اے نوحؑ تم کشتی کو میری آنکھ (جو سر میں ہوتی ہے) کے سامنے بناؤ اور میری وحی سے بناؤ۔ الخ جیسا کہ بعض اسلامیوں کا خیال ہے سوائے ہٹ دھرمی کے اور کچھ نہیں اور جب کہ احتمال مجاز بھی عبارت میں موجود ہو۔ تو کیا وجہ کہ اُس مجاز پر اُسے حمل نہ کیا جائے؟ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے بہت سے موقعوں پر مجازات کا استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے (نقل قول فرعون) يَا هَامَانُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا اے ہامان میرے لئے ایک بلند مکان بنا۔ حالانکہ واضح ہے کہ ہامان کسی طرح صرح (مکان بلند) کو نہیں بنا سکتا تھا۔ بلکہ وہ معماروں کو حکم دیتا تو وہ اسے تیار کر دیتے۔ لیکن از بسکہ یہ فعل ہامان کے حکم سے ہوتا۔ اس لئے خود ہامان کی طرف اس فعل کی نسبت دے دی۔ علیٰ ہذا القیاس اور بھی بہت مجازات ہیں۔ مثلاً يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْ اٰذَانِهِمْ۔ کان کے اندر پوری انگلی کسی طرح نہیں جاسکتی۔ لیکن کل کا اطلاق جزو پر کر کے مجازاً یہ فرما دیا کہ وہ لوگ اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔ حالانکہ صرف انگلیوں کے سرے کان میں جاسکتے ہیں۔ پس کیوں ناممکن ہے کہ یہ معنی مراد ہو کہ اے نوحؑ تم کشتی کو ہمارے

حضور میں اور سامنے بناؤ۔ یا یہ کہ ہماری حفاظت اور نگہبانی میں۔ ہم تمہارے حافظ ہیں۔ کوئی کافر تم کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔ اور نہ اُس کے بنانے سے تمہیں کوئی روک سکتا ہے؟ اور کیوں خواہ مخواہ اعین سے مراد آنکھیں ہی لی جائیں۔ جس سے تجسّم باری تعالیٰ لازم ہے جو محال ہے وہاں اگر کوئی دلیل عقلی اس کی آنکھیں ہونے پر موجود ہو۔ تو اسے پیش کرنا چاہیئے۔ تاکہ اس میں نظر کی جائے یا اگر کسی نے خود خدا تعالیٰ کو دیکھا ہو کہ اس کے لئے سر ہے اور سر میں دو آنکھیں بھی ہیں۔ تو اُسے لازم ہے کہ باقاعدہ گواہی دے ورنہ ایسا ذلیل قول کبھی تسلیم نہیں ہو سکتا۔

نویں آیت: كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ۔ اس آیت سے بعض اہلِ اسلام نے یہ سمجھ لیا ہے کہ خدا تعالیٰ پردے کے پیچھے بیٹھے گا اور گناہ گاروں کو اپنی صورت نہ دکھائے گا۔ وتعالی اللہ عن ذالک۔ اس کم عقل نے خدا تعالیٰ کو خاصہ آدمی بنایا ہے۔ جو پردے کے پیچھے چھپ کر بیٹھتا ہے اس عقل مند کو یہ نہ معلوم ہوا کہ حجاب کے اور بھی کئی معنی آئے ہیں۔ جو یہاں صحیح ہو سکتے ہیں نہ کہ حجاب بمعنی پردہ کے ہو۔ کیوں یہ بات جائز نہیں کہ محجوب بمعنی ممنوع ہو۔ یعنی انھم عن ربھم الممنوعون۔ وہ گناہ گار خدا تعالیٰ کے قرب سے ممنوع ہوں گے اور کیوں نہ یہ مراد بھی جائے کہ عن ربھم سے مراد عن ثواب ربھم یعنی وہ گناہ گار اپنے پروردگار کے ثواب سے محروم رہیں گے۔ اور واقعی یہ معنی درست بھی معلوم ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے چھپ کر بیٹھنے سے گناہ گاروں کو کیا تکلیف پہنچے گی۔ آج ہی کب لوگوں کے سامنے آتے ہیں۔ جو اس دن چھپ کر بیٹھیں گے۔ بلکہ بسبب گناہ کے ثواب سے البتہ محروم رہیں گے۔ چنانچہ یہ معنی امام رضا علیہ السلام سے بھی مروی ہیں۔ محمد بن بابویہ علیہ الرحمہ نے اپنی اسناد سے علی بن فضال سے اور اس نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ امام رضا علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کلّا انھم عن ربھم یومئذٍ لمحجوبون۔ کے کیا معنی ہیں تو آپ نے فرمایا۔ ان اللہ تبارك و تعالیٰ لا یوصف بمکان یحلّ فیہ فیحجب عنہ فیہ عبادۃ ولکنہ یعنی انھم

عن ثواب ربھم لمحجوبون ۔ بے شک خدا تعالیٰ کسی مکان کے ساتھ موصوف نہیں ہو سکتا جس میں وُہ داخل ہو اور وہاں اپنے بندوں سے چھپ کر بیٹھے ۔ لیکن اس کا مطلب اس ارشاد سے یہ ہے کہ گناہ گار و کفار ثواب سے اپنے رب سے محروم رہیں گے ۔

دسویں آیت: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ۔ (سورہ شوریٰ) کسی آدمی کے لئے سزاوار نہیں ہے کہ اُس سے خدا تعالیٰ کلام کرے مگر بذریعہ وحی کلام کرتا ہے یا وراء حجاب سے ۔ بعض عقل مند مسلمانوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ بیچ میں چلمن یا پردہ ڈال کے اور پیچھے اُس کے بیٹھ کے خدا تعالیٰ اپنے بندہ سے کلام کرتا ہے ۔ حالانکہ اس سے تجسّم لازم آتا ہے ۔ جو محال ہے ۔ پس یہ معنی بھی لغو اور محال ہوگا ۔ تو اس سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ وُہ کلام کو کسی ایسے جسم میں پیدا کر دیتا ہے ۔ جو دوسرے بات کرنے والے سے مخفی ہو اور مخاطب اس سے گفتگو سنتا ہو ۔ مگر اس کے محل کو نہ جانتا ہو جیسا کہ جناب موسیٰؑ سے کلام ہُوا کہ پہلے تو درخت سے آواز آئی ۔ اور پھر جس طرف رُخ کرتے تھے ۔ اُدھر ہی سے آواز آتی تھی ۔ یا یہ کہ حجاب سے مُراد کوئی درمیانی شخص ہو جس کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ اپنے کلام کو مخاطب تک پہنچاتا ہو ۔ جیسے جبرئیل علیہ السلام تھے کہ ان کے ذریعہ سے رسُولِ خدا یا اور رسولوں تک کلام خدا پہنچا تھا یا یہ مطلب ہو کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے بر سبیل وحی کلام کرتا ہے ۔ یا بطریق خفاء و بعُد مثلاً ایسی علامتیں اور دلیلیں قائم کر دیتا ہے ۔ جن کے معلوم کرنے اور دیکھنے سے مقصود پروردگار عالم واضح ہو جاتا ہے جیسا کہ فرمایا سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ یہ اس کی نشانیاں اور دلیلیں جو آثار قدرت و صنعت ہیں ۔ وہی گویا کلامِ خدا ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پروردگارِ عالم کہہ رہا ہے کہ دیکھو میں خالق الخلق اور مالک الملک ہوں جس نے یہ آثار حکمت ظاہر کر کے تمہیں دکھائے ہیں یا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ وراء حجاب

سے گفتگو کرتا ہے۔ یعنی جس سے چاہتا ہے اس کلام کو مخفی رکھتا ہے اور جس پر چاہتا ہے ظاہر کر دیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ سے کلام کرنے میں پہلی مرتبہ اس طرح گفتگو ہوئی کہ وہ سن سکے اور دوسرا کوئی اس سے واقف نہ ہو سکا۔ اور دوبارہ کی گفتگو میں وہ اور دیگر ستر آدمی جو اُن کے ہمراہ تھے۔ وہی اس گفتگو کو سُن سکے اور باقی لوگوں تک وہ آواز نہ پہنچی۔ پس جب کہ یہ احتمالات صحیحہ موجود ہیں تو خواہ مخواہ پردہ مراد لینے سے کیا فائدہ سوائے اس کے کہ اپنی عقلمندی ظاہر کی جائے۔

گیارہویں آیت: يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ۔ جس دن ساق کھل جائے گی اور وہ لوگ (کفار) سجدہ کرنے کے لئے پکارے جائیں گے۔ پس قادر نہ ہو سکیں گے۔"

کشف ساق سے مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا تو مومن لوگ اسے دیکھ کر سجدہ میں جھک جائیں گے اور منافقین نہ جھک سکیں گے۔" پناہ بخدا ایسے افترا سے۔ پروردگار عالم کو پنڈلی کھول کر دکھلانے کی کیا ضرورت ہے۔ منہ ہی کیوں نہ دکھلا دے گا۔ خدا تعالیٰ کو بھی کیا تماشا ان لوگوں نے بنایا ہے۔ عقل سے بالکل ناراض ہو کر اسے بالکل ہٹا دیا ہے اور جو جی آتا ہے بک دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابن مسعود نے یہ روایت رسولؐ خدا سے بیان کی ہے۔ جیسا کہ کشاف زمخشری میں مذکور ہے۔ ایک تو یوں ہی جھوٹ بولنا کس قدر حلال ہے اُس پر خدا کے حبیبؐ پر اتہام لگانا کہ حضرت نے ایسا فرمایا ہے کس قدر حلال اور جائز ہو گا؟ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ۔ مگر بے چارے صاحب کشاف نے خود اس رائے کو قبول نہیں کیا ہے اور لکھا ہے کہ

الكشف عن الساق والابداء عن الخدام مثل فی شدة الامر وصعوبة الخطب واصله فی الروع والهزيمة وتشمير المخدرات عن سوقهن فی الهرب وابداء خدامهن عند ذلك قال حاتم ـ

اخو الحرب ان عضت به الحرب عضها وان شمرت عن ساقها الحرب شمرا

وقال ابن الدقیات ؎

تذھیل الشیخ عن بنیہ وبتدی عن خدام العقیلۃ العذراء

نعنی یوم یکشف عن ساق فی معنی یوم یشتد الامر ویتفاقم ولا کشف ثم ولاساق کما تقول للاقطع الشحیح یدہ مغلولۃ ولا ید ثم ولا غل وانما ھو مثل فی البخل انتھی بقدر الحاجۃ۔ یعنی کشف عن الساق اور پردے کا ہٹ جانا یہ ایک مثل ہے۔اس وقت بولی جاتی ہے جب کہ کوئی امر شدّت کا واقع ہو مثلاً لڑائی وغیرہ اور اصل اس مثل کا موقع گریز اور شکست میں ہے اور عورتوں کا اپنی پنڈلیو پرسے چادر کا ہٹا لینا اور پردے کو کھول دینا اسی وقت ہوتا ہے جب کہ بھاگنا مقصود ہو۔ دیکھو حاتم نے کہا۔جس کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ میرا ممدوح ایسا لڑنے والا ہے کہ اگر لڑائی اس کو اپنے دانتوں سے کاٹے تو وہ بھی اُسے اپنے دانتوں سے کاٹتا ہے۔یعنی جب وہ اس پر شدت کرتی ہے تو یہ بھی اس پر شدت کرتا ہے اور جب لڑائی اپنی پنڈلیوں سے دامن اٹھالیتی ہے۔یعنی اسباب جنگ مہیا ہو جاتے ہیں اور لڑائی ٹھن جاتی ہے۔تو وہ بھی اپنی پنڈلیوں سے دامن اٹھالیتا ہے یعنی وہ بھی آمادۂ جنگ ہو جاتا ہے اور ابن دقیات نے کہا۔جس کے شعر کا یہ حاصل ہے کہ بڈھا آدمی بھی اپنی اولاد سے غافل ہو جائے گا (بظاہر اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت کا دن ایسا سخت ہو گا۔یا یہ کہ کسی لڑائی کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس وقت یہ حالت ہو رہی ہے) اور جوان خوبصورت عورت اپنے منہ پر سے نقاب ہٹالے گی یا لیتی ہے۔پس معنی یوم یکشف عن ساق یہ ہیں کہ قیامت کا دن نہایت سخت ہو گا۔نہ یہ کہ وہاں کشف ساق ہو گا۔جیسا کہ تو کسی بخیل کی بابت کہتا ہے کہ اُس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔حالانکہ نہ وہاں مراد ہاتھ ہیں اور نہ بیڑیاں بلکہ بخل مراد ہے۔

غرض یہ کہ یوم یکشف عن ساق سے یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی پنڈلی کھول لوگوں کو دکھلائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس دن امر سخت پیش ہو گا۔یعنی

قیامت کا روز ہوگا۔ سوا نیزہ پر آفتاب آجائے گا۔ زمین حرارت آفتاب سے تپتی ہوگی۔ تمام انسان وغیرہ محضر حساب میں طلب ہوں گے۔ تمام امم و انبیاء موجود ہوں گے۔ ہر شخص کو نفسی نفسی کی پڑی ہوگی اور وہ شدت و سختی اُن سے کہتی ہوگی کہ اب بھی تو خدا کو سجدہ کرلو مگر اُن میں نہ طاقت ہوگی اور نہ یہ ہوسکے گا کہ سجدہ کرلیں۔

یہی وجہ تھی کہ جب جناب صادق علیہ السلام کے سامنے اس معنی کا ذکر آیا۔ جو عوام الناس نے مراد لئے ہیں۔ تو آپ نے سر پہ ہاتھ رکھا اور تعجب سے سبحان ربی الاعلیٰ فرمایا۔ چنانچہ ابن بابویہ علیہ الرحمۃ نے روایت کی ہے عبید بن زرارہ سے اس نے جناب صادق علیہ السلام سے قال سئلتہ عن قول اللہ عزوجل یوم یکشف عن ساق قال کشف ازارہ عن ساق و وضع یدہ الاخری علی راسہ فقال سبحان ربی الاعلیٰ "یعنی راوی کہتا ہے میں نے حضرت کے سامنے اس آیت کو پڑھا تو آپ نے چادر اپنے ساق سے ہٹائی (اور ظاہر فرمایا کہ کیا لفظ ساق سے جو قرآن میں ہے یہ ساق مراد لیتے ہو؟) اور دوسرا ہاتھ آپ کا سر پر تھا اور فرمایا کہ پاک ہے میرا بلند رتبہ پروردگار (اس سے کہ اُس کے لئے ساق ہو جسے وہ کھولے)

بارہویں آیت: وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا "(سورہ فجر جزو ۳۰)۔

اور آئے گا (قیامت کے دن) حکم تیرے پروردگار کا اور فرشتے صف بصف "جَآءَ رَبُّكَ سے بعض مسلمان بھی یہ سمجھے ہیں کہ خدا تعالیٰ قیامت کے دن خود مجمع عام میں آئے گا اور لوگ اس کو دیکھیں گے " مگر جس وقت جناب امام رضا علیہ السلام سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا اِنَّ اللہ عزوجل لا یوصف بالمجی والذھاب تعالیٰ عن الانتقال انما یعنی بذلک وجآء امر ربک و الملک صفاً صفاً۔ بے شک خدا تعالیٰ کی صفت آنا جانا نہیں ہے۔ وہ نقل مکانی سے برتر ہے۔ بلکہ صرف اس آیت سے مراد یہ ہے کہ آئے گا امر تیرے رب کا۔ اور فرشتے صف بصف " مولانا طبرسی علیہ الرحمۃ نے تحریر فرمایا۔ وَجَآءَ رَبُّكَ قضائہ و

محاسبه عن الحسن والجبائی۔ وقیل جاء امرہ الذی لا امر معه بخلاف الدنیا عن ابن مسلم۔ وقیل جاء جلائل آیاته فجعل مجیئها مجیئه تفخیما لامرها۔ یعنی حسن اور جبائی نے بیان کیا ہے کہ جاء ربّک سے مراد احکام الٰہیہ اور محاسبہ کا پیش ہونا ہے۔ اور ابن مسلم کا خیال ہے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں۔ جس وقت آئے گا امر و حکم اس کا جس کے ساتھ کوئی امر نہ ہو گا۔ بخلاف دنیا کے کہ یہاں تو اور لوگ بھی مدعی امر و حکم ہیں۔ مگر وہ وقت ایسا ہو گا کہ سوائے حکم خدا کے کسی کا حکم نہ ہو گا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ جَآءَ رَبُّکَ سے مراد یہ ہے کہ جس وقت اس کے بڑے بڑے آیات و آثار قدرت ظاہر ہوں گے۔" اور چونکہ وہ جلائل آیات نہایت معظم ہوں گے۔ اس لئے اُن کے ظہور کو خدا تعالیٰ نے اپنے آنے سے تعبیر فرمایا ہے۔

تیرھویں آیت: هَلْ يَنْظُرُونَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ۔ (سورہ بقر رکوع ۹) یہاں بھی اتیان سے خدا تعالیٰ کا آنا مراد لیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ آئے گا اس طرح کہ ابر کا چھتر اس کے سر پر لگا ہو گا۔ لیکن یہ قول بھی حماقت پر مبنی ہے۔ بلکہ مراد اس سے یہ ہے کہ هل ينتظر هؤلاء المكذبون بآيات الله الا ان ياتيهم امر الله او عذاب الله وما توعدهم به على معصيته في ستر من السحاب وقيل من قطع السحاب۔ یعنی کہ نہیں انتظار کرتے یہ جھٹلانے والے مگر اس امر کا کہ حکم خدا یا عذاب آ ہی جائے۔ اور جس عذاب سے تم (اے رسولؐ) اُن کو ڈراتے ہو وہ اُن ہی پڑے بادل کے پردے میں یا بادل کے ٹکڑے میں۔" (تفسیر مجمع البیان) اور حاصل اس کا یہ ہے کہ یہ کفار و مشرکین تو عذاب خدا کے نازل ہونے کے منتظر ہیں اور بغیر اس کے ایمان نہ لائیں گے۔"

مگر اس سے بہتر ایک تفسیر معصوم سے مروی ہے۔ علی بن فضال کہتے ہیں کہ میں نے جناب امام رضا علیہ السلام سے اس آیت کی نسبت سوال کیا تھا تو آپ نے فرمایا

کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ھل ینظرون الا ان یاتیھم اللہ بالملائکۃ فی ظلل من الغمام۔ یعنی یہ مشرکین و منکرین تو صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ خدا تعالے اپنے فرشتوں کو بادل کے سایہ میں اور اس کے چھتر کے نیچے لائے۔" (تب یہ مسلمان ہوں گے۔" ورنہ کافر ہی رہیں گے) اس کے بعد آپ نے فرمایا ھکذا نزلت یہ آیت اس طرح نازل ہوئی تھی۔" مگر لوگوں نے بالملائکۃ کی جگہ والملائکۃ پڑھنا شروع کر دیا۔

چودھویں آیت: سَخِرَ اللّٰہُ مِنْھُمْ۔

پندرھویں آیت: اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ

سولھویں آیت: مَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ۔

سترھویں آیت: یُخَادِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ۔" ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے بظاہر خود اپنی طرف نسبت تمسخر یہ (مسخراپن) استہزاء (ٹھٹھا) اور مکر اور خدع (فریب) کی دی ہے لیکن مطلب ان آیتوں کا یہ ہے کہ منافقین و کفار جو خدا تعالیٰ سے مسخراپن۔ ٹھٹھا۔ مکر اور فریب کرتے ہیں تو خدا تعالیٰ بھی ان کو پورا عوض اس مسخراپن اور مکر و فریب کا دے گا۔

مولانا طبرسی علیہ الرحمہ نے یستھزء بھم کی تفسیر میں لکھا ہے قیل فی معنی الاٰیۃ وتاویلھا وجوہ احدھا ان یکون معنی اللہ یستھزؤ بھم یجازیھم علی استھزئھم والعرب سمّی الجزاء علی الفعل باسمہ وفی التنزیل وجزاؤ سیئۃ سیئۃ مثلھا وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ وقال عمرو ابن کلثوم ؎

الا لا یجھلن احدٌ علینا ... فنجھل فوق جھل الجاھلینا

وانما جاز ذالک لان حکم الجزاء ان یکون علی المساواۃ وثانیھا ان یکون معنی استھزاء اللہ تعالیٰ بھم تخطیئۃ ایاھم وتجھیلہ لھم فی اقامتھم علی الکفر واصرارھم علی الضلال والعرب یقیم الشیٔ مقام ما یقع بہ فی معناہ قال الشاعر ؎

ان دهرًا یلف شملی بسعدٍ لزمان یهم بالاحسان

وقال آخر

کم اناس فی نعیم عمروا فی ذری ملك تعالی فسبق

سکت الدهر زمانا عنهم ثم ابکاهم دمًا حین نطق

والدهر لا یوصف بالسکوت والنطق والهم وانما ذکر ذلك علی الاستعارة والتشبیه ثالثها ان یکون بمعنی الاستهزاء المضاف الیه تم ان یستدرجهم ویهلکهم من حیث لا یعلمون وقد روی عن ابن عباس انه قال فی معنی الاستدراج انهم کلما احدثوا خطیئةً جدد الله لهم نعمةً وانما سمی هذا الفعل استهزاء لان ذالك فی الظاهر نعمةً والمراد به استدراجهم الی الهلاك والعقاب الذی استحقوه بما تقدم من کفرهم - انتهی بقدر الحاجة۔

اور اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ وهذه الوجوه الذی ذکرنا ها یمکن ان یذکر فی قول تعالی ویمکرون ویمکر الله ویخادعون الله وهو خادعهم۔ انتہی - یعنی اس آیت کے معنی اور تاویل میں کئی وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالے ان لوگوں کو جو خدا کو ٹھٹھا کرتے ہیں۔ ان کے اس فعل کا بدلہ دے گا۔ عرب کا دستور ہے کہ وہ بدلہ کو اُس فعل کے نام کے ساتھ تعبیر کیا کرتے ہیں۔ دوسرے مقام پر بھی قرآن مجید میں ہے جزاء سیئة سیئةٌ مثلها برائی کا بدلہ ویسا ہی برائی ہے۔ اور ان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به یعنی اگر کسی پر عتاب کرو تو ویسا ہی عتاب کرو جیسا تم پر عتاب کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر فعل کا بدلہ اُس کے موافق ہُوا کرتا ہے۔" عمرو بن کلثوم کہتا ہے۔ کوئی ہم سے جہالت نہ کرے۔ ورنہ ہم بھی جہالت کرنے والوں کی جہالت سے زیادہ کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہم سے جہالت کی رُو سے شر و فساد کرے گا تو ہم بھی اس سے زیادہ اس کو نقصان پہنچائیں گے۔ نہ یہ مطلب ہے کہ اس کے ساتھ جہالت کریں گے۔ یہ بات صرف اس وجہ سے جائز ہوئی کہ جزا کو اس فعل کے مساوی ہونا چاہیے جس

کی وہ جزا ہے۔ دوسرے معنی آیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ خدا کے استہزار کرنے کے یہ معنی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطا بیان کرتا ہے اور اُن کے افعال کی وجہ سے جاہل بتاتا ہے۔ کیونکہ عرب کا دستور ہے کہ وہ کسی شئے کو اس کے قریب والی شئے سے مسمّیٰ کرتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے وہ زمانہ جو سعادت کے ساتھ کبھی مجھے جمع کر دیتا ہے۔ تو پھر اُس پر غم کھانے لگتا ہے کہ میں نے کیوں اس کم بخت کو نیک بخت کیا چاہئے تھا کہ ہمیشہ اس کو مصائب و تکلیف ہی میں رکھتا ہے

شاعر نے زمانہ کو سکوت اور گویائی سے متصف کیا ہے حالاں کہ زمانہ ان صفات سے فی الحقیقۃ متصف نہیں ہوتا۔ تو صرف بطور استعارہ و تشبیہ کے ایسا کیا گیا ہے۔ تیسرے معنی اس آیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ کفار مستہزئین کے ساتھ خدا تعالیٰ معاملہ استدراج کرتا ہے یعنی کہ وہ کفر و شرک کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ ان کو نعمت دیتا ہے گویا مطلب یہ ہوا کہ دیکھو تم تو ہماری مخالفت کرتے ہو اور ہم تمہیں دیتے ہیں تاکہ آہستہ آہستہ تم کو ہلاکت میں ڈالیں اور یہی تاویلیں یمکرون ویمکراللہ ویخادعون اللہ وھو خادعھم میں جاری ہو سکتی ہیں۔

نیز امام رضا علیہ السلام سے توحید بحار میں مروی ہے۔ قال ان اللہ تع لا یسخر ولا یمکر ولا یستھزء ولا یخادع ولکنہ تع تعالیٰ یجازیھم جزاء السخریۃ وجزاء الاستھزاء وجزاء المکر والخدیعۃ تعالی اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا" آپ نے فرمایا۔ کہ بے شک خدا تعالیٰ کسی سے مسخراپن نہیں کرتا۔ فریب کاری نہیں کرتا لیکن وہ ان (مشرکوں) کو سخریہ کا بدلہ دے گا۔ مکر و فریب کا بدلہ دے گا (جو یہ لوگ اس سے کرنا چاہتے ہیں) خدا تعالیٰ اس سے بہت برتر ہے۔ جو ظالمین (اس کی شان میں) کہتے ہیں (کہ وہ مذاق یا ٹھٹھا یا مکر و فریب کرتا ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔)

اٹھارہویں آیت: ویحمل عرش ربک فوقھم یومئذٍ ثمانیۃ۔ اور (اے رسول) تیرے پروردگار کے عرش کو اپنے اوپر دیا

تمام ناؤس کے اوپر) اُس دن (یعنی قیامت کے روز) آٹھ (فرشتے) اٹھائے ہوں گے۔ (سورہ حاقہ جزو ۲۹) کافی میں جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ عرش سے مراد (اس مقام پر) علم ہے وقال حملۃ العرش والعرش العلم ثمانیۃ اربعۃ منا واربعۃ ممن شاء اللہ۔ عرش کے اٹھانے والے جس سے مراد علم ہے۔ آٹھ شخص ہوں گے۔ چار شخص ہم میں سے ہوں گے۔ اور چار جن لوگوں میں سے خدا چاہے گا۔ اور ایک دوسری حدیث میں مروی ہے۔ حملۃ العرش ثمانیۃ اربعۃ من الاولین واربعۃ من الآخرین فاما الاربعۃ من الاولین فنوحؑ وابراہیمؑ وموسیٰؑ وعیسیٰؑ واما الاربعۃ من الآخرین فمحمدؐ وعلیؑ والحسنؑ والحسینؑ ومعنی یحملون العرش یعنی العلم (تفسیر صافی) عرش کے اٹھانے والے آٹھ ہوں گے چار اولین میں سے اور چار آخرین میں سے۔ لیکن اولین میں سے تو نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ہوں گے اور چار آخرین میں سے پس محمدؐ اور علیؑ اور حسنؑ اور حسینؑ ہوں گے۔

انیسویں آیت: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ۔ اللہ کو ان لوگوں (یعنی کفار و منافقین) نے بھلا دیا پس اللہ بھی اُن کو بھول گیا۔ خدا تعالیٰ کے لئے بھول چوک تو ناممکن ہی ہے۔ چنانچہ خود فرماتا ہے۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا۔ تیرا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے۔ لیکن اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اُن لوگوں نے خدا تعالیٰ کی یاد اپنے دلوں سے بھلا دی ہے اور اُس کی پروا نہیں کرتے۔ اسی طرح پروردگار عالم بھی اُن کو عذاب میں مبتلا کر کے چھوڑ دے گا اور پھر اُن کی کچھ پروا نہیں کرے گا۔ علامہ طبرسی علیہ الرحمہ نے تفسیر مجمع البیان میں تحریر فرمایا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ طاعت خدا تعالیٰ چھوڑ دی ہے اس لئے خدا تعالیٰ بھی اُن کو جہنم میں ڈال کر چھوڑ دے گا۔ اور اُن پر رحم نہ کرے گا۔ اور نہ اُن کو ثواب دے گا اور کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ معنی آیت یہ ہے کہ جس طرح ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کو مثل ایک بھولی ہوئی شے کے قرار دے لیا ہے۔ یعنی کہ کچھ اس کے معاملہ میں نہیں

سوچتے کہ اُن کا کوئی صانع وخالق ومثیب ومعاقب بھی ہے یا نہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی اُن کو مثل بھول ہوئی شے کے کر دیا ہے کہ اُن کو ثواب نہ دے گا۔ اور یہ کلام یعنی نسوا اللّٰہ فنسیھم بسبب ازدواج کلام کے ہے۔ جو منجملہ صنائع کلامیہ کے ہے انتہی ملخص التفسیر۔

عبدالعزیز سے مروی ہے کہ میں نے جناب امام رضا علیہ السلام سے دریافت کیا کہ قول خدا تعالیٰ نسوا اللّٰہ فنسیھم سے کیا مراد ہے تو آپ نے فرمایا ان اللّٰہ تبارک وتعالیٰ لاینسی ولا یسھو وانما ینسی ویسھوا المخلوق المحدث الا تسمعہ عز وجل یقول وما کان ربک نسیا وانما یجازی من نسیہ ونسی لقاء یومہ بان ینسیھم۔ انفسھم کما قال اللّٰہ تعالیٰ لا تکونوا کالذین نسوا اللّٰہ فانسٰھم انفسھم اولئک ھم الفسقون۔ وقال تعالیٰ فالیوم ننسٰھم کما نسوا لقاء یومھم ھذا ای نترکھم کما ترکوا الاستعداد للقاء یومھم ھذا۔"

بیشک خدا تعالیٰ کو بھول اور چوک نہیں ہوتا۔ پس اگر ہوتا ہے تو مخلوق حدوث الوجود کو یعنی انسان کو تو سہو ونسیان ہو سکتا ہے مگر خدا تعالیٰ کو نہیں ہو سکتا۔ کیا تم خدائے عز وجل کے کلام کو نہیں سنتے کہ فرماتا ہے وما کان ربک نسیا۔ تمہارا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے (بلکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے) پس بدلہ دیتا ہے اُن لوگوں کو جو بھول گئے ہیں اور قیامت کے دن کی حاضری کو بھلا رکھا ہے۔ اس طرح پر کہ اُن کے نفسوں کو انہیں بھلا دیتا ہے۔ یعنی ایسی حالت میں اُن کو مبتلا کرے گا۔ کہ اپنی بھی یاد اُن کو نہ رہے کہ ہم کون ہیں کیا ہیں۔) جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے (ایہا الناس) تم ان لوگوں کے مانند نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی اُن کی یاد آپ انہیں بھلا دی (اور) وہی لوگ بدکار ہیں اور نیز فرمایا ہے "پس آج کے دن ہم بھی اُن کو بھول جائیں گے۔ جیسا وہ اس (قیامت کے) دن کی ملاقات اور حاضری کو بھولے ہوئے تھے یعنی کہ ہم اُن کو چھوڑ دیں گے۔ جس طرح انہوں نے آج کے دن کے واسطے کی تیاری

اور آمادگی کو چھوڑ دیا تھا۔ ذکر بالکل اعمال حسنہ نہ کئے اور اس دن کی حاضری کے لئے کوئی توشہ کار خیر ساتھ نہ لیا۔ لہذا ہم بھی ان کو ثواب نہ دیں گے۔ بلکہ مبتلائے عذاب کریں گے۔

بیسویں آیت : وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِيْنَ۔ جب میں آدم میں اپنی رُوح داخل کروں۔ بس اے فرشتو اُن کے سامنے سجدہ کے لئے جھک جانا" اور ایک مقام پر حضرت عیسیٰؑ کی نسبت فرمایا ہے۔ انما المسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ وکلمتہ القاھا الی مریم وروح منہ۔ مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح تو بس اللہ کے رسول تھے اور اس کا ایک کلمہ (حکم) تھا جو مریم کے پاس بھیجا گیا تھا اور اُس کی (بھیجی ہوئی) رُوح تھی۔

پہلی آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ اے فرشتو جب میں اپنی پیدا کی ہوئی رُوح اور اپنی مملوک رُوح کو آدم کے جسم میں داخل کروں۔ تو جھٹ سجدہ میں جھک جائیو یہ استعمال ایسا ہے جیسا کہ ہم لوگ بلکہ تمام دنیا کے آدمی اپنے مقبوض و مملوک چیز کو اپنی طرف نسبت دیتے تھے۔ مثلاً کہتے ہیں۔ میری کتاب۔ میرا لباس۔ میرا مال۔ میرا بندہ۔ یعنی میری وہ کتاب جو اپنے داموں سے خریدی ہُوئی ہے۔ میرا وہ لباس جو ذاتی اپنا مملوک ہے۔ اس طرح خدا تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے۔ روحی۔ میری رُوح یعنی وہ رُوح جو میری پیدا کی ہوئی اور میری مملوک ہے۔ یہ ارشاد زیادتی خصوصیت کے اظہار کے لئے فرمایا ہے۔ اور اس میں رد ہے ان لوگوں کی بھی جو کہتے ہیں کہ رُوح قدیم ہے اس کو خدا تعالیٰ سے کچھ تعلق نہیں۔ جیسا وہ ایک واجب الوجود ہے ویسی ہی رُوح بھی واجب الوجود ہے" تو اس آیت میں اُسے بھی ظاہر کر دیا ہے کہ رُوح کوئی قدیم شے نہیں ہے۔ بلکہ وہ میری ہی پیدا کی ہوئی اور میری ہی مملوک و مقبوض ہے اور اگر غلطی سے کوئی شخص یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی رُوح یعنی وہ رُوح جس سے وہ خود زندہ ہے۔ حضرت آدمؑ میں داخل کر دی تھی۔ تو اس کو یُوں جواب دیا جائے گا کہ برادر! اگر ایسا ہو تو لازم آتا ہے کہ خدا تعالیٰ

کے لئے جسم بھی ہو جس میں یہ روح قائم ہے۔ کیونکہ روح کے لئے کوئی نہ کوئی محل قیام ضرور ہونا چاہیئے۔ پھر تو تمہارا پروردگار مرکب ہو جائے گا۔ اس لئے کہ جمعیت بغیر ترکیب کے نہیں ہو سکتی۔ اور جب مرکب ہو گا تو حادث ہو جائے گا۔ واجب الوجود نہ رہ سکے گا۔ حالانکہ وہ واجب الوجود ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر یہی مطلب ہو۔ جو تم کہتے ہو تو لازم آئے گا کہ خدا تعالیٰ کی روح میں کمی اور زیادتی بھی ہو سکتی ہے اس لئے کہ جب اس نے اپنی روح نکال کر حضرت آدمؑ میں داخل کر دی۔ پس یا تو ساری روح داخل کر دی تو خود مر گیا۔ حالاں کہ یہ محال ہے۔ اور اگر اس کا ایک جزو داخل کیا تو اس کی روح کا گھٹنا لازم آیا اور جب گھٹ گیا۔ تو لامحالہ بہ نسبت پہلے کے کمزور ہو گیا ہو گا۔ حالاں کہ یہ شان پروردگار کی نہیں۔ جس کا تجزیہ ہو سکے یا جس میں کمی بیشی کا ہونا ممکن ہو۔

دیکھو جن کے گھر میں قرآن نازل ہوا۔ وہ کیا فرماتے ہیں۔ محمد بن مسلم راوی ہیں کہ میں نے ابو جعفر (امام محمد باقر علیہ السلام سے) دریافت کیا کہ نفخت فیه من روحی سے کیا مطلب ہے فرمایا روح اختاره الله واصطفاه وخلقه واضافه الی نفسه وفضله علی جمیع الارواح۔ اس روح سے مراد وہ روح ہے جس کو خدا تعالیٰ نے منتخب اور برگزیدہ کیا تھا کیوں کہ روحیں تو کروڑوں ہی ہیں۔ مگر ان سب میں سے یہ روح چھانٹی ہوئی اور منتخب تھی) اور اس کو پیدا کیا تھا اور اپنی طرف اسے منسوب کیا (زیادتی خصوصیت کی وجہ سے) اور اُسے تمام روحوں پر فضیلت دی تھی۔"

نیز جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ فاذا سویته ونفخت فیه من روحی کا مطلب یہ فرمایا کہ ان الله خلق خلقا وخلق روحا ثم امر ملکا فنفخ فیه۔ یعنی خدا تعالیٰ نے ایک جسم پیدا کیا (آدمؑ کا) اور ایک روح پیدا کر دی پھر ایک فرشتے کو حکم دیا۔ تو اس نے وہ روح اس جسم (آدمؑ) میں پھونک دی (یعنی داخل کر دی۔ (بحار توحید)

نیز حضرت نے فرمایا۔ ان اللہ تبارک وتعالیٰ۔ احدٌ صمدٌ لیس لہ جوف وانما الروح خلق من خلق الخ بے شک خدا تعالیٰ احد و صمد ہے اُس میں کوئی جوف نہیں ہے۔ (جس میں روح رہ سکے) بس روح تو اس کی ایک مخلوق ہے اس کی مخلوقات میں سے "

اکیسویں آیت: اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (سورہ نور) خدا تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ واضح ہو کہ مصدر کا استعمال مبالغہ کے موقع پر مشتق پر عام طور سے ہوتا ہے۔ اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ زَیْدٌ عَادِلٌ کی جگہ پر زَیْدٌ عَدْلٌ کہنا شائع اور عام ہے۔ پس ممکن ہے کہ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے مراد اس آیت میں منیر السموٰتِ والارض ہو یعنی اللہ تعالےٰ آسمانوں اور زمین کا روشن کرنے والا ہے۔ اسی نے یہ کواکب طالعہ اور نجوم ساطعہ پیدا کئے ہیں۔ جن کی روشنی سے تمام جہان منور رہتا ہے اور ممکن ہے بمعنی ہدایت استعمال ہوا ہو۔ یعنی کہ اللہ تعالیٰ اہلِ آسمان و زمین کا ہدایت کرنے والا ہے۔ اُسی نے عقل پیدا کی اور اُسی نے رسول بھیجے جو ہدایت کا فرض پورا کریں۔ چنانچہ توحید بحار میں توحید صدوق علیہ الرحمہ سے نقل کیا ہے۔ عن العباس بن ہلال قال سألت الرضا علیہ السلام عن قول اللہ عزوجل اللہ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ والارض فقال ھادٍ لاھل السمٰوٰت وھاد لاھل الارض وفی روایۃ البرقی ھُدیٰ من فی السمٰوٰت وھدیٰ من فی الارض۔ عباس بن ہلال کہتے ہیں کہ میں نے جناب امام رضا علیہ السلام سے اللہ نور السمٰوٰت والارض کے معنی دریافت کئے آپ نے فرمایا کہ اللہ ہدایت کرنے والا آسمانوں کے رہنے والوں کا ہے اور زمین کے رہنے والوں کا۔ اور برقی کی روایت میں ھادی کی جگہ ھدیٰ ہے مگر مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔

نیز توحید بحار میں جناب صادق آلِ محمد سے مروی ہے جس میں کسی قدر اور تفصیل ہے اسی مطلب کی جو امام رضا علیہ السلام سے روایت کیا گیا ہے فس

حمید بن زیاد عن محمد بن الحسین عن محمد بن یحییٰ عن طلحة بن زید عن جعفر بن محمد عن ابیہ علیہ السلام فی ھذہ الآیة اللہ نور السمٰوٰت والارض قال بداء بنور نفسہ مثل نورہ مثل ھداہ فی مومن قولہ کمشکوٰة فیھا مصباح المشکوٰة جوف المومن والقندیل قلبہ والمصباح النور الذی جعلہ اللہ فیہ توقد من شجرة مبارکة قال الشجرة المومن زیتونة لاشرقیة ولا غربیہ قال سواء الجبل لا غربیة ای لاغرب لھا ولاشرقیة ای لاشرق لھا اذا طلعت الشمس طلعت علیھا واذا غربت غربت علیھا یکاد زیتھا یضئ یکاد النور الذی جعلہ اللہ فی قلبہ یضئ وان لم تمسسہ نار نور علیٰ نور فریضة علی فریضة وسنتہ علیٰ سنتہ یھدی اللہ لنورہ من یشآء یھدی اللہ لفرائضہ وسنتہ من یشآء ویضرب اللہ الامثال للناس فھذا مثل ضرب اللہ للمومن قال فالمومن یتقلب فی خمسة من النور مدخلہ نور ومخرجہ نور وکلامہ نور ومسیرہ یوم القیامة الی الجنة نور قلت لجعفر علیہ السلام انھم یقولون مثل نور الرب قال سبحان اللہ لیس اللہ بمثل ما قال اللہ فلا تضربوا اللہ الامثال۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ نور سے مراد نور ہدایت ہے جسے خدا تعالیٰ مومن کے دل میں ڈالتا ہے۔ گویا آیت کا مطلب یہ ہے کہ مثال اس نور کی جسے خدا تعالیٰ مومن کے دل میں داخل کرتا ہے۔ اس مشکوٰة کی مانند ہے جس میں چراغ ہو بس مشکوٰة تو جوف مومن ہے اور قندیل اس کا قلب ہے اور مصباح سے مراد نور ہدایت ہے جو اس کے دل میں ڈالا گیا ہے۔ شجرہ سے مراد بھی مومن ہی ہے یکاد زیتھا یضئ سے مراد یہ ہے کہ وہ نور ہدایت آپ سے آپ روشن ہوتا ہے خواہ وہ مومن زبان سے کہے یا نہ کہے۔ نور علیٰ نور سے مطلب یہ ہے کہ اس نور ہدایت میں فریضہ بالائے فریضہ ہے اور سنتہ بالائے سنت ہے۔ یعنی اس کو فریضہ اور سنت کی طرف خدا نے ہدایت فرمائی ہے۔ اپنے فریضے اور سنت کی طرف جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا

ہے۔ یہ مثل مومن کی بابت بیان کی ہے۔ پس اس مثال سے معلوم ہوا کہ مومن کے لئے پانچ نور ہیں۔ اس کا داخل ہونا بھی نور ہی سے ہے اور خارج ہونا بھی نور ہی سے۔ علم بھی اس کا نور ہے اور کلام بھی اُس کا نور قیامت کے دن چلنا بھی اُس کا نور ہی میں ہوگا۔ راوی کہتا ہے۔ میں نے عرض کی کہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ مثال نور پروردگار کی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ سبحان اللہ خدا کی کوئی مثال نہیں ہے کیا خدا تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے کہ اس کی مثال مت دیا کرو۔ یعنی وہ ضرب المثل کے قابل نہیں ہے اور نہ یہ کہ جو جی چاہے اس کے لئے مثال بیان کر دو ایسا وہ پروردگار نہیں ہے۔"

بائیسویں آیت: ما یکون من نجوی ثلثۃ الا ھو رابعھم ولا خمسۃ الا ھو سادسھم ولا ادنیٰ من ذالک ولا اکثر الا ھو معھم اینما کانوا۔ جب تین آدمی بیٹھ کر سرگوشی (راز کی بات) کرتے تو چوتھا خدا تعالیٰ ہوتا ہے اور جب پانچ آدمی بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں تو چھٹا خدا تعالیٰ ہوتا ہے اور جو اس سے کم کی تعداد ہو یا زیادہ کی سب کے ساتھ خدا ہوتا ہے جہاں کہیں وہ لوگ موجود ہوں۔" اس آیت میں خدا تعالیٰ نے اپنے علم کی وسعت کو ظاہر فرمایا ہے۔ کہ تم لوگ یہ نہ سمجھو کہ چھپکے چھپکے باتیں کرتے ہو اور اس سے خدا تعالیٰ واقف نہیں ہے بلکہ جب تم لوگ جمع ہو کر سرگوشی کرتے ہو۔ میں اس سے مطلع ہو جاتا ہوں خواہ تم کیسی ہی تنہا جگہ میں بیٹھ کر باتیں کرو۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ جس جگہ تین آدمی بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں تو اُن کے ساتھ چوتھا خدا تعالیٰ بھی بیٹھا ہوا ہے یا پانچ آدمی بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں تو چھٹا خدا تعالیٰ بھی اُن کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے کیوں کہ اگر ایسا ہو تو لازم آئے گا کہ اس کو کوئی چیز یا مکان محتوی ہو۔ حالانکہ وہ ہرگز محتاج مکان نہیں۔ ورنہ امکان و حدوث اس کے لئے لازم ہو جائے گا۔ جو محال ہے اسی وجہ سے معصوم نے اس کے معنی کی تفصیل یوں فرمائی جو حدیث ذیل سے معلوم ہوتی ہے (توحید بحار) عن ابن اُذینہ عن

ابی عبد اللہ فی قولہ تبارک و تعالیٰ ما یکون من نجوی ثلٰثۃ الا ھو رابعھم ولا خمسۃ الا ھو سادسھم ولا ادنی من ذالک ولا اکثر الا ھو معھم اینما کانوا فقال ھو واحدٌ احدیّ الذات بائنٌ من خلقہ وبذالک وصف نفسہ وھو بکل شیئٍ محیط بالاشراف والاحاطۃ والقدرۃ لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ فی السمٰوٰت ولا فی الارض ولا اصغر من ذالک ولا اکبر بالاحاطۃ والعلم لا بالذات لان الاماکن محدودۃ تحویھا حدودٌ اربعۃ فاذا کان بالذات لزمہا الحوایۃ" ابن اذینہ جناب صادق علیہ السلام سے قول خدا تعالیٰ ما یکون من نجوی ثلٰثۃ الا ھو رابعھم الخ کی تفسیر میں روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا وہ (خدا تعالیٰ) ایک یکتا ذات والا ہے (اس میں کسی طرح کا تعدد نہیں ہے) اپنی مخلوقات سے (بالکل) جُدا ہے۔ اور یہی اس نے اپنی تعریف بھی کی ہے وھو بکل شیئٍ محیط وہی (معبود برحق) ہر شے کو محیط ہے۔ بذریعہ اطلاع اور احاطہ و قدرت کے اُس سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز آسمانوں میں اور زمین میں مخفی نہیں ہے اور نہ اُس (ذرّہ) سے چھوٹی اور بڑی (بلکہ اُن سب کو وُہ جانتا ہے) احاطہ و علم سے (مگر) نہ (اس طرح کہ) خود (آتا ہو اور اس شے کے پاس بیٹھ کر اس کی حقیقت معلوم کرتا ہو) کیونکہ اماکن اور مقامات محدُود بحدود اربعہ ہیں (یعنی فوقؔ و تحتؔ اور قدامؔ و خلفؔ (بغیر تغیر و عدم تمایز) اور یمینؔ شمال (باعتبار عدم تمایز) بس جب کہ وہ (خدا تعالیٰ) کسی شے کو یا مکان کو اپنی ذات سے احاطہ کرے گا اور اس میں داخل ہو گا۔ تو احتوا اور اشتمال لازم آئے گا جو مکانیات کے لوازم میں سے ہے (اور وُہ اس کے لئے محال ہے)

تیئسویں آیت: وھو اللہ فی السمٰوٰت وفی الارض۔ وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی۔ (یعنی زمین کا مالک اور خالق بھی وہی ہے اور آسمانوں کا مالک و خالق بھی وہی ہے یا یہ کہ جس طرح اس کو آسمانوں پر فرشتے معبود برحق جانتے ہیں۔ اسی طرح زمین پر اہل زمین اس کو معبود حقیقی سمجھتے ہیں۔ اگرچہ

ہٹ دھرمی سے بتوں کو بھی پوجتے ہیں) اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے علم وقدرت واحاطہ وسلطنت وغلبہ کے لحاظ سے ہر مقام پر موجود ہے خواہ آسمان ہو یا زمین۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ وہی ایک معبود ہے۔ جو سب جگہ حاضر و ناظر ہے۔ یہی مطلب معصوم سے بھی مروی ہے۔ چنانچہ توحید بحار میں منقول ہے۔ عن مثنی الحناط عن ابی جعفر اظنه محمد بن النعمان قال سالت اباعبد اللہ علیہ السلام عن قول اللہ تعالیٰ وھو اللہ فی السمٰوٰت وفی الارض قال کذلک ھو فی کل مکان۔ قلت بذاته قال ویحك ان الاماکن اقدار فاذا قلت فی مکان بذاته لزمك ان تقول فی اقدار وغیر ذلك ولکن ھو بائن من خلقه محیط بما خلق علماً وقدرۃً احاطةً وسلطاناً ولیس علمه بما فی الارض باقل مما فی السماء لایبعد منه شیء والاشیاء له سواء علماً وقدرۃً وسلطاناً وملکاً واحاطةً مثنی خیاط نے ابو جعفر سے روایت کی ہے جنہیں میں محمد بن نعمان خیال کرتا ہوں (یعنی میرے گمان میں ابو جعفر سے مراد محمد بن نعمان ہیں) کہ میں نے ابو عبد اللہ الصادق علیہ السلام سے قول خدا تعالیٰ وھو اللہ فی السمٰوٰت وفی الارض کے معنی دریافت کئے آپ نے فرمایا (واقعی) ایسا ہی ہے۔ وہ ہر مقام پر موجود ہے۔ میں نے کہا تو کیا بذاتہ موجود ہے؟ آپ نے فرمایا وائے تجھ پر۔ مقامات تو اقدار ہیں۔ پس جب کہ تم کہو گے کہ وہ بذاتہ کسی مکان میں موجود ہے تو تمہیں یہ کہنا پڑے گا کہ وہ اقدار وغیرہ میں ہے (اقدار سے مراد حدود ہیں) (ایسا نہیں ہے) لیکن وہ اپنی مخلوقات سے (بالکل) جدا ہے اور اپنے علم وقدرت واحاطہ وغلبہ کے راہ سے اپنی مخلوقات کو محیط ہے (یعنی سب کی حالتیں جانتا ہے) اور اس کا جاننا زمین کی چیزوں کو کچھ کم آسمان کی چیزوں کے جاننے سے نہیں (بلکہ جتنا وہ زمین کی اشیاء کا عالم وعارف ہے اتنا ہی آسمانی اشیاء کا بھی عالم ہے) اس سے کوئی شے بعید نہیں ہے۔ اس کے علم وقدرت وغلبہ وملک واحاطہ کے لحاظ سے ہر شے اس کے نزدیک مساوی (نسبت رکھتی) ہے۔

چوبیسویں آیت : رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔

پچیسویں آیت : وَمَنْ یَّحْلِلْ عَلَیْہِ غَضَبِیْ فَقَدْ ھَوٰی ۔ خُدا تعالیٰ اُن (اہل اسلام وایمان) سے راضی ہُوا اور وُہ اس سے راضی ہُوئے ۔ اور جس پر میرا غضب پڑا پس سمجھو کہ وہ) گڑھے میں جا گرا۔ ان دو آیتوں میں رضامندی اور غصّہ کی نسبت اپنی طرف خدا تعالیٰ نے دی ہے۔ حالانکہ غصّہ اور رضا تغیّرات اور تبدل حالات ہیں۔ جو انسان کو عارض ہوتے ہیں۔ تو کیا خدا تعالےٰ بھی محل حوادث و تغیّرات ہے؟ اس کا جواب معصوم کے کلام سے نکلتا ہے چنانچہ محمد بن عمارہ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ میں نے جناب صادق علیہ السلام سے دریافت کیا اور عرض کی یا بن رسول اللہ مجھے آپ بتائیں کہ آیا خدا تعالےٰ کے لئے رضا و سخط (رضامندی اور ناراضی) بھی ہے۔ آپ نے فرمایا نعم ولیس ذٰلک علی ما یوجد من المخلوقین ولکن غضب اللّٰہ عقابہ ورضاہٗ ثوابہٗ۔ (توحید بحار)

عمرو بن عبید نے جناب محمد باقر علیہ السلام سے دریافت کیا من یحلل علیہ غضبی فقد ھوی کے کیا معنی ہیں۔ ماذٰلک الغضب۔ غضب سے کیا مراد ہے۔ جو اس آیت میں مذکور ہے۔ آپ نے فرمایا ھو العقاب یا عمرو انہ من زعم ان اللّٰہ عزوجل قد زال من شیٔ الی شیٔ فقد وصفہ صفۃ مخلوق ان اللّٰہ لا یستفزہ شیٔ ولا یغیرہ۔" اے عمرو۔ غضب سے مراد عذاب ہے اور جو کوئی یہ سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف بدلتا رہتا ہے وہ اپنے پروردگار کو مخلوقات کی صفات سے متصف کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی کوئی صفت متغیر و متبدل نہیں کرتی۔

چھبیسویں آیت : فلمّا آسفونا انتقمنا منھم (سورہ زخرف) پس جب انہوں نے ہم کو غضب ناک کیا ہم نے ان (قوم) سے بدلہ لیا (یعنی ان کو غرق کر دیا) تفسیر مجمع البیان میں تحریر فرماتے ہیں۔ فلمّا آسفونا ای

اغضبونا عن ابن عباس ومجاهد وغضب الله سبحانه علی العصاۃ ارادۃ عقوبتھم ورضاہ عن المطیعین ارادۃ ثوابھم الذی یستحقونہ علی طاعتھم وقیل آسفوا رسلنا لان الاسف بمعنی الحزن لایجوز علی اللہ تعالی انتقمنا منھم ای انتقمنا للاولیاء منھم۔ یعنی فلما آسفونا سے مطلب یہ ہے کہ جب قوم موسٰی نے اپنی شرارتوں سے ہمیں غضب ناک کیا (مطلب ابن عباس اور مجاہد سے منقول ہے) اور خدا کا غضب گناہ گاروں پر یہ ہے کہ وہ اُن کو عذاب کرنے کا ارادہ کرتا ہے (نہ یہ کہ اُس کو اس طرح غصّہ آتا ہے جس طرح انسانوں کو) اور اس کی رضامندی یہ ہے کہ وہ اُن کو ثواب دینے کا ارادہ فرماتا ہے اُن کی اطاعت پر۔

نیز یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ آسفونا سے مراد آسفوا رسلنا ہے یعنی جب ان شریروں نے ہمارے رسولوں کو غضب ناک کیا (اور اُن کے حکم کو نہ مانا مگر چونکہ یہ رسول خدا تعالیٰ ہی کے بھیجے ہوئے تھے۔ اور اسی کے حکم کی تعمیل کرتے تھے تو ان کو غضب ناک کرنا گویا خدا تعالیٰ کو غضب ناک کرنا ہوا۔ اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف دی ہے) کیونکہ اسف بمعنی حزن و رنج کے خدا تعالیٰ کے لئے جائز نہیں۔ ورنہ اس کی ذات میں تغیر لازم آئے گا جو محال ہے انتقمنا منھم سے مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان نافرمانوں سے اپنے دوستوں (رسولوں) کی خاطر سے بدلہ لیا (اور اُن پر عذاب کیا) اور جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ قال ان اللہ تبارک وتعالی لا یاسف کاسفنا ولکنہ خلق اولیاء لنفسہ یاسفون ویرضون وھم مخلوقون مدبرون فجعل رضاھم لنفسہ رضیً و سخطھم لنفسہ سخطاً وذالک لانہ جعلھم الدعاۃ الیہ والادلاء علیہ ولذلک صاروا کذلک (توحید بحار) یعنی کہ آپ نے فرمایا۔ بے شک خدا تعالےٰ کے واسطے رنج وغم نہیں ہوتا۔ جس طرح ہم لوگوں کو ہوتا ہے۔ مگر یہ کہ اس نے اپنے دوست (رسول) پیدا کئے جن کو (امت کی شرارتوں کی وجہ سے) رنج (ان کی اطاعت کی وجہ سے) خوشی ہوتی ہے۔ اور وہ مخلوق و مدبر ہیں (تو اُن کے لئے رنج وخوشی

کا ہونا ممکن ہے) پس خدا تعالیٰ نے ان کی رضامندی کو اپنی رضامندی فرمایا۔ اور ان کی ناراضی کو اپنی ناراضی۔ اس وجہ سے کہ ان کو خدا تعالیٰ نے اپنی (اللہ) طرف دعوت دینے والا اور اپنی طرف رہنما کر کے بھیجا تھا۔ پس جب لوگ اُن کی بات کو نہ مانتے اور اُن کو ناراض کیا تو گویا خدا کو ناراض کیا) اسی وجہ سے وہ لوگ (انبیاء) ایسے ہوئے۔" حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجازاً اسف و رنج کی نسبت اپنی طرف دی ہے۔ نہ حقیقۃً کیونکہ اس کے لیے حقیقۃً غم و رنج کا ہونا ناممکن عقلی ہے۔

ستائیسویں آیت: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (سورہ رحمان) ہر روز خدا تعالیٰ ایک شان میں ہے۔ یعنی ہر روز کسی کے گناہ بخشتا ہے کسی کو اس کے گناہ کی وجہ سے پروانہ عذاب دیتا ہے۔ کسی کے غم کو دور کرتا ہے۔ کسی کو امتحاناً یا عقوبۃً بلا میں مبتلا کرتا ہے۔ کسی کو عزت دیتا ہے۔ کسی کو اس کی بد افعالی کی وجہ سے پست کرتا ہے۔ نہ یہ کہ خدا تعالیٰ میں (العیاذ باللہ) روزانہ تغیر حالات ہوتا رہتا ہے۔ یہی مطلب توحید بحار میں منقول ہے۔ باسناد المجاشعی عن الصادق علیہ السلام عن آبائہ علیہم السلام ان النبیؐ قال ان اللہ تعالیٰ کل یوم ھو فی شان فان من شانہ ان یغفر ذنبا و یفرج کربا و یرفع قوما و یضع آخرین۔ مجاشعی کی اسناد سے مروی ہے کہ حضرت صادق علیہ السلام نے اپنے آباء طاہرین سے روایت فرمائی کہ رسولؐ خدا نے فرمایا بے شک خدا تعالیٰ ہر روز ایک نئی شان میں ہے۔ کیوں کہ اس کی شان سے یہ بات ہے کہ کسی کے گناہ بخشے کسی کے کرب کو دور کرے۔ کسی قوم کو بلند رتبہ بنا دے اور کسی قوم کو پست کر دے۔

نواں باب
رؤیت خدا تعالیٰ کی ناممکن ہے

پہلی آیت: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ۔ (سورہ انعام) آنکھیں خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتیں۔ یعنی ادراک نظری اس پر واقع نہیں ہو سکتا اور وہ تمام نگاہوں کا جاننے والا ہے اور وہی لطیف و خبیر ہے" یہ آیت اس مطلب میں صریح ہے۔ کہ آنکھیں ہرگز خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتیں۔ خواہ دنیا میں ہو یا قیامت کے دن ہو۔ کیونکہ اس آیت میں کوئی تخصیص نہیں ہے کہ دنیا میں تو نہیں دیکھ سکتیں مگر آخرت میں دیکھ سکیں گی۔ بلکہ تعمیم ہے کہ کسی مقام پر اس کی رویت آنکھ کے ذریعے سے نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ کسی نے انبیاء میں سے بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ ہم نے اسے آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یا قیامت کے دن دیکھیں گے۔ بلکہ حضرت موسیٰ کو صاف جواب ہی مل گیا تھا۔ کہ لن ترانی تم ہرگز مجھ کو نہیں دیکھ سکتے (جس کا بیان آئندہ آئے گا) ہاں دل کی آنکھوں سے دیکھنا ہر وقت ممکن ہے۔ بلکہ اہل ایمان کو اس قسم کی رویت ہر وقت حاصل ہے۔ چنانچہ توحید بحار میں جناب امیرالمومنین علیہ السلام سے منقول ہے جب کہ آپ سے ذعلب یمانی نے دریافت کیا تھا کہ ھل رأیت ربک۔ کیا آپ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ویلک یا ذعلب لم اکن بالذی اعبد ربا لم ارہ۔ وائے تم پر اے ذعلب! میں وہ شخص نہیں ہوں جو بن دیکھے خدا کی عبادت کروں اس نے کہا۔ فکیف رأیتہ۔ آپ نے اسے کیوں کر دیکھا صفۃ لنا۔ اسے ذرا ہم سے بیان کیجئے۔ آپ نے فرمایا یا ویلک لم ترہ العیون بمشاھدۃ الابصار ولکن رأتہ القلوب بحقایق الایمان الخ ہائے افسوس تم پر اے ذعلب! اس کو آنکھوں نے مشاہدہ نظری سے نہیں دیکھا۔ لیکن دلوں نے ایمان کی حقیقتوں

سے اس کو دیکھ لیا ہے۔" اسی سے قریب قریب جناب امام باقر علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔ عبداللہ بن سنان اپنے باپ سے روایت کرتا ہے کہ میں ابوجعفر محمد بن علی الباقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپ کے پاس ایک شخص خوارج میں سے آیا کہ یا اباجعفر ای شئ تعبد اے ابوجعفر تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ آپ نے فرمایا اللہ خدا کی عبادت کرتا ہوں۔ اس نے کہا رأیتہ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ لم تره العیون بمشاھدۃ العیان ورأتہ القلوب بحقائق الایمان۔ اس کو آنکھوں نے مشاہدہ ظاہری سے ہرگز نہیں دیکھا ہے۔ اور (مگر) دلوں نے ایمان کی حقیقتوں سے اُسے دیکھ لیا ہے۔" (توحید بحار)

غرض اس کلام سے یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا آنکھوں سے دکھائی دینا تو ناممکن ہے اس وجہ سے کسی آنکھ نے اس کو نہیں دیکھا لیکن دل چونکہ اس کے آثار قدرت و اعلام حکمت کو دیکھتے ہیں۔ اس سبب سے بالیقین جانتے ہیں کہ ان آثار کا موثر اور ان علامتوں کا قائم کرنے والا اور ان حکمتوں کا مظہر اور ان مقدورات کا مقدر ضرور موجود ہے۔ اور یہ یقین دل کو اس طرح حاصل ہے جیسے آنکھ سے دیکھ کر کسی شے کا علم ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ نظر چشم میں تو کبھی کبھی غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ مگر دلی نظر جو برہانی ہو وہ قطعاً صحیح ہوتی ہے اور یقین اسی کا نام ہے۔ جو دل میں مرتکز ہو۔ پس ہمارا دل سے یقین کرنا کہ ہمارا کوئی خالق ضرور ہے۔ یہی ہمارا دیکھنا ہے۔

لیکن جن لوگوں کے دل کو بغیر دیکھے یقین ہوتا ہی نہیں۔ اور جن کے دلوں کی قوت اتنی نہیں جو اپنی ذاتی قوت سے خدا تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کریں۔ ان کو شاید مجبور ہو کر یہ کہنا پڑا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رؤیت ضرور ہو گی اور اسے عوام تک میں ایسا مشتہر کر دیا ہے کہ بطور مثل کے استعمال ہونے لگا ہے۔ اور قسم کے موقع پر بولا جاتا ہے (مثلاً فلاں شخص کو خدا کا دیدار اور محمدؐ کی شفاعت نصیب نہ ہو اگر وہ ایسا کرے) مگر میں اس قدر کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر ایک طرف عقل

اور دوسری طرف ہٹ دھرمی ہو۔ یا ایک طرف عوام الناس اور دوسری طرف اہلبیت رسولؐ ہوں۔ جو رسولِ خدا کے خزانہ دار تھے۔ تو کسی طرح انصاف اور عقل کی (رو) نہیں معلوم ہوتی کہ ہٹ دھرمی کو عقل سے اور عوام الناس کو اہل بیت پر ترجیح دی جائے اور نہ اس کی کوئی وجہ معقول نظر آتی ہے۔

ہم صریح دیکھ رہے ہیں کہ عقلاً رؤیت خدا تعالیٰ محال ہے۔ کیونکہ کسی چیز کے کے لئے جب تک بارہ شرطیں موجود نہ ہوں۔ اس کی رویت ناممکن ہے۔ ۱۔ یہ کہ مرئی مقابل میں رائی (دیکھنے والے) کے ہو۔ یا حکم میں مقابل کے ہو۔ اگرچہ فی الواقع مقابل نہ ہو۔ جیسے آئینہ میں صورت کا نظر آنا۔ ۲۔ بہت زیادہ فاصلہ نہ ہو کیونکہ اگر رائی (دیکھنے والے) کے اور مرئی (جسے دیکھا جانا مقصود ہے) کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہوگا۔ تو یقیناً وہ شے نہ دکھائی دے گی۔ جیسے ایک خردل کے دانہ کو تین فرلانگ سے اگر ہم دیکھنا چاہیں تو ہرگز دکھائی نہیں دے سکتا۔ یا کوہ ہمالیہ کو دہلی سے دیکھنا چاہیں تو ہرگز نظر نہیں آسکتا۔ ۳۔ بہت زیادہ قریب بھی نہ ہو کیوں کہ جس شے کو آنکھ سے بالکل قریب کرلو یعنی اس سے ملادو اس کو آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ ۴۔ بہت چھوٹی چیز نہ ہو جیسے مثلاً وہ کیڑے جسے لوگ پانی میں بتاتے ہیں جو خوردبین کے بغیر آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے۔ ۵۔ درمیان رائی مرئی کے کوئی حجاب بھی نہ ہو۔ کیونکہ اگر پردہ حائل ہوگا۔ مثلاً دیوار کے اس طرف دیکھنے والا ہوگا اور دیوار سے اس طرف شے مرئی ہوگی۔ تو ہرگز دکھائی نہیں دے سکتی۔ ۶۔ جسے دیکھنا مقصود ہے وہ کثیف ہو کیوں کہ اگر لطیف ہوگی جیسے روح یا نفس تو ہرگز نظر میں نہیں آسکتی۔ ۷۔ جسے دیکھنا مقصود ہے اس میں کوئی رنگ بھی ہو ورنہ دکھائی نہ دے گی۔ جیسے ہوا کہ باوجود ثقیل ہونے اور جسم سے ملاصق ہونے کے دکھائی نہیں دیتی۔ ۸۔ حاسہ بصری سالم ہو۔ بیمار اور ماؤف نہ ہو۔ کیوں کہ اندھا کوئی شے نہیں دیکھ سکتا۔ ۹۔ دیکھنے کا قصد بھی کیا جائے۔ اگر دیکھنے کا قصد نہ ہوگا۔ تو اس کا دکھائی دینا ضرور نہیں۔ ۱۰۔ جس کے دیکھنے کا قصد کیا جاتا ہے

وہ مضئی وروشن بھی ہو اگر تاریک ہو گا تو دکھائی نہ دے گا۔ ۱۱۔ رائی اور مرئی کے درمیان کسی شفاف چیز کا بھی واسطہ ہو۔ جیسے ہوا یا فضا۔ یا آئینہ یا پانی وغیرہ۔ ورنہ وہ کبھی نظر سے محسوس نہ ہو گا۔ ۱۲۔ مقدار ہو۔ یعنی مقولہ کم سے ہو۔ یا مقولہ علک سے ورنہ مرئی ہونا معلوم۔

اب ان شرطوں پر غور کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی۔ چھٹی۔ ساتویں اور بارہویں شرط خدا تعالیٰ میں مفقود ہے۔ کیونکہ اگر کہو کہ خدا تعالیٰ مقابل میں دیکھنے والے کے ہوگا۔ تو لامحالہ اُسے کسی مکان (یعنی جگہ) اور کسی جہت میں ہونا لازم ہے اور جب وہ کسی جگہ یا جہت میں ہو گا۔ تو اس کا محتاج محل اور محتاج جہت ہونا لازم آئے گا۔ جسے کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور اگر کہو کہ خدا تعالیٰ جسم کثیف ہے تو ترکیب لازم آتا ہے۔ اور ترکیب حدوث کو مستلزم ہے اور اگر کہو کہ اس میں رنگ پایا جاتا ہے تو رنگ عرض ہے اور عرض بغیر محل کے قائم نہیں رہ سکتا۔ تو لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ محل اعراض ہے اور محل حوادث ہے حالانکہ کوئی ایمان والا اس کے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا اور اگر کہو کہ وہ مقدار یا ملک ہے۔ تو یہ دونوں بھی مثل رنگ کے عرض ہیں۔ پھر کیوں کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ خدا تعالےٰ عرض یا محل اعراض ہے اور جب ایسا نہیں تو وہ کون سی عقلی صورت ایسی ہے جس سے خدا تعالیٰ کا دکھائی دینا ممکن ہو سکتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص عقل کے مقابلہ میں اپنی ہٹ دھرمی پیش کرے۔ اور کہے کہ چاہے عقل کہے یا نہ کہے مگر ہم تو خدا کو ضرور دیکھیں گے۔ تو اس کا قول ہرگز قابل سماعت نہ ہو گا۔

اور نیز ہم بداہتہً دیکھ رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ مجھ کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ پھر خدا تعالیٰ کے قول کے مقابلہ میں اپنی رائے اڑانی کس قدر بے ایمانی اور زبردستی ہے۔ جسے کوئی ایماندار تسلیم نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر کوئی شخص اس آیت کی دلالت میں بحث کرے اور کہے اس آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی تو البتہ کچھ گنجائش ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں کیونکہ لفظ الابصار آیت

میں معرف باللام اور جمع ہے۔ اور جمع معرف باللام مفید عموم استغراق ہے تو یہ معنی ہوئے کہ کوئی آنکھ بھی اس کو نہیں دیکھ سکتی۔ نیز یہ کہ لاتدرکہ سے مراد کسی طرح زمانہ حال تو ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ تو بدیہی ہے اور بدیہی کی نفی سے فائدہ ہی کیا۔ جب کہ ہم قطعاً اور بداہۃً جانتے ہیں کہ بالفعل کوئی اس کو نہیں دیکھتا تو اس کا یہ فرمانا کہ اس کو کوئی آنکھ زمانہ حال میں نہیں دیکھتی بالکل فضول ہے پس لامحالہ اس سے مراد زمانہ مستقبل ہوگا۔ یعنی کہ جس طرح زمانہ حال میں کوئی نگاہ اس کو نہیں دیکھتی اسی طرح زمانہ مستقبل میں بھی کوئی آنکھ اس کو نہ دیکھ سکے گی اور چونکہ مستقبل کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس لئے قیامت اور قیامت سے بعد کو بھی آپ شامل ہوگئی۔ یعنی کہ نہ اس کو کوئی نگاہ قیامت میں دیکھ سکے گی اور نہ اس کے بعد۔ پس دعوئے رؤیت خدا بروز قیامت خدا تعالیٰ کے کلام کو رد کرنا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ جو جمع محلی باللام ہوتی ہے۔ وہ حالت نفی اور حالت اثبات دونوں ہی میں مفید عموم و استغراق ہوتی ہے۔ جیسے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَا اللّٰهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ۔ "اللہ نہیں ارادہ کرتا کہ وہ بندوں پر ظلم کرے" اس میں خاص بندوں کی خصوصیت نہیں ہے۔ بلکہ وہ کسی بندہ پر ظلم نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ بندہ کافر ہو یا مومن۔ البتہ بسبب افعال و اعمال سزا وجزا ضرور دے گا۔ نیز فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔ اور اللہ ہر متکبر اور اترانے والے کو دوست نہیں رکھتا۔ اس سے یہ مطلب تو ہے نہیں کہ کل کو تو دوست نہیں مگر بعض متکبر اترانے والے کو دوست رکھتا ہے بلکہ غرض تو یہ ہے کہ کسی اترانے والے متکبر کو خدا پسند نہیں کرتا علی ہذا القیاس اس آیت میں بھی عموم ہی مراد ہوگا۔ یعنی کوئی اس کو نہ دیکھ سکے گا اور از بسکہ زمانہ میں کوئی قید نہیں ہے اس لئے مستقبل کا زمانہ بھی محدود نہیں سمجھا جا سکتا۔

پس یہ کہنا کہ تدرکہ الابصار باعتبار جمع محلی باللام کے موجبہ ہے اور جب موجبہ کو سلب کیا جاتا ہے تو مفید ایجاب جزئی ہوتا ہے بالکل لغو اور آیات

سابقہ قرآنیہ کے خلاف ہے۔ لہذا ساقط اور غیر معتنیٰ بہ ہے۔

نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو موقع مدح میں فرمایا ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے فرماتا ہے وخلق کل شیئ وھو بکل شیئ علیم ذالکم اللہ ربکم لا الٰہ الا ھو خالق کل شیئ فاعبدوہ وھو علیٰ کل شیئ وکیل۔ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر۔ "اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہی ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ وہی اللہ تمہارا پالنے والا ہے۔ جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ ہر شے کا خالق ہے۔ پس تم لوگ اس کی عبادت کرو اور وہ ہر شے کا نگہبان ہے۔ اس کو کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکے گی۔ اور وہ آنکھوں کا علم رکھنے والا ہے۔ اور وہی پاک اور با خبر ہے" پس جس صفت کا نہ ہونا قابل مدح ہے۔ اس کا ہونا ضرور قابل مذمت ہوگا۔ لہذا جب کہ خدا تعالیٰ کا دکھائی نہ دینا قابل مدح ٹھیرا جس سے اس نے اپنی تعریف کی ہے تو اس کا دکھائی دینا خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں اس کے لئے باعث نقص وعیب ہوگا۔ حالاں کہ کوئی ایمان دار اس امر کے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ خدا تعالیٰ میں کبھی نقص وعیب بھی ہو سکے گا۔ لہذا معلوم ہوا کہ اس کا دکھائی دینا بھی ممکن نہیں۔ واللہ الہادی الی الصواب۔

دوسری آیت: وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا فَلَمَّا اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

اور جب کہ موسیٰ ہماری میقات کے لئے آیا اور اس سے اس کے پروردگار نے گفتگو کی تو کہا (موسیٰ نے کہ) اے میرے پروردگار مجھے (اپنے تئیں) دکھا (کہ) میں تیری طرف نظر کروں کہا (خدا نے) تو مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکے گا اور لیکن پہاڑ کی طرف دیکھ پس اگر وہ اپنے مقام پر ٹھیرا رہے تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا۔

توجس وقت اس کے پروردگار نے پہاڑ پر روشنی ڈالی۔ اسی روشنی نے اُس کو ریزہ ریزہ کردیا اور موسیٰ چیخ کر گر پڑا (اور بیہوش ہوگیا) پس جب اُسے ہوش آیا تو کہا کہ تو پاک اور منزہ ہے (اس سے کہ تیرے دیکھنے کی تجھ سے درخواست کی جائے) میں تجھ سے توبہ کرتا ہوں اور میں ایمان لانے والوں میں پہلا مومن ہوں۔

یہ وہ معرکۃ الآرا آیت ہے کہ اہل سنت تو اس سے ایک طرف رؤیت خدا تعالیٰ کے مسئلہ کو ثابت کر رہے ہیں۔ اور شیعہ و معتزلہ اسی آیت سے عدم امکان رؤیت کو ثابت کرتے ہیں مشبہ اور کرامیہ اہل سنت کا تو یہ خیال ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرمایا۔ رَبِّ اَرِنِیٓ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ (اے میرے رب تو مجھے اپنے تئیں دکھا کہ میں تجھ کو دیکھوں) پس اگر خدا تعالیٰ کی رؤیت ناممکن تھی تو موسیٰ نے کیوں اس کی درخواست کی اگر کہا جائے کہ وہ حقیقت حال سے ناواقف تھے تو ایسا شخص رسول نہیں ہوسکتا اور اگر کہا جائے کہ حقیقت حال کو جانتے تھے مگر باوجود جاننے کے پھر سوال کیا تو ایسا فعل حماقت میں داخل ہے کہ ایک شخص کسی بات کے محال ہونے کو جانتا ہو اور پھر اس کی درخواست کرے یہ نبی کی شان نہیں ہے۔ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ جناب موسیٰ کا سوال کرنا اور یہ کہنا کہ اے پروردگار تو اپنے کو مجھے دکھا دے صرف اس وجہ سے تھا کہ اُن کی قوم نے اُن کو تنگ کیا اور کہا کہ ہم تو تمہارے خدا پر بے دیکھے ایمان ہی نہ لائیں گے۔ جیسا کہ خود خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَهۡرَةً (اور جبکہ اے یہودیو! تم نے موسیٰ سے کہا کہ اے موسیٰ ہم تو ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں۔ نیز اس خیال کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔ فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰۤی اَکۡبَرَ مِنۡ ذٰلِکَ فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰہَ جَهۡرَةً ۔ (اے رسول اگر تم سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ آسمان سے کتاب نازل کرو تب ہم ایمان لائیں گے تو اس کا کچھ خیال مت کرو کیوں کہ ان لوگوں نے تو موسیٰ سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا (جو ناممکن تھا) کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا

دکھا دو) فَاَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ۔ پس اُن پر اُن کے اس ظلم (کی بات) کی وجہ سے بجلی گری" نیز خدا تعالیٰ نے موسیٰ کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا رب لو شئت اهلكتهم من قبل واياى اتهلكنا بما فعل السفهآء منا اے پروردگار اگر تو چاہتا تو ان سب آدمیوں کو پہلے ہی ہلاک کر دیتا۔ اور مجھ کو بھی (لیکن) کیا تو ہم کو ہلاک کرے گا اس فعل پر جو ہمارے سفیہ اور احمق لوگوں نے کیا" (یعنی درخواست دیدار خدا تعالیٰ) ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ نے اپنے لیے یہ سوال نہ کیا تھا۔ ورنہ یہ نہ کہتے کہ یہ فعل اور درخواست ہمارے احمق آدمیوں کی تھی۔ کیا تو اس پر ہم سب لوگوں کو ہلاک کرے گا اور نیز خدا تعالیٰ نے خود اس درخواست کو قوم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور سألوا موسیٰ اکبر من ذالک۔ ان یہودیوں نے تو موسیٰ سے اس سے بڑی درخواست کی تھی۔ کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھا دو" اور اسی پر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ چونکہ ان لوگوں نے ایسا عظیم الشان سوال کیا تھا۔ اس وجہ سے اُن پر بجلی گری" پس جب کہ یہ درخواست حضرت موسیٰ کی طرف سے نہ ہوئی بلکہ قوم موسیٰ کی طرف سے ہوئی۔ جو حقیقت حال سے ناواقف تھی تو حضرت موسیٰ پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا۔ نہ اُن کا جہل لازم آتا ہے۔ اور نہ فعل عبث کرنا لازم آتا ہے اور نہ اس درخواست سے اُن کی نبوت میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے۔

ہاں اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ اچھا اگر جناب موسیٰ نے خود یہ درخواست اپنے لئے نہیں کی تھی۔ تو توبہ کیوں کی اور یہ کیوں فرمایا۔ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ توبہ یہاں پر بمعنی مطلق رجوع ہے۔ نہ گناہ سے رجوع کرنی۔ کیوں کہ توبہ کے لغوی معنی یہی ہیں۔ پس اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب موسیٰ کو غش سے افاقہ ہوا۔ تو انہوں نے کہا کہ خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔ درحالیکہ میں تجھ پر پہلا ایمان لانے والا ہوں اور اس میں اظہار تذلل و فروتنی ہے جو بندے کی شان ہے۔ کہ ہر وقت اپنے معبود

حقیقی کی طرف رجوع قلب رکھے۔ اور اپنی عاجزی اور فروتنی ظاہر کرتا رہے یا یہ مطلب ہو کہ جب لوگوں کی غرض حاصل ہو گئی اور معلوم ہو گیا۔ کہ تیری رؤیت ناممکن ہے تو اب میں اپنی درخواست سابق سے رجوع کرتا ہوں۔ کیونکہ مصلحت ختم ہو گئی یا یہ کہ توبہ اپنی قوم کی طرف سے ہو۔ یعنی یہ کہ لوگوں نے اپنی حماقت سے یہ درخواست کی تھی۔ اب یہ لوگ اپنے کئے پر توبہ کرتے ہیں اور میں اس کو پیش کرتا ہوں۔

اور اگر بالفرض مان بھی لیا جائے کہ حضرت موسیٰ نے اپنے ہی لئے یہ سوال کیا تھا (حالاں کہ قرآن مجید کی تصریح کے خلاف ہے) تب بھی اس کا یہ جواب ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باوجود ایمان و معرفت کاملہ کے خدا تعالےٰ سے درخواست کی۔ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی۔ خدایا مجھے دکھا دے۔ تو مُردوں کو کیوں کر زندہ کرتا ہے۔ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ۔ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ۔ خدا تعالیٰ نے کہا کہ کیا ابھی تم کو اس بات پر یقین نہیں ہے کہ میں مُردوں کو زندہ کرتا ہوں۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی کہ یقین تو ہے لیکن میں اطمینان قلب چاہتا ہوں۔

اسی طرح ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی درخواست کی کہ خدایا کوئی ایسی تدبیر کر جس سے مجھ کو اطمینان ہو جائے اور معرفت بدیہیہ حاصل ہو۔

نیز یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے اس سوال میں حذف واقع ہُوا ہو یعنی رَبِّ اَرِنِیْ آیَۃً اَنْظُرْ اِلٰی آیٰتِکَ خدایا مجھے کوئی نشانی دکھا جسے میں آنکھوں سے دیکھوں نہ کہ اپنے تئیں دکھا۔" مگر ان جوابوں کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید خود فیصلہ کر رہا ہے کہ یہ درخواست حضرت موسیٰ کی طرف سے نہ تھی۔ بلکہ اُن کی قوم کی طرف سے تھی۔

دوسرا خیال مشبہ اور کرامیہ کا یہ ہے کہ اگر دیدار اللہ تعالیٰ کا محال ہے تو پھر اس نے کیوں فرمایا لٰکِنِ اُنْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوْفَ تَرَانِیْ۔

لیکن اے موسیٰ پہاڑ کی طرف نظر کر۔ پس اگر یہ اپنی جگہ پر ٹھیرا رہے۔ تو عنقریب تم مجھے دیکھو گے"۔

استقرار جبل یعنی پہاڑ کا اپنے مقام پر قائم رہنا ایک امر ممکن ہے اس پر خدا تعالیٰ نے اپنے دیدار کو معلق کیا جس سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی رؤیت ممکن ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ فی نفسہ استقرار جبل ممکن ہے۔ مگر اسباب خارجیہ کی وجہ سے اُس کا استقرار محال ہے مثلاً جب کہ قیامت ہوگی۔ اور پہاڑوں کو حکم ہوگا کہ ریزہ ریزہ ہو کر مثل دھنکی ہوئی اُون کے ہو جاؤ۔ جس کی خبر خود خدا تعالیٰ نے دی ہے۔ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ۔ تو کیا ممکن ہے کہ باوجود حکم خدا تعالیٰ کے یہ پہاڑ اپنی جگہ قائم رہیں۔ اور ریزہ ریزہ نہ ہو جائیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ حکم خدا تعالیٰ کے بعد ان کا مستقر رہنا ناممکن تھے باوجودیکہ فی نفسہ ممکن ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس موقع پر خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے ان استقر مکانہٗ۔ اگر پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہے۔ قائم رہنا بھی لَنْ تَرَانِیْ فرمادینے کے بعد ناممکن ہے۔ کیونکہ جب وہ خود فرماتا ہے۔ کہ اے موسیٰ تم ہرگز مجھ کو نہیں دیکھ سکتے۔ اور پھر اپنے دیدار کو استقرار جبل پر معلق کیا۔ تو بعد اس نفی کے کس طرح استقرار جبل ہو سکتا ہے۔ جس سے رؤیتِ باری تعالیٰ ممکن ہو۔ دوسرے یہ کہ خود پروردگار عالم کو اس امر کا علم تھا کہ تجلی نور اس پہاڑ پر ہوگی تو ہرگز یہ اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور یہی اس کا ارادہ بھی تھا کہ تجلی نور سے اس کو ریزہ ریزہ کر دے۔ تو بعد اس کے کہ خدا تعالیٰ کو علم بھی اس کے عدم استقرار کا تھا اور اس نے ارادہ بھی اس کے ریزہ ریزہ کرنے کا کر لیا تھا کس طرح ممکن ہے یا ممکن تھا کہ وہ پہاڑ اپنی حالت پر باقی رہ سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ اگرچہ فی نفسہ پہاڑ کا باقی رہنا ممکن ہے مگر چونکہ حکم و علم کا ارادہ پروردگار عالم اس امر پر جاری ہو چکا تھا کہ وہ قائم نہ رہے گا۔ اس لئے اس کا قائم رہنا محال تھا اور جب محال تھا۔ تو وہ دیدار جو اس محال پر معلق کیا گیا ہے۔ وہ بھی محال تھا نہ کہ ممکن پس یہ کہنا کہ دیدار ایک امر

ممکن پر معلق کیا گیا تھا۔ قابل سماعت نہیں ہے؟

اور شیعہ و معتزلہ کہتے ہیں کہ اسی آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا دیدار ابدالاباد بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ خود فرماتا ہے۔ لَنْ تَرَانِیْ ہرگز ہرگز کبھی تو مجھ کو نہ دیکھے گا۔" اور یہ معنی اس وجہ سے بیان کئے گئے کہ علامہ زمخشری نے اپنی کتاب انموذج میں اور نیز دیگر اہل نحو نے نہایت کشادہ دلی سے اس امر کا اقرار کیا ہے کہ لَنْ ہمیشہ کی نفی کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی جس لفظ پر یہ آتا ہے اُس کو ہمیشہ کے لئے نفی کر دیتا ہے پس جب کہ یہ لفظ ترانی پر آیا۔ تو یہ معنی ہوئے کہ کبھی تو مجھ کو نہ دیکھے گا۔ اور ظاہر ہے۔ خدا تعالیٰ کا کلام خلاف واقع نہیں ہو سکتا۔ پس ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ جب موسیٰ سے نبیؑ کو لَنْ تَرَانِیْ کا خطاب ہُوا تو دوسرا کیا قابلیت رکھتا ہے۔ کہ دنیا یا آخرت میں اُسے دیکھ سکے۔

نیز خدا تعالیٰ کا یہ کلام بھی صاف دیدار کے ناممکن ہونے پر دال ہے فقد سألوا موسیٰ اکبر من ذالك۔" اے ہمارے حبیب تم سے تو یہ لوگ ایک امر ممکن کا سوال کرتے ہیں کہ آسمان سے کتاب نازل کر دو۔ لیکن موسیٰ سے تو اس سے زیادہ عظیم سوال تھا کہ خدا ہی کو دکھا دو۔ پس اگر دیدار خدا تعالیٰ ممکن ہوتا تو اس کو اعظم و اکبر کہنے کی ضرورت نہ تھی اور اگر اس کا دُنیا یا آخرت میں دیکھا جانا ممکن تھا تو اس سے انکار ہی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ ایک قوم کی قوم صرف دیدار کے حصول پر ایمان لانے کے لئے تیار تھی۔ پس اگر دیدار ممکن تھا۔ اور پھر اس نے حیلہ کر کے ٹال دیا تو باعث بقائے کفار علی الکفر خود ہُوا۔ حالانکہ ایسی نسبت اس کی طرف کوئی عقلمند نہیں دے سکتا۔

اس کے علاوہ اگر ہم عقلائے اسلام کے باہم بیانات کا مقابلہ کریں اور دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو رسول اللہؐ کے اہل بیتؑ رؤیت خدا تعالیٰ سے انکار کر رہے ہیں۔ باوجودیکہ جو مرتبے اُن کو عند اللہ حاصل ہیں ان کو تمام عالم جانتا ہے۔ پس اگر رؤیت ممکن ہوتی تو ان کو انکار کی کیا وجہ تھی؟ اور دوسری طرف

چند اور لوگ ہیں جو اس کا اقرار کر رہے ہیں۔ کسی عقلمند آدمی کی تو عقل اس بات کو مان نہیں سکتی کہ اہل بیتؑ جس امر کے قائل ہوں وہ تو غلط ہو اور چند عوام الناس جس امر کے قائل ہوں وہ صحیح ہو۔ باوجود کہ اہل بیتؑ کے کلام کی تائید عقلی دلیلوں سے بھی ہوتی ہو اور اُن کے مخالفین کے اقوال کو عقل تسلیم نہ کرتی ہو۔

اب ملاحظہ ہوں اہل بیت کے اقوال اس معاملے میں کہ کس قدر متین اور مطابق عقل ہیں۔ توحید بحار میں محمد بن عبیدہ سے مروی ہے وہ کہتا ہے کتبت الی ابی الحسن الرضا علیہ السلام اسألہ عن الرؤیۃ وما ترویہ العامۃ والخاصۃ وسألتہ ان یشرح لی ذلک فکتب علیہ السلام بخطہ اتفق الجمیع لا تمانع بینھم ان المعرفۃ من جھۃ الرویۃ ضرورۃ فاذا جاز ان یُری اللّٰہ عزوجل بالعین وقعت المعرفۃ ضرورۃً ثُمّ لم تخل تلک المعرفۃ من ان تکون ایمانا اولیست بایمان فان کانت تلک المعرفۃ من جھۃ الرویۃ ایماناً فالمعرفۃ التی فی دار الدنیا من جھۃ الاکتساب لیست بایمانٍ لانّھا ضدّہٗ فلایکون فی الدنیا احدٌ مومناً لانّھم لم یروا اللّٰہ عزوجل وان لم تکن تلک المعرفۃ التی من جھۃ الرویۃ ایمانا لم تخل ھذہ المعرفۃ التی من جھۃ الاکتساب ان تزول اولا تزول فی المعاد فھذا دلیل علی ان اللّٰہ عزّوجل لایری بالعین اذا لعین یُؤدّی الی ما وصفناہُ۔ محمد بن عبیدہ کہتے ہیں کہ میں نے جناب ابوالحسن الرضا علیہ السلام کی خدمت میں خط لکھا اور مسئلہ رؤیت کو دریافت کیا اور جو روایتیں عامہ وخاصہ اس معاملہ میں نقل کرتے ہیں۔ ان کو بھی پوچھا تو آپ نے جواب میں تحریر فرمایا (اور ایسا بے مثل استدلال لکھا جس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا) کہ یہ بات متفق علیہ تمام عقلا کی ہے اور کسی نے اس میں نزاع نہیں کی ہے کہ جب کوئی شے آنکھ سے دیکھ لی جاتی ہے تو اس کا علم بدیہی ہو جاتا ہے۔ پس اگر خدا تعالیٰ کا آنکھ سے دکھائی دینا ممکن ہو۔ تو اس کی معرفت بدیہی ہو جائے گی (اور اس میں کوئی شک نہیں) پھر یہ سوال ہوگا

کہ آیا یہ معرفت جو آنکھ سے دیکھ کر حاصل ہوئی ہے۔ ایمان ہے یا نہیں اگر کہو کہ یہ معرفت ایمان ہے تو دنیا میں جن لوگوں نے بغیر دیکھے ہوئے خدا تعالیٰ کے وجود کو مان لیا ہے۔ اور اس پر ایمان لائے ہیں۔ بذریعہ دلیل و برہان کے وہ ایمان ایمان نہ ہوگا (کیونکہ رؤیت اللہ تعالیٰ کی آنکھ سے حاصل نہیں ہوئی) کیونکہ یہ اس کی ضد اور مخالف ہے تو لازم آتا ہے کہ دنیا میں اس وقت کوئی مومن ہی نہ ہو۔ کیوں کہ خدا تعالیٰ کو یہاں کسی نے نہیں دیکھا اور باوجود اس کے مومن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اگر کہو کہ وہ معرفت جو آنکھ سے دیکھ کر حاصل ہوئی ہے ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان اسی رؤیت قلبی کا نام ہے جو دلیلوں کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہے اور حسی ذریعے سے لوگ اپنے تئیں مومن سمجھتے اور اس کے وجود کا یقین کرتے ہیں۔ تو دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ رؤیت قلبی اور معرفت اکتسابیہ قیامت کے دن زائل ہو جائے گی یا باقی رہے گی۔ اگر کہو کہ زائل ہو جائے گی اور اس کا اثر باقی نہ رہے گا تو لازم آتا ہے کہ دنیا میں خدا تعالیٰ پر ایمان لانا ہی فضول ہوا جب کہ یہ مان لیا گیا کہ اس کا قیامت کے دن کچھ اثر نہ ہوگا۔ اور اگر کہو کہ زائل نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا اثر باقی رہے گا اور اسی معرفت و ایمان پر سزا و جزا مترتب ہوں گے۔ تو وہ رؤیت عیانی فضول ٹھیری۔ اس سے معلوم اور ثابت ہوا کہ رؤیت خدا تعالیٰ ناممکن ہے واللہ یعلم۔

نیز بحار میں مروی ہے سئل الصادق علیہ السلام هل یری اللہ فی المعاد قال سبحانه تبارك وتعالیٰ عن ذلك علوا کبیرًا ان الابصار لا تدرك الا ماله لون وكيفية والله خالق الالوان والكيفية۔ جناب صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ آیا پروردگار عالم قیامت کے دن دکھائی دے گا؟ آپ نے فرمایا وہ معبود برحق اس سے بہت بالاتر ہے۔ بے شک آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں مگر انہیں چیزوں کو جن میں رنگ اور کیفیت ہو۔ اور خدا تعالیٰ رنگوں اور کیفیت کو پیدا کرنے والا ہے (تو اس میں کوئی رنگ یا کیفیت کیوں کر ہو گی۔ کیوں کہ واجب

الوجود میں حادث کا قیام ناممکن ہے نیز یہ کہ خالق کو مخلوق کے مغائر ہونا چاہیئے۔ پس خدا تعالیٰ رنگ وکیفیت نہ ہوگا۔ اور جب رنگ نہ ہوگا تو دکھائی بھی نہ دے گا۔

نیز مروی ہے احمد بن اسحاق سے قال کتبت الی ابی الحسن علی بن محمد علیہ السلام اسألہ عن الرؤیۃ وما فیہ الخلق فکتب علیہ السلام لا تجوز الرؤیۃ وما فیہ الخلق فکتب علیہ السلام لا تجوز الرؤیۃ ما لم یکن بین الرائی والمرئی ھواء ینفذہ البصر فمتی انقطع الھوآء وعُدم الضیاء لم تصح الرؤیۃ و فی وجوب اتصال الضیاء بین الرائی والمرئی وجوب الاشتباہ واللہ تعالیٰ عن الاشتباہ فثبت انہ لا یجوز علیہ سبحانہ الرؤیۃ بالابصار لان الاسباب لا بُدّ من اتصالھا الی المسببات۔" (توحید بحار) احمد بن اسحاق کہتے ہیں میں نے ابوالحسن علی بن محمد علیہ السلام کو خط لکھا اور اُس میں دیدار خدا کا مسئلہ دریافت کیا اور لوگوں کے خیالات ظاہر کیئے) تو آپ نے تحریر فرمایا کہ دیکھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دیکھنے والے اور دیکھی ہوئی شے کے درمیان ہوا نہ ہو۔ جس میں سے نظر کا نفوذ ہو سکے۔ پس جب کہ ہوا اور ضیا دونوں ہی منقطع ہوں۔ تو رؤیت ناممکن ہے اور جب کہ روشنی کا درمیان رائی اور مرئی کے ہونا لازم ہوا (جس کے بغیر کسی شئے کا دکھائی دینا ممکن نہیں) تو مشابہت رائی کی مرئی سے بھی ضرور ہے (یعنی کہ جو امر دیکھنے والے کے لئے دیکھنے میں ضروری لازم ہے۔ مثلاً ہوا اور روشنی کا توسط وہی مرئی کے دکھائی دینے میں ضروری ہے۔ مثلاً ہوا اور روشنی کا واسطہ ہونا اور جب ایسا ہوا۔ تو جس طرح دیکھنے والا کسی جہت میں قائم ہوگا۔ اسی طرح مرئی (دیکھا ہوا) بھی دوسری جہت میں ہوگا۔ پس جس طرح رائی محتاج جہت ہوا مرئی بھی محتاج جہت ہوگا۔) پس ثابت ہوا کہ (خدا تعالیٰ کا) دیکھنا آنکھ سے ناممکن ہے کیوں کہ اسباب کا اتصال اپنے مسببات سے لازم ہے (اور جب یہاں سبب ہی کا وجود نہیں تو مسبب کا وجود کہاں سے ہوگا) ان مدلول

حدیثوں میں ہر دو معصومین علیہما السلام نے رؤیت کی دونوں لازمی شرطوں سے بحث فرمائی ہے اور بے نظیر استدلال پیش کیا ہے۔

یعقوب بن اسحاق سے مروی ہے کہ میں نے بذریعہ تحریر حضرت ابو محمد علیہ السلام سے دریافت کیا کہ ھل رای رسول اللہ ربہ۔ کیا رسولؐ خدا نے اپنے پروردگار کو دیکھا تھا۔ تو آپ نے جواب میں تحریر فرمایا۔ ان اللہ تبارک وتعالی اری رسولہ بقلبہ من نور عظمتہ ما احب۔ بے شک خدا تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اُن کے دل کی آنکھوں سے اپنے نورِ عظمت کو جیسا چاہا دکھا دیا (نہ یہ کہ آنکھوں سے حضرت نے ان کو دیکھا ہو)۔

ایک بزرگ نے اس مطلب کی اور نئی طرز سے تشریح فرمائی ہے۔ ابوہاشم جعفری کہتے ہیں کہ میں نے ابوجعفر بن الرضا علیہ السلام سے دریافت کیا۔ لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار سے کیا مطلب ہے (یعنی کہ خدا تعالیٰ آنکھ سے نہ دکھائی دے گا اس کا کیا سبب ہے) تو آپ نے فرمایا۔ یا اباھاشم۔ اوھام القلوب ادق من ابصار العیون انت تدرک بوھمک السند والھند والبلدان التی لم تدخلھا ولم تدرکھا ببصرک فاوھام القلوب لا تدرکہ فکیف ابصار العیون۔ اے ابوہاشم دل کی نگاہیں تو آنکھ کی نظر سے زیادہ باریک ہیں دیکھو کہ تم اپنے دل کی نگاہوں سے سندھ۔ ہند اور دیگر شہروں کو جن میں تم کبھی داخل نہیں ہوئے اور نہ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جانتے ہو۔ (اور اس کی حقیقت کو پہچانتے ہو) پس جب کہ دل کی نگاہیں خدا تعالےٰ کی حقیقت معلوم نہیں کر سکتیں اور اسے دیکھ نہیں سکتیں۔ تو آنکھوں کی نگاہیں کیوں کر اسے ادراک کر سکیں گی۔

آخر میں اس قدر اور کہنا مقصود ہے کہ مدعیان دیدار خدا تعالیٰ قرآن مجید کی ایک آیت پیش کرتے ہیں جس کو اپنے دعوے کی دلیل کافی سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہے وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ۔ مگر پہلے اس قدر کہہ دینا ضروری ہے کہ اس آیت کے معنی میں جس قدر مجازات اور استعارات ہیں اور جو احتمالات

لغوی معنوں میں ہیں وہ ہرگز اس آیت کو خصم کے لئے دلیل نہیں ہونے دیتے اوّل تو وجوہ میں مجاز ہے کیونکہ اگر دیکھنے کی نسبت کی جاتی ہے تو آنکھ کی طرف نہ چہرے کی طرف۔ دیکھنا آنکھ کا فعل ہے نہ چہرہ کا۔ چہرہ آنکھ نہیں ہے بلکہ آنکھ آنکھ ہے۔ پس رویت کی نسبت وجوہ کی طرف مجازی ہے۔ نیز ناضرۃ میں استعارہ ہے۔ نضارت باغ سبز پھول وغیرہ کی حقیقی صفت ہے نہ چہرہ کی۔ نیز الیٰ جس طرح بمعنی "طرف" ہے۔ اور حرف جر ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ اسی طرح بمعنی نعمت ہونے کا بھی احتمال ہوتا ہے۔ الی کے لغوی معنی نعمت کے ہیں۔ (دیکھو کتب لغت) پھر لفظ ناظرۃ جس طرح بمعنی دیکھنے والے کے ہیں۔ اسی طرح بمعنی منتظر بھی ہے۔ پھر باوجود اس کے کہ الی بمعنی طرف ہو۔ جس طرح ایک ذات ربہا کا احتمال ہے۔ اسی طرح الی ثواب ربہا یا الی رحمۃ ربہا ناظرۃ کا بھی متحمل ہے۔ پس جب کہ آیت میں اتنے احتمال موجود ہیں۔ تو ان میں سے کسی خاص معنی کو جو بالخصوص عقل کے خلاف ہو۔ مراد لینا سوائے اس کے کہ عقل سے جنگ کرنا ہے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

لفظی معنی اس آیت کے کئی ہو سکتے ہیں ۱ کچھ لوگ اس دن خوش وخرم ہوں گے اپنے پروردگار کی نعمت کو دیکھ رہے ہوں گے ۲ کچھ لوگ ایسے ہوں گے۔ جو خوش وخرم اپنے پروردگار کے ثواب کے منتظر ہوں گے ۳ کچھ چہرے ایسے ہوں گے جو تر وتازہ ہوں گے اپنے پروردگار کے منتظر ہوں گے کہ کب وہ ہماری طرف اپنے ثواب بے حساب کو بھیجتا ہے ۴ کچھ چہرے یعنی آنکھیں ایسی ہوں جو اپنے پروردگار کو دیکھ رہی ہوں گی۔

تو اب میں مدعی رویت سے صرف اس قدر سوال رکھتا ہوں کہ اس آیت سے صرف چوتھے معنی مراد لینے اور باقی تین معنوں کی پرواہ نہ کرنی حالاں کہ قرینہ ان کا موجود ہے۔ اور اس معنی کے خلاف دلائل عقلیہ موجود ہیں۔ کس سبب سے ہے۔ آیا مقتضی اس کا ایمان ہے یا ہٹ دھرمی۔ اگر ہٹ دھرمی اس کی مقتضی ہے تو ہمیں اس سے کچھ بحث نہیں اور اگر ایمان اس کا مقتضی ہے تو میں پوچھتا ہوں

کہ اس نے کس دلیل سے اس رائے کو اختیار کیا کہ خدا تعالیٰ ضرور دکھائی دے گا۔ جب کہ وہ خود بڑے زور سے منکر ہے اور فرماتا ہے۔ لا تدرکہ الابصار اس کو آنکھیں نہ دیکھ سکیں گی۔

پس اگر ہم کہیں کہ ناظرۃ بمعنی منتظرہ ہے۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

انی الیک لما وعدت لناظرٌ

میں تیرے وعدہ کا منتظر ہوں۔ اور جیسا کہ دوسرا شاعر کہتا ہے ؎

ویوم بذی قار رایتُ وُجوھھم الی الموت من وقع السُیوف نواظرٌ

ذی قار[1] میں بعض دن ایسے بھی گذرے ہیں کہ میں نے اُن اہلِ مقابلہ کے چہروں کو دیکھا کہ تلواروں کے پڑنے کی وجہ سے موت کے منتظر تھے۔ ان دونوں کلامو سے دو باتیں ثابت ہوئیں ایک یہ کہ ناظرہ بمعنی منتظرہ آیا ہے اور دوسرے یہ کہ جو ناظرہ بمعنی منتظر آیا ہے اس کا صلہ حرف الیٰ بھی آیا ہے۔ نیز شاہد معنی منتظرہ قولِ خدا تعالیٰ ہے جو حکایت کلام بلقیس میں فرمایا ہے۔ اِنّی مُرسلۃٌ الیھم بھدیۃ فناظرۃ بم یرجع المرسلون۔ (البتہ میں حضرت سلیمان کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں پھر انتظار کرتی ہوں کہ ایلچی کیا جواب لاتے ہیں) تو کیا اعتراض لازم آتا ہے۔ یا اگر ہم کہیں کہ الیٰ بمعنی نعمت ہے۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

ابیض لا یرھب الھزال ولا یقطع رحماً ولا یخون اِلیٰ اے لا یخُون نعمۃ" تو کیا خرابی لازم آتی ہے۔

یا اگر ہم کہیں کہ الیٰ بمعنی عند ہے۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

فھل لکم فیما الیّ فانّنی طبیب بما اعیی النطاسیّ حذیماً

جس کی بنا پر معنی آیت یہ ہوں گے۔ کہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے۔ جو اپنے پروردگار کے نزدیک خوش و خورم ہوں گے اور انتظار کرتے ہوں گے کہ کب ہمارے لئے وہ ثواب حاصل ہوتا ہے۔ جس کا وعدہ خدا نے فرمایا ہے۔ تو کیا نقص لازم

---

[1] نام موضع

آتا ہے۔ یا اگر ہم کہیں کہ اچھا الیٰ ربہا ناظرہ کے وہی معنی سہی۔ جو تم دیکھتے ہو۔ لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ اس وقت رُوح کو چونکہ کمال صفائی اور ضیا رحاصل ہوگی۔ اس لئے اُسے پوری معرفت اپنے معبود کی ہوگی۔ اور جو شبہات آج ان علائق جسمانیہ کی وجہ سے اسے واقع ہوتے ہیں۔ اس وقت واقع نہ ہوں گے۔ تو تمہارے پاس اس خیال کے رد کرنے کی کیا دلیل ہے۔

بہر حال خصم چونکہ مدعی ہے۔ اس لئے بار ثبوت اس کے ذمہ ہے۔ اور اُسے لازم ہے کہ اس آیت سے صرف رویت باری تعالیٰ کو ثابت کردے اور باقی معانی جو بیان کئے گئے ہیں اُن کی دلیل سے نفی کر دے۔ ورنہ یہ مسئلہ اس آیت سے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا۔ علاوہ اس کے کہ دلائل عقلیہ اور دیگر نصوص قرآنیہ بھی اس کے منکر ہیں۔ مثلاً وہی آیۃ لیس کمثلہ شیٔ اس کے مثل کوئی شے نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی چیزیں عالم میں۔ مسموعات۔ مبصرات۔ مشمومات۔ مذوقات۔ ملموسات ہیں۔ ان سب سے برخلاف اور جداگانہ ذات باری تعالیٰ ہے۔ پس اس کا دیدار آنکھ سے کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ ہاں دل سے دیکھنے کا انکار نہیں۔ تراہ القلوب بحقائق الایمان۔ واللہ الہادی۔

دسواں باب

علمِ خدا تعالیٰ کے بیان میں

یہ مطلب اگرچہ نہایت دقیق مطالب میں سے ہے اور اس میں بحث کرنی اور اس کو ایسا عام فہم بنانا جس سے ہر دماغ مانوس ہو سکے مشکل ہے۔ مگر میں اس طرز پر لکھنا نہیں چاہتا۔ جو قدمائے مصنفین رحمہم اللہ کا طریقہ تھا۔ جس میں مبحث کے تمام مالہ اور ماعلیہ سے بحث ہوتی تھی بلکہ اصل معاملہ کو صاف لفظوں میں ادا کروں گا۔ اگر خدا نے مدد دی۔

یہ تو شاید ہر عاقل کو زمانہ موجودہ میں بالیقین معلوم ہو گا کہ خدا تعالیٰ عالم ہے۔ لیکن چونکہ اس مسئلہ میں غور کرتے وقت بہت سے لوگوں کو لغزشیں ہو گئی ہیں۔ اور اس وجہ سے بہت سے اختلاف ان میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے کسی قدر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے خیالات موٹے لفظوں میں عام فہم بیان کر دیئے جائیں اور ہلکی ہلکی اُن کی تائید یا عدم تائید بھی ظاہر کر دی جائے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ طبقہ حکمائے یونان سے لے کر طبقہ علمائے اسلام تک نے علم باری تعالیٰ کے معاملہ میں بہت کچھ اختلافات کیئے ہیں۔ کسی کا یہ خیال ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی شے کا علم ہی نہیں اور وہ اس کے وجوہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر باری تعالیٰ کو علم ہو گا تو دو طرح سے ہو سکتا ہے یا تو اس میں صورتیں معلومات کی چھپ جائیں جیسے آئینہ میں صورت منقش ہو جاتی ہے یا انسان کی آنکھوں میں۔ لیکن اس صورت میں لازم آئے گا کہ خدا تعالیٰ محل حوادث و اعراض ہو۔ حالانکہ یہ ناممکن ہے اور یا اس صورت سے ہو گا کہ اشیائے معلومہ اس کے سامنے موجود ہوں تو اس بناء پر لازم آتا ہے کہ بغیر موجود ہوئے ان کا علم نہ ہو مگر اس شبہ کا جواب صرف اس قدر ہے کہ انتقاش اور ارتسام (چھپ جانا) کے طور پر تو ہرگز اس کو

علم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ جسم نہیں ہے اور نہ جسمانی ہے بلکہ علم چونکہ بمعنی انکشاف وظہور کے ہے اور خدا تعالیٰ بھی مجرد تام ہے۔ جس کے لئے ظلمانیت کا ہونا ناممکن ہے اس لئے تمام چیزیں اس کے سامنے ظاہر و منکشف رہتی ہیں۔ خواہ موجود ہوں یا موجود ہونے والی ہوں۔ گذر چکی ہوں یا اب پیدا ہونے والی ہوں۔ اور انکشاف وظہور کے واسطے شے یا ارتسام کی شرط نہیں ہے۔ لہذا یہ شبہ تو بالکل لغو ہے۔

بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہیں ہوتا البتہ اُن جزئیات کو بطور کلی جانتا ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ جزئیات کو بھی جانے تو تغیر و تکثر اُس کی ذات میں لازم آئے گا۔ مگر یہ شبہ بھی قابل اعتنا نہیں ہے۔ کیونکہ تغیر تو اس وقت لازم آئے کہ اُس علم کا اثر اس کی ذات پر کچھ پڑے حالانکہ نہ کچھ جزئیات کا اثر اس پر ہوتا ہے اور نہ اُن کے علم کا۔ بلکہ وہ جزئیات جس حالت صورت اور کیفیت پر ہیں۔ انہیں حالتوں۔ صورتوں اور کیفیتوں سے اُس کے سامنے روشن ہیں اُس کی نظیر شمع کی روشنی کو مثلاً فرض کرو کہ اس کی روشنی میں آدمی کھڑا ہو۔ پھر بیٹھ جائے۔ پھر لیٹ جائے۔ پھر کھڑا ہو جائے۔ پھر چلنے لگے تو روشنی پر اس کی ان حالتوں کا اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ جس طرح اس کی روشنی اس شخص پر پہلے پڑ رہی تھی۔ اُسی طرح اب بھی پڑتی ہے۔ صرف اگر تغیر ہوا ہے۔ تو اس شخص میں اور اس کی حالات جزئیہ میں علی ہذا القیاس خدا تعالیٰ کے سامنے بھی سب چیزیں روشن۔ واضح اور ظاہر ہیں۔ جس حالت میں بھی ہوں۔ اور اُن حالتوں کا اُس پر اثر نہیں پڑتا۔ اگرچہ شمع کی روشنی کو خدا تعالےٰ سے کوئی مناسبت نہیں اور نہ اس انکشاف پر اُس انکشاف کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ لیس کمثلہ شیئٌ وھو السمیع البصیر لیکن صرف سمجھانے کے لئے یہ نظیر بیان کر دی ہے۔

اور چونکہ یہ خیال یعنی کہ باری تعالیٰ کو علم نہ ہونا بہت سے وجوہ و دلائل سے غلط بلکہ خیال مہمل ہے۔ اس وجہ سے علمائے اسلام اور حکمائے سابقین نے اس کو نہایت ذلت کی نظر سے دیکھا ہے۔ اور بیان کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے عالم ہونے

کے بہت سے دلائل ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ اس سے جس قدر افعال سرزد ہُوئے۔ مثلاً آسمانوں کا پیدا کرنا۔ ستاروں کا خلق فرمانا۔ عناصر کی ایجاد۔ موالید ثلاثہ حیوانات و نباتات و جمادات کا ابداع ملائک و جن و روح و نفس و قوے کا اختراع اور اُن میں ہزاروں ہزاروں حکمتوں۔ تدبیروں اور مصالح کا ہونا ایسے ہیں جو صاف طور پر پُکار پُکار کر کہہ رہے ہیں کہ اُن کا مُوجد و خالق بہت بڑا حکیم ہے اور جو حکیم ہوگا۔ اُسے عالم ہونا بھی ضروری ہے۔ لہذا خدا تعالیٰ عالم ہے۔

شیخ صدوق علیہ الرحمۃ نے تحریر فرمایا ہے۔ من الدلیل علی ان اللہ تعالی عالم ان الافعال المختلفۃ التقدیر المتضادۃ التدبیر المتفاوتۃ الصنعۃ لا تقع علی ما ینبغی ان یکون من الحکمۃ ممن لا یعلمھا ولا یستمر علی منھاج منتظم ممن یجھلھا الا تری انہ لا یصوغ قرطا یحکم صنعتہ ویضع کلا من دقیقہ وجلیلہ موضعہ من لا یعرف الصیاغۃ ولا ان ینظم کتابۃ ینظم کل حرف منھا ما قبلہ من لا یعلم الکتابۃ والعالم الطف صنعۃ وابدع تقدیرا مما وصفناہ فوقوعہ من غیر عالم بکیفیتہ قبل وجودہ ابعد واشد استحالۃ۔ اللہ تعالیٰ کے عالم ہونے پر یہ دلیل ہے۔ کہ مختلف اندازوں کے کام اور مختلف تدبیروں کے فعل اور رنگ برنگ کی صنعتوں کے امور جیسی حکمتوں پر مشتمل ہونے چاہئیں۔ ویسے کسی ایسے شخص سے واقع نہیں ہو سکتے جو اُن حکمتوں تدبیروں اور صنعتوں کو نہ جانتا ہو اور نہ طریق منتظم پر قائم رہ سکتی ہیں۔ ایسے شخص کے بنانے سے جو اُن سے ناواقف ہو۔ دیکھو کہ بندہ (جو کان میں پہنا جاتا ہے) اُسے کوئی ایسا شخص جو اُس کی باریک اور موٹی باتو کو اچھی طرح نہ جانتا ہو۔ اور اُس کو عمدہ نہ بنا سکتا ہو۔ (ہرگز) بنا نہیں سکتا۔ (اگر کسی ناواقف بچے سے کہو کہ بھائی یہ سونے کا بندہ۔ یا اور کوئی زیور بنا دو وہ ہرگز نہیں بنا سکے گا) اور نہ وہ شخص جس نے لکھنا نہ سیکھا ہو اور اس کا علم نہ رکھتا ہو۔ حروف کو انتظام سے لکھ سکتا ہے (کیونکہ اُسے کیا معلوم کہ کون سا

حرف اوپر ہونا چاہیئے۔ کون سا نیچے۔ سطریں کس طرح سیدھی لکھی جاتی ہیں۔ دوائر کس طرح بنائے جاتے ہیں۔ حرفوں کی کرسی کیوں کر برابر رکھی جاتی ہے۔ تو جب کہ یہ معمولی چیزیں بغیر جاننے والے کے حکمت وصنعت کے ساتھ نہیں بن سکتیں تو عالم (جو کہ) صنعت و تقدیر میں زیادہ لطیف و بدیع ہے اس کا پیدا ہونا ایسے شخص سے جو اس کی کیفیتوں کا عالم نہ ہو۔ کیونکر ممکن ہے ہرگز نہیں بلکہ بہت دُور اور سخت محال ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے جتنے افعال ہیں۔ وہ قدرت و اختیار سے ہوئے ہیں اور قدرت و اختیار سے کسی فعل کا ہونا بغیر علم کے بالکل خلاف عقل ہے کیونکہ جو شخص اپنے اختیار سے کوئی کام کرے گا۔ ضرور اُسے جاننا بھی ہوگا۔ کہ یہ کیا کام ہے اور کیوں کر ہوگا اور اس کا انجام کیا ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ باری تعالیٰ ازبسکہ مجرد ہے اور اس میں مادہ کا بالکل شائبہ نہیں۔ جس کی وجہ سے تاریکی اور عدم ظہور وکشف اور جہالت ہوتی ہے تو لامحالہ اس کو عالم ہونا چاہیئے کیوں کہ جب عدم علم کے موانع سب مرتفع ہو چکے ہیں تو اگر پھر بھی عالم نہ ہو۔ تو ارتفاع نقیضین لازم آئے گا۔ یعنی کہ عالم بھی نہ ہو۔ اور لا عالم بھی نہ ہو۔ حالاں کہ یہ محال ہے۔ پس عالم ہونا اس کا لازم وواجب ہے۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ جب اُس کے بعض مخلوقات مثل حیوانات اور ملائکہ وجن کے قوت عاقلہ رکھتے ہیں اور اُن کو ہر اُس شئے کا علم ہوتا ہے۔ جو اُن کے سامنے ہے۔ اور اکثر اُن امور کا بھی علم ہو جاتا ہے جو آئندہ حادث ہونے والے ہیں۔ یا پہلے ہو چکے ہیں تو اُن کا خالق جو اُن سے زیادہ قوی ہے کیوں کر عالم نہ ہوگا۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ چونکہ خدا تعالیٰ اپنی ذات کو ضرور جانتا ہے۔ کیونکہ وُہ خود اپنے سامنے حاضر ہے (جیسے انسان اپنے تئیں جانتا ہے کہ میں ہوں اس وجہ سے کہ وہ اپنے سامنے ہر وقت آپ موجود ہے) اس لئے ضرور ہے کہ وہ اوروں کے

حالات وکیفیات و ماہیات کا بھی عالم ہو۔ کیوں کہ تمام چیزوں کی وہی علت ہے اور علت کا علم مستلزم ہے معلول کے علم کو۔ تو جب کہ اُس نے اپنے تئیں جانا جو کہ علت ہے تو اور چیزوں کو بھی ضرور جانتا ہوگا جو معلول ہیں۔

چھٹی دلیل سمعی ہے اور وہ انبیاء علیہم السلام کا بیان کرنا کہ خدا تعالیٰ عالم ہے کیونکہ کوئی نبی مرسل ایسا نہیں آیا جس نے یہ بتایا ہو کہ خدا تعالیٰ جاہل ہے بلکہ سب نے متفق اللفظ اُس کے علم کی شہادت دی اور از بسکہ وہ عادتاً اور عقلاً جھوٹ نہیں بولتے اور نہ بول سکتے تھے اس لئے اُن کا کلام سچا ہی ہوگا۔

یہاں تک تو دلیلوں کی رُو سے مان لیا گیا کہ خدا تعالیٰ عالم ضرور ہے۔ اگر اس کے بعد یہ بحث پیدا ہوئی کہ کس طرح عالم ہے اور اس کا علم کیا ہے اور یہ وُہ مصیبت ہے۔ جس میں حکمائے یونان سے لے کر متکلمین اسلام تک سب مبتلا ہیں۔ اور تقریباً کسی کو بھی اس مصیبت سے نجات نہیں ملی۔ اور سبب اس کا صرف یہ ہے کہ ایک تو ایسے امر میں عقل دوڑائی ہے۔ جس میں اُسے رسائی ہے نہیں۔ جب کہ خدا تعالیٰ کی حقیقت کا ہی کسی کو علم ممکن نہیں تو اس کے صفات کا علم کما حقہ کیونکر ممکن ہوگا۔ میرے خیال میں تو ان لوگوں کو اس معاملہ میں یہیں سکوت کرنا لازم تھا۔ کہ جس طرح مجبوری دلائل اُس کے وجود کو مان لیا ہے۔ گو اس کی حقیقت سے بالکل ناواقف ہیں۔ حتیٰ کہ رسولؐ کو بھی اس کی کنہ و ماہیت کا علم نہ ہو سکا۔ (کیونکہ محال ہے) علیٰ ہذا القیاس یہاں بھی اسی قدر پہ اکتفا کرنی چاہیے تھی کہ وُہ عالم ہے۔ کیوں کہ دلیلیں اس امر کے ماننے پر مجبور کر رہی ہیں۔ لیکن یہ کہ وُہ کس طرح عالم ہے اُس کا علم کیا ہے؟ اس کا دریافت کرنا قبل از وقت اور غیر ضروری تھا۔ مگر جتنی ہی اس کی ضرورت نہ تھی اتنی ہی سب نے اس میں کوشش کی اور ساری قوت علمیہ اپنی یہیں لاکر صرف کر دی ہے کوئی دقیقہ زور لگانے کا چھوڑا نہیں۔ سوائے محرومی کے اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ علاوہ ازیں ان لوگوں نے حقیقی عالموں سے بھی اس معاملہ میں مدد نہ لی۔ کاش یہی کیا ہوتا تو اس مصیبت میں نہ پڑتے

اور اس مشکل سے صاف چھوٹ جاتے۔

اگر تمام تفصیل اس معاملہ کی معلوم کرنی ہو تو صدرالدین شیرازی کی اسفار یا کتاب عماد الاسلام مولانا سید دلدار علی اعلی اللہ مقامہ کی ملاحظہ کرنی چاہیئے اور اگر اجمالاً بغیر مالہ اور ماعلیہ کے معلوم کرنا ہو تو اس تھوڑے سے بیان سے حاصل ہونا ممکن ہے۔ جو اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

سب سے پہلے اس مصیبت میں افلاطون کو ابتلاء ہوا جو اس امر کے قائل ہو گئے کہ خدا تعالیٰ کا علم مجردہ اور عقلیہ صورتیں ہیں انہیں کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ ہر شئے کو جانتا ہے اسی کو لوگ مثل افلاطونیہ بھی کہنے لگے ہیں۔ کیوں کہ مثل بمعنی صوَر ہے مگر اس رائے کی غلطی یوں معلوم ہوتی ہے کہ اولاً تو خدا تعالیٰ کو اپنے علم میں غیر کا محتاج ہونا لازم آتا ہے۔ کیوں کہ جب صورتیں اس کا علم ٹھیریں اور وہ اس کی ذات پاک کے مغائر ہیں تو اُسے ضرورت پڑی کہ جب تک یہ صورتیں نہ ہوں اُسے علم ہی نہ ہو۔ نیز یہ کہ لازم آتا ہے کہ ازل میں خدا تعالیٰ جاہل ہو اس لئے کہ یہ صورتیں یقیناً حادث ہیں اور جب ان کا وجود ہو چکا تب جا کر یہ علم نہیں اور پہلے وہ ناواقف تھا۔ حالاں کہ اگر اس کا جہل تسلیم کیا جائے اگرچہ ازل ہی میں کیوں نہ ہو۔ تو خلق عالم کا مسئلہ دشواری میں پڑتا ہے۔ حالاں کہ اُسے خالق عالم تسلیم کیا گیا ہے۔

اور جب اس خیال کی غلطی محسوس ہوئی تو پچھلوں میں فرفوریوس نے جو ارسطو کا شاگرد ہے۔ یہ رائے اختیار کی کہ علم خدا تعالیٰ اس کی ذات سے علیحدہ تو نہیں ہے۔ ورنہ احتیاج لازم آئے گی جو محال ہے مگر یہ کہ وہ صورتیں اس کی ذات سے متحد ہیں۔" اس رائے کو بھی غلط سمجھا گیا ہے کیونکہ واجب و ممکن کا اتحاد ناممکن ہے جب صورتیں ممکن ہیں تو واجب الوجود سے کیوں کر متحد ہوئیں۔

اور جب اس رائے کی غلطی معلوم ہوئی تو بہمنیار وغیرہ نے یہ رائے اختیار کی کہ ممکنات کی صورتیں بطور حصول ذہنی کے ذاتِ خدا تعالیٰ میں قائم ہیں مگر بروجہ

کلی نہ بروجہ جزئی۔ اور اس مطلب کو یوں بیان کرتے ہیں کہ جیسے معمار عمارت بنانے سے پہلے تمام نقشہ مکان اپنے ذہن میں حاضر کر لیتا ہے اور جس طرح کوئی مصنف قبل تصنیف کتاب کے تمام مضمون کو بروجہ کلی اور اجمالاً ذہن میں موجود کر لیتا ہے اور اُسی کے مطابق معمار عمارت بناتا اور مصنف کتاب تصنیف کرتا ہے۔ اسی طرح یہ اشیاء حادثہ خدا تعالیٰ کی ذات میں موجود ہیں۔"

مگر اس میں بھی یہ خرابی ہے کہ اوّل تو ذات خدا تعالیٰ کے لئے محل اعراض ہونا لازم آتا ہے۔ جو کسی طرح قابل قبول نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ خود ہی قائل ہیں کہ بروجہ کلی ان اشیاء کا عالم ہے جس سے نفی علم جزئی کی ثابت ہوتی ہے۔ حالاں کہ جب وہ عالم ہے تو بطور کلی اور بطور جزئی ہر طرح سے عالم ہے اور اگر نہیں تو کسی طرح نہیں۔ اس نقص کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہوئی۔ کہ کلیتہً تو عالم ہے۔ مگر جزیتہً غیر عالم ہے۔

اور جب اس سے بھی ہٹے تو یہ کہا کہ جتنی ہی موجودات ممکنہ ہیں وہ سب کی سب اپنے موجود ہونے سے پہلے موجود تھے۔ اور وُہی ان کا موجود ہونا باری تعالیٰ کا علم ہے" یہ بھی خوب کہی کہ موجودات حادثہ ممکنہ اپنے موجود ہونے سے پہلے موجود ہیں۔ یہ بزرگی فرقہ معتزلہ کی ہے۔ اگرچہ ان بے چاروں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کو ازلی وابدی عالم ثابت کر دیں۔ مگر رفتار وہ اختیار کی جو محال ہے یعنی معدومات کا قبل وجود موجود ہونا جو کسی عقل میں نہ آئے۔

غرض اس طرح کے اور بہت سے اقوال لایعنی بیہاد جن کی طرف توجہ نہ دی جائے ہیں۔ جو علم باری تعالیٰ کی بابت کتابوں میں درج ہیں مگر حق تحقیق اور قول فیصل وہی ہے جو مسلک رسولؐ کے سچے جانشینوں نے بتایا ہے یعنی کہ جمیع صفات کمالیہ خدا تعالیٰ کے عین ذات ہیں۔ قدرت بھی اس کی عین ذات ہے۔ حیات بھی علم بھی۔ ادراک بھی وغیر ذلک۔ کیوں کہ اس بناء پر کوئی اعتراض واقع نہیں ہوتا۔ جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے ابان بن احمر کہتا ہے کہ میں نے حضرت کی خدمت میں

عرض کی کہ آپ مجھے بتائیں کہ خدا تعالیٰ ہمیشہ سے سمیع وبصیر وعلیم وقادر ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر میں نے عرض کی ایک شخص جو لوگوں کی محبت کا دعویٰ رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ سماعت سے سمیع ہے۔ بصارت سے بصیر ہے۔ علم سے علیم ہے۔ قدرت سے قادر ہے (یعنی یہ سب صفات اس کی ذات سے علیحدہ ہیں اور پھر اس میں پائی جاتی ہیں۔) راوی کہتا ہے کہ حضرت کو یہ سن کر غصہ آگیا اور فرمایا کہ جو شخص کہتا ہے وہ مشرک ہے اور ہماری ولایت سے خارج ہے (کیونکہ اس خیال کے موجب وہ بہت سے قدماء کے وجود کا قائل ہو گیا) ان اللہ تبارک تعالیٰ ذاتٌ علامۃ سمیعۃ بصیرۃ قادرۃ (ایسا نہیں جو وہ کہتا ہے بلکہ) بے شک خدا تعالیٰ ایک ذات علام سمیع وبصیر وقادر ہے۔" (نہ یہ کہ اس کی قدرت وبصارت وسماعت وعلم اس کی ذات سے علیحدہ ہیں)

حسین بن خالد سے روایت ہے کہ میں نے جناب امام رضا علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا لم یزل اللہ وتعالیٰ عالماً قادراً حیاً قدیماً سمیعاً بصیراً۔ ہمیشہ سے خدا تعالیٰ عالم۔ قادر۔ حی۔ قدیم۔ سمیع اور بصیر ہے۔ تو میں نے عرض کی یا ابن رسول اللہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ علم سے عالم ہے۔ قدرت سے قادر ہے۔ حیوٰۃ سے زندہ ہے۔ قدم سے قدیم ہے۔ سمع سے سمیع ہے۔ بصر سے بصیر ہے (یعنی اس کے صفات کمالیہ زائد بر ذات ہیں) آپ نے فرمایا جو شخص اس کا قائل ہے اس نے خدا تعالیٰ کے ساتھ اور کئی خدا بنا لئے اور وہ ہماری ولایت سے خارج ہو گیا۔ پھر آپ نے فرمایا لم یزل اللہ عزوجل عالماً قادراً حیاً قدیماً سمیعاً بصیراً لذاتہ وہ اپنی ذات سے ہمیشہ سے عالم۔ قادر۔ زندہ۔ قدیم اور سمیع وبصیر ہے۔ تعالیٰ عما یقول المشرکون والمشبھون علواً کبیراً۔ یہ جو مشرکین ومشبہین اس کی نسبت کہتے ہیں۔ اس سے خدا بالاتر ہے۔" (یعنی اس میں وہ امور نہیں جن کے قائل یہ فرقہ مشرکین ہیں۔)

نیز جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اللہ تبارک وتعالیٰ کان لا شیئ غیرہ نوراً لاظلام فیہ وصادقاً لا کذب فیہ

وعالمًا لا جهل فیه وحیا لا موت فیه وکذٰلک ھو الیوم وکذٰلک لا یزال ابداً۔ (توحید بحار) بے شک خدا تعالیٰ موجود تھا اور اس کے ساتھ کوئی شے نہ تھی (یعنی ایک وہی قدیم ہے اور باقی تمام چیزیں حادث ہیں) وہ نور ہے جس میں ظلمت نہیں ہے اور صادق ہے جس میں کذب نہیں۔ اور عالم ہے جس میں جہالت نہیں اور حی ہے جس میں موت نہیں۔ اور ایسا ہی وہ آج ہے اور ایسا ہی وہ ہمیشہ رہے گا۔

نیز جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ لم یزل اللہ جل وعزّ ربّنا والعلم ذاتہ ولا معلوم والسّمعُ ذاتہ ولا مسموع والبصر ذاتہ ولا مبصر والقدرۃ ذاتہ ولا مقدور فلمّا احدث الاشیاء وکان المعلوم وقع العلم منہ علی المعلوم والسّمع علی المسموع والبصر علی المبصر والقدرۃ علی المقدور۔ ہمیشہ سے ہمارا خدائے عزوجل ایسا ہے کہ علم اس کا عین ذات ہے جب کہ کوئی معلوم نہ تھا تب بھی عالم تھا اور سمع اس کا نفس ذات ہے۔ جب کہ کوئی مبصر نہ تھا تب بھی وہ بصیر تھا اور قدرت اس کی عین ذات ہے جب کہ کوئی مقدور نہ تھا تب بھی وہ قادر تھا۔ پھر جب اُس نے اشیائے عالم کو حادث کیا اور معلوم کا وجود ہُوا تو اس کا علم ذاتی اس معلوم پر واقع ہُوا اور اس کا سمع مسموع پر اور اس کی بصر مبصر پر اور قدرت مقدور پر۔" راوی نے کہا میں نے دریافت کیا کہ آیا وہ ہمیشہ سے متکلم بھی تھا۔ تو آپ نے فرمایا کہ کلام تو صفت حادثہ ہے۔ ازلی صفت نہیں ہے۔" (توحید بحار)

جب یہ بات معلوم ہو چکی۔ تو اُن آیات پر غور کرنا چاہیئے جو خدا تعالیٰ نے اپنے علم کی نسبت آپ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے۔ اس مضمون کو خدا تعالےٰ نے تقریباً ایک سو چھبیس مقام پر قرآن میں ذکر فرمایا ہے اور اپنے علم کی وسعت ظاہر کی ہے اور غالباً اس سے غرض یہی ہو گی کہ اس قدر جو اختلافات لوگوں میں ہیں۔ وہ بالکل فضول ہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ ہر شے کا ہر حیثیت سے ہر وقت عالم ہے۔

سورہ بقر میں ایک موقع پر ارشاد فرماتا ہے۔ وھو بکل شیئ علیم۔ وہی (معبود حقیقی) ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے بجائے عالم کے علیم فرمایا ہے۔ اور غرض یہ ہے کہ عالم اسم فاعل ہے جس کے معنی میں ثبوت و دوام و استقرار نہیں ہے۔ عالم اس وقت کسی کو کہیں گے جب کہ اُسے کسی شے کا علم حاصل ہو۔ اس میں حالت سابقہ اور مسبوقہ دونوں سے بحث نہیں ہے۔ برخلاف علیم کے کہ یہ لفظ صفت مشبہ ہے جس میں اتصاف ذات بطور استقرار و دوام کے سمجھ میں آتی ہے۔ چونکہ خدا تعالیٰ بحسب ذاتہ عالم ہے۔ بلکہ خود ہی عین علم ہے۔ تو اس کے علم کے واسطے کوئی وقت وقوع اور حدوث کا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ یہ صفت ذاتیہ ہے۔ جس کا انفکاک نہیں ہو سکتا تو لفظ علیم سے اس امر کو واضح کیا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر شے کا علم رکھتا ہے، عام اس سے کہ وہ اس وقت موجود ہو یا معدوم۔ ظاہر ہو یا باطن۔ دلی خیالات ہوں یا زبانی گفتگو۔ آہستہ یا بلند آواز سے۔ کوئی شے کسی وقت اس کے علم سے غائب نہیں ہے۔ اس عموم کو خدا تعالیٰ نے فرد فرد کر کے بھی بیان کر دیا ہے اور ظاہر کر دیا ہے کہ جن لوگوں کو یہ خیال ہے کہ خدا تعالیٰ جزئیات کا علم نہیں رکھتا وہ خیال غلط ہے چنانچہ اسی سورہ بقرہ میں ایک مقام پر فرماتا ہے وما تفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم۔ تم جو نیکی کرو۔ اس سے خدا تعالیٰ واقف ہے۔ دوسرے مقام پر فرماتا ہے وَاللہ یعلم المفسد من المصلح۔ اللہ تعالیٰ فسادی آدمی اور اصلاح کرنے والے کو علیحدہ علیحدہ جانتا ہے۔ یعنی اس کو مفسد اور مصلح کے فساد اور اصلاح کا اور خود دونوں کا علم ہے کہ کون اُن میں فسادی ہے اور کون اصلاح کرنے والا ایک اور مقام پر اسی سورہ میں فرماتا ہے۔ واعلموا ان اللہ بما تعملون بصیر۔ جان لو کہ خدا تعالیٰ جانتا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو۔ پھر دوسرے مقام پر فرماتا ہے یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم۔ خدا تعالیٰ اُن چیزوں کا علم رکھتا ہے جو ان (آدمیوں) کے سامنے یا پیچھے ہے۔ یعنی ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جو ان کے پیش نظر ہے اور اُن کے سامنے موجود ہے۔ جسے یہ لوگ بھی جانتے ہیں

اور ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جن کی ان لوگوں کو خبر بھی نہیں اور اسے ماخلفہم سے تعبیر فرمایا ہے۔ کیوں کہ انسان اکثر اپنے پس پشت کی چیزوں کا حال نہیں جانتا کرکیا ہے تو گویا وہ شئے اس سے غائب ہے لہذا غائب اور نامعلوم کو اس لفظ سے بیان فرمایا ہے۔ اور اس سے عموم علم جزئیات وکلیات کا ثابت ہوتا ہے۔ پھر ایک مقام پر فرمایا ہے۔ وما انفقتم من نفقۃٍ او نذرتم من نذرٍ فان اللہ یعلمہ۔ جو کچھ تم نے خرچ کیا ہو راہ خدا میں۔ یا جو کوئی نذر تم سے واقع ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے۔ نیز سورہ آل عمران میں فرمایا۔ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْہُ یَعْلَمْہُ اللّٰہُ وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ اے ہمارے حبیبؐ (ان لوگوں سے) کہہ دو کہ چاہے تم اپنے دلوں کی باتوں کو چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو اللہ تو اسے جانتا ہے۔ اور جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین پر ہے اسے بھی جانتا ہے۔ پھر فرمایا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ۔ تم جو کچھ بھی راہ خدا میں خرچ کرو۔ پس بے شک اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے۔" اور جب جانتا ہے تو ضرور ہے کہ اس کا نیک معاوضہ بھی دے گا۔ کیوں کہ خدا تعالیٰ کسی کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ اس پر شاہد ہے۔ پھر فرمایا ہے وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ۔ خدا تعالیٰ جانتا ہے پرہیزگاروں کو یعنی کہ کون پرہیزگاری کے عمل کرتا ہے اور کون اس کے خلاف اور جو پرہیزگار ہے اس کو اس کے عمل کے موافق جزا دیتا ہے۔ پھر فرمایا ہے۔ ولیعلم المومنون ولیعلم الذین نافقوا۔ خدا تعالیٰ مومنوں کو جانتا ہے اور ان لوگوں سے بھی واقف ہے جو نفاق رکھتے ہیں۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے منافقوں پر ظاہر کر دیا ہے کہ تم لوگ جو ظاہر میں اسلامی برتاؤ کرتے ہو اور باطن میں کافر ہو۔ اور اپنے اس عمل کو ہمارے رسول سے چھپاتے ہو۔ اور لوگوں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تو کیا پروا ہے خدا تعالیٰ تو تمہارے اس عمل کو جانتا ہے۔ اور اس سے اپنے رسول کو مطلع فرما دیتا ہے۔ پھر بلحاظ عموم تعلق علم فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ کا

بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْماً بے شک خدا تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ پھر اپنے علم کے دائرہ کی وسعت کو یوں ارشاد فرمایا ہے۔ یستخفون من الناس ولا یستخفون من اللہ و ھو معھم اذ یبیتون ما لا یرضی من القول وکان اللہ بما یعملون محیطا۔ یہ لوگ اپنے راز آدمیوں سے تو چھپاتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ درحالیکہ وہ ان کے ساتھ ہے جب کہ راتوں کو بیٹھ کر آپس میں وہ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ جسے وہ پسند نہیں کرتا اور اللہ تمام اُن کاموں کو جنہیں وہ کرتے ہیں جانتا ہے۔

پھر سورہ مائدہ میں فرمایا۔ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (خدا تعالیٰ ہی نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے اس کا گھر بنایا ہے اور محترم مہینے یعنی محرم۔ رجب۔ ذیقعدہ۔ ذوالحجہ مقرر کئے ہیں اور قربانی کے جانور اور وہ جانور جو خدا کی نیاز کے واسطے مخصوص کیے جاتے ہیں ان کے گلوں میں کوئی علامت لٹکائی جاتی ہے۔ بنا دیئے ہیں) یہ اس وجہ سے ہے کہ تم لوگ جان لو کہ خدا تعالیٰ تمام ان چیزوں سے واقف اور باخبر ہے۔ جو آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہے اور یہ کہ بے شک خدا تعالیٰ ہر شئے کا علم رکھنے والا ہے۔ غرض یہ کہ خانہ کعبہ کو امن کا گھر بنانا اور حاجیوں اور قربانیوں کی حفاظت کے لئے حکم دینا اور چار مہینے ایسے محترم قرار دینا۔ جن میں خون ریزی اور جنگ و فساد نہ کیا جائے۔ یہ صرف امن قائم رکھنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اور یہ تمام امور ہمارے انتظام اور علم سیاست پر دلالت کرتے ہیں اور یہ بھی غور کرنے والوں کو بتاتے ہیں کہ ہم نے ان امور میں کیا کیا حکمتیں ؔرا دی ہیں۔ مثلاً حج کو۔ قربانی کو اُس کے خانہ امن ہونے کو مکہ کی آبادی کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ ورنہ تم لوگ دن رات کی جنگ اور آپس کے کشت و خون سے کب کے تباہ ہو چکے ہوتے۔ دوسرے یہ کہ ان امور کو تمہاری وسعت معاش کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ تیسرے یہ کہ تم جیسے وحشی عربوں کو جنگ و فساد سے ہاتھ روکنے کا طریقہ تعلیم کر دیا ہے کہ اسی طرح تم کو عادت پڑ جائے اور دن رات جنگ باہمی نہ ہوا کرے۔

پھر اسی سورہ میں فرماتا ہے وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَکْتُمُوْنَ اور اللہ جانتا ہے جسے تم ظاہر کرتے ہو اور جسے تم چھپاتے ہو۔

پھر سورہ انعام میں فرمایا ہے وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَا اِلَّا ھُوَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَۃٍ اِلَّا یَعْلَمُھَا وَلَا حَبَّۃٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ۔ اور اسی (معبود حقیقی) کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ اُن کو نہیں جانتا مگر وہی اور (وہ) جانتا ہے۔ اُن چیزوں کو جو خشکی میں ہیں اور اُن چیزوں کو بھی جو دریا میں ہیں۔ اور کوئی سا پتا نہیں گرتا مگر یہ کہ (وہ) اس کو بھی جانتا ہے اور نہ کوئی ایسا دانہ ہے۔ زمین کی تاریکیوں میں۔ اور نہ کوئی خشک و تر چیز ہے جو بیان کرنے والی کتاب میں نہ ہو یعنی ہر چیز کا ذکر اجمالاً ہم نے اس کتاب مجید و فرقان حمید میں بھی کر دیا ہے۔

ابو بصیر سے مروی ہے کہ میں نے معصوم سے دریافت کیا کہ ما تسقط من ورقۃ الا یعلمھا ولا حبۃ فی ظلمات الارض ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین سے کیا مراد ہے۔ آپ نے فرمایا۔ الورقۃ السقط والحبۃ الولد وظلمات الارض الارحام والرطب ما یحیی والیابس ما یغیض وکل ذالک فی کتاب مبین۔

ورقۃ سے مراد وہ بچہ ہے جو قبل زمانہ پورا کرنے کے ساقط ہو جاتا ہے اور حبۃ سے مراد بچہ کامل ہے اور ظلمات الارض سے مراد وہ رحم ہیں جن میں بچہ رہتا ہے رطب سے مراد وہ بچہ ہے جو زندہ رہتا ہے اور یابس سے مراد وہ ہے جو فنا ہو جاتا ہے یہ تمام ہی باتیں کتاب مبین میں موجود ہیں۔ اس تفسیر کی بناء پر خلاصہ آیت یہ ہوا کہ رحم کی اندرونی حالت جو احوال جزئیہ ہیں اُن سے بھی خدا تعالیٰ مطلع ہے۔ یہ بھی جانتا ہے کہ کون قبل از وقت ساقط ہو جائے گا۔ یہ بھی جانتا ہے کہ کون صحیح و سالم زندہ پیدا ہوگا اور یہ بھی جانتا ہے کہ پیدا ہو کر کون مر جائے گا۔ بلکہ ان تمام باتوں کو تو کتاب مبین میں پہلے ہی لکھ دیا ہے۔

واضح ہو کہ کتاب مبین سے مراد لوح محو و اثبات یا لوح محفوظ بھی ہو سکتی

ہے۔ اور قرآن مجید بھی مگر اوّل اولیٰ ہے۔ (واللہ یعلم)

نیز اسی سورۃ میں فرماتا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ۔ بے شک تیرا پروردگار اُن لوگوں کا بھی علم رکھتا ہے۔ جو اُس کی راہ (دین اسلام) سے بھٹک گئے (اور گمراہ ہو گئے ہیں) اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کا بھی بڑا جاننے والا ہے۔

پھر سورہ انفال میں یہ بھی فرمایا ہے۔ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ بے شک وہ دل کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

پھر سورہ توبہ میں فرماتا ہے۔ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ بالضرور خدا تعالیٰ اُن کے مخفی امور اور اُن کی سرگوشیوں کو جانتا ہے اور یہ کہ بے شک اللہ غیبوں کا جاننے والا ہے۔

پھر سورہ یونس میں فرمایا ہے۔ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔ (اے رسولؐ تم جس حال میں رہتے ہو اور جس کام میں اپنے امور دین سے مشغول ہوتے ہو۔ تبلیغ رسالت اور تعلیم شریعت وغیرہ اور جو آیات قرآنیہ تم پڑھتے ہو (یعنی لوگوں کے سامنے) اور جو کچھ تم اور تمہاری امت عمل کرتی ہے۔ ان سب امور کو ہم جانتے ہیں اور اس کے شاہد رہتے ہیں جب کہ تم ان کاموں میں داخل ہوتے ہو اور اے رسولؐ ہمارے ایک چیونٹی کے برابر بھی کوئی چیز تمہارے پروردگار سے غائب اور پوشیدہ نہیں ہے۔ خواہ زمین میں ہو۔ خواہ آسمان میں۔ اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی کوئی چیز ہے مگر یہ کہ وہ کتاب مبین یعنی لوح محفوظ میں درج ہے۔

جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جناب رسالت مآبؐ جب اس آیت

کو تلاوت فرماتے تو بہت روتے تھے" اور یہ آپ کا رونا اس وجہ سے تھا کہ انسان جو کچھ نیکی اور بدی کرتا ہے اس کو خدا تعالیٰ جانتا ہے جو عادل ہے اور ضرور اس پر جزا وسزا دے گا تو اس خیال سے آپ کو خوف خدا طاری ہوتا تھا اور نیز یہ محتمل ہے کہ آپ کا یہ رونا اپنی امت کے خیال سے ہو۔ چونکہ آپ اپنی اُمت پر حد سے زیادہ مہربان تھے۔ اس لئے آپ اُن کا معذب ہونا اُن کی بداعمالیوں کی وجہ سے پسند نہ فرماتے تھے۔ اور از بسکہ خدا تعالیٰ عادل ہے۔ لہذا اُن کو اُن کے افعال کی سزا ملنا ضروری ہے۔ اس لئے آپ اُن پر ترحم کے خیال سے گریہ فرماتے تھے۔ نیز یہ بھی محتمل ہے کہ ایک سبق رہا ہو۔ جو آپ اپنی اُمت کو دیتے تھے۔ بایں معنی کہ جب آپ اس سبب سے گریہ فرماتے ہوں کہ خدا تعالیٰ ہمارے تمام نیک و بد کاموں کی خبر رکھتا ہے۔ باوجودیکہ آپ معصوم عن الخطا تھے۔ تو اوروں کو اس سے زیادہ اپنی حالت پر رونا چاہیئے۔ اس خیال سے کہ ہم جس قدر معاصی کرتے ہیں۔ وہ سب خدا تعالیٰ کو معلوم ہے۔ پھر اس کا کیا نتیجہ پیدا ہوگا۔ اور وہ عادل حقیقی ہمارے ساتھ اس سبب سے کیا برتاؤ کرے گا۔ واللہ تعلم

نیز سورہ رعد میں فرمایا ہے۔ اَللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ کُلُّ اُنْثٰی وَمَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْکَبِیْرُ الْمُتَعَالِ۔ سَوَآءٌ مِّنْکُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّیْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ فی قوله اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ کُلُّ اُنْثٰی وَمَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ مَا تَغِیْضُ ای ما تسقط قبل التمام وما تزداد یعنی علی تسعة اشهر کلما رأت المرأة حیضا فی ایام حملها زاد ذالک علی حملها وفی روایة ابی الجارود عن ابی جعفر علیه السلام فی قوله سواء منکم من اسرّ القول ومن جهر به السرّ والعلانیه عندہ سواء وقوله مستخف باللیل مستخف فی جوف بیته وقال علی بن ابراهیم فی قوله وسارب بالنهار یعنی تحت الارض فذالک کله عند الله عزوجل واحد یعلمه۔ یعنی آیة الله یعلم ما تحمل

کل انثی الا اس آیت میں ماتغیض سے مطلب یہ ہے کہ جو بچہ قبل پورا ہونے کے ساقط ہو جاتا ہے اور ما تزداد سے مراد یہ ہے کہ مدت حمل نو مہینے سے زیادہ ہو جائے جب کہ عورت کو ایام حمل میں حیض آجاتا ہے۔ تو مدت حمل دبسبب عورت کی کمزوری کے) بڑھ جاتی ہے۔ ابو الجارود کی روایت میں امام جعفر علیہ السلام سے مروی ہے کہ سواء منکم من اسر القول و من جھر بہ۔ میں آپ نے فرمایا پوشیدہ وظاہر اس (معبود حقیقی) کے نزدیک یکساں ہیں" اور قول خدا تعالیٰ مستخف باللیل سے مراد مستخف فی جوف بیتہ ہے اور علی بن ابراہیم نے کہا کہ سارب بالنہار سے مراد تحت الارض ہے۔ پس یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کے نزدیک ایک طرح ہیں۔ اور وہ ان سب کو جانتا ہے۔

محصل آیت یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ جانتا ہے عورت کے حمل کو (کہ اس میں کیا ہے لڑکا ہے یا لڑکی) اور اُسے بھی جو ساقط ہو جائے گا (یعنی قبل از سقوط اسے علم ہے کہ یہ بچہ قبل پورا ہونے کے ساقط ہو جائے گا) اور اسے بھی جانتا ہے جو رحم میں نو مہینے سے زیادہ ٹھہرے گا اور ہر شے خدا تعالیٰ کے نزدیک ایک مقدار معین پر پیدا کی گئی ہے۔ خدا تعالیٰ غائب وحاضر (سب کا جاننے والا ہے (اور) کبیر متعال ہے۔ برابر ہے (اس کے نزدیک) تم میں سے جو کوئی آہستہ بولے یا بلند آواز سے بولے (وہ ان سب باتوں کو سن لیتا ہے (اور جو رات میں پوشیدہ ہو یا دن میں زمین کے اندر چھپ جائے۔ خدا تعالیٰ سب کی حالتیں جانتا ہے۔

پھر اپنے عموم علم کو سورہ نحل میں فرماتا ہے لا جرم ان اللہ یعلم ما یسرون وما یعلنون۔ اس سے کوئی چارہ نہیں کہ خدا تعالیٰ جانتا ہے ان باتوں کو بھی جنہیں یہ لوگ پوشیدہ کرتے ہیں اور ان باتوں کو بھی جنہیں اعلان کے ساتھ کرتے ہیں" باقی آیتیں ذیل میں مندرج ہیں:۔

سورہ اسریٰ میں فرمایا وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔	خدا جانتا ہے ان تمام لوگوں کو جو زمین و آسمان میں ہیں۔

پھر فرمایا قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا۔

اے رسول کہہ دو کہ خدا تعالیٰ کا میرے اور تمہارے درمیان شاہد ہونا کافی ہے بیشک وہ اپنے بندوں کے حال سے خبیر و بصیر ہے۔"

سورہ مریم لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا۔

بے شک خدا تعالیٰ نے ان سب لوگوں کو شمار کر لیا ہے اور خوب گن لیا ہے۔

سورہ طٰہٰ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا۔

وہ جانتا ہے اُن کے سامنے کی چیزوں کو اور نیز اُسے جو اُن سے غائب ہے۔ مگر یہ لوگ اس کو اچھی طرح نہیں جانتے۔

سورہ حج اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ۔

اے رسول کیا تم نہیں جانتے کہ خدا کو آسمانوں اور زمین کی سب چیزوں کا علم ہے بے شک یہ چیزیں لوح محفوظ میں موجود ہیں بیشک یہ بات خدا پر آسان ہے۔

سورہ مومنین عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ۔

اللہ غیب اور موجود سب کا جاننے والا ہے۔

سورہ فرقان قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

اے رسول کہہ دو کہ اس قرآن کو اس نے نازل کیا جو آسمانوں اور زمین کے راز سے واقف ہے۔

سورہ نمل وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ۔ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔

بے شک تیرا پروردگار جانتا ہے ان چیزوں کو جو ان کے سینوں میں مخفی ہیں اور جسے یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں اور کوئی غائب چیز ارض و سما میں ایسی نہیں جو لوحِ محفوظ میں نہ ہو۔

سورہ عنکبوت اَوَلَيْسَ اللّٰهُ

کیا خدا تعالیٰ اُسے نہیں جانتا جو خلائق کے

بِاَعْلَمَ بِمَا فِیْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِیْنَ - وَ
لَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ
لَیَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ -

سورہ لقمان اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ
السَّاعَۃِ - وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ
مَا فِی الْاَرْحَامِ ۚ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ
مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ
بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ
خَبِیْرٌ -

سورہ احزاب سُبْحَانَہٗ اِنَّ اللّٰہَ
کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدًا -

سورہ سبا یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ
وَمَا یَخْرُجُ مِنْہَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ
السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْہَا ؕ وَہُوَ
الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ -

سورہ فاطر اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌۢ بِمَا
یَصْنَعُوْنَ -

سورہ یٰسٓ وَکُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰہُ
فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ -

سورہ مومن یَعْلَمُ خَآئِنَۃَ
الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ -

سورہ سجدہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ
فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا -

دلوں میں ہے؟ ضرور ہر ایک مومن و منافق
کو وہ جانتا ہے۔

بے شک خدا کو قیامت کا علم ہے وہ مینہ
برساتا ہے۔ رحم کی چیزوں کو جانتا ہے اور
کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کے دن کیا کام
کرے گا اور کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ
کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ
علیم و خبیر ہے۔

وہ پاک ہے۔ بے شک خدا ہر شے کو جانتا
ہے۔

خدا جانتا ہے اُسے جو زمین میں جاتی ہے
اور جو چیز اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان
سے اُترتی ہے اور جو چیز آسمان میں جاتی
ہے اور وہ رحیم و غفور ہے۔

بے شک خدا علم رکھتا ہے ان باتوں کا
جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

ہر شے کو ہم نے امام روشن میں جمع کر دیا
ہے۔

خدا جانتا ہے خیانت چشم اور اُسے بھی جو
دلوں میں ہے۔

بے شک وہ لوگ جو ہماری آیتوں میں کفرو
الحاد کو دخل دیتے ہیں۔ وہ ہم سے مخفی

نہیں ہیں۔

سورہ زخرف اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰهُمْ ؕ بَلٰی وَ رُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ۔

کیا یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے سر و نجوی کی خبر نہیں رکھتے۔ بے شک ہمیں علم ہے اور ہمارے ایلچی فرشتے اُن کے پاس بیٹھے لکھتے رہتے ہیں۔

سورہ محمد وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ۔

اللہ تمہارے متقلب و مثوی کی خبر رکھتا ہے۔

سورہ فتح وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا۔

اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔

سورہ حجرات قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِیْنِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔

اے رسول کہہ دو کہ کیا تم جتلاتے ہو اللہ کو اپنا دین حالاں کہ خدا تو ارض و سما کی تمام چیزوں کو جانتا ہے اور اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔

سورہ ق وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۔ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔

بے شک اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے وسوسہ دل کو جانتا ہے (اور اے رسول) ہم تو آدمی کی رگ ورید سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔

سورہ نجم هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔

اُس کو تمہارا علم تھا۔ جب کہ تم کو زمین سے پیدا کیا تھا۔ اور جب کہ تم اپنی ماؤں کے شکموں میں بچے تھے۔ پس تم اپنے تئیں پاک مت جتاؤ۔ وہ آپ جانتا ہے اس کو جو پرہیزگار ہے۔

سورہ مجادلہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ

بے شک خدا کو ارض و سما کی چیزوں کا علم

يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔

سے نہیں ہوتی تین آدمیوں کی سرگوشی مگر یہ کہ چوتھا اُن میں پروردگار عالم ہوتا ہے اور نہ کہیں پانچ آدمیوں کی سرگوشی مگر یہ کہ چھٹا اُن میں خدا تعالیٰ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ۔ مگر یہ کہ پروردگار اُن کے ساتھ جہاں کہیں وہ ہوں۔ پھر قیامت کے دن انہیں بتا دے گا جو ان لوگوں نے کیا ہے۔ بے شک خدا ہر شے کا علم رکھتا ہے۔

سورہ ممتحنہ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَ اَعْلَنْتُمْ۔

میں جانتا ہوں جسے تم نے چھپایا اور جسے ظاہر کیا۔

سورہ ملک وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۔

تم اپنی بات کو چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ اللہ تو سینے کی باتوں کو جانتا ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اسی کو خبر نہ ہو جس نے پیدا کیا ہے حالاں کہ وہ لطیف و خبیر ہے۔

سورہ جن عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ۔

وہ عالم الغیب ہے کسی کو اپنے غیب پر مطلع نہیں کرتا مگر اس رسولؐ کو جسے اس نے پسند کر لیا ہے۔"

سورہ اعلیٰ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى۔

بے شک پروردگار عالم ظاہر و خفی ہر ایک ہی جانتا ہے۔

سورہ علق اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى۔

کیا اسے خبر نہیں کہ خدا دیکھتا ہے۔

علاوہ ان کے اور بہت سی آیتیں سب سورتوں میں موجود ہیں۔ جن کا ذکر

بسبب خیال طول کے نہیں کیا گیا۔ اس قدر ایک بصیرت حاصل کرنے والے کے واسطے کافی ہے جسے یہ مقصود ہو کہ میں قرآن مجید کے ذریعے سے خدا تعالیٰ کی صفت علمی کو معلوم کرنا چاہوں۔

گیارہواں باب

مسئلہ بداء

اس مسئلہ میں خدا تعالیٰ اور رسولِ خدا اور آئمہ طاہرین معصومین۔ اور شیعہ امامیہ کا گروہ تو ایک فریق ہے اور اہلِ سنت کا فرقہ اس مسئلہ میں دوسرا فریق ہے۔ خدا تعالیٰ تو اس کے وجود کا اقراری ہے اور حضرات اہلِ سنت اس کو مذاق بنا کر انکاری ہوتے ہیں گو ہمیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سوادِ اعظم نے عموماً وہی رائے مسائل اصول و فروع میں اختیار کر لی ہے جسے خُدا اور رسولؐ اپنی معلومات کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن ہم کو صرف اس مسئلہ خاص کی حقیقت سر دست بیان کرنی مقصود ہے دیگر مسائل سے اس وقت بحث نہیں ہے۔

بَدَاَ۔ بالمد ظہور کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ بَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوْا۔ (بدکاروں کو اُن کی بدکاری کی برائیاں ظاہر ہو گئیں) بَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتِ مَا كَسَبُوْا۔ اُن کے عمل کی برائیاں اُن پر کھل گئیں۔ اور بمعنی ظہور رائے کے بھی آیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے کسی نے کوئی رائے دی تھی۔ اُس کے بعد اُس رائے کی غلطی اُسے معلوم ہوئی اور دوسری رائے صحیح معلوم ہوئی تو کہتے ہیں بَدَءَ لَهٗ رَائِیْ۔ فلاں شخص کی رائے میں بداء واقع ہوا۔ یعنی پہلی رائے کی غلطی اُسے معلوم ہو گئی۔

پس چونکہ خدا تعالیٰ سے بہتر عالم ماکان و مایکون اور عالم مالم یکن ولا یکون کوئی نہیں وہ ہر فعل اور ہر حکم کی حقیقت کو ابتداء سے انتہا تک جانتا ہے۔ اس لئے اس کو اپنی رائے میں غلطی کبھی نہیں ہو سکتی اور نہ ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام نے اس کی تعلیم ہمیں دی ہے بلکہ اس کے برخلاف یہ فرمایا ہے من زعم ان اللہ عزوجل یبدٔ لہ فی شیٔ لم یعلمہ امس فابرء منہ

جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ خدا تعالیٰ کو بدا ہوتا ہے۔ یعنی اس کو جو بات کل نہ معلوم تھی آج معلوم ہوئی۔ تو میں ایسے شخص سے بری ہوں (یعنی میں ایسے قائل کا ساتھی نہیں ہوں۔ (عماد الاسلام)

نیز کافی میں جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ عبداللہ بن سنان کہتے ہیں کہ جناب ابو عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا ان اللہ لم یبد لہ من جھل بے شک خدا تعالیٰ کو نادانستگی سے بدا نہیں ہوتا۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اس کو کوئی بات معلوم نہ رہی ہو۔ اور کوئی رائے یا حکم اس امر میں اُس نے جاری کر دیا ہو اور پھر واقفیت کے بعد اس رائے سے رجوع کی ہو۔

نیز تفسیر عیاشی میں جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ انّ اللہَ یقدّم ما یشاء و یؤخر ما یشاء و یمحو ما یشاء و یثبت ما یشاء و عندہٗ ام الکتاب وقال لکلّ امر یرید ہ اللہ فھو فی علمہ قبل ان یصنعہ و لیس شئ یبدو لہ الّا وقد کان فی علمہ۔ انّ اللہ لا یبدو لہ من جھل۔ بے شک خدا تعالیٰ جس چیز کو چاہتا ہے مقدم کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے مؤخر کرتا ہے جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے ثابت کرتا ہے اور اسی کے نزدیک ام الکتاب (لوح محفوظ و محو و اثبات) ہے اور نیز آپ نے فرمایا جس امر کا خدا تعالیٰ ارادہ کرتا ہے۔ وہ اس کے علم میں موجود رہتا ہے (یعنی پہلے سے اُسے وہ جانتا ہوتا ہے) اور جس امر کو وہ ظاہر فرماتا ہے۔ اس کا علم اُسے پہلے سے ہوتا ہے۔ بے شک خدا تعالیٰ کو جہالت کی وجہ سے بدا نہیں ہوتا۔ (عماد الاسلام)

اور وسعت علم خدا تعالیٰ کی نسبت جو کچھ اُن حضرات نے فرمایا ہے۔ اُن میں سے بعض یہاں مذکور ہوتے ہیں۔ مثلاً جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے ابو علی کہتے ہیں۔ میں حضرت کی خدمت میں موجود تھا۔ اس وقت میری زبان سے نکلا الحمد للہ منتھیٰ علمہ میں خدا تعالیٰ کی حمد بجا لاتا ہوں اس کے منتہائے

علم تک۔ آپ نے فرمایا لا تقل ذالک فانہ لیس لعلمہ منتہیٰ۔ اے ابو علی! یہ نہ کہو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کے علم کی کوئی حد نہیں منتہا نہیں ہے۔

نیز حسین بن بشار نے ابوالحسن علی بن موسیٰ الرضا سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت سے پوچھا العلم اللہ الشی الذی لم یکن ان لو کان کیف کان یکون اولا یعلم الا ما یکون فقال ان اللہ تعالیٰ ھو العالم بالاشیاء قبل کون الاشیاءُ کیا خدا تعالیٰ اس چیز کو بھی جانتا ہے جو ابھی نہیں ہوئی۔ کہ اگر ہو گی تو کیوں کر اور کس طرح ہو گی۔ یا نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا بے شک خدا تعالیٰ تمام چیزوں کو اُن کے پیدا ہونے سے پہلے جانتا ہے۔

حاصل یہ کہ علم خدا تعالیٰ محدود نہیں ہے۔ بلکہ سابق و لاحق موجود و معدوم ممکن و ممتنع تمام چیزوں کا اُسے علم حاصل ہے۔ جس چیز کا جس کام کا اس نے حکم دیا ہے اور جسے ہمیشہ قائم رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یا کسی زمانے میں اس کا منسوخ کر دینا مقصود ہے۔ ان سب باتوں کو وہ جانتا ہے۔

پس بدا بمعنی ظہور غلطی رائے سابق کسی شیعہ کا مذہب نہیں ہے اور نہ کسی امام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے۔ بلکہ احادیث سابقہ سے اس کی نفی معلوم ہو گئی۔ لہٰذا اہلسنت کا یہ کہنا کہ شیعہ گروہ بدا بمعنی مذکور کا قائل ہے۔ سفید جھوٹ ہے۔ جس میں سچائی کا ایک خال بھی نہیں۔ خیر جاہلوں پر تو چنداں افسوس نہیں۔ زیادہ افسوس تو پڑھے لکھوں پر ہے کہ وہ بھی تعصب کی پٹی آنکھ پر باندھ کر شیعوں پر تہمت لگا گئے ہیں۔ دیکھئے امام رازی صاحب نے ایک مقام پر سلیمان بن جریر سے نقل کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے۔ ان ائمۃ الرافضۃ وضعوا القول بالبداء لشیعتھم فاذا قالوا انہ سیکون لھم امر و شوکۃ ثم لا یکون الامر علی ما اخبروہ قالوا ابداللہ تعالیٰ فیہ۔ یعنی شیعوں کے اماموں نے بداء کا قول اپنے شیعوں کے لئے تصنیف کر لیا تھا۔ جب کبھی کہتے تھے کہ ہمیں عنقریب حکومت و شوکت ملنے والی ہے اور وہ نہ ملتی تھی اور وہ خبر غلط ثابت ہو جاتی تھی۔ تو کہہ دیتے تھے کہ خدا تعالیٰ

کو اس میں بدا واقع ہُوا۔

دیکھئے خباثت باطن اسے کہتے ہیں کہ باوجود کہ ائمہ ہدیٰ علیہ السلام خود ہی بدا، بمعنی ظہور فساد رائے کے منکر ہیں پھر بھی یہ احمق ان کی طرف اس قول کی نسبت کرتا ہے اور پھر باوجود کہ اُن کے تمام علماء حضرات ائمہ معصومین علیہم السلام کے علم و کمال و زہد و تقویٰ و راستی و راست گفتاری کے قائل ہیں۔ چنانچہ اُن کی کتب مناقب سے معلوم ہوتا ہے۔ (جیسے شک ہو وہ دیکھے مطالب السئول۔ مناقب خطیب خوارزم نور الابصار۔ ینابیع المودہ۔ صواعق محرقہ۔ تاریخ ابن خلکان وغیرہ کہ کس قدر یہ مصنفین ان حضرات کے مدح سرا ہیں) پھر بھی اس متعصب نے ان کو جھوٹا بتایا ہے۔

اسی شخص کی اقتدا میں اوروں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ شیعہ گروہ بدا بمعنی ظہور فساد رائے سابق کے قائل ہیں۔ حالاں کہ خدا سے نہیں ڈرتے کہ ہم اس جھوٹ سے سوائے لعنۃ اللہ علی الکاذبین کے اور کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

غرض یہ کہ کوئی شیعہ خواہ عالم ہو یا جاہل اس امر کا قائل نہیں کہ خدا تعالیٰ بے سمجھے بوجھے ایک رائے پیش کر دیتا ہے اور جب اس رائے کی غلطی اسے معلوم ہو جاتی ہے۔ اس سے نادم ہوتا ہے۔ بلکہ شیعہ گروہ اس معنی سے بدا کا قائل ہے جس معنی سے خدا تعالیٰ خود قرآن مجید میں قائل ہے۔ سورہ بقر میں فرماتا ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ جس آیت کو ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے لوگوں کے دلوں سے بھلا دیتے ہیں۔ تو اس سے بہتر یا ویسی ہی آیت اور نازل کر دیتے ہیں۔ کیا تم جانتے نہیں کہ خدا تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ احکام اور آیات کا منسوخ ہونا ممکن ہے۔ اور ایسا واقع بھی ہُوا کہ ایک وقت میں کسی مصلحت خاصہ کی وجہ سے کوئی حکم دیا گیا اور پھر جب وہ ضرورت نہ رہی اور دوسری ضرورت داعی ہوئی، تو دوسرا حکم اس کے مطابق دیا گیا چنانچہ ایک وقت میں کہا گیا لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔ اور دوسرے وقت میں کہا گیا۔ فَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ یا جیسے

پہلے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے عبادت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر جب وہ مصلحت نہ باقی رہی تو خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ پڑھو سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا۔ ایسا جیسے

امر جہاد میں ہُوا کہ پہلے حکم تھا کہ بیس آدمی مسلمان دو سو کافروں کے مقابلے کے لئے جایا کریں اور ایک سو آدمی ایک ہزار آدمیوں کے مقابلے میں دیکھو سورہ انفال يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا۔ پھر خدا تعالیٰ نے یہ حکم منسوخ کر دیا اور فرمایا اَلْآنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضُعْفًا۔ یعنی خدا تعالےٰ نے دیکھا کہ تم میں کمزوری ہے اس لئے اس حکم سابق کو نسخ کر کے اور تخفیف کر دی کہ فَإِنْ يَكُنْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ اگر تم میں سے سو آدمی مستقل مزاج ہُوں تو دو سو کافروں پر غالب آسکیں گے اور اگر ایک ہزار تم میں سے ہوں گے۔ تو دو ہزار پر حکم خدا سے غالب آئیں گے"۔ یعنی وہ حکم کہ بیس آدمی دو سو سے اور ایک سو آدمی ایک ہزار سے مقابلہ کریں منسوخ کیا گیا اور یہ قرار دیا گیا کہ چونکہ تم لوگ پست ہمت ہو۔ اس لئے سو آدمی دو سو سے مقابلہ کریں اور ایک ہزار دو ہزار کافروں سے۔

غرض سنّی اور شیعہ دونوں ہی فریق آیات و احکام کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں۔ کسی کو اس معاملہ میں شبہ نہیں۔ کیوں کہ قرآن مجید خود ہی کھلے خزانے پکار پکار کر اس مطلب کو بیان کر رہا ہے۔

البتہ خارج اسلام لوگوں کو اگر شبہ ہو کہ خدا تعالیٰ اپنے احکام کو کیوں منسوخ کرتا ہے اور ایسا کیوں کیا تو اُن کو یہ جواب دیا جائے گا کہ خدا تعالیٰ حکیم ہے اور حکیم کا فعل ہمیشہ علم و حکمت و عقل کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یہ کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا کہ ایک حکیم شخص کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف دے اور

یہ بھی ضروری ہے کہ زمانہ۔ وقت۔ اشخاص۔ ضرورت وقتیہ۔ اور مصلحت میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ تو لامحالہ قرین عقل یہی بات ہے کہ اگر ایک وقت میں کسی شخص کی نسبت کسی خاص مصلحت اور ضرورت سے کوئی حکم دیا گیا تھا۔ تو جب وہ ضرورت باقی نہ رہی۔ یا وہ شخص ہی نہ رہے یا وہ زمانہ جو اس حکم کا مقتضی تھا نہ باقی رہا۔ تو اس حکم کو ضرور بدلنا چاہیئے۔ ورنہ وہ حکم فضول ہو گا اور اس میں کوئی مصلحت نہ ہوگی۔ حالاں کہ فضول اور عبث کو خدا تعالیٰ کی جناب میں کوئی دخل نہیں۔ لہذا منسوخ ہونا احکام و واقعات کا ضروری ہوا اور یہی عین حکمت ہے اور اس کے برخلاف کرنا حماقت اور سفاہت ہے جس سے خدا تعالیٰ مبرّا اور منزّہ ہے۔

پس جس طرح آیات و احکام کی تبدیل بحسب مصلحت و ضرورت و اوقات و اشخاص لازمی ہے اس طرح واقعات اور حالات کا بدلنا اور منسوخ کرنا بھی خدا تعالیٰ کو بحسب مصالح لازم ہے اور ایسا ہی کرتا بھی ہے۔ چنانچہ کسی کو تونگری سے فقر میں مبتلا کر دیا کیونکہ اُس کے لئے یہی امر صلاح تھا اور کسی کو فقر سے تونگری میں لایا۔ کیوں کہ اُس کے لئے اس میں بہبودی تھی۔ کسی کی عمر طولانی کر دی۔ کسی کی عمر گھٹا دی۔ کسی کو مصائب میں مبتلا کیا اور کسی کو مصائب سے نجات دی!! یہ تمام باتیں خداوندی مصلحت اور انسانی اصلاح اور بقائے سلسلہ نظام تمدن پر مبنی ہیں ان میں کسی کو جائے دم زدن نہیں ؎ ہر چہ اوے کند ہمہ نیکوست ٭ پڑھو آیہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ اور دیکھو اس کی تفسیر جو سابق میں مذکور ہوئی۔

تو اگر شیعہ گروہ حسب فرمودہ خدا تعالیٰ بدا یعنی نسخ احکام و احوال و واقعات و آیات کا قائل ہے تو اس نے کیا خرابی کی جو سنّی خواہ مخواہ منہ آتے اور بلا ضرورت سفیہانہ قہقہہ لگاتے ہیں۔ یہ قہقہہ شیعوں پر نہیں ہے۔ بلکہ دراصل خُدا پر ہے پھر خدا تعالیٰ اسی مطلب کے مؤید سورہ رعد میں فرماتا ہے لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ۔ جس کا حاصل ترجمہ یہ ہے کہ واسطے ہر مدت کے

ایک کتاب ہے (یعنی ہر شے کی مدت حیات و بقا کو ہم نے لوح محو و اثبات میں لکھ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اُسے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے لکھ دیتا ہے۔ اور اسی کے پاس اُم الکتاب ہے۔)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی اپنے حکم سابق کو محو کر دیتا ہے اور اُس کی جگہ پر بمصلحت وقت و شخص و زمانہ دوسرا حکم ثبت فرما دیتا ہے۔ پس جب کہ خدا تعالیٰ خود بدا بمعنی نسخ کا اقراری ہے۔ تو کسی کو جائے اعتراض کیا باقی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں علی بن ابراہیم علیہ الرحمۃ نے صادقؑ آل محمدؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اذا کان لیلۃ القدر نزلت الملائکۃ والروح والکتبۃ الی السماء الدنیا فیکتبون ما یکون من قضاء اللہ فی تلک السنۃ فاذا اراد اللہ ان یقدم شیئاً او یؤخرہ او ینقص شیئاً امر الملک ان یمحو ما یشاء ثم اثبت الذی ارادہ یعنی کہ جب شب قدر ہوتی ہے تو فرشتے اور روح (القدس) اور کاتبان (قضا و قدر) پہلے آسمان پر (حکم خدا سے اُترتے ہیں اور جو کچھ قضاء فیصلہ الٰہی اُس سال میں ہونے والا ہوتا ہے۔ اُسے لکھ لیتے ہیں۔ پس جب کہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُن امور میں سے کسی چیز کو مقدم یا مؤخر کر دے یا کسی چیز کو کم کر دے تو فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ وہ مٹا دے۔ جسے خدا تعالیٰ مٹانا چاہتا ہے۔ پھر وہاں پر جو کچھ خدا تعالیٰ چاہتا ہے اُسے ثبت فرما دیتا ہے۔ (توحید بحار)

پھر اسی کے مؤید سورہ رُوم کا یہ بیان ہے۔ الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ هُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ ۔ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ ۔ لِلّٰهِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡۢ بَعۡدُ۔ ابو عبیدہ سے روایت ہے کہ میں نے جناب امام محمد ابو جعفر محمد باقرؑ سے۔ الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ کے معنی دریافت کئے آپ نے فرمایا اے ابو عبیدہ اس کی ایک ایسی تاویل ہے جسے سوائے خدا تعالیٰ اور ائمہ راسخین فی العلم کے کوئی نہیں جانتا اور وہ یہ ہے کہ جب رسول اللہؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور اسلام کا ظہور ہوا تو آپ نے بادشاہ رُوم کے پاس ایک خط لکھا۔ اور

اس کو اسلام کی طرف دعوت کی (جیسا کہ عام طور پر کتب تواریخ میں مذکور ہے) اور بادشاہ فارس کو بھی ایک خط لکھا اور اسے اسلام کی طرف دعوت کی لیکن بادشاہ روم نے تو قاصد کی تعظیم و توقیر کی۔ اور آپ کے خط کی بھی تعظیم کی۔ مگر بادشاہ فارس نے رسولِ خدا کے ایلچی کی اہانت اور تذلیل کی۔ اسی زمانہ میں بادشاہ روم اور بادشاہ فارس کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی تھی اور مسلمانوں کو یہ شوق تھا کہ بادشاہ روم کو بادشاہ فارس پر غلبہ حاصل ہو۔ کیونکہ اس نے رسول اللہ کے قاصد اور ایلچی کی قدر و عزت کی تھی۔ اور بادشاہ روم کے جیتنے کے زیادہ اُمیدوار تھے۔ بہ نسبت بادشاہ فارس کے۔ مگر جب بادشاہ روم مغلوب ہو گیا اور شاہ فارس غالب آگیا۔ تو اس سے مسلمان دل شکستہ اور غمگین ہوئے۔ اس وقت خدا تعالیٰ نے (ان لوگوں کی تسکین کے واسطے) یہ سورہ (روم) نازل فرمایا الم غلبت الروم فی ادنی الارض یعنی کہ (اس وقت تو) فارس ہی بادشاہ روم پر ادنی الارض یعنی شامات (نام مقام) وغیرہ میں غالب آگیا مگر اس کے بعد بادشاہ روم اُن پر چند سال بعد غالب آئے گا۔ لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ہی کے لئے حکم (کا اختیار) حاصل ہے حکم کرنے سے پہلے (من بعد) اور بعد اس کے بھی کہ اپنی مشیت کے مطابق جو چاہا ہو۔ حکم جاری کر دیا ہو۔ یعنی اس کو ہر وقت اور ہر صورت میں اختیار حاصل ہے کہ جس طرح چاہے اور مصلحت دیکھے۔ حکم جاری کر دے جسے چاہے مقدم کرے جسے چاہے مؤخر کرے۔ اسے کوئی روکنے والا نہیں) وَ یَوْمَئِذٍ یَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰہِ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ۔ اور اس دن ایمان والے لوگ خوش ہوں گے۔ خدا کی مدد سے" جسے وہ چاہتا ہے دیتا ہے (راوی کہتا ہے) میں نے عرض کی کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ۔ حالاں کہ (مسلمانوں کو) انتظار کرتے کرتے بہت سے برس گزر گئے۔ رسول اللہ کے زمانہ میں بھی اور ابوبکر کی حکومت میں بھی (مگر روم کو فتح نہ ہوئی) البتہ مومنین تو اہل فارس پر عمر کی حکومت کے زمانے میں غالب آئے۔ آپ نے فرمایا تو کیا میں تم سے یہ نہیں کہہ چکا تھا کہ اس آیت کی ایک

خاص تاویل و تفسیر ہے۔ ابو عبیدہ ! قرآن میں ناسخ بھی ہے منسوخ بھی۔ کیا تم نے خدا تعالیٰ کا یہ کلام (جو اسی آیت میں ہے) نہیں سنا کہ فرماتا ہے) لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ یعنی کہ اسی کے لئے مشیت ہے چاہے مقدم کو مؤخر کرے اور چاہے مؤخر کو مقدم کرے اس دن تک کہ جس دن میں مومنین پر نصرت نازل کرنی حتمی اور لازمی فرما دے (مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو تقدیم و تاخیر کا اپنے کاموں میں کلی اختیار حاصل ہے۔) اور یہی مطلب ہے خدا تعالیٰ کے اس قول کا وَیَوْمَئِذٍ یَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰہِ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ۔

نیز اس کی مؤید یہ آیت بھی ہے۔ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰٓی اَجَلًا وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَہٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ۔ (سورہ انعام) اسی نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ایک مدت مقرر کی اور ایک مدت معین اس کے نزدیک ہے۔ پھر تم انکار کرتے ہو۔

تفسیر علی بن ابراہیم قمی میں مروی ہے۔ جناب صادق علیہ السلام سے آپ نے فرمایا الاجل المقضی ھو المحتوم الذی قضاہ اللہ حتمہ۔ والمسمّی ھو الذی فی البداء یقدم ما یشآء و یوخر ما یشآء والمحتوم لیس فیہ تقدیم ولا تاخیر۔ یعنی اجل مقضی سے مراد تو وہ مدت عمر ہے جو خدا تعالیٰ نے لازم کر دی ہے اور اس کا فیصلہ کر دیا ہے (یہی مطلب قضیٰ اجلاً کا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ نے ایک خاص مدت مقرر کر دی ہے) اور (اجل) مسمّیٰ وہ ہے جو بداء میں ہے جسے چاہے مقدم کرے اور جسے چاہے مؤخر کرے (مگر) (اجل) محتوم میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ خود ہی فرماتا ہے کہ اس نے (یعنی خدا تعالیٰ نے) تم لوگوں کو مٹی سے پیدا کیا پھر ایک مدت عمر مقرر کر دی۔ جس میں زیادتی و کمی اور تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک ایک اجل مسمّیٰ بھی ہے (یعنی جس میں کمی و زیادتی تقدیم و تاخیر کرنی بحسب مصلحت و وقت ممکن ہے۔ پس یہ آیت بھی باآواز بلند جواز بداء کی حامل و مصرح ہے۔

نیز سورہ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے۔ قَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ" (یعنی یہودی کہتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں" حالاں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ انہیں یہودیوں کے ہاتھ بندھیں گے اور اُن پر لعنت پڑے گی اُن کے اس کلام کی وجہ سے۔ خدا تعالیٰ کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے (جس کو جتنا چاہتا ہے دیتا ہے۔ جس سے روک لینا چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ غرض جس کے لئے جو مصلحت ہوتی ہے۔ وہی اس کے لئے کرتا ہے۔)

تفسیر علی بن ابراہیم میں مذکور ہے کہ یہود کہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کام کرنے سے فارغ ہو گیا ہے اور جو کچھ تقدیر اولیٰ میں مقدر کر چکا ہے۔ اس کے سوا اب کچھ نہیں کرے گا۔ تو خدا تعالیٰ نے اُن کے رد میں یہ فرمایا۔ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ یعنی مقدم کرتا ہے اور مؤخر اور زیادہ کرتا ہے اور کم کر دیتا ہے اور اسی کے لئے بدا و مشیت ہے۔"

ملاحظہ ہو کہ امام فخر الدین رازی اس آیت کی تفسیر میں کیا تحریر فرماتے ہیں۔ اور اس آیت کی تاویل میں کیا کیا وجوہ لکھی ہیں۔ الاول ان القوم انما قالوا ذالك على الالزام فانهم لما سمعوا قوله تعالى من ذا الذی یقرض الله قرضا حسنا قالوا لو احتاج الی القرض لكان فقیرا۔ یعنی اوّل یہ کہ یہودیوں نے جو یہ کہا تھا کہ "ید الله مغلولة" (خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں) تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کا یہ کلام سُنا۔ من یقرض الله قرضا حسنا (کون خدا تعالیٰ کو قرض حسنہ دے گا) تو کہنے لگے کہ اگر خدا تعالیٰ قرض کا محتاج ہوا تو پھر فقیر و عاجز ہوا (اس لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا بل یداه مبسوطتان۔ (بلکہ اس کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں) الثانی ان القوم لما رأوا اصحاب الرسول فی غایة الشدة والفقر قالوا علی سبیل الاستهزاء ان اله محمد فقیر مغلول الید۔ دوسرے یہ کہ قوم یہود نے جب دیکھا کہ اصحاب رسول اللہ نہایت سختی و افلاس میں مبتلا

ہیں۔ تو مسخراپن کے طور پر کہنے لگے کہ محمدؐ کا خدا مغلول الید (محتاج ہے) الثالث قال المفسرون ان الیھود کانوا اکثر الناس مالاً وثروۃً فلما بعث اللہ محمداً وکذبوا بہ ضیق اللہ علیھم المعیشۃ فعند ذالک قالت الیھود ید اللہ مغلولۃ ای مقبوضۃ عن العطا۔ تیسرے یہ کہ مفسرین نے کہا ہے کہ یہود سب سے زیادہ مال و ثروت رکھتے تھے۔ پس جب کہ خدا تعالیٰ نے محمدؐ کو مبعوث کیا اور یہودیوں نے حضرت کی تکذیب کی۔ تو پروردگار عالم نے اُن پر معاش تنگ کر دی۔ تو کہنے لگے کہ خُدا تعالیٰ کے ہاتھ بندھے ہُوئے ہیں۔ یعنی بخشش نہیں کر سکتا۔ (بخیل ہے)۔ الرابع لعلہ کان فیھم من کان علی مذھب الفلسفۃ وھو انہ تعم موجبٌ لذاتہ وان حدوث الحوادث عنہ لایمکن الا علی نھج واحدٍ وسنن واحدٍ وانہ تعم غیر قادر علی احداث الحوادث غیر الوجوہ التی علیھا یقع فعبروا عن عدم الاقتدار علی التغیر والتبدیل بغل الید۔ چوتھی یہ کہ شاید ان میں کوئی فلسفی رہا ہو اور اس کا یہ خیال ہو کہ خدا تعالیٰ فاعل موجب یعنی بے اختیار ہے (جس طرح آگ اپنے فعل میں بے اختیار ہے) اور اس سے حوادث کا حدوث نہیں ممکن ہے مگر ایک طریقہ اور ایک رفتار پر اور یہ کہ اسے یہ قدرت نہیں کہ جن طریقوں پر اشیائے عالم پیدا ہوتے ہیں۔ اُن سے علیحدہ کوئی اور صورت حوادث و ممکنات کے پیدا کرنے کی ایجاد کر سکے۔ تو ان لوگوں نے تغیر و تبدیل پر قادر نہ ہونے کی تعبیر ہاتھ بندھے ہونے سے کی (جس کا جواب خدا تعالیٰ نے یہ دیا کہ بلکہ اس کے دونوں کھلے ہُوئے ہیں۔ وُہ ہر چیز پر ہر طرح سے قادر ہے۔ اُسے تبدیل و تغیر کا پورا اختیار ہے")

واضح ہو کہ یہی چوتھی وجہ ہے جو اس موقع پر واقعی اور تحقیقی ہے۔ فی الواقع یہود یہ کہتے تھے کہ خدا تعالیٰ تو فارغ ہو چکا۔ جو کچھ اُسے کرنا تھا کر لیا۔ اب وُہ بالکل معطّل اور بیکار ہے جس کے رد کرنے کی ضرورت خدا تعالیٰ کو پڑی "یعنی کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ بلکہ کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ " ہر روز وہ ایک شان میں ہے جو شان سابق سے علیحدہ ہے۔ کسی کو زندہ کرتا ہے کسی کو مار ڈالتا ہے۔ کسی کو امارت

دیتا ہے کسی کو فقر میں مبتلا کرتا ہے۔ کسی کے سر پر تاج شاہی رکھتا ہے اور کسی کے بر میں دلق گدائی۔ وہ ہرگز معطل اور بیکار نہیں ہے اور نہ اس کی شان سے تعطل اور عبثیت ہے انہیں لوگوں کی رد میں یہ بھی فرمایا یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت اسی کو محو و اثبات کا اختیار ہے۔ جو حکم مصلحت کے موافق دیکھا نافذ فرمایا۔ اور جسے چاہا منسوخ کیا اس کا عمل ہمیشہ جاری ہے۔ اسی مطلب کو یہ آیت بھی ظاہر فرماتی ہے وما یعمر من معمر ولا ینقص من عمرہ الا فی کتاب،، جس معمر آدمی کی عمر زیادہ کی جاتی یا اُس کی عمر گھٹائی جاتی ہے۔ وہ سب کتاب میں موجود ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ جو خدا تعالیٰ نے کسی کی زندگانی کی مدت مقرر فرمادی ہے اس کے بعد بھی اس میں زیادتی اور کمی کرتا ہے اور یہ مقدمہ بہت سے مقامات سے ثابت ہے۔ شیعہ اور سنی دونوں ہی اس کے ناقل ہیں اور باوجود اس کے صرف لفظ بدا سے گھبراتے ہیں۔ نہ معلوم اس لفظ میں کیا جادو ہے۔ ملاحظہ ہو زیادتی و کمی عمر کا حال۔ جناب صادق آل محمد سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ روح اللہ کا گزر ایک قوم کی طرف ہوا جو شور و غل کرتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ آپ نے فرمایا ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کسی نے عرض کی یا روح اللہ ان فلانۃ بنت فلان تھدیٰ الی فلان بن فلان فی لیلتھا ھذہ۔ اے روح اللہ! فلاں شخص کی فلاں لڑکی کو آج کی شب میں بغرض زفاف فلاں بن فلاں کے پاس لوگ لے جائیں گے (اسی کا یہ شور و غل ہے) آپ نے فرمایا کہ آج کو تو یہ خوشی کے نعرے ہیں اور کل یہ سب لوگ روئیں گے۔ یہ سن کر کسی نے حاضرین میں سے عرض کی ولم یا رسول اللہ اے خدا کے پیغامبر! ایسا کیوں ہو گا؟ آپ نے فرمایا کہ اسی شب میں یہ لڑکی مر جائے گی پس جو لوگ کہ آپ کے معتقد تھے۔ ان لوگوں نے تو تسلیم کر لیا اور منافقین نے کہا کہ کل کا دن ہی کیا دور ہے (صبح کو عیسیٰ کا صدق و کذب معلوم ہو جائے گا) جب صبح ہوئی تو اس کے مکان پر آئے اور اُسے زندہ دیکھا کسی قسم کا ضرر بھی اُسے نہ پہنچا تھا (مرنا کیسا) لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ سے عرض کی یا روح اللہ جس کی بابت مرنے

کی خبر آپ نے دی تھی۔ وہ تو زندہ موجود ہے۔ آپ نے سن کر فرمایا یفعل اللہ ما یشآء۔ خدا تعالیٰ جو چاہتا ہے وُہی کرتا ہے۔ اچھا ہمیں وہاں تک لے چلو۔ پس جلدی جلدی حضرت کو ساتھ لئے وہاں تک پہنچے۔ یہاں تک کہ دروازہ کھٹکھٹایا جب اس لڑکی کا شوہر نکل آیا تو آپ نے اس سے فرمایا کہ استاذن لی علی صاحبتک اپنی بیوی کے سامنے جانے کی میرے لئے اجازت مانگ۔ غرض اس کے شوہر نے زن مذکورہ سے حضرت عیسیٰؑ کی تشریف آوری اور آپ کا اجازت طلب کرنا بیان کیا۔ یہ سُن کر وہ پردے میں بیٹھ گئی اور جناب عیسیٰؑ تشریف لے گئے۔ اس سے دریافت کیا کہ تو نے آج کی شب میں کیا نیک کام کیا تھا؟ اس نے عرض کی میں نے تو کوئی کام نہیں کیا مگر وہی جو برابر معمول تھا کہ ہر شب جمعہ میں ہمارے مکان پر ایک سائل آیا کرتا تھا اور اُسے ہم بقدر قوت جمعہ آئندہ تک کے لئے دے دیا کرتے تھے۔ جب وہ اس شب میں آیا تو میں اپنے (شادی) کے کاموں میں مشغول تھی۔ اور میرے اعزا و اقارب بھی مصروف تھے۔ فقیر نے حسب معمول آواز دی مگر اُسے کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر اس نے پکارا۔ مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ کئی مرتبہ اس نے پکارا۔ جب میرے کان میں آواز آئی۔ تو میں لباس بدل کر اُٹھی۔ اور جو اس کے لئے مقرر و معمول تھا۔ وہ اسے دے دیا۔ (یہ سن کر) حضرت عیسیٰ نے فرمایا۔ تنحی عن مجلسک ذرا اپنی نشست گاہ سے اٹھ تو سہی۔ اب جو اٹھتی ہے فاذا تحت ثیابھا افعی مثل جذعۃ عاضٌ علیٰ ذنبہ۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک موٹا سانپ اس کے کپڑوں کے نیچے بیٹھا ہُوا ہے اور اپنی دُم اپنے منہ میں لئے ہُوئے ہے۔ یہ دیکھ کر جناب حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا بما صنعتِ صُرِفَ عنکِ ھٰذا۔ رات کو تو نے جو عمل خیر کیا اس کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے تجھ سے ہٹا دیا۔ یعنی کہ واقعی تیری موت آچکی تھی لیکن تیرے اس عمل خیر نے یہ اثر کیا کہ وہ سانپ جو تجھے کاٹنے کے لئے آیا تھا۔ اس کو خدا تعالیٰ نے یہ موقع نہ دیا اور تیری عمر میں زیادتی کی۔" (ترجمہ مافی البحار)

نیز روایت ذیل کا آخری حصہ بھی اس مضمون کا مؤید ہے اور علاوہ اس کے بداؔ کے ثبوت پر چند آیتیں بطور شاہد کے بھی معصوم نے پیش کی ہیں۔ عن محمد بن عمر بن عبد العزیز عمن سمع الحسن بن محمد النوفلی یقول قال الرضا علیہ السلام لسلیمان المروزی ما انکرت من البداء یا سلیمان واللہ عزوجل یقول اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَكُ شَیْئًا۔ ویقول عزوجل وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ۔ ویقول بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ ویقول عزوجل یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ۔ ویقول وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ۔ ویقول عزوجل وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا یُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْهِمْ۔ ویقول عزوجل وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ۔ قال سلیمان هل رویت فیه عن ابائك شیئًا قال نعم رویت عن ابی عن ابی عبد اللہ علیهما السلام انه قال ان اللہ عزوجل علمین علما مخزونا مکنونا لا یعلمه الا هو من ذالك یکون البداء وعلمًا علمه ملائکته ورسله۔ فالعلما من اهل بیت نبیّك یعلمونه۔ قال سلیمان۔ اُحِبُّ ان تنزعه من کتاب اللہ عزوجل قال قول اللہ عزوجل لنبیّه فتول عنهم فما انت بملوم اراد هلاکهم ثم بدا۔ فقال وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ قال سلیمان زدنی جعلت فداك قال الرضا علیه السلام لقد اخبرنی ابی عن ابائه ان رسول اللہ قال ان اللہ عزوجل اوحی الی نبی من انبیائه ان اخبر فلان الملك انی متوفیه الی کذا وکذا فاتاه ذالك النبی فاخبره فدعا اللہ الملك وهو علی سریره حتی سقط من السریر وقال رب اجّلنی حتی یشب طفلی وقضی امری فاوحی اللہ عزوجل الی ذالك النبی ان ایت فلان الملك فاعلمه انّی قد انسیت اجله وزدت فی عمره خمس عشرة سنته فقال ذالك النبی یا ربّ انّك لتعلم انّی لم اکذب قط فاوحی اللہ عزوجل الله انّما انت عبد مامور فابلغه ذالك واللہ لا یسئل عمّا یفعل۔ ثم التفت الی سلیمان فقال احسبك ضاهیت الیهود فی هذا الباب قال

اعوذ باللہ من ذالک وقالت الیھود بقال قالت الیھود ید اللہ مغلولۃ یعنون ان اللہ قد فرغ من الامر فلیس یحدث شیئاً۔ فقال اللہ عزوجل غلت ایدیھم ولعنوا بما قالوا انتھی بقدر الحاجۃ۔

محمد بن عمر بن عبدالعزیز سے مروی ہے اُس نے ایسے شخص سے روایت کی ہے جس نے حسن بن محمد نوفلی سے سنا کہ امام رضا علیہ السلام نے سلیمان مروزی سے فرمایا، اے سلیمان تو بداء سے انکار کیا کرتا ہے۔ خدا تو خود فرماتا ہے۔ اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰہُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَکُ شَیْئًا۔ اور فرماتا ہے ھُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ اور فرماتا ہے بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ نیز فرماتا ہے یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ نیز فرماتا ہے وَبَدَءَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ نیز فرماتا ہے وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰہِ اِمَّا یُعَذِّبُھُمْ وَاِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْھِمْ۔ اور نیز فرماتا ہے وَمَا یُعَمَّرُ من معمر وما ینقص من عمرہ الا فی کتاب۔ (یعنی ان سب باتوں سے بداء کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔) سلیمان نے کہا کیا اس باب میں آپ کو اپنے آبائے طاہرین سے بھی روایت ملی ہے آپ نے فرمایا ہاں جناب ابو عبداللہ الصادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا خدائے عزوجل کے دو قسم کے علم ہیں۔ ایک علم مخزون و مخفی کہ جسے سوائے اسکے کوئی نہیں جانتا۔ بداء کا امر اسی میں ہے۔ دوسرا وہ علم ہے۔ جسے اُس نے اپنے فرشتوں اور رسولوں کو بتایا ہے۔ پس وہ لوگ جو تمہارے نبی کے اہل بیت میں سے عالم ہیں وہ اس علم کو جانتے ہیں سلیمان نے عرض کی میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے قرآن مجید سے نکال کر ثابت کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا خدا تعالیٰ کے اس قول سے بداء ثابت ہوتا ہے کہ فرمایا فتول عنھم فما انت بملوم (اے رسول تم ان کافروں سے اپنا منہ پھیر لو۔ تمہارے لئے اس میں کوئی ملامت نہیں ہے۔ یعنی کہ جب یہ کفار تمہارا کہا نہیں سنتے تو تم بھی اُن سے اعراض کرو اور اُن کو اُن کی حالت پر چھوڑ دو) جس سے خدا کا مقصود یہ تھا کہ ان کفار کو ہلاک کرے (کیونکہ جب ان کو اُن کی حالت پر چھوڑ دیا جائے گا تو لامحالہ بحالت کفر مریں گے اور معذب ہوں گے) پھر

بداء واقع ہُوا اور فرمادیا وذکر فان الذکریٰ تنفع المومنین۔ اے رسول ان کافروں سے اعراض مت کرو (بلکہ) ان کو یاد دہانی (ہدایت) کرو کیونکہ یاد دہانی ایمان والوں کو فائدہ دے گی۔ (سبحان اللہ کیا بے مثل آیت حضرت نے اپنے استدلال میں پیش کی ہے کہ جس کے ماننے بغیر چارہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں صریح بداء کا مسئلہ موجود ہے۔ پہلے تو پروردگار فرماتا ہے اے رسول تم ان کافروں کو اُن کی حالت پر چھوڑ دو۔ آئندہ ہدایت نہ کرو۔ تاکہ اسی طرح کفر میں رہ کر ہلاک ہُوں اور پھر اس حکم کو بدل کر فرماتا ہے۔ ایسا نہ کرو اُن کو ہدایت کرو۔ کیونکہ یاد دہانی وہدایت ایمان لانے والوں کو فائدہ مند ہو گی۔ اس سے عمدہ دلیل اہل سنت کو کیا چاہیئے۔ اگر عقل رکھتے ہوں تو دیکھیں کہ بداء کا مسئلہ شیعوں یا شیعوں کے اماموں کا تصنیف کیا ہُوا نہیں ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ خود اس مسئلہ کا اقرار فرماتا ہے) الغرض سلیمان نے عرض کی یا بن رسول اللہ کچھ اور ارشاد فرمائیے۔ میں آپ پر قربان ہوں۔ آپ نے فرمایا میرے پدر بزرگوار نے اپنے آبائے طاہرین سے روایت کی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا خدا تعالیٰ نے ایک نبی کو انبیاء میں سے وحی کی کہ فلاں بادشاہ کو یہ خبر دو کہ میں اسے فلاں فلاں روز میں موت دوں گا۔ وہ نبی اس کے پاس آئے اور اسے خبر دی۔ اسی وقت بادشاہ نے خدا سے دعا شروع کی یہاں تک کہ تخت سے نیچے گر پڑا اور کہتا تھا کہ پروردگارا مجھے اتنی مہلت دے کہ میرے بچے جوان ہو جائیں۔ اور میں اپنے کام پورے کر لوں۔ تب خدا تعالیٰ نے نبی کو وحی کی کہ اے نبی تم اس بادشاہ کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ میں نے تیری مدت میں بھول ڈال دی (یعنی اس پہلے امر کو محو کر دیا) اور تیری زندگانی بڑھا دی تو پندرہ برس اور زندہ رہے گا۔ نبی نے عرض کی خدایا تو جانتا ہے کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اب یہ کیوں کر اس سے کہوں کہ تو پندرہ برس نہیں مرے گا۔ حالاں کہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ فلاں وقت میں تو مر جائے گا) خدا تعالیٰ نے فرمایا نہیں اس سے کیا مطلب ہے تم کو صرف حکم دیا جاتا ہے۔ اس حکم کو اس بادشاہ تک پہنچا دو۔ خدا سے کوئی نہیں پوچھ سکتا

تو یہ کام کیوں کرتا ہے!! پھر آپ سلیمان کی طرف توجہ ہوئے اور فرمایا کہ اس قدر تیرے لئے کافی ہے۔ تو نے تو اپنے خیال عدم بدا میں یہودیوں سے مشابہت پیدا کر لی۔ سلیمان نے عرض کی پناہ بخدا۔ میں کیوں یہودیوں سے مشابہ ہوتا۔ آپ نے فرمایا اس وجہ سے کہ یہودیوں نے کہا تھا۔ کہ خدا کے ہاتھ بندھ گئے (اب وہ کام میں تغیّر وتبدل نہیں کر سکتا) جس سے اُن کا مطلب یہ تھا کہ خدا تعالیٰ اپنے کاموں سے فارغ ہو چکا۔ اب آئندہ کوئی چیز حادث نہ کرے گا۔ تو پروردگار عالم نے اُن کی رد میں فرمایا غُلَّتْ اَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا انہیں یہودیوں کے ہاتھ بندھ گئے ہیں اور یہ یہودی اپنے اس قول سے مستحق لعنت ہیں۔" انتہیٰ بقدر حاجۃ

نیز امام محمد باقر علیہ السلام سے ابوحمزہ ثمالی نے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا بینما داؤد علیہ السلام جالسٌ وعندہ شابٌ رثّ الھیئۃ یکثر الجلوس عندہ ویطیل الصّمت اذ اتاہ ملک الموت فسلّم علیہ واحدّ ملک الموت النظر الی الشابّ فقال داؤد علیہ السلام نظرت الی ھذا فقال نعم انی امرت بقبض روحہ الی سبعۃ ایام فی ھذا الموضع فرحمہ داؤد فقال یا شابّ ھل لک امرأۃ قال لا وما تزوّجت قط قال داؤد فأتِ فلانا رجلاً کان عظیم القدر فی بنی اسرائیل فقل لہ ان داؤد یامرک ان تزوّجنی ابنتک وتدخلھا اللیلۃ وخذ من النفقۃ ما تحتاج الیہ وکن عندھا فاذا مضت سبعۃ ایام فوافنی فی ھذا الموضع فمضی الشاب برسالۃ داؤد علیہ السلام فزوجہ الرّجلُ ابنتہ وادخلوھا علیہ واقام عندھا سبعۃ ایام ثم وافی داؤد یوم الثامن فقال لہ داؤد یا شاب کیف رأیت ما کنت فیہ قال ما کنت فی نعمۃ ولا سرور قط اعظم ما کنت فیہ قال داؤد اجلس فجلس وداؤد ینتظر ان یقبض روحہ فلما طال قال انصرف الی منزلک فکن مع اھلک فاذا کان یوم الثامن فوافنی ھاھنا فمضی الشاب ثم وافاہ یوم الثامن وجلس عندہ ثم انصرف اسبوعاً آخر ثم اتاہ وجلس فجاء ملک الموت داؤد فقال داؤد صلوات اللہ علیہ ان

الست حدثتنی بانک امرت بقبض روح ھذا الشاب الی سبعۃ ایام قال بلی قال فقد مضت ثمانیہ و ثمانیۃ و ثمانیہ قال یا داؤد ان اللہ تعالیٰ رحمہ برحمتک لہ فاخر فی اجلہ ثلثین سنۃ (بحار جلد توحید) اسی اثنا میں کہ حضرت داؤد علیہ السلام بیٹھے ہوئے تھے۔ اور آپ کے سامنے ایک نوجوان بھی بلباس کہنہ موجود تھا جو اکثر آپ کی خدمت میں حاضر رہتا اور چپ چاپ بیٹھتا کہ ناگاہ ملک الموت آئے حضرت کو سلام کیا اور گھور گھور کر اس نوجوان کو دیکھنے لگے۔ حضرت داؤد نے فرمایا اے ملک الموت تم نے اس جوان کو دیکھا۔ کہا ہاں مجھے حکم ہوا ہے کہ سات دن کے اندر اس کی روح قبض کر لوں۔ اسی مقام پر۔ یہ سن کر حضرت داؤد کو اس جوان کے حال پر ترس آیا اور فرمایا کہ اے جوان تیری کوئی بیوی ہے اس نے کہا نہیں میں نے ابھی تک بیاہ نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا اچھا فلاں شخص کے پاس جا (جو بنی اسرائیل میں عظیم القدر شخص تھا) اور اس سے کہہ کہ داؤد کا حکم ہے کہ تو اپنی لڑکی سے میری شادی کر دے!! اور تو اسی شب میں اس کو اپنے گھر لے آ۔ اور جس قدر اخراجات کی ضرورت ہو وہ جمع کر لے۔ اور اسی کے پاس رہ۔ جب سات دن پورے ہو جائیں تو میرے پاس اسی جگہ آنا وہ جوان یہ سن کر گیا۔ حضرت داؤد کا پیغام اس اسرائیلی کو پہنچایا۔ اس نے اپنی لڑکی کا بیاہ اس سے کر دیا۔ اور لوگوں نے اس عورت کو اس کے گھر پہنچا دیا۔ یہ جوان سات روز تک اس کے پاس رہا۔ آٹھویں روز داؤد علیہ السلام کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا کہ ان آٹھ دنوں میں کیسا رہا۔ اس نے کہا اس سے بہتر نعمت و سرور میں، میں کبھی نہیں رہا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا بیٹھ جا۔ وہ بیٹھ گیا۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ اب اس کی روح قبض کی جائے گی۔ جب دیر ہو گئی تو فرمایا کہ اچھا تو اپنے گھر کو واپس جا۔ سات روز تک اپنے عیال کے پاس رہ۔ آٹھویں روز پھر یہاں آنا۔ جوان یہ سن کر چلا گیا۔ آٹھویں روز حسب حکم آیا آپ کے پاس بیٹھا۔ پھر ایک ہفتہ کے لئے اپنے گھر کو چلا گیا۔ پھر آیا اور حاضر خدمت ہوا۔ تب ملک الموت آئے۔ آپ نے پوچھا۔ اے ملک الموت کیا تم نے یہ

نہیں کہا تھا کہ مجھ کو اس جوان کی روح قبض کرنے کا حکم ملا ہے ایک ہفتہ میں؟ کہا ہاں حکم تو ملا تھا۔ فرمایا تو وہ آٹھ دن گذر گئے اور آٹھ۔ اور آٹھ اور بھی گزر چکے عرش کی ملک الموت نے کہ اے داؤد۔ خدا تعالیٰ نے اُس جوان پر بسبب تمہارے ترس کھانے کے رحم کیا اور اس کی عمر میں تیس برس کی تاخیر کر دی۔ (ترجمہ حدیث منقول از توحید بحار)

یہ مضامین تو بطریق شیعہ امامیہ تھے۔ اب ملاحظہ ہوں۔ وہ اقرارات جو زبانی اہل سنت والجماعت کے ہیں۔ حالانکہ یہ حضرات بداء کے منکر ہیں۔ بات تو صرف یہ ہے کہ حقیقت بداء کے تو دل میں بلکہ زبان سے بھی ضرور قائل ہیں۔ مگر صرف لفظ بداء سے گھبراتے ہیں کہ یہ کیا منتر ہے اور اس کا علاج کچھ نہیں ہے۔ خیر ہمیں تو صرف ان کے اقرارات متعلق بہ بداء دکھانے مقصود ہیں۔ خواہ وہ اپنے قول کو آپ مانیں یا نہ مانیں ملاحظہ ہوں آیات ذیل اور ان کے متعلق علمائے اہل سنت کی تفسیریں۔

لکل اجل کتاب یمحوا اللہ ما یشآء ویثبت وعندہٗ ام الکتاب (سورہ رعد) یہ آیت سابق میں بیان ہو چکی ہے۔ مگر یہ دیکھنا ہے کہ امام فخر الدین رازی کیا فرماتے ہیں۔ فی ھذہ الآیۃ قولان الاول انہا عامۃ فی کل شیٔ کما یقتضیہ ظاہر اللفظۃ قالوا ان اللہ یمحوا اللہ من الرزق ویزید فیہ وکذا القول فی السعادۃ والشقاوۃ والایمان والکفر وھو مذھب عمرو بن مسعود ورواہ جابر عن رسول اللہ والثانی انہا خاصۃ فی بعض الاشیآء دون البعض ففیہا وجوہ الاول ان المراد من المحو والاثبات نسخ الحکم المتقدم واثبات حکم آخر بدلا عن الاول الثانی انہ تعالیٰ یمحو من دیوان الحفظۃ ما لیس بحسنۃ ولا سیئۃ لانہم مامورون بکتبۃ کل قول وفعل ویثبت غیرہ الثالث انہ تعالیٰ اراد بالمحوان من اذنب اثبت ذالک الذنب فی دیوانہ فاذا تاب عنہ محی عن دیوانہ۔ الرابع یمحوا اللہ ما یشآء وھو من جاء اجلہ ویدع من لم یجی اجلہ ویثبت۔ الخامس انہ تعالیٰ یثبت فی اول السنۃ فاذا مضت السنۃ محی واثبت کتاباً آخر للمستقبل

السادس يمحو نور القمر ويثبت نور الشمس ۔ السابع يمحو الدنيا ويثبت الآخرة الثامن انه فی الارزاق والمحن والمصائب يثبتها فی الکتاب ثم يزيلها بالدعاء والصدقة وفيه حيث على الانقطاع الى الله تعم ۔ التاسع تغير احوال العبد فما مضی منها فهو المحو وما حصل وحضر فهو الاثبات ۔ العاشر يزيل ما يشاء من حکمه لا يطلع عليه احد فهو المتفرد بالحکم کما يشاء وهو المستقبل بالايجاد والاعدام والاحياء والاماته والاغناء والافقار بحيث لا يطلع على غيبه احد من خلقه واعلم ان هذا الباب فيه مجال عظيم فان قال قائل الستم تزعمون ان المقادير قد جف به القلم فکيف يستقيم مع هذا المعنی المحو والاثبات قلنا ذالك المحو والاثبات ايضا قد جف به القلم فلا يمحوا الا ما سبق فی علمه وقضائه محوه ۔

ملاحظہ ہو اس کلام میں پہلی۔ تیسری۔ آٹھویں اور دسویں وجہ جو تفسیر آیت مذکورہ میں بیان کی ہے اور یہ آخری سوال و جواب کہ کس قدر اعتقاد شیعہ امامیہ سے متفق ہے یہی تو وہ مطلب ہے۔ جسے شیعہ امامیہ اور ان کے پیشوایان دین اس آیت سے تفسیر کرتے ہیں۔ یا کوئی اور مطلب ہے کیسی زبردستی کی بات ہے کہ خود کسی مطلب کو صحیح بتادیں اور جب دیکھیں کہ کوئی شیعہ اس رائے کا معتقد ہے تو اس پر اعتراض کریں۔ نہ معلوم یہ اعتراض خود ان پر واقع ہوتا ہے۔ یا اس شیعہ پر جو اس رائے کا معتقد ہے۔ جس کے آپ بھی معتقد ہیں۔

پھر ملاحظہ ہو جو اسی آیت کے ذیل میں علامہ زمخشری تفسیر کشاف میں کیا تحریر فرماتے ہیں۔ ”یمحوا الله ما يشاء ينسخ ما يستصوب نسخه ويثبت بدله ما يری المصلحة فی اثباته ويترکه غير منسوخ ۔ وقيل يمحو من ديوان الحفظة ما ليس بحسنة ولا سيئة لانهم ماموروں بکتبة کل قول وفعل ويثبت غيره وقيل يمحو کفر التائبين ومعاصيهم بالتوبة ويثبت ايمانهم وطاعتهم ۔ يعنی يمحوا الله ما يشاء سے یہ مراد ہے کہ خدا تعالیٰ جس امر کے منسوخ کرنے کو بہتر سمجھتا ہے اُسے منسوخ کر دیتا ہے اور اس کے عوض میں جس امر کے ثابت و قائم کرنے کو

مصلحت جانتا ہے۔ اس کو قائم کرتا ہے اور اس کو منسوخ نہیں کرتا بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یمحوا اللہ ما یشاء سے یہ مراد ہے کہ خدا تعالیٰ فرشتگانِ حفاظت کنندہ اعمال کے دفتر سے اُن امور کو محو فرماتا ہے جو نہ نیکی ہیں اور نہ بدی۔ (فرشتگانِ محافظین کو چونکہ ہر قول و فعل کے لکھ لینے کا حکم ہے اس لئے وہ حسنہ اور سیئہ اور غیر حسنہ اور غیر سیئہ کو لکھ لیتے ہیں۔ مگر پروردگارِ عالم اپنے فضل سے ایسے امور کو محو کرتا ہے) اور اس کے علاوہ امور کو درج فرما دیتا ہے۔" اور بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ توبہ کرنے والوں کے کفر اور معصیتوں کو اُن کی توبہ کے سبب سے محو فرما دیتا اور ان کی طاعت اور ایمان کو درج کر لیتا ہے۔" اس تفسیر میں بھی جو کچھ علامہ زمخشری نے ابتدًا لکھا ہے یعنی کہ خدا تعالیٰ امورِ عالم میں سے جس کے مٹا دیئے جانے کی مصلحت دیکھتا ہے مٹا دیتا اور اس کے مقام پر دوسرے امر کو جس کا ہونا مصلحت ہے قائم کرتا ہے یہی مسلک ہم لوگوں کا بھی مسئلہ بداء میں ہے اور ہم بداء بمعنی نسخ ہی کے قائل ہیں نہ یہ کہ بداء بمعنی ظہورِ غلطی رائے سابق۔ جیسا کہ بلاوجہ ہم پر اس کا الزام لگایا جاتا ہے۔

پھر ملاحظہ ہو یہ آیت اور اس کی تفسیر وما یعمر من معمر ولا ینقص من عمرہ الا فی کتاب اس آیت کے متعلق علامہ زمخشری اپنی تفسیر میں تھوڑی دور آگے چل کر فرماتے ہیں وفیہ تاویل آخر وھو ان لا نطول عمر الانسان ولا نقصر الا فی کتاب وصورتہ۔ ان یکتب فی اللوح ان حج فلان اوغزا فعمرہ اربعون سنة وان حج وغزا فعمرہ ستون سنة فاذا جمع ما بینهما فبلغ الستین فقد عمر واذا افرد احدھما فلم یتجاوز الاربعین فقد نقص من عمرہ الذی ھو الغایة وھو الستون والیہ اشار رسول اللہ فی قولہ ان الصدقة والصلة تعمران الدیار وتزیدان فی الاعمار وعن کعب انہ قال حین طعن عمر لو ان عمر دعی اللہ لاخر فی اجلہ فقیل لکعب الیس قد قال اللہ تع اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعة ولا یستقدمون قال فقد قال اللہ تع وما یعمر من معمر و

افاق اللہ علی الالسنۃ اطال اللہ بقاءک وفسح فی مدتک وما اشبہ۔"
یعنی کہ اس آیت کی ایک اور بھی تاویل ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم انسان کی عمر کو گھٹاتے بڑھاتے نہیں مگر کتاب میں۔ اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ لوح پر لکھ دیتا ہے کہ اگر فلاں شخص جہاد یا حج کرے گا۔ تو اس کی عمر چالیس سال کی ہوگی۔ اور اگر حج اور جہاد دونوں کرے گا تو اس کی عمر ساٹھ برس کی ہوگی۔ پس اگر وہ دونوں کام کر لیتا ہے تو ساٹھ برس کے سن تک پہنچ جاتا ہے پس اسے عمر (کا پورا حصہ) مل گیا۔ اور اگر صرف ایک ہی کام ان دونوں میں سے کیا تو چالیس برس سے تجاوز نہ کرے گا۔ تو اس کی زندگی گھٹ جائے گی اس انتہائی عمر سے جو ساٹھ برس مقرر ہوئے تھے (یہی مطلب ہے ینقص من عمرہ کا) اور اسی کی طرف رسول اللہ نے اشارہ فرمایا ہے کہ صدقہ اور صلہ رحم شہروں کو آباد اور عمروں کو زیادہ کرتے ہیں (یعنی صدقہ اور صلہ رحم کرنے سے زندگی کی مدت زیادہ ہو جاتی ہے) اور کعب الاحبار سے مروی ہے کہ جب خلیفہ عمر کو کسی شخص نے زخمی کیا تو کعب نے کہا کہ اگر یہ اپنے لئے خدا تعالیٰ سے دعا کرتے تو پروردگار عالم ان کی موت میں تاخیر کر دیتا۔ تو کعب سے کسی نے (بطور اعتراض کے) کہا کہ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ کہ اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ (جب مدت زندگی آدمیوں کی ختم ہو جاتی ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں) تو کعب نے جواب دیا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وما یعمر من معمر"
(یعنی کہ خدا تعالیٰ عمر میں زیادتی بھی کر دیتا ہے۔ باوجود کہ پہلے ایک حد اس کی مقرر کر دی تھی۔ مگر مختلف اسباب سے اس میں کمی اور زیادتی کر دینے کا بھی اس کو اختیار ہے) اور البتہ خدا تعالیٰ نے عام زبانوں پر یہ کلام جاری بھی فرما دیا ہے کہ اطال اللہ بقاءک۔ خدا تعالیٰ تیری عمر طولانی کرے۔ فسح اللہ فی مدتک۔ خدا تعالیٰ تیری مدت زندگی کو وسیع فرمائے۔ وغیرہ کلمات جو عام طور پر مشہور ہیں (جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعتقاد عام ہے کہ خدا تعالیٰ امور مقررہ میں کمی اور زیادتی

بھی فرماتا رہتا ہے۔

اس عبارت تفسیر سے چند باتیں سمجھ میں آئیں ! ایسا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک لوح محو و اثبات بنایا ہے اور کسی امر کو لکھتا یا اس کو مٹاتا ہے اور یہی مطلب مرحلہ بدا میں بھی ملحوظ ہے ۲ ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ لوح محو و اثبات پر مدت زندگانی کسی شرط پر بھی معلق فرماتا ہے۔ مثلاً اگر فلاں شخص حج و جہاد کرے گا۔ تو ساٹھ برس اس کی زندگی ہو گی اور اگر صرف ایک ہی عمل خیر ان دونوں میں سے کرے گا تو صرف چالیس ہی برس جئے گا۔ ۳ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ صدقہ اور صلہ رحم کے طولانی ہو جانے میں مدد دیتے ہیں۔ یعنی اگر کسی شخص کی زندگی پچاس برس کی مقرر ہو چکی ہے تو بسبب صدقہ دینے یا صلہ رحم کرنے کے اس سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ بدا شیعوں میں احداثی اور ایجادی نہیں ہے۔ بلکہ حضرت سرور کائنات کے کلام و احادیث سے ماخوذ ہے اور آپ ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے ۴ اصحاب کو بھی مسئلہ بدا کا اعتقاد تھا۔ چنانچہ کعب الاحبار نے کہا ہے کہ اگر عمر اپنی زندگی کے طولانی ہونے کی دعا کرتے تو ان کو کچھ مدت اور زندگی مل جاتی ۵ آیہ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ الخ آیہ ما یعمر من معمر کے مخالف نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو علم خدا تعالیٰ میں وقت حتمی موت کا مقرر ہے اس میں کمی اور زیادتی نہیں ہوتی۔ اور نہ کسی کو اختیار ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر کر سکے۔ مگر چونکہ خود خدا تعالیٰ مختار و قادر مطلق ہے اس لئے اسے ممکن ہے کہ جس کی مدت زندگی مقررہ سابقہ کو چاہے بڑھا دے اور چاہے گھٹا دے۔ اس پر کوئی الزام عاید نہیں ہو سکتا۔

اسی آیۂ مذکورہ کے متعلق تفسیر بیضاوی میں تحریر فرماتے ہیں وقیل الزیادۃ والنقصان فی عمر واحد باعتبار اسباب مختلفۃ اثبت فی اللوح مثل ان یکون فیہ ان حج عمر و فعمرہ ستون سنۃ والا فاربعون۔ انتہیٰ۔ یہ بھی کہا گیا ہے

کہ کسی کی زندگی کی مدت میں کمی اور زیادتی واقع ہونے کو مختلف اسباب سے لوح محو و اثبات میں خدا تعالیٰ لکھ دیتا ہے۔ مثلاً اس میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ اگر عمرو حج کرے گا تو اس کی زندگی ساٹھ برس کی ہوگی۔ اور نہیں تو صرف چالیس سال" یہ عبارت بھی کھلے لفظوں میں بداء کا اقرار کر رہی ہے۔

نیز ملاحظہ ہو۔ آیۃ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ. صاحب کشاف علامہ زمخشری بعد ایک کلام طولانی کے اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ عن عبد اللہ بن طاہر انہ دعا الحسین بن الفضل وقال اشکلت علیّ ثلث آیاتٍ دعوتك لتکشفها لی ۱ قولہ تعالیٰ فَأَصْبَحَ مِنَ النَّادِمِينَ وَقَدْ صح ان الندم توبۃ۔ ۲ وقولہ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ وصح ان القلم جف ھو بما کائن الی یوم القیامۃ۔ ۳ وقولہ وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ فما بال الاضعاف فقال الحسین یجوز ان لایکون الندم توبۃ فی تلك الامۃ ویکون توبۃ فی ھذہ الامۃ لان اللہ خص ھذہ الامۃ بخصائص لم یشارکھم فیھا الامم۔ وقیل ان ندم قابیل لم یکن علی قتل ھابیل ولکن علی حملہ واما قولہ وان لیس للانسان الاما سعیٰ عدلا ولی ان اجزیہ لواحدہ الفا فضلاً واما قولہ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ۔ فانھا شیون یبدیھا لا شیون یبتدیھا فقام عبد اللہ وقبل راسہ۔ انتہیٰ بقدر الحاجۃ۔ یعنی کہ عبد اللہ بن طاہر نے ایک مرتبہ حسین بن فضل کو بلایا اور کہا کہ قرآن مجید کی تین آیتیں مجھے مشکل معلوم ہوئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے حل کر دو ۱ ایک تو خدا تعالیٰ کا یہ قول کہ فاصبح من النادمین" کیونکہ حدیث صحیح سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ندامت ہی توبہ ہے (اور جب کہ قابیل نے توبہ کر لی تو پھر اس کے معذب رہنے کی کیا وجہ؟) ۲ خدا تعالیٰ کا یہ کلام کہ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ۔ اس لئے کہ صحیح حدیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے اسے لکھ کر قلم قدرت خشک ہو چکا ہے (یعنی روز اول سے جو کچھ ہونے والا تھا۔ لکھا جا چکا اب اس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا) حالانکہ اس آیت سے نسخ

وتغیرو تبدل سمجھ میں آتا ہے) ۳۔ خدا تعالیٰ کا یہ کلام ان لیس للانسان الّا ما سعٰی (انسان کو وہی ملے گا جو اس نے کوشش کی ہے۔ یعنی اس سے زیادہ اس کے ہاتھ نہ آئے گا)، تو ایک نیکی کا بدلہ دس گنا یا اس سے زیادہ ملنے کے کیا معنی ہوئے؟ حسین مذکور الصدر نے جواب دیا! جائز ہے کہ اس اُمت میں صرف ندامت ہی توبہ نہ رہی ہو۔ اور اس امت مرحومہ محمدیہ میں ندامت کو قائم مقام توبہ کا قرار دیا ہو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس امت مرحومہ کو ایسے ایسے خصائص سے مخصوص کیا ہے۔ جن میں اور امتیں اس کی شریک نہیں ہیں۔ (مثلاً صرف سترہ رکعت نماز واجبہ کا ان کے متعلق ہونا۔ باوجود کہ اگلی اُمتوں میں اس سے زیادہ نماز واجب تھی۔ یا مثلاً تیس روز کے روزے کا وجوب باوجود کہ اگلی اُمتوں پر اس سے زیادہ روزہ واجب تھے۔ علیٰ ہذا القیاس اور بھی بہت سے امور ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے کہ اس امت مرحومہ پر غایت رحم کی وجہ سے یہ قرار دیا گیا ہو کہ صرف تیرا نادم ہونا ہی اپنے بُرے کام پر توبہ سمجھا جائے گا۔ اور دیگر امتوں میں یہ بات نہ رہی ہو بلکہ توبہ کی کچھ اور شرائط ہوں جن کے بغیر توبہ نہ ہوسکتی ہو۔ تو صرف نادم ہونے سے قابیل کو کیا فائدہ مل سکتا ہے) نیز یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ قابیل کا نادم ہونا ہابیل کے قتل پر نہ تھا بلکہ اس بات پر تھا کہ میں اُن کی نعش کو تین دن تک لادے ہوئے کیوں پھرا۔ ان لیس للانسان الّا ما سعٰی۔ سے مراد یہ ہے مقتضائے انصاف تو صرف اتنا ہے کہ جس قدر آدمی کوشش کرے اتنا ہی پھل پائے مگر فضل خدا تعالیٰ کا مقتضا یہ ہے کہ ایک کی عوض میں ہزار عطا فرمائے کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ میں شان سے مراد شان بدأ ہے نہ شان ابتدا، یہ سن کر عبداللہ اٹھے اور حسین بن فضل کا سر چوم لیا۔

اس عبارت سے بھی تسلیم کرنا مسئلہ بداء کا زبانی حسین بن فضل کی اور علامہ زمخشری کا اس پر کچھ جرح و قدح نہ کرنا معلوم ہوا جو اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ علمائے اہل سنت بھی شیعوں کے اس مسئلہ کے قائل و معتقد ہیں۔ صرف زبانی طور پر اس

کی مخالفت فرماتے ہیں۔

ایک اور ثبوت بدا کا قرآن مجید سے واقعہ ذبح اسماعیل ہے۔ جس کا حکم خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو دیا تھا اور پھر منع فرما دیا۔ "فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ" پہلے تو خدا تعالیٰ نے خواب میں حضرت ابراہیم سے فرمایا کہ تم اپنے فرزند کو ذبح کرو جسے یہ فقرہ ظاہر کر رہا ہے۔ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ۔ اے پدر بزرگوار جس امر کا آپ کو حکم ملا ہے (یعنی میرے ذبح کرنے کا) وہ عمل میں لائیے۔ اس کے بعد ہی جب دونوں باپ اور بیٹے راضی ہو گئے اور باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لٹا بھی دیا۔ تو وہ حکم منسوخ کیا گیا اور ندا آئی کہ يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا۔ تم نے خواب کی تصدیق کر دی۔ اب اسے ذبح نہ کرو۔ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ۔ اور ہم نے اس کا بڑا فدیہ دے دیا۔ اسی آیت سے مفسر بیضاوی نے مسئلہ جواز نسخ قبل الوقوع کو پیدا کیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت ابراہیم باوجود کہ ذبح فرزند پر مامور تھے۔ مگر خدا تعالیٰ نے قبل وقوع ذبح کے اپنے اس حکم سابق کو منسوخ کر دیا۔

پھر ایک اور بہت بڑا ثبوت بدا کا وہ آیت ہے جو قصہ حضرت یونس میں مذکور ہے۔ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ۔" جس

جس سے مطلب یہ ہے کہ پہلے تو قوم یونس کے لیے بسبب ان کے کفر کے وعدہ عذاب کیا گیا - اور حسب وعدہ وہ عذاب بھیجا بھی گیا مگر قوم یونس کی تضرع وزاری نے وہ فائدہ پہنچایا کہ آیا ہوا عذاب خدا تعالیٰ نے ٹال دیا اور ایک مدت دراز تک اس کے بعد بھی اُن کو زندہ رکھا۔ چنانچہ اس کی تفسیر میں مفسر بیضاوی نے تحریر کیا ہے۔ روی ان یونس علیہ السلام بعث الی نینوی من الموصل فکذبوہ واصروا علیہ فوعدھم بالعذاب الی ثلث وقیل الی اربعین فلما دنا العذاب اغامت السماء غیما اسود ذا دخان شدید فھبط حتی

غشی منھم فتابوا وطلبوا یونس فلم یجدوہ فایقنوص ق فلبسوا المسوح وبرزوا الی الصعید بانفسھم ونسائھم ودوابھم وفرقوا بین کل والدۃ و ولدھا فحن بعضھا الی بعض وعلت الاصوات والعجیج واخلصوا التوبۃ و اظھروا ایمان وتضرعوا الی اللہ تعالیٰ فرحمھم وکشف عنھم وکان یوم عاشورآء یوم الجمعۃ" یعنی - مروی ہے کہ یونس علیہ السلام موصل سے نینوےٰ کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ مگر لوگوں نے ان کی تکذیب کی اور انکار پر مصر رہے۔ پس حضرت یونس نے اُن کو عذاب کا وعدہ دیا۔ تین روز یا چالیس روز کا (باختلاف روایات) پس جب عذاب قریب آیا تو آسمان پر بہت سیاہ ابر چھا گیا۔ جس میں سخت دھواں بھی تھا۔ اور وُہ نیچے اُترا۔ یہاں تک کہ رستے تاریک ہو گئے۔ اُس وقت قوم یونس نے توبہ کی اور یونس کو تلاش کیا۔ مگر وہ نہ ملے۔ تب اُن کو حضرت یونس کی سچائی کا یقین ہو گیا۔ پھر تو کمبل اوڑھے اور میدان میں خود اور اپنی عورتوں اور چوپایوں کو نکالا۔ اور بچوں اور ماؤں کو الگ کر دیا۔ اس وقت ایک دوسرے کی طرف مشتاق ہوا اور آوازیں فریاد کی بلند ہوئیں۔ اور سب نے خالص دل سے توبہ کی اور ایمان ظاہر کیا اور خدا تعالیٰ کی جناب میں تضرّع کی۔ پس اللہ نے اُن پر رحم کیا اور اُن سے عذاب کو ہٹا دیا۔ وہ روز عاشورا اور جمعہ تھا۔

پھر ایک ثبوت بدا کا یہ آیت قرآنیہ بھی ہے۔ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَۃً وَّاَتْمَمْنٰھَا بِعَشْرٍ "ہم نے موسیٰ سے تیس دن کا وعدہ کیا تھا۔ اور دس اور اضافہ کر کے چالیس پورے کئے۔ پہلے تو تیس ہی دن کے روزہ کا اُن کو حکم دیا گیا تھا مگر بعد میں اور دس روزوں کا حکم ہُوا جو صاف بدا ہے۔ صاحب حبیب السیر تحریر فرماتے ہیں "بنی اسرائیل بکرات ومرات بعرض موسیٰ رسانیدند کہ ما را شریعتی مجدد میباید تا بمقتضائے آن عمل نمائیم وآنجناب این معنی را معروض بارگاہ احدیت گردانید خطاب آمد کہ بطور سینا شتافتہ سی روز روزہ دار تا مسئول عز قبول یابد وموسیٰ ہارونؑ را بخلافت خویش درمیان قوم خود گذاشتہ ایشان را بجانب بریہ روانہ فرمود۔

ونفس نفیس با ہفتاد تن از صلحائے بنی اسرائیل بطرف طور در حرکت آمد و بعد از وصول بمقصد از غرہ ذیقعدہ تا سلخ ماہ مذکور روزہ گذرانید و موجب وحی الٰہی عشرہ ذی الحجہ بر آں منضم گردانید کما قال عز و علا۔ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَۃً وَّ اَتْمَمْنٰہَا بِعَشْرٍ۔

اب دیکھو اے برادران اسلام! کہ وہ انکار جو تم اس مسئلہ کی نسبت محض ہٹ دھرمی سے کرتے تھے کہاں قائم رہا۔ تم خود بھی اس کے اقراری ہو۔ اور خدا تعالیٰ کا تو وہ فعل ہی ہے اس لئے انکار کی کیا وجہ ہے۔ پھر کیوں اپنے اوقات عزیز کو اس کے رد میں ضائع کرتے۔ اور مخالفت الٰہیہ کی معصیت کا بار اپنے سر لیتے ہو۔ سمجھو اور غور کرو۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ

باقی رہی یہ بات کہ تم جو الزام ہم پر مسئلہ بدا میں یہ لگاتے ہو کہ "یہ لوگ خدا تعالیٰ کی رائے کی غلطی کے ظہور کے قائل ہیں" اس الزام کا بار ثبوت تم پر ہے ہرگز تم ہمارے علمائے یا ائمہ علیہم السلام کے کلام سے اس کا ثبوت نہیں دے سکتے بلکہ جہاں تک تم تلاش کرو گے۔ بعینہٖ وہی مطلب تمہیں ہماری کتابوں میں نظر آئے گا جو ہمارے علماء مفسرین نے لکھا ہے۔ دیکھو کہ ہمارے قدماء و علماء میں سے شیخ صدوق ہیں۔ وہ اپنی کتاب توحید میں اس مسئلہ کی نسبت اور تمہارے جھوٹے الزام کی نسبت کیا فرماتے ہیں۔ "لیس البداء کما یظنہ جہال الناس بانہ بداء ندامۃ تعالی اللہ عن ذالک علوًا کبیرًا و لکن یجب علینا ان نقر للہ عزوجل بان له البداء معناہ ان یبداء بشیٔ من خلقہ فیخلقہ قبل شئ ثم یعدم ذلک الشیٔ و یبدأ بخلق غیرہ او یامر بامر ثم و ینھی عن مثلہ و ینھی عن شیٔ ثم یامر بمثل ما ینھی عنہ وذالک مثل نسخ الشرائع و تحویل القبلۃ و عدۃ المتوفی عنھا زوجھہ۔ ولا یامر اللہ عبادہ بامر فی وقت ما الا و ھو یعلم ان الصلاح لھم فی ذلک الوقت فی ان یامرھم بذلک و یعلم ان فی وقت اخر الصلاح لھم فی ان ینھاھم عن مثل ما امرھم بہ"

پھر تھوڑی عبارت کے بعد فرماتے ہیں۔ والبداء ردٌ علی الیهود لانهم قالوا ان الله قد فرغ من الامر فقلنا ان الله کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ یحیی ویمیت ویرزق ویفعل ما یشاء والبداء لیس من ندامة "

تم نے غور سے پڑھا اور سمجھ لیا کہ شیخ رح نے کیا ارشاد فرمایا ہے۔ کہیں اس کلام میں اس الزام کا شائبہ بھی ہے۔ جو تم لوگ ہم پر لگاتے ہو (بالکل نہیں) بلکہ اس میں انکار صریح موجود ہے۔

اسی مطلب کو سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے بھی جواب مسائل اہل الرے میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں ان المراد بالبداء النسخ " وہ بدا جس کے قائل شیعہ امامیہ ہیں اس سے مراد نسخ ہے۔ (اور نسخ کے قائل تم بھی ہو۔ اگر اعتبار نہ ہو تو اپنے علماء سے پوچھو اور اصول فقہ کی کتابیں دیکھو)

اسی مطلب کو سید داماد رحمہ اللہ نے نبراس میں ارشاد فرمایا ہے ان البداء منزلة فی التکوین منزلة النسخ فی التشریع فما فی امر التشریعی والاحکام التکلیفی نسخ فهو فی الامر التکوینی والمکونات الزمانیة بداء فالنسخ کانه بداءٌ تشریعی والبداء کانه نسخ تکوینیٌ ا۔ جس سے مراد یہ ہے کہ بداء کا مرتبہ تکوین و خلق میں وہی ہے جو نسخ کا مرتبہ تشریع میں ہے۔ پس جو چیز کہ امر تشریعی اور احکام تکلیفیہ میں نسخ ہے سو ہی امر تکوین اور مکونات زمانیہ میں بداء ہے۔ پس نسخ ہو تو گویا بداءٌ تشریعی ہے اور بداء گویا کہ نسخ تکوینی ہے۔

اس عبارت نے بھی یہی بتایا کہ بداء سے مراد بداء ندامت و جہالت نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد نسخ ہے جو کہ جائز بلکہ واقع بھی ہو چکا ہے۔ جیسا کہ تحویل قبلہ وغیرہ مثالوں سے پہلے ثابت ہو چکا ہے۔ پس جب کہ ائمہ علیہم السلام اور علمائے کرام کے بیانات سے واضح ہو گیا کہ ہمارے فرقہ میں سے کوئی بھی اس امر کا قائل نہیں جس کا الزام لگایا جاتا ہے تو معترضین کو لازم ہے کہ اپنا الزام نہایت عاجزی کے ساتھ واپس لیں اور پھر کبھی اس کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

بارھواں باب
قدرت و ارادۂ خدا

چونکہ قائلین وجود خدا تعالیٰ میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے۔ جو پروردگار عالم کو فاعل موجب جانتا ہے یعنی فاعل بے اختیار جیسے آگ اپنے جلانے میں نہ خود قدرت رکھتی ہے۔ اور نہ اس کو جلانے کا ارادہ ہوتا ہے۔ بلکہ جلانا اس کا ایک طبعی فعل ہے۔ جو اس سے صادر ہوتا ہے مگر چونکہ یہ خیال غلط ہے اس لئے خدا تعالےٰ نے اس کی غلطی کو اپنی کتاب مجید میں بہت سے موقعوں پر ظاہر فرما دیا ہے۔

چنانچہ سورہ بقر میں ارشاد فرماتا ہے۔ اَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔ جانو کہ خدا تعالیٰ کو ہر شے پر قدرت حاصل ہے۔ وہ بے اختیار نہیں ہے۔ پھر سورہ آلِ عمران میں فرمایا وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔ خدا تعالیٰ کو ہر شے پر قدرت ہے۔ پھر سورہ نساء میں ہے اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ اَیُّھَا النَّاسُ وَیَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی ذٰلِکَ قَدِیْرًا۔ اگر خدا تعالیٰ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور (تم جیسے) دوسرے لوگوں کو پیدا کر دے اور اللہ اس امر پہ قادر ہے۔" پھر اسی سورہ میں فرمایا۔ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا۔ پس بے شک خدا تعالےٰ معاف کرنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جیسا اس نے ارشاد فرمایا ہے۔ ویسا ہی ہے۔ اور قدرت بھی عام ہے۔ کسی خاص حد تک محدود نہیں ہے کہ جہاں پہنچ کر ٹھہر جائے اور اس سے آگے نہ متجاوز ہو۔ اس معاملے میں حکماء نے بہت بڑی غلطی کھائی ہے۔ جو اس کے فاعل موجب ہونے کے قائل ہوئے ہیں۔ کیونکہ انہیں سمجھنا چاہیئے کہ اول تو یہ ہے کہ وہ صانع قدیم ہے اور اس سے یہ موجودات عالم جو حادث ہیں اور ظاہر ہے کہ حادث کا قدیم ہونا سے بطور ایجاب اور بے اختیاری کے ہرگز

نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ اگر موجودات کا حدوث اس سے بلا اختیار ہوگا۔ تو یا یہ لازم آئے گا کہ عالم قدیم ہے۔ یا یہ لازم آئے گا کہ معلول اپنی علت سے متخلف ہے حالاں کہ دونوں باتیں ناممکن ہیں۔ تشریح اس کی یوں ہوسکتی ہے کہ اگر ہم خدا تعالیٰ کو فاعل بے اختیار مانیں گے تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ عالم کے جمیع موجودات کا صدور اس سے ازل ہی میں ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ فاعل موجب کا فعل اس سے کسی قدر جدا نہیں ہوسکتا۔ حالاں کہ ہم یقیناً اور بداہتہً جانتے ہیں کہ عالم کے تمام موجودات ازلی نہیں ہیں۔ بلکہ یکے بعد دیگرے اور آناً فاناً۔ یوماً فیوماً۔ پیدا ہوتے رہتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فعل خلق اس کا اختیاری ہے نہ اضطراری اور بلا اختیار اور اگر ہم عالم کو قدیم نہ مانیں۔ بلکہ حوادث زمانیہ ہی سمجھیں۔ جیسا کہ وہ فی الواقع بھی ایسے ہی ہیں تو اس بنا پر کہ ہم خدا تعالیٰ کو فاعل موجب تسلیم کر چکے ہیں۔ لازم آتا ہے کہ علت تامہ تو موجود ہو اور اس کا معلول موجود نہ ہو۔ حالاں کہ یہ محال ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ ہرگز فاعل موجب نہیں ہے بلکہ قادر مختار ہے۔

دوسرے یہ کہ عالم کو جس نے بھی پیدا کیا ہو وہ قادر ضرور ہے کیونکہ اس عالم میں ایسے ایسے عجائب صنعت اور لطائف حکمت ہیں۔ جنہیں دیکھ کر ہرگز کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا کہ اس کا بنانے والا قادر و توانا و حکیم نہیں ہے۔ پس اگر تم کہو کہ عالم کا بنانے والا خدا تعالیٰ ہی ہے فہو المراد۔ اور اگر کہو کہ وہ اس کا خالق نہیں ہے بلکہ اس کو کسی اور خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو ہم کہیں گے کہ جس نے ایسے خالق و قادر کو پیدا کیا۔ جس سے عالم کے موجودات اور اس کے عجائب حکم وصنعت ظاہر ہوئے وہ بطریق اولیٰ قادر ہوگا۔ کیونکہ معلول اپنی علت سے کبھی بڑھا ہوا نہیں ہوسکتا۔ جب کہ عالم کا بنانے والا قادر ہے تو اس کا بنانے اور پیدا کرنے والا جسے تم نے خدا مانا ہے۔ وہ کیوں کر نہ قادر ہوگا۔ نیز ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ موجودات و کائنات عالم میں ہزاروں ایسے مخلوق ہیں جو صاحب قدرت وطاقت

ہیں، مثلاً انسان وحیوانات وغیرہ۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ سب خدا تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ پس کیوں کر عقل تجویز کرسکتی ہے کہ مخلوقات صاحب قدرت و اختیار ہوں اور ان کا خالق بے قدرت و بے اختیار ہو۔ کیونکہ معلول اپنی علت سے ہرگز بڑھ نہیں سکتا۔

تیسرے یہ بات بھی سوچنے کے قابل ہے کہ جب کہ عالم کا موجد خدا تعالیٰ کو مانا گیا تو باوجود اس کے کہ اس کے مصنوعات نہایت استحکام و اتقان و حکمت وصنعت وکمال وحسن و فوائد و منافع و آثار و خواص پر مشتمل ہیں۔ مثلاً مواقع مخصوص پر ہواؤں کا چلنا۔ پھلوں کا پھلنا۔ پھولوں کا کھلنا۔ مینہ کا برسنا۔ نباتات کا اگنا ستاروں کا طلوع کرنا۔ حیوانات کا اغراض کثیرہ و منافع غیر متناہیہ پر شامل ہونا وغیرہ وغیرہ۔ امور جو آسمان اور زمین کے درمیان اور اُن کے اُوپر اور ان سے نیچے موجود ہیں۔ کس طرح نہیں بتاتے کہ اُن کا پیدا کرنے والا حکیم و قادر ہے۔ کیونکہ اگر بلا قدرت والے سے اس قسم کے امور کا صدور ممکن ہو۔ تو اگر کوئی قدرت والا ہوتا۔ تو اس سے کس قسم کے امور صادر ہوتے لامحالہ کہنا پڑے گا کہ اس سے بہتر کسی قادر و توانا سے ہونا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا لازم ہُوا۔ کہ خالق عالم کو قادر مانا جائے۔

البتہ یہ امر ضرور ہے کہ پروردگار عالم نے جو کچھ اپنے عموم قدرت کی نسبت ارشاد فرمایا ہے مثلاً اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا۔ اس کا تعلق انہیں امور سے ہے جن میں قابلیت بھی قبول اثر کی ہو ورنہ اگر خود اُن امور میں قابلیت قبول اثر نہ ہوگی۔ تو اُن سے قدرت خدا تعالیٰ کا متعلق نہ ہونا عموم قدرت کے لئے مضر نہیں ہے۔ بلکہ دراصل یہ نقصان اُن اشیاء کا ہے جن میں قابلیت قبول اثر نہیں۔ پس اس قسم کا سوال جیسا کہ کسی نے امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ "آیا آپ کا پروردگار اس بات پر قادر ہے کہ دنیا کو ایک انڈے کے اندر داخل کردے۔ بشرطیکہ نہ انڈا بڑھے اور نہ دنیا چھوٹی ہو" خالی از حماقت نہیں۔ کیونکہ دنیا میں بایں عظمت خود ہی اس بات کی قابلیت نہیں ہے کہ ایک انڈے کے اندر

سما سکے تو یہ نقصان دراصل اس انڈے اور اس دنیا کا ہے۔ جس میں صلاحیت تاثیر ہی نہیں ہے۔ نہ خالق عالم کی قدرت کا۔ چنانچہ حضرت نے اس سائل کو یہی جواب دیا تھا کہ ان اللہ تعالیٰ لاینسب الی العجز والذی سالتنی لا یکون۔ یعنی خدا تعالیٰ کی طرف عجز کی نسبت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن تو نے جس امر کا سوال کیا ہے وہ خود ہی ناممکن ہے۔ جس میں موثر کے اثر کے قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اجتماع نقیضین اور اجتماع ضدین ایک محل میں وقت واحد میں یا اپنا شریک پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ امور جو محال عقلی ہیں۔ یہ سب کے سب اپنی ذات سے موجود ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے نہ یہ کہ خدا تعالیٰ کو ان پر قدرت نہیں ہے۔

رہا ارادہ اس کے متعلق خدا تعالیٰ سورہ حج میں ایک موقع پر فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ۔ بے شک خدا تعالیٰ وہی کرتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ اور سورہ احزاب میں فرماتا ہے۔ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُکُمْ مِّنَ اللّٰہِ اِنْ اَرَادَ بِکُمْ سُوْٓءً اَوْ اَرَادَ بِکُمْ رَحْمَۃً وَّلَا یَجِدُوْنَ لَھُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا۔ اے رسول کہہ دو (ان لوگوں سے) کہ تم کو خدا تعالیٰ سے کون بچائے گا۔ اگر وہ ارادہ کرے تمہیں برائی پہنچانے کا (اور کون روک سکتا ہے اگر وہ ارادہ کرے رحمت بھیجنے کا؟) اور یہ لوگ ہرگز اللہ کے سوا ولی اور مددگار (اپنا) نہ پائیں گے۔" اور سورہ نحل میں اپنے ارادے کی حقیقت کو ارشاد فرمایا ہے کہ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنٰہُ اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ جس وقت ہم کسی چیز کے موجود کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو بس ہمارا کہنا یہ ہوتا ہے کہ ہم کہہ دیتے ہیں۔ اسے ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے اور سورہ یٰسین میں فرماتا ہے۔ اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ پس اس کی بات تو اتنی ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو اس سے کہہ دیتا ہے" ہو جا" پس وہ ہو جاتی ہے۔

اب رہا یہ امر کہ ارادہ خدا تعالیٰ کے معنی کیا ہیں۔ تو اس کی نسبت صرف اس

قدر کہنا ضروری ہے کہ پروردگار عالم کا ارادہ مثل اُن ارادوں کے نہیں ہے جو انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے کیوں کہ وہ ایک کیفیت ہے جو کسی شے کے جاننے کے بعد بغرض اس کے حاصل ہونے کے فطرۃً پیدا ہوتی ہے اور اس کی مددگار حرص۔ رغبت شہوۃ۔ انتقام وغیرہ صفتیں ہوتی ہیں بلکہ مراد اس صفت سے صرف "علم مصلحت یا علم مفسدہ" ہے۔ جیسا کہ اکثر محققین معتزلہ و امامیہ کا مسلک ہے۔ چنانچہ محقق طوسی طاب ثراہ فرماتے ہیں۔ تخصیص بعض الممکنات بالایجاد فی وقت یدل علی ارادتہ ولیست زائدۃ علی الداعی اعنی العلم بالمصلحۃ والمفسدۃ والالزم التسلسل او تعدد القدماء" یعنی بعض ممکنات کا کسی وقت خاص میں پیدا ہونا اور اس سے پہلے یا پیچھے اس کا نہ پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ خدا تعالیٰ صاحب ارادہ ہے۔ مگر اس کا ارادہ داعی یعنی علم مصلحت یا علم مفسدہ سے زائد نہیں ہے۔ (مصلحت یہ ہے کہ اس کا کسی شے کے صلاح یا فساد کو جاننا ہی ارادہ ہے) اور اگر کوئی شخص علاوہ علم کے کسی اور شے زائد بر ذات کو ارادہ کہتا ہے تو تسلسل یا تعدد قدمار لازم آئے گا۔ جو محال ہے (حاصل یہ ہے کہ اگر ارادہ کو علم کے علاوہ کوئی اور صفت مانتے ہو۔ تو یا اُسے حادث مانو یا قدیم۔ پس اگر حادث کہو تو اس کے پیدا کرنے کے واسطے بھی ارادے کی ضرورت ہوگی۔ اور وہ ارادہ بھی اگر حادث ہوگا تو اس کے پیدا کرنے میں بھی ارادہ کی ضرورت ہوگی۔ لہذا اس کی ترکیب سے تسلسل لازم آئے گا اور اگر اس صفت کو قدیم مانو تو تعدد قدمار لازم آئے گا اور یہ دونوں باتیں محال ہیں۔ پس لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ "ارادہ خدا تعالیٰ نام ہے علم مصلحت یا علم مفسدہ کا۔"

حکما کا خیال بھی قریب قریب یہی ہے۔ کیوں کہ اُن لوگوں نے بھی "علم نظام الکمل" کو ارادہ باری تعالیٰ کہا ہے۔ مگر فرق صرف اس قدر ہے کہ حکما کی راہ کے مطابق صفت ارادہ صراحتاً قدیم مانی گئی ہے۔ اور پہلے بیان میں ہوئے حدوث آتی ہے۔ بلکہ بعض محققین نے اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔ چنانچہ ابن بابویہ

علیہ الرحمۃ نے کتاب توحید میں فرمایا ہے۔ ولیست الارادۃ والمشیۃ والرضا والغضب وما یشبہ ذالک من صفات الافعال بمثابۃ صفات الذات لانہ لا یجوز ان یقال لم یزل اللہ تم مریداً شائیاً کما یجوز ان یقال لم یزل اللہ قادراً عالماً۔ یعنی ارادہ مشیت اور رضا و غضب وغیرہ صفات افعال خدا تعالیٰ مثل صفات ذاتیہ کے نہیں ہیں۔ کیوں کہ یہ جائز نہیں ہے کہ کہا جائے کہ خدا تعالیٰ ہمیشہ سے مرید شائی (چاہنے والا ہے) جیسا کہ اس کو ازلی و ابدی قادر و عالم کہنا جائز ہے۔

خلاصہ یہ کہ رائے حکما کی تفصیل اس مادہ میں یہ ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کا ارادہ عنایت بالمخلوقات کا نام ہے۔ یعنی تمام موجودات کے نظام کا ازل سے لے کر ابد تک علم خدا تعالیٰ میں متمثل ہونا۔ (جو کہ ان موجودات سے سابق ہے) مع ان اوقات و حالات کے جو بترتیب غیر متناہی ظہور میں آنے والے ہیں۔ یعنی جن جن وقتوں اور جن جن حالتوں میں موجودات و ممکنات کا پیدا اور ظاہر ہونا اس کے علم قدیم میں گزر چکا ہے۔ انہیں صورتوں سے اس کے علم میں موجود ہونے کا نام ارادۃ اللہ ہے۔

مگر از بسکہ شارع علیہ السلام کو تو اس کے اختیار کا ثابت کرنا مقصود ہے یعنی کہ باری تعالیٰ قادر مختار ہے (موجب نہیں ہے) اور یہ دکھلانا مد نظر ہے کہ اس کا اختیار اور اس کی قدرت عام ہے کسی وقت خاص کے ساتھ اس کو خصوصیت نہیں ہے تاکہ اس امر کے معلوم کرنے سے بندوں کو خیال عبادت و طاعت پیدا ہو اور معصیتوں سے باز رہیں اور قدم ارادہ کے قائل ہونے سے یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا۔ کہ جو کچھ علم سابق میں گزر چکا ہے۔ اس کے برخلاف تو ہونے ہی کا نہیں۔ لہذا طاعت و عبادت و صدقہ و دعا وغیرہ بیکار ہے۔ کیونکہ جو کچھ ہو گا۔ وہ اسی ارادہ کے مطابق واقع ہو گا۔ جو سابق ہو چکا ہے۔ اس لئے کتاب خدا و احادیث انبیاء و اوصیاء میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ارادہ خدا تعالیٰ بحسب مصلحت پیدا ہوتا رہتا ہے۔ تاکہ سننے والا یہ نہ سمجھے کہ جف القلم بما ھو کائن۔ جو کچھ ہونے والا تھا۔ وہ تو ارادہ خدا تعالیٰ میں گزر ہی چکا اور اسی کے مطابق

حادث بھی ہو گا لہذا آئندہ زحمت اٹھانے اور عمل خیر اور اجتناب معصیت کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ بدیں لحاظ خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ " خدا تعالیٰ کی بات تو صرف اس قدر ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہہ دیتا ہے ہو جا۔ پس وہ ہو جاتی ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ارادہ خدا تعالیٰ بحسب حدوث اشیاء پیدا ہوتا رہتا ہے " اور اسی کے مطابق معصوم نے بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ کسی نے جناب صادق آل محمدؐ سے دریافت کیا کہ آیا خدا تعالیٰ ہمیشہ سے مرید (ارادہ کرنے والا) ہے تو آپ نے فرمایا۔ ان المرید لایکون الا المراد معہ بل لم یزل عالماً قادراً ثم اراد " یعنی مرید کا اطلاق تو اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے۔ جب کہ مراد (جس کا ارادہ کیا گیا ہے) بھی ہو۔ البتہ خدا تعالیٰ ہمیشہ سے عالم و قادر ہے۔ پھر اس نے ارادہ فرمایا " مگر اس قدر ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ ان عبارتوں میں ارادہ سے مراد ایجاد۔ اور خلق بمعنی مصدری ہے۔ کیوں کہ یہ صفت صفات ذات میں سے نہیں ہے جس کا حدوث محال ہو۔ چنانچہ حدیث ذیل سے بتصریح یہ بات ثابت ہے صفوان بن یحییٰ جناب ابوالحسن علیہ السلام سے روایت کرتا ہے کہ میں نے حضرت کی خدمت میں عرض کی۔ اخبرنی عن الارادۃ من اللّٰہ تعالیٰ ومن المخلوق قال فقال الارادۃ من المخلوق الضمیر وما یبدولہ بعد ذالک من الفعل واما من اللّٰہ عزوجل فارادتہ احداثہ لاغیر ذالک لانہ لایروی ولایھم ولایتفکر وا ھذہ الصفات منفیۃ عنہ وھی من صفات الخلق فارادۃ اللّٰہ تم ھی الفعل لاغیر ذالک یقول کن فیکون بلا لفظ ولا نطق بلسان ولا ھمۃ ولا تفکر ولا کیف لذالک کما انہ بلا کیف " (توحید بحار) اسی حدیث پر نظر کر کے جناب شیخ مفید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؛ الارادۃ من اللّٰہ جل اسمہ نفس الفعل ومن الخلق الضمیر واشباھہ مما لا یجوز الا علی ذوی الحاجۃ والنقص وذلک لان الفعل شاھدۃ بان القصد لا یکون الا بقلب

كما لا تكون الشهوة والمحبة إلّا الذى قلب ولا تصحّ النية والضمير والعزم إلّا على ذى خاطر يضطر معها فى الفعل الذى يغلب عليه الى الارادة له داعية فيه والعزم لما كان الله تعالىٰ يجل على الحاجات ويستحيل عليه الوصف بالجوارح والادوات ولا يجوز عليه الدواعى والخطرات بطل ان كون محتاجاً فى الافعال الى القصود والعزمات وثبت ان وصفه بالارادة مخالف فى معناه لوصف العباد وانها نفس فعله الاشياء - انتہیٰ بقدر الحاجۃ (عماد الاسلام)

حدیث مذکور کا حاصل یہ ہے کہ مخلوقات کے دل میں جو ارادہ پیدا ہوتا ہے وہ تو اس ضمیر کا نام ہے۔ جس کا ظہور قلب میں ہوتا ہے اور جو فعل اس ارادے کے بعد ظاہر ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کا ارادہ صرف اس کا پیدا کر دینا ہے کسی چیز کو۔" اور حاصل عبارت صدوق یہ ہے کہ مخلوق کا ارادہ بغیر قلب کے نہیں ہو سکتا۔ جیسے شہوت و محبت وغیرہ کا تعلق دل سے ہے اسی طرح ارادہ مخلوق کا تعلق بھی دل ہی سے ہے۔ مگر چوں کہ باری تعالیٰ کے جوارح و اعضا و قلب وغیرہ نہیں ہیں۔ جن میں اس ضمیر کا آنا ممکن ہے۔ اس لئے اس کا ارادہ صرف اس معنی سے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ اشیاء ممکنہ کو پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی مخلوقات کو عدم سے وجود میں لانا ہی خدا کا ارادہ ہے۔"

تیرھواں باب

خدا تعالیٰ ہر شئے کا پیدا کرنے والا ہے

یوں تو برہان سے جب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ خالق عالم ایک ہی ہے اور وہی قدیم ہے۔ اس کے سوا سب چیزیں حادث ہیں۔ تو آپ سے آپ نتیجۃً یہ امر بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر شئے کا خالق وہی ہے کیونکہ دوسرا کوئی قدیم ایسا نہیں ہے جس طرف اس فعل خلق و ایجاد کی نسبت کی جا سکے وہی مبدءِ اول ہے جو حکیم و قدیر اور علیم و خبیر ہے۔ جس کی حکمتوں کے آثار عالم کے ہر ذرے سے نمودار ہیں۔ ہر جسم خواہ نباتی ہو یا حیوانی یا جمادی بلکہ ہر موجود خواہ جوہر ہو یا عرض۔ بسیط ہو یا مرکب۔ مرئی ہو یا غیر مرئی۔ اپنے اپنے آثار و افعال و قویٰ و حرکات و اشتمال علی الحکم العجیبۃ والصنائع الغریبۃ سے باآواز بلند پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ہمیں اس بے نیاز صناع یکتا نے بنایا ہے۔ جس کی حکمت کا اندازہ اور جس کے کمالات کی تقدیر ذہن بشری سے باہر ہے۔

اور جب کہ ماورائے باری تعالیٰ تمام موجودات ممکن ہیں تو کوئی وجہ نہیں، کہ بعض کی نسبت تو خدا تعالیٰ کی طرف دی جائے اور بعض کو کسی اور کا پیدا کیا ہوا مانا جائے اس لئے کہ اس میں ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے۔ جو محال ہے۔ رہی یہ بات کہ خدا تعالیٰ واحد حقیقی ہے اور واحد حقیقی سے صرف ایک ہی کام ہو سکتا ہے جیسے مثلاً آگ کہ اس سے صرف جلانے کا کام ہو سکتا ہے۔ بجھانے کا یا تر کرنے کا کام اس سے نہیں ہو سکتا (باوجود کہ آگ بسیط حقیقی نہیں ہے۔ بلکہ بہ نسبت مرکبات عنصریہ کے بسیط ہے۔ ورنہ باعتبار اپنے مافوق کے مرکب ہے) تو چاہیے کہ خدا تعالیٰ صرف کسی ایک شئے کا خالق مانا جاوے نہ تمام ممکنات کا۔ پس اس کا جواب یہ ہے کہ جن بسائط کا قیاس خدا تعالیٰ کی بساطت سے کیا گیا ہے وہ

سب کے سب ممکنات ہیں اور اپنے افعال میں غیر مختار۔ لیکن باری تعالیٰ تو وہ قدیم واجب الوجود ہے اور اپنے افعال میں مختار ہے۔ پھر اور بسائط کا قیاس اس پر کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ جو کسی طرح تسلیم نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں جن بسائط پر قیاس کر کے یہ کہا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات سے امور کثیرہ کا صدور نہیں ہو سکتا وہی غلط ہے۔ کیوں کہ جس بسیط کو دیکھو وہی کئی امروں کے صدور کا باعث و فاعل ہے۔ یہاں تک کہ عقل اور نفس جن کو حکماء نے ممکنات میں سے ابسط البسائط کہا ہے وہ بھی مصدر امور متعددہ ہیں مثلاً عقل اوّل کو ان کے مذاق کے موجب دیکھئے۔ تو دو چیزوں کی موجد ہے ایک عقل اور دوسرے فلک اوّل۔ اور رہا نفس اُس کے افعال کی کثرت کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے۔ تمام تدابیر بدنی اسی سے متعلق ہیں۔ پس یہ قیاس کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ جب کہ مقیس علیہ ہی میں دعوے کی صحت معدوم ہے۔

رہا یہ عذر کہ عقل اور نفس وغیرہ میں جہالت مختلف ہے۔ اس لئے اُن سے امور کثیرہ کا صدور ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ میں سوائے وجوب کے دوسری جہت نہیں ہے۔ اس لئے اس سے امور کثیرہ پیدا نہیں ہو سکتے۔ تو یہ عذر بھی نا مسموع ہے اس لئے کہ وہی جہت وجوب وجود خدا تعالیٰ میں ہے جس کو تم ایک جہت کہتے ہو۔ اسی کے سبب سے باری تعالیٰ عز اسمہٗ کو تمام ممکنات سے نسبت مساوی ہے یعنی کہ جو نسبت کسی ایک ممکن کو خدا تعالیٰ سے ہے۔ وہی نسبت دوسرے کو بھی حاصل ہے۔ پھر کیا وجہ کہ ایک کا تو اس سے صدور ہو اور دوسرے کا نہ ہو۔ یہ تفریق اور ترجیح بلا مرجح کیسی۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر واحد حقیقی سے کئی چیزیں پیدا ہو سکیں تو وہ سب اُس کے آثار سمجھے جائیں اور تعدد اثر تعدد موثر پر دلالت کرتا ہے اور اگر یہ بات نہ مانی جائے کہ تعدد اثر تعدد موثر پر دلالت کرتا ہے۔ تو کبھی یہ استدلال درست نہ ہو کہ حرارت اور برودت چونکہ دو اثر ہیں۔ لہٰذا اُن کے موثر

بھی دو ہوں گے۔ یعنی پانی اور آگ۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو اس دلیل میں مصادرہ علی المطلوب ہے۔ وہی دعویٰ اور وہی دلیل (یہ خوب کہی) دوسرے یہ کہ۔ آگ اور پانی کا تعدد تو اس وجہ سے سمجھا گیا ہے کہ ایک کا اثر دوسرے میں نہیں پایا جاتا۔ ورنہ اگر حرارت کا اثر پانی میں بھی ہوتا۔ یا برودت کا اثر آگ میں بھی تو کبھی تعدد ممکن نہ ہوتا اور نہ استدلال ٹھیک ہو سکتا۔ دیکھو۔ یہی ایک پانی ہے۔ جس میں تین اثر پائے جاتے ہیں۔ مثلاً برودت۔ سیلان اور رطوبہ۔ مگر کیا تم کہہ سکتے ہو کہ اس تعدد اثر کی وجہ سے موثر بھی متعدد ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ موثر ان تینوں اثروں کا صرف وہ پانی ہے۔ یا مثلاً آگ ہی ہے کہ اس کے آثار میں سے جلا دینا۔ پگھلا دینا اور بغیر پگھلائے ہوئے تفتیح مسامات کرنا ہے تو کیا تم کہہ سکتے ہو کہ ان آثار کا موثر صرف آگ ہی نہیں ہے بلکہ کئی موثر ہیں؟ پس سمجھو کہ تعدد آثار سے تعدد موثر پر اسی وقت دلیل لائی جا سکتی ہے جب کہ ان موثرات کے آثار کا ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہونا ناممکن ہو ورنہ یہ استدلال غلط ہو گا۔

کسی نے یہ بھی دلیل پیش کی ہے کہ اگر واحد سے کثیر چیزوں کا صدور ہو سکے تو اجتماع نقیضین لازم آئے گا۔ یعنی کہ مثلاً اگر ہم خدا تعالیٰ کو زید کا پیدا کرنے والا مانیں اور عمرو کا بھی۔ تو از بسکہ عمرو۔ مغائر زید کے ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکے گا کہ خدا تعالیٰ زید اور لا زید دونوں کا خالق ہے۔ حالاں کہ یہی اجتماع نقیضین ہے۔ مگر یہ دلیل بھی غلط ہے کیوں کہ اجتماع نقیضین جس کو کہا گیا ہے وہ اجتماع نقیضین ہی نہیں ہے۔ ہاں اگر زید کو پیدا کرنا اور پھر اسی کو نہ پیدا کرنا ایک ہی وقت میں کہا جاتا تو البتہ صحیح ہو سکتا تھا۔ کہ یہ محال ہے۔ بیشک ایک ہی وقت میں زید کا موجود ہونا اور اس کا نہ موجود ہونا محال ہے۔ مگر یہ کسی طرح محال نہیں ہے کہ زید اور عمرو۔ مثلاً ایک وقت میں موجود ہوں۔ اگر اسی کا نام اجتماع نقیضین ہے تو آپ کی منطقیت معلوم !!

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر واحد حقیقی سے کئی امور کا صدور ہو سکے گا۔ تو وہ واحد ان میں سے ہر ایک کا مصدر سمجھا جائے گا۔ اور پھر ہر ایک کے لئے ایک مصدریۃ بھی ہوگی۔ پس اگر ان مصدریتوں کو اس واحد حقیقی کا عین کہو تو پھر وہ مرکب ہو جائے گا۔ واحد حقیقی نہ رہے گا اور اگر غیر کہو تو ان کا صدور بھی اسی واحد سے ہوا ہوگا۔ تو ان کے لئے بھی علیحدہ علیحدہ مصدریۃ ہوگی۔ اور پھر ان مصدریتوں میں وہی کلام ہوگا جو پہلی مصدریتوں میں ہوا تھا۔ جس سے تسلسل لازم آئے گا اور وہ محال ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مصدریۃ سے تم نے کون سا جانور مراد لیا ہے۔ اگر اس سے مراد معنی مصدری ہے۔ یعنی کسی چیز کا جائے صدور ہونا۔ تو یہ ایک ایسی چیز ہے۔ جس کا وجود خارج میں نہیں ہے کیونکہ معنی مصدری امور خارجیۃ میں سے نہیں ہے۔ پھر تو نہ تسلسل لازم آئے گا اور نہ واحد حقیقی کا مرکب ہونا۔ اور اگر اس سے مراد خصوصیۃ ہے۔ تو اس میں بھی کوئی خرابی نہیں لازم آتی۔ کیوں کہ ایک شے واحد کو اگر دس چیزوں سے مختلف طرح کی خصوصیت ہو تو اس میں کیا استحالہ لازم آتا ہے۔ مثلاً اگر پانی کو سیلان۔ برودت اور رطوبت سے خصوصیت ہے تو کون سا تسلسل لازم آیا اور کیا ترکیب (اگرچہ پانی واحد حقیقی نہیں ہے لیکن سمجھنے کے لئے یہ مثال کافی ہے۔ کیوں کہ اگر واحد حقیقی میں خصوصیات کی وجہ سے مرکب ہونا یا تسلسل لازم آتا ہو تو اس میں بطریق اولیٰ ہونا چاہیئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔)

حاصل یہ کہ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ خدا تعالیٰ سے بہت سے امور کا پیدا ہونا ناممکن ہے اور جو دلیل اس مطلب پر بیان کی گئی ہے وہ بالکل فاسد ہے۔ لہذا وہ خالق کل مخلوق اور جاعل کل مجعولؑ ہے۔

اسی مطلب کو ہادیانِ اسلام نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ جو ذیل میں مذکور ہوتے ہیں۔ جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے ایک دعا میں یہ تعلیم فرمائی ہے۔ یا ذا الذی کان قبل کل شیئٍ ثم یبقیٰ ویفنیٰ کل شیئٍ۔ (اے وہ کہ جو ہر شے سے پہلے موجود تھا۔ پھر ہر شے کو پیدا کیا۔ پھر وہ خود تو باقی

رہے گا۔ مگر اور تمام چیزیں فنا ہو جائیں گی۔

اور ایک اور حدیث میں جو تقریر امام علی نقی علیہ السلام ہے۔ بیان کیا گیا ہے
ھو مجسم الاجسام ومصور الصور وخالق الاعراض والجواھر ورب کل شیٔ ومالکہ وجاعلہ ومحدثہ۔ وہی جسموں کو جسم بنانے والا ہے اور صورتوں کا پیدا کرنے والا اعراض وجواہر کا خالق ہے اور ہر شے کا پروردگار اور مالک اور بنانے والا اور ایجاد کرنے والا ہے۔

نیز جناب صادق آلِ محمد سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ کلما وقع اسم شیٔ ماخلا اللہ عز وجل فھو مخلوق واللہ خالق کل شیٔ۔ سوائے خدا تعالیٰ کے جس پر بھی لفظ شے کا اطلاق ہو سکتا ہے وہ مخلوق ہے اور خدا تعالیٰ ہر شے کا خالق ہے۔"

نیز صادق آلِ محمدؐ نے بطور دلیل کے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ فلما راینا الخلق منتظما والفلک جاریا والتدبیر واحدا واختلاف اللیل والنہار والشمس والقمر دل صحۃ الامر والتدبیر وایتلاف الامر علی ان المدبر واحد۔ یعنی جب کہ ہم نے دیکھا کہ خلق میں انتظام قائم ہے۔ اور آسمان ایک ہی گردش کر رہا ہے دیا اگر فلک بفتح فا پڑھو۔ تو یہ معنی ہوں گے کہ جس طرح کشتی چلا کرتی تھی۔ اسی طرح اب بھی پانی پر چلتی ہے کوئی اس کا مانع ومزاحم نہیں ہے) اور تدبیر (ان سب میں) ایک ہی ہے۔ رات اور دن۔ سورج اور چاند۔ برابر آتے جاتے ہیں (ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔ جس طرح مقرر ومقدر کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح فوق آسمان سے لے کر تحت زمین تک کی تمام چیزیں ایک ہی نظام پر قائم ہیں) تو اس امر و تدبیر کے صحیح رہنے اور ان تمام کاموں کے باہم متناسب حالت پر قائم رہنے نے بتا دیا کہ مدبر (عالم کا) ایک ہی ہے۔

اس مطلب کو قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ۔ (سورہ رعد) اے ہمارے حبیبؐ کہہ دو کہ "اللہ" ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہی یکتا اور غالب ہے۔"

نیز ایک اور مقام پر فرماتا ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ۔ وہی "اللہ" تمہارا پروردگار ہے۔ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اس کے سوائے کوئی معبود برحق نہیں۔ پس (اے کفار و مشرکین) تم کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔

پھر ایک مقام پر فرمایا ہے۔ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَّ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ کہاں اس کے لئے لڑکی یا لڑکا ہو سکتا ہے حالاں کہ اس کی کوئی بیوی ہی نہیں۔ اور اسی نے ہر چیز کو خلق فرمایا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

نیز فرماتا ہے۔ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ۔ کہہ دو اے رسولؐ کہ کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور پروردگار تلاش کروں۔ حالاں کہ وہی ہر چیز کا پروردگار ہے۔ نیز فرمایا ہے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ آگاہ ہو کہ اسی کے لئے خلق اور امر ہے۔ مبارک ہے اللہ اور وہی تمام جہان کا مالک (یا پالنے والا) ہے۔

نیز فرمایا۔ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ ہر چیز کو پیدا کیا اور اسے باندازۂ معین مقرر کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شے کو ایک اندازہ خاص پہ پیدا کر دیا ہے کہ مثلاً اس قدر طول ہونا چاہیئے۔ اتنا عرض۔ اتنا عمق۔ اتنا وزن۔ ایسا رنگ۔ اتنے عدد۔ ایسی کیفیت۔ ایسا اثر۔ اتنی قوت وغیرہ وغیرہ کہ نہ تو جس سے زیادہ وہ شے ہو سکتی ہے اور نہ کم۔ جس کے لئے جو وقت مقرر کر دیا ہے اسی وقت پر اس کا ظہور ہوگا۔ جس حالت سے جس کے لئے بقا و نشو و نما مقرر کر دیا ہے اسی حالت سے اس میں نشو و نما ہوگا۔ اور اسی مقررہ حالت پر اس کا قیام رہے گا اور ایسا کرنا دلیل اس کی حکمت اور غایت ضبط کی ہے کیوں کہ جس کا کام انضباط اور پابندی کے ساتھ نہیں وہ حکیم نہیں ہے اب کہ تمام کام خدا تعالیٰ کے انضباط کے ساتھ ہیں۔ ان پر ہر معاملہ میں جو اُن سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا ہر ان تجربوں میں جو اُن سے حاصل ہوتے ہیں۔ پورا اعتماد ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہوتا ہے۔ اور اگر

انقباط نہ ہوتا تو کبھی کسی کو تجربہ یا معاملہ پر اطمینان و اعتماد نہ ہو سکتا۔ پھر نظام عالم ہرگز اس طرح منتظم و صحیح و قابل ثنا نہ رہتا۔ جیسا اب ہے۔ البتہ بضرورت کبھی کبھی عمدًا اور بالقصدًا اگر وہ خود کسی تقدیر میں الٹ پلٹ کر دیتا ہے تو اس کا مقصود اظہار اختیار کلی ہے یا کسی حکمت کا اظہار جو اس تبدیلی سے ہونے والا ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

نیز فرماتا ہے قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ ۔ اے رسول پوچھو ان لوگوں سے! کہ کون زمین اور آسمانوں کا مالک (یا پروردگار) ہے کہو کہ "اللہ"۔

پھر ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۔ کیا سوائے اللہ کے کوئی اور بھی خالق (پیدا کرنے والا) ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے (مینہ برسا کر اور دانے اور سبزیاں اگا کر) رزق پہنچاتا ہے۔ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" بس وہی ایک معبود ہے۔ اس کے سوائے کوئی نہیں۔

پھر ایک مقام پر فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ اللہ نے پیدا کیا ہر چلنے والے کو پس بعضے تو پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعضے دو پاؤں پر چلتے ہیں اور بعضے چار پاؤں پر۔ اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہاں تک تو عموم تعلق خلق و ایجاد خدا تعالیٰ کا ہر شے سے ثابت ہوا مگر اس عموم میں دو تین مقام پر بحث کی گئی ہے۔ ایک تو خواص و افعال اشیاء۔ دوسرے افعال قوائے بدنیہ۔ تیسرے افعال اختیاریہ بندوں کے۔ چوتھے بعض وہ اشیاء جن کو کسی آدمی نے بنایا۔ مگر میرے خیال میں ان سب میں بحث بیکار ہے۔ کیونکہ اگرچہ بظاہر اُن افعال و خواص کا صدور ان اشیاء سے ہوتا ہے مگر در اصل اُن قوتوں کا خالق وہی معبود برحق ہے۔ مگر بعض چیزیں تو ان میں سے فاعل موجب ہیں کہ جو طاقت ان میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ اُن سے افعال کا صدور بلا ارادہ و اختیار ہوتا

ہے۔ مثلاً سنکھیا سے۔ چوتھے درجے کی یبوست اور قتل کا ظہور یا دیگر دواؤں سے اُن کے خواص کا ظہور۔ یا عناصر سے اُن کے خاص افعال کا صدور۔ اور بعض فاعل مختار ہیں۔ جیسے حضرتِ انسان و دیگر حیوانات جن میں ارادہ و قدرت بھی ہے۔ ان میں بھی دو قسم کے افعال ہیں ایک افعال طبعیہ مثلاً ہضم طعام۔ نیند۔ بیداری۔ جذب و امساک و دفع وغیرہ۔ اور دوسرے افعال ارادیہ مثل ضرب قتل و کلام و مشی۔ و جلوس و قیام و نظر وغیرہ۔ پس ان افعال کے قوے بھی اگرچہ خدا تعالیٰ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں مگر اُن کے کرنے یا نہ کرنے میں آدمی مختار کیا گیا ہے۔ چاہے کرے اور چاہے نہ کرے۔ اور اسی پر مدار تکلیفات کا قرار دیا گیا ہے۔ دیکھو کہ نباتات و جمادات اور سوائے انسان کے دیگر حیوانات کی طرف تکلیف شرعی متوجہ نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اُن کے افعال طبعیہ ہیں۔ اور بعض جو ارادی ہیں۔ وہ بھی صرف وہی جو ان کی نوع یا شخص کے بقا کے لئے ضروری ہیں۔ بخلاف انسان کے کہ اس میں اس طرح کے افعال کے بھی قوے پیدا کئے گئے ہیں اور اُن افعال کے بھی جن پر علاوہ بقائے نوع یا شخص کے فائدہ تمدن بھی ہے۔ جنہیں وہ اپنے ارادے سے کر سکتا یا چھوڑ سکتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی۔ تو تکلیفات شرعیہ کا تعلق اس سے بیکار ثابت ہوتا۔ حالاں کہ خدا تعالیٰ کا کوئی کام۔ یا حکم عبث نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ حکیم مطلق اور مصلح نظام ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ افعال ارادیہ کا فاعل خود انسان ہے۔ البتہ اُن کے آلات و قویٰ مخلوق خدا ہیں۔ لیکن اُن میں دونوں جہتیں موجود ہیں خواہ انہیں استعمال میں لاؤ یا نہ لاؤ اور اگر استعمال میں لاؤ تو یا اچھی طرح۔ یا بُری طرح۔ جس سے تین صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً قوت بصارت خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے اور محل قوت بصارت بھی بنا دیا ہے۔ اب چاہے تو آدمی انہیں معطل رکھے اور آنکھیں بند کئے رہے۔ یا چاہے تو اس سے عالم کی چیزوں کو دیکھے اور دیکھنے میں بھی چاہے بطور حرام دیکھے یا بطور حلال۔ یہ اُسے اختیار دیا گیا ہے۔ تاکہ تعلق تکلیف اور مسئلہ عذاب

وثواب وخلق جنت ونار۔ وارسال رسل اور انزالِ کتب۔ بیکار اور عبث نہ ہو۔ ورنہ اگر یہ مان لیا جائے کہ ان افعال اختیاریہ کا فاعل بھی خدا تعالیٰ ہی ہے تو انسان کے پاس رسولوں کو ہدایت کے لئے کیوں بھیجا۔ کتابیں کیوں نازل فرمائیں۔ جنت و دوزخ کیوں پیدا کئے۔ عذاب ثواب کیوں مقرر فرمائے۔ کیا کوئی عقل سلیم اور دماغ صحیح اور ذہن مستقیم اس بات کو جائز سمجھ سکتا ہے کہ خود پروردگار ہی کسی کو کسی بندے کے ہاتھ سے قتل کرے اور پھر اس پر جس کے ہاتھ سے کسی کو قتل کیا ہے مورد عذاب بھی قرار دے۔ یا خود ہی کسی بندے کے ہاتھ سے کسی کو خیرات وصدقہ دے اور پھر اسے ثواب بھی دے۔ جس کے ہاتھ سے صدقہ دیا ہے۔ اگر ایسا مان لیا جائے گا تو خدا تعالیٰ سخت ظالم یا بے عقل ثابت ہوگا۔ ونعوذ باللہ من ذالک۔

جو لوگ کہ خدا تعالیٰ کو بندوں کے ارادی افعال کا بھی خالق اور فاعل مانتے ہیں انہیں دوبارہ اس مسئلہ پر نظر کرنی چاہیے۔ واللہ الہادی۔

چودھواں باب

کلام خدا تعالیٰ کے بیان میں

چند مقام پر قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے اپنے لئے یہ صفت بیان کی ہے منجلہ ان کے ایک مقام یہ ہے کہ فرمایا۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا جیسا چاہیے۔ اس آیت میں اُس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ جو جناب موسیٰ علی نبینا و علیہ السلام کو مدین سے واپس آتے ہوئے راہ میں پیش آیا تھا۔ جب کہ اُن کو سردی کی وجہ سے آگ کی ضرورت ہوئی اور دُور سے اُن کو روشنی دکھائی دی تو اپنی اہلیہ سے فرمایا۔ اِمْكُثُوْا اِنِّيْ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى۔" مگر جب وادیٔ ایمن میں پہنچے تو آواز آئی کہ یا مُوْسٰى اِنِّيْ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى۔ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى۔ (سورہ طٰہٰ) اسی کو خدا تعالیٰ نے سورہ نساء میں ذکر انبیاء کے ذیل میں فرمایا ہے۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ "ہم نے ایسے بھی پیغامبر بھیجے ہیں جن کے حالات تم سے بیان کر دیئے اور ایسے بھی رسول بھیجے۔ جن کا ذکر تم سے نہیں کیا اور اللہ نے موسیٰ سے خوب باتیں کیں۔" اور ایک اور مقام پر فرمایا ہے۔ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ۔ اور جب کہ موسیٰ ہماری میقات پر آئے اور اُن سے اُن کے رب نے کلام کیا۔

پھر ایک اور مقام پر فرمایا ہے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ۔ "نہیں ہے کسی آدمی کے لئے یہ بات کہ اُس سے خدا تعالیٰ کلام کرے مگر بذریعہ وحی کے یا غائبانہ طور پر۔"

پھر ایک اور مقام پر فرمایا ہے۔ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ

لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔ اے ہمارے رسول کہہ دو کہ اگر سمندر بھی میرے رب کے کلمات کے لئے روشنائی بن جائے تو سمندر تمام ہو جائے گا۔ مگر میرے رب کے کلمات تمام نہ ہوں گے۔ اگرچہ ہم اس سمندر کی مدد کے لئے اور سمندر بھی لائیں۔

حاصل یہ کہ کتاب خدا سے اُس کا متکلم ہونا ثابت ہے اور انبیاء علیہم السلام کا اجماع بھی اسی بات پر ہے کہ خدا تعالیٰ نے کلام کیا۔ کیونکہ ان بزرگواروں نے اپنے کلام میں فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ حکم دیا اور اُس شے سے منع فرمایا اور یہ وحی کہ۔ وغیرہ وغیرہ۔ جو از قبیل کلام ہیں اور عقل بھی حاکم ہے کہ خدا تعالیٰ کو متکلم ہونا چاہیئے۔ کیونکہ کلام کرنا بھی اک صفت کمال ہے اور اس کا نہ ہونا کسی شخص میں عیب و نقص ہے۔ پس جب کہ ذات باری تعالیٰ عیب و نقص سے بری ہے۔ تو کیوں کر غیر متکلم ہوگا۔ لامحالہ اس کو متکلم ماننا پڑے گا۔ وہو المقصود۔ مگر جھگڑا ہے تو صرف یہ کہ آیا صفت کلام خدا تعالیٰ کی صفت حادثہ ہے یا قدیمہ۔ اہل اسلام نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے۔ اشاعرہ (فرقہ کا نام) کا تو مسلک ہے کہ کلام خدا تعالیٰ کا کلام نفسی ہے۔ یعنی نہ وہ حروف کی قسم میں سے اور نہ آواز کی قسم سے بلکہ ایک ازلی صفت ہے جو ذات پروردگار عالم میں قائم ہے اور اس کلام نفسی پر کلام لفظی دلالت کرتا ہے۔ جس قسم کے لفظ سے چاہتا ہے اسے ادا کرتا ہے۔ کبھی عربی الفاظ میں اور کبھی عبرانی میں کبھی سریانی میں وغیرہا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ اور حنابلہ کا یہ مذہب ہے کہ یہی آواز اور حروف حادثہ جو زبان سے ادا ہوتے ہیں اور ہوا کی مدد سے قائم ہوتے ہیں ازلی ہیں اور ذات خدا تعالیٰ میں قائم ہیں۔ صاحب شرح مقاصد ملا سعد الدین تفتازانی فرماتے ہیں۔ قالت الحنابلة والحشوية ان تلك الاصوات والحروف مع توالیها وترتب بعضها علی البعض وکون الحرف الثانی من کل کلمة مسبوقا بالحرف المتقدمة علیه کانت ثابتةً فی الازل قائمة بذات الباری تعالیٰ

وتقدس وان المسموع من اصوات القراء والمرئی من اسطر الکتاب نفس کلام الله تعالی القدیمة۔ اس رائے کی غلطی اس سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ ذات پروردگار عالم کو محل حوادث بناتے ہیں۔ کیونکہ جب یہ کلام و آواز و حروف حادثہ ذات خدا تعالی میں قائم ہوئے تو اس کا تغیر اور محل حوادث ہونا لازم آیا جو محال ہے۔ علاوہ اس کے خود صاحب شرح مقاصد نے ان لوگوں کی رائے کی غلطی کے اظہار میں فرما دیا ہے کہ کفی شاہدا علی جہلہم ما نقل عن بعضہم ان الجلد الغلاف ازلیان وعن بعضہم الجسم الذی کتب بہ القرآن فانتظم حروفاً ورقوماً... ہو بعینہ کلام الله تعالی وقد صار قدیما بعد ما کان حادثا۔ انتہیٰ

اور کرامیہ کی یہ رائے ہے کہ یہی حروف منتظمہ مسموعہ باوجود اپنے حدوث کے قائم بذات خدا تعالی ہیں۔ مگر اُن کا نام کلام نہیں ہے۔ بلکہ ان حروف کو قول خدا کہتے ہیں۔ اور کلام کے معنی "قدرت تکلم" کے بتاتے ہیں اور قدرت تکلم کو قدیم کہتے ہیں۔

اس رائے کے پہلے جزو میں تو وہی غلطی ہے جو رائے حنابلہ میں تھی اور دوسرے جزو کی غلطی آئندہ معلوم ہوگی۔

چوتھا مسلک امامیہ اثنا عشریہ کا ہے۔ جو ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کا تعلیم فرمایا ہُوا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالی متکلم ہے۔ اس اعتبار سے کہ جس جسم کے اندر چاہتا ہے آواز پیدا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ سے کلام کرتے وقت درخت سے آواز پیدا کر دی۔ چنانچہ آیت قرآنیہ اس پر شاہد موجود ہے۔

اور ایک صفت حادثہ ہے۔ جسے پروردگار عالم جب چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے، اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ صفات الٰہیہ تین قسم کی ہیں۔ ایک حقیقۃ محضہ جیسے وجوب وجود۔ حیاۃ وغیرہ۔ دوسری حقیقۃ ذات الاضافۃ۔ جیسے قدرت۔ علم وغیرہ۔ تیسری اضافیہ محضہ۔ جیسے خلق۔ رزق وغیرہ۔ ان میں دو قسمیں تو عین ذات باری تعالی ہیں اور تیسری قسم صرف اضافت ہے نہ عین ذات جس کا حدوث محال ہو۔ اور ہم اُسے ذات خدا تعالی میں قائم بھی نہیں مانتے۔ جس سے پروردگار عالم

کا محل حوادث ہونا لازم آئے۔ بلکہ اس کا تکلم صرف اسی قدر ہے کہ جس چیز کو چاہتا ہے متکلم کر دیتا ہے۔ نہ یہ کہ خود بولتا ہے یا کلام اس کی ذات میں قائم ہے۔

اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ دعاوے سابقہ باطل ہیں اور جب وہ باطل ہوئے تو اُن کا مخالف قول ضرور صحیح ہوگا۔ کیونکہ مطلقاً صفت تکلم تو ثابت ہے صرف بحث اس کے اقسام میں ہے۔ پس جب ایک قسم باطل ہوئی تو دوسری قسم قطعاً صحیح ہوگی ورنہ ارتفاع اصل صفت لازم آئے گا۔ ولا قائل بالثالث فثبت المطلوب۔ توضیح اس کی یوں ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی صفت تکلم قدیم ہو اور اس کی ذات میں قائم ہو تو چاہیئے کہ پروردگار عالم ازل ہی میں آمر، ناہی، مخبر ہوگا (یعنی حکم کرنے والا، منع کرنے والا، خبر دینے والا ہوگا) حالاں کہ ازل میں کوئی مامور ہی نہ تھا جس کو امر کیا جاتا۔ کوئی منہی نہ تھا۔ جس کو نہی کی جاتی۔ کوئی مخبر نہ تھا۔ جو سنتا اور اسے خبر کی جاتی۔ تو لغویت اس صفت کی لازم آتی۔ حالاں کہ ذات خدا تعالیٰ لغو یہ سے بری و منزّہ ہے۔

دوسری یہ کہ اگر اس صفت کو خدا تعالیٰ میں قائم مانیں اور قدیم بھی سمجھیں۔ تو اس میں کئی خرابیاں لازم آئیں گی۔ ایک تو کئی قدیم کا ہونا جو محال ہے۔ دوسرے محتاج ہونا ذات باری تعالیٰ کا اپنی غیر ذات کی طرف۔ اور یہ بھی محال ہے لہذا اس صفت کا قدیم یا قائم بذاتِ خُدا ہونا بھی محال ہے۔

تیسرے یہ کہ اگر کلام نفسی حق ہو تو لامحالہ بسیط ہوگا۔ اور یہ بات عقلاً ثابت ہے کہ بسیط چیز کی تقسیم اقسام متضادہ کی طرف نہیں ہو سکتی۔ حالاں کہ کلام خدا تعالیٰ امر، نہی، اخبار اور انشا وغیرہ متضاد و متخالف اقسام کی طرف منقسم ہے۔

چوتھے۔ اگر کلام نفسی کی رائے صحیح ہو تو چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کا یہ کلام کہ "اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوْحًا" غلط ہو۔ کیوں کہ ارسال نوح پیغمبر زمانۂ متاخرہ میں ہوا۔ اور جس وقت سے یہ کلام ہے اس وقت نوح کا وجود خارجی نہ تھا۔ ارسال کجا پھر کے خدا نے بھیجا جسے فرمایا کہ اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوْحًا۔

پانچویں یہ کہ کلام کا اطلاق عرف اور لغت دونوں ہی میں حقیقۃً اُسی پر ہوتا ہے جو مرکب ہے حروف و آواز سے۔ نہ محض مفہوم لفظ۔ پس محض مفہوم الفاظ کو کلام کہنا اور اسے قدیم بتانا دلیل کا طالب ہے اور بغیر دلیل کے قابل سماعت نہیں۔

چھٹے یہ کہ کلام اور سکوت دونوں آپس میں ضد ہیں۔ جب سکوت ہوگا۔ تو کلام نہ ہوگا۔ اور جب کلام ہوگا تو سکوت نہ ہوگا۔ حالاں کہ کلام نفسی اور سکوت دونوں ایک مقام پر جمع ہو رہے ہیں۔ کیوں کہ ازل میں کوئی متکلّم نہ تھا جس کی طرف توجہ کلام ہوسکتی۔ پس لامحالہ سکوت تھا۔ ہاں اگر سکوت کی بھی دو قسمیں کہہ لی جائیں تو پھر اس اعتراض کا جواب ممکن ہے لیکن یہ تقسیم بھی نعیق غراب البین سے زیادہ وقعت نہ رکھے گی۔

ساتویں یہ کہ اگر کلام نفسی ثابت ہو اور جیسا کہا گیا ہے قدیم بھی ہو تو لامحالہ ازلی و ابدی ہوگا۔ پس لازم آئے گا کہ قیامت میں اور اس کے بعد بھی بندگانِ خُدا مکلف اور مخاطب بخطاب اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِهَادِہٖ وغیرہ ہوں۔ حالاں کہ یہ امر اجماعاً باطل ہے۔

اور جب ان دلیلوں سے کلام نفسی کا بطلان ثابت ہوگیا تو لامحالہ خُدا تعالیٰ متکلّم بکلام لفظی ہوگا۔ کیوں کہ تیسری قسم کا کوئی قائل نہیں اور نہ ممکن ہی ہے اور از بس کہ ذات باری تعالیٰ محل حوادث نہیں ہوسکتی۔ پس لامحالہ یہ کلام اس کی ذات میں بھی قائم ہوگا بلکہ تکلّم اس وقت صرف اسی معنی سے ہوگا۔ جو سابقاً بیان کیا گیا کہ جس شے میں چاہتا ہے پروردگار عالم کلام کو پیدا کر دیتا ہے اور یہی مقصود ہے اور باقی مردود۔

ابو بصیر راوی ہیں کہ میں نے جناب صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا کہ لم یزل اللّٰہ عالماً بذاتہ ولامعلوم ولم یزل قادراً بذاتہ ولامقدور۔ خدا تعالیٰ ازل سے بذاتہ عالم تھا جب کہ کوئی معلوم موجود نہ تھا۔ اور ازل سے بذاتہ

قادر تھا جب کہ کوئی مقدور موجود نہ تھا۔" تو میں نے عرض کی کہ میں آپ پر فدا ہوں
فلم یزل متکلما" کیا وہ ازل سے متکلم بھی ہے؟ آپ نے فرمایا۔ الکلام محدث
کان اللہ عزوجل ولیس بمتکلم ثم احدث الکلام۔ کلام ایک حادث چیز
ہے۔ خدا تعالیٰ عزوجل ازل سے موجود ہے مگر ازل سے متکلم نہیں تھا۔ (کیونکہ
عبثیہ اور لغویت کلام کی لازم آئے گی) پھر اس نے کلام کو حادث کیا۔

(توحید بحار)

پندرھواں باب
اسمائے خدا تعالیٰ کے بیان میں

جو اسمائے پروردگار عالم کہ قرآن مجید میں مذکور ہیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اَللّٰہُ ۲۔ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ ۳۔ اَلرَّحْمٰنِ ۴۔ اَلرَّحِیْمِ ۵۔ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ (سورہ فاتحہ) اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں ۶۔ غَفُوْرٌ ۷۔ عَلِیْمٌ۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (سورہ بقر) وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ میں (سورہ بقرہ) ۸۔ سَرِیْعُ الْحِسَابِ۔ وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ میں ۹۔ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (سورہ بقر) ۱۰۔ رَءُوْفٌ۔ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ میں۔ ۱۱ عَزِیْزٌ ۱۲۔ حَکِیْمٌ۔ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ میں (سورہ بقر) ۱۳۔ حَلِیْمٌ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ میں۔ ۱۴۔ سَمِیْعٌ ۱۵۔ عَلِیْمٌ۔ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ میں۔ ۱۶۔ بَصِیْرٌ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ میں۔ ۱۷۔ خَبِیْرٌ۔ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا میں۔ ۱۸۔ وَاسِعٌ۔ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ میں۔ ۱۹۔ عَلِیٌّ۔ ۲۰۔ عَظِیْمٌ۔ وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ میں۔ ۲۱۔ اَلْحَیُّ ۲۲۔ اَلْقَیُّوْمُ۔ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ میں۔ ۲۳۔ غَنِیٌّ ۲۴۔ حَمِیْدٌ۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ میں۔ ۲۵۔ قَدِیْرٌ۔ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں (سورہ بقر) ۲۶۔ وَھَّابٌ۔ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ میں (سورہ آل عمران) ۲۷۔ رَقِیْبٌ۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا ۲۸۔ حَسِیْبٌ۔ کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا میں۔ ۲۹۔ تَوَّابٌ۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا میں۔ ۳۰۔ کَبِیْرٌ۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا میں۔ ۳۱۔ عَفُوٌّ۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا میں۔ ۳۲۔ وَلِیٌّ ۳۳۔ نَصِیْرًا وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا وَّکَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیْرًا میں ۳۴۔ شَھِیْدٌ۔ کَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا میں۔ ۳۵۔ وَکِیْلٌ۔ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا میں۔ ۳۶۔ مُقِیْتٌ۔ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا میں۔ ۳۷۔ شَاکِرًا۔ وَکَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا عَلِیْمًا میں (سورہ نسا) ۳۸۔ خَبِیْرٌ

الحاکمین ۳۹۔ وھو خیر الحاکمین (سورہ اعراف) ۴۰۔ خیر الفاتحین۔ وانت خیر الفاتحین میں (سورہ اعراف) ۴۱۔ قوی۔ ان اللہ قوی شدید العقاب میں (سورہ انفال) ۴۲۔ خیر الحاکمین (سورہ یونس) ۴۳۔ الواحد۔ ۴۴۔ القہار۔ الواحد القہار۔ (سورہ یوسف) ۴۵۔ حافظ ۴۶۔ ارحم الراحمین۔ فاللہ خیر حافظا وھو ارحم الراحمین میں (سورہ یوسف) ۴۷۔ شدید المحال۔ وھو شدید المحال۔ (سورہ رعد) ۴۸۔ الملک ۴۹۔ الحق۔ فتعالی اللہ الملک الحق میں (طٰہٰ) ۵۰۔ المبین۔ ویعلمون ان اللہ ھو الحق المبین میں (سورہ نور) ۵۱۔ رزاق ۵۲۔ ذوالقوۃ ۵۳۔ متین۔ ان اللہ ھو الرزاق ذوالقوۃ المتین ۵۴۔ ذوالجلال والاکرام (سورہ رحمٰن) ۵۵۔ عالم الغیب والشھادۃ۔ ۵۶۔ قدوس۔ ۵۷۔ سلام ۵۸۔ مومن۔ ۵۹۔ مھیمن ۶۰۔ جبار۔ ۶۱۔ متکبر۔ ۶۲۔ خالق۔ ۶۳۔ باری۔ ۶۴۔ مصور۔ ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون ھو اللہ الخالق الباری المصور لہ الاسماء الحسنیٰ یسبح لہ ما فی السمٰوٰت والارض وھو العزیز الحکیم میں (سورہ حشر) ۶۵۔ خیر الرازقین۔ واللہ خیر الرازقین میں (سورہ جمعہ) ۶۶۔ صمد۔ اللہ الصمد (سورہ توحید) ۶۷۔ لطیف۔ اللطیف الخبیر میں۔ ۶۸۔ خالق۔ ۶۹۔ نور۔ اللہ نور السمٰوٰت والارض میں (سورہ نور) ۷۰۔ محیط۔ واللہ بما تعملون محیط۔ ۷۱۔ متعال عالم الغیب والشھادۃ الکبیر المتعال۔ ۷۲۔ بدیع۔ بدیع السمٰوٰت و الارض میں ۷۳۔ ذوالفضل۔ اور علی ہذا القیاس اور اسمائے باری تعالیٰ ہیں۔ ان اسمائے کریمہ کے معانی جو صدوق علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب توحید میں تحریر فرمائے ملخصاً لکھے جاتے ہیں اور وہ ننانوے اسم ہیں۔ ان میں بعض وہ اسماء بھی ہیں جو قرآن مجید میں صراحۃً نہیں آئے ہیں۔ اللہ۔ الالٰہ۔ مستحق عبادت۔ جس کے سوا کسی اور کے لئے عبادت کرنی جائز نہیں۔ الواحد۔ جس کا کوئی نظیر نہ ہو۔ یکتا جس کے ساتھ دوسرا نہ ہو۔ جو شمار عدد میں نہ آسکے۔ صمد۔ سید (سردار) جس کی طرف لوگوں

کو احتیاج ہو۔ جو جسم نہ رکھتا ہو۔ اَحَدٌ ایسا واحد ذاتی جس کے لئے نہ اجزا ہوں نہ اعضاء نہ وہ شمار عدد میں آسکے اور نہ اس پر اختلاف حالات طاری ہو سکے اَلْاَوَّلُ الْاٰخِرُ۔ ایسا اوّل جس کی ابتداء نہ ہو اور آخر یعنی جس کی انتہا اور حد نہ ہو سَمِیْعٌ دعا کا قبول کرنے والا۔ آواز کا علم اسی طرح بغیر کان کے رکھنے والا جس طرح کان والے محسوس کرتے ہیں۔ بَصِیْرٌ مبصرات کا ادراک کرنے والا۔ اس طرح دیدنی چیزوں کا ادراک کرنے والا۔ جس طرح آنکھ والے محسوس کرتے ہیں۔ حالاں کہ اس کے لئے آنکھ نہیں ہے۔ قَدِیْرٌ۔ قَاھِرٌ۔ وہ ایسا ہے کہ ہر شے اس کے قبضہ اختیار میں ہے۔ کوئی چیز اس کے نزدیک ناممکن نہیں ہے (بشرطیکہ خود وہ شے محال عقلی نہ ہو۔ جیسا کہ سابق میں بیان کیا گیا) عَلِیٌّ۔ غالب۔ صاحب قدرت۔ غلبہ اَلْبَاقِی موجود بلا حدوث وفنا۔ یعنی نہ جو اپنے وجود سے پہلے معدوم تھا۔ اور نہ اس کے بعد معدوم ہوگا۔ اَلْبَدِیْعُ۔ اشیاء کا پیدا کرنے والا۔ بغیر اس کے کہ ان کی کوئی مثال یا نمونہ اپنے سامنے رکھتا ہو۔ اَلْبَارِئُ خلق کا پیدا کرنے والا۔ اَلْاَکْرَام۔ کریم۔ کرم والا۔ اَلظَّاھِرُ۔ جس کی نشانیاں ظاہر ہیں۔ جس کے وجود کے شواہد اور جس کی حکمت کے آثار روشن ہیں۔ اَلْبَاطِنُ جسے کوئی وہم وخیال ادراک نہ کر سکے۔ اَلْحَیُّ فعال۔ مدبّر جس کے لئے موت وفنا نہیں اس کی حیات عین ذات ہے۔ اَلْحَکِیْمُ عالم۔ علم والا۔ عَلِیْمٌ ہر ظاہر اور پوشیدہ امور کو جاننے والا۔ جس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ حَلِیْمٌ گناہ گاروں پر عذاب کرنے میں جلدی نہیں کرتا۔ صفت علم کام میں لاتا ہے۔ حَفِیْظٌ۔ حفاظت کرنے والا ہر شے کا۔ اور اس سے بلا کو دور کرنے والا حَقٌّ۔ مُحِقٌّ اور یہ کہ اسی کی عبادت کرنی درست ہے کسی اور کی عبادت کرنی باطل ہے۔ اَلْحَسِیْبُ۔ ہر شے کا علم رکھنے والا۔ بندوں کے اعمال کا حساب لینے والا اور ان کے اعمال کے مطابق جزا دینے والا۔ کفایت ومدد کرنے والا۔ حَمِیْدٌ قابل ستائش وتعریف۔ حَفِیٌّ عالم۔ لطیف۔ رَبٌّ۔ مالک۔ رَحْمٰنٌ۔ جس کی رحمت اپنے بندوں پر بہت وسیع ہے۔ یہ نام بھی مثل لفظ اللہ کے ذات خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص

ہے کسی اور کو رحمٰن نہیں کہہ سکتے۔ رَحِیْمٌ۔ ایمان والوں پر رحم کرنے والا۔ نعمت دینے والا۔ خَالِقٌ۔ پیدا کرنے والا۔ رَزَّاقٌ۔ ہر نیک و بد کو روزی پہنچانے والا۔ رَقِیْبٌ۔ حفاظت کرنے والا۔ نگہبان۔ رَءُوْفٌ۔ رحم والا۔ رَائِی۔ عالم۔ مبصرات کو جاننے والا۔ سَلَامٌ۔ مُسلِم۔ مُؤْمِنٌ۔ اپنے وعدوں کا پورا کرنے والا۔ اپنے قول کو سچا کر کے دکھانے والا۔ وحدانیت کو ثابت کرنے والا۔ آیات و آثارِ قدرت کے ذریعے سے۔ مُھَیْمِنٌ۔ شاہد و حاضر (جو ہر شے کا ناظر ہے اور کوئی جگہ اس سے خالی نہیں) اَمِیْنٌ (امن دینے والا) عَزِیْزٌ۔ ہر شے پر غالب۔ جسے کوئی شے عاجز نہ کر سکے اور نہ اس کے اختیار سے کوئی شے باہر ہو۔ جَبَّارٌ۔ غالب۔ جس پر دست رس نہ ہو۔ صاحبِ عظمت۔ اَلْمُتَکَبِّرُ صاحبِ عظمت و بزرگی۔ سَیِّدٌ۔ مَلِک (بادشاہ) بادشاہ واجب الاطاعت۔ سُبُّوْحٌ۔ پاک (ہر عیب و نقص سے مبرّا) شَاهِدٌ۔ ہر جگہ موجود۔ مُدبّر۔ صانع۔ صَادِقٌ۔ اپنے وعدوں کو پورا کرنے والا۔ صَانِعٌ۔ ہر مصنوع کا بنانے والا۔ ہر مخلوق کا پیدا کرنے والا۔ طَاهِرٌ۔ جس کی کوئی مثال نہیں۔ جو شریک و ضد و زوال و انتقال سے پاک و مبرّا ہے جو امکانی تمام صفتوں سے منزہ ہے۔ عَدْلٌ۔ منصف۔ فیصلہ میں عدالت سے کام کرنے والا۔ عَفُوٌّ۔ گناہوں کا معاف کرنے والا۔ مٹا دینے والا۔ غَفُوْرٌ۔ اپنے بندوں کو اپنی رحمت سے ڈھانک لینے والا۔ گناہوں کا بخشنے والا۔ غَنِیٌّ۔ جسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ جس کو کسی شے کی حاجت نہیں۔ غِیَاثٌ۔ فریاد رس۔ فَاطِرٌ۔ خالق پیدا کرنے والا۔ موجد۔ فَرْدٌ۔ جو حکم و ربوبیۃ میں یکتا ہے۔ اُس کا سا کوئی نہیں۔ وہ اپنی ہستی میں فرد ہے۔ فَتَّاحٌ۔ حاکم۔ فَالِقٌ۔ نرالا۔ اپنے مخلوقات سے بالکل مشابہ نہیں شگافتہ کرنے والا (مثلاً دانوں کو شگافتہ کر کے نباتات کو پیدا کرنے والا) قَدِیْمٌ۔ ہر چیز سے پہلے۔ جس سے پہلے کوئی شے نہیں۔ نہ اُس کی ابتدا کے لئے کوئی حد ہے نہ انتہا کے لئے۔ مَلِکٌ۔ ملک کا مالک۔ (تمام جہان کا مالک) قُدُّوْسٌ۔ پاک۔ طاہر۔ تمام نقص و عیب سے بری۔ قَوِیٌّ۔ صاحبِ قوت۔ بلا مدد۔ اور بلا زحمت کام کرنے والا۔ قَرِیْبٌ۔ دعاؤں کو قبول کرنے والا۔ دلوں کے وساوس و خطرات

کو جاننے والا۔ قَیُّوْمٌ۔ خود جہان کو پیدا کرنے والا۔ اُس کی حفاظت و اصلاح کرنے والا۔ قَابِضٌ۔ مالک۔ جانوں کا قبض کرنے والا۔ بَاسِطٌ۔ نعمت دینے والا فضل کرنے والا۔ قَاضِیٌ۔ حکم جاری کرنے والا۔ مالک قضا و قدر۔ مَجِیْدٌ۔ کریم۔ عزیز صاحب عظمت و بزرگی۔ مَوْلٰی۔ مددگار۔ ایمان والوں کو نصرت دینے والا۔ سب سے زیادہ سب کی جانوں پر اختیار رکھنے والا۔ مَنَّانٌ۔ عطا کرنے والا۔ نعمت دینے والا۔ مُحِیْطٌ ہر شے کا عالم۔ جس سے کوئی شے غائب اور دُور نہیں۔ غالب۔ مقتدر۔ مُبِیْنٌ ظاہر جس کی حکمتیں نمایاں ہیں۔ اپنے وجود کو اپنے آثار و قدرت سے ظاہر کرنے والا۔ اَلْمُقِیْتُ۔ حافظ۔ حفاظت کرنے والا۔ نگہبان۔ مُصَوِّرٌ۔ صورتوں کا بنانے والا۔ ہر صورت کا پیدا کرنے والا۔ کَرِیْمٌ۔ عزیز۔ غالب۔ جواد۔ فضل کرنے والا۔ کَبِیْرٌ۔ صاحب عظمت سید۔ سردار۔ کَافِیٌ۔ مدد کرنے والا۔ جو اس پر بھروسا کرے اُسے کسی کا محتاج نہیں کرتا۔ کَاشِفٌ۔ کرب و تکلیفات کو دور کرنے والا۔ وَتْرٌ۔ فرد۔ یکتا۔ نُوْرٌ۔ روشن کرنے والا۔ تمام جہاں میں روشنی کرنے والا۔ وَهَّابٌ۔ دینے والا۔ بخشنے والا۔ نَاصِرٌ۔ مددگار۔ وَاسِعٌ۔ غنی بے نیاز۔ وَدُوْدٌ۔ اپنے نیک بندوں کو دوست رکھنے والا۔ هَادِیٌ۔ حق کی طرف رہنمائی کرنے والا۔ وَفِیٌّ۔ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا۔ وَکِیْلٌ۔ خود اپنے بندوں کی حفاظت کرنے والا۔ معتمد علیہ۔ وَارِثٌ۔ جو کچھ خدا تعالیٰ نے کسی کو دیا ہے۔ ان سب چیزوں کا مالک۔ کیوں کہ سوائے اس کے تمام وہ لوگ جو کسی شے کے مالک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں فنا ہو جائیں گے بس ایک وہی باقی رہے گا۔ اَلْبَرُّ۔ صادق۔ سچا۔ بَاعِثٌ۔ قبروں سے بروز قیامت مُردوں کو اٹھانے والا۔ زندہ کرنے والا۔ تَوَّابٌ۔ توبہ قبول کرنے والا۔ گناہوں کو معاف کرنے والا۔ جَلِیْلٌ۔ صاحب عظمت و بزرگی۔ جَوَّادٌ۔ احسان کرنے والا۔ نعمت دینے والا۔ خَبِیْرٌ۔ خبر رکھنے والا۔ ہر شے کا جاننے والا۔ خَالِقٌ۔ پیدا کرنے والا خلائق کا۔ شَکُوْرٌ۔ بندوں کے عمل کو قبول کرنے والا۔ اور انہیں نیک بدلہ دینے والا۔ خَیْرُ النَّاصِرِیْنَ خیر کرنے والا۔ وہی فاعل خیر ہے۔ دَیَّانٌ بندوں کو اُن

کے اعمال کا بدلہ دینے والا۔ عَظِیمٌ۔ صاحب جلالت وعظمت۔ جس کے سوائے باقی تمام مخلوقات سب ذلیل وخاضع ہے۔ غالب۔ قادر۔ لطیف۔ بندوں پر مہربانی کرنے والا اُن کو نعمت دینے والا۔ اُن کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے والا۔ شَافِیٌ۔ بیماری کو دُور کرنے والا صحت بخشنے والا۔ تَبَارَکَ۔ صاحب برکت۔ برکت دینے والا۔ اپنی مخلوقات میں برکت پیدا کرنے والا۔

یہ معانی جو بیان کئے گئے ان کے علاوہ علمائے شیعہ وسُنّی نے اور بھی بیان کئے ہیں بلکہ مستقل رسالے ان اسمائے کریمہ کی شرح میں لکھے ہیں۔ جن کا اس موقع پر بیان کرنا باعثِ طول ہے۔ اس لئے اسی مقدار پہ اکتفا کی جاتی ہے۔

سولھواں باب

باب جوامع توحید

جوامع توحید سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید میں علاوہ مذکورہ بالا آیتوں کے جو توحید الٰہی کے متعلق خاص خاص امور کو ثابت کر رہی تھیں۔ ایسی بھی بہت سی آیتیں ہیں۔ جو اس مضمون کے کئی کئی امروں کو معًا بیان کرتی ہیں۔ ان آیتوں میں وہ توصیف الٰہی مُندرج ہے۔ جو آج تک دُنیا کی کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ جن کی بابت آسمانی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ یہ آیتیں انسان کے لئے کامل رُوحانی تعلیمیں ہیں کہ وُہ اپنے معبود حقیقی کو کیسا سمجھیں اور کیا سمجھ کر اُس کی حمد و ثنا اور عبادت کریں۔ ان آیتوں کو سُن کر انسان کے دل میں اپنے حقیقی معبود کی عظمت و جلالت قائم ہوتی ہے۔ اور انہیں کو دیکھ کر اس کے دل کو سچّا میلان اپنے صانع و منعم کی طرف پیدا ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص غلطی سے یہ سمجھے کہ اپنی معرفت آپ کرنی کیسی؟ خدا تعالےٰ نے کیوں اپنی ہی حمد و ثنا کی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اپنی تعریف آپ کرنی دو غرض سے ہُوا کرتی ہے۔ ایک بغرض تنبیہ و تعلیم کے اور دوسرے بغرض جلب نفع یا اظہار نخوت کے۔ تو از بس کہ انسان خاکی بسبب اپنے بُعد اور اشتغال امور دنیاوی کے یا اُس سبب سے کہ مواد جسمانیہ میں ڈوبا ہُوا ہے۔ خود بخود ساحت معرفت الٰہیہ تک نہیں پہنچ سکتا اور اس کی معرفت کاملہ حاصل نہیں کر سکتا۔ حالاں کہ بسبب عقل پانے کے تحصیل معرفت اپنے معبود کی اس کے ذمّے فرض ہے تاکہ اس کے ذریعے سے اپنے معبود سے محبت پیدا کر سکے۔ اور اس کی عبادت کی طرف اسے دلی رغبت ہو۔ لہٰذا ضرور ہُوا کہ خود معبود ہی اُسے اپنے اوصاف و کمالات کی تفہیم و تعلیم کردے۔ تاکہ ان کی معرفت کے بعد ہم اس کی یاد کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ جس کا نفع خاص ہماری ہی طرف متوجہ ہے۔ نہ اُس کی طرف۔ کیونکہ وہ تمام عالم سے مستغنی ہے۔ مگر یہ اس کے انتہا درجے کی رأفت و رحمت ہے کہ باوجود اپنے استغنا کے ہم کو ہمارے فائدوں کی جانب راہنمائی

کرتا ہے۔

اس تعریف وحمد میں کسی قسم کی بداخلاقی نہیں۔ بلکہ یہ عین حسن اخلاق ہے۔ کیوں کہ اس کی غرض افادہ عامہ ہے اور اگر بالغرض اظہار بھی مقصود ہو۔ تو اُس کی جناب میں یہ کچھ نازیبا بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ اس سے بڑا کون ہے۔ جس کے مقابلے میں اُسے انکسار و تواضع کرنا مناسب ہو۔ وہ تو بالکل متفرد و یکتا ولاشریک وبے مثل ہے۔ اگر وہ اپنی حد کی ثنا وصفت کرے۔ تب بھی اس کے لئے زیبا ہے۔ ہاں انسان خاکی ناقص الاوصاف کو البتہ نازیبا ہے۔ کہ باوجود اپنے نقصان اور ہزاروں عیبوں سے بھرے ہوئے ہونے کے نخوت وتکبر کرے یا اپنے تئیں نمودار کرنے میں کوشاں ہو۔ اس لئے کہ اگر وہ خود غور کرے تو اُس سے اکمل وافضل افراد اور بھی موجود ہیں۔ جن کے مقابلے میں اسے سر تواضع جھکانا چاہیئے۔ نہ سر افتخار اٹھانا۔ خصوصاً اس وقت جب کہ وہ دیکھتا ہو کہ میرا خالق جو کہ جامع جمیع صفات کمال ہے۔ وہ میرے اس تکبّر و نخوت آویزادا اور تقریر سے اطلاع رکھتا ہے۔ اور واقف ہے۔ تو اُسے شرم کرنی چاہیئے۔ کہ میں کس بنیاد پر تکبّر کرتا ہوں حالانکہ مجھ سے اکبر اس وقت موجود ہے۔ جس کے سامنے میں لا کے مانند ہوں۔ بلکہ اُس کا یہ اظہار اس وقت نہایت بے ادبی میں داخل ہوگا۔ جو عقلاً اس کے لئے مذموم ہے۔

بخلاف جناب باری عزاسمہٗ کے کہ اُس کے واسطے کوئی شے منافی موجود نہیں ہے۔ جس سے اس کو اپنے تئیں پست سمجھنے کی ضرورت ہو یا اُسے انکسار کرنا لازم پڑے۔ بالجملہ اب یہاں چند آیتیں ان بہت سی آیتوں میں سے جو جوامع توحید پر مشتمل ہیں۔ مع حل اور مختصر شرح کے درج کی جاتی ہیں۔ آیہ اولیٰ۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ۔ (سورہ بقر) یہ آیت الکرسی کے نام سے مشہور ہے۔ بعضوں نے اس کو دو آیتیں سمجھا ہے ایک اَلْقَیُّوْمُ تک اور دوسری

عظیم تک مگر حق یہ ہے کہ یہ ایک ہی آیت ہے۔ اس کی بابت کتاب خصال میں مروی ہے کہ اعظم اٰیۃ فی القراٰن اٰیۃ الکرسی۔ قرآن میں سب سے زیادہ عظمت والی آیت آیت الکرسی ہے (صافی) جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جو شخص آیت الکرسی کو ایک مرتبہ پڑھے۔ پروردگارِ عالم اس سے ہزار مکروہات کو مکروہات دنیا سے دفع کرتا ہے اور ہزار مکروہات مکروہاتِ آخرت سے۔ جن میں آسان ترین مکروہاتِ دنیا سے فقر ہے اور آسان ترین مکروہاتِ آخرت سے عذابِ قبر ہے۔ جناب ابو عبد اللہ الصادق علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے فرمایا کہ ان لکل شیٔ ذروۃ وذروۃ القرآن اٰیۃ الکرسی۔ ہر شے کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن کی چوٹی آیت الکرسی ہے (مجمع البیان) اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ لفظ اللہ اس آیت میں مبتدا ہے اور باقی فقرہ خبر ہے معنی یہ ہے کہ مستحق عبادت وبندگی کوئی نہیں ہے۔ سوائے اللہ کے، کیوں کہ وہی تمام صفات کمال کا جامع ہے۔ جس سے زیادہ باعظمت کوئی نہیں۔ پس عقلاً اُسی کے لئے عبادت زیبا ہے نہ کسی اور کے لئے۔ اس فقرہ میں انتہائے توحید پروردگارِ عالم بیان کر کے اُن لوگوں پر رد کی گئی ہے۔ جو کئی معبود کے وجود کے قائل ہیں مثلاً ہنود اور مشرکین عرب جو پتھر کے از خود تراشے ہوئے بتوں کو قابلِ عبادت سمجھتے ہیں جن میں نہ حس ہے نہ ادراک۔ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ۔ اور مثلاً ستارہ پرست یا قوٰے پرست جو ستاروں اور قوتوں کو معبود سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ یہ سب مخلوق پروردگار ہیں اور مثلاً آتش پرست جو یزدان واہرمن کو خدا سمجھتے ہیں اور آگ کی پرستش کرتے ہیں۔ وغیر ذلک۔ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ حی اُسے کہتے ہیں جو ایسی صفت پر ہو۔ جس کی وجہ سے ادراک مدرکات کر سکے۔ اور قیوم اُسے کہتے ہیں جو تدبیرِ خلقت وایجاد وبقا کو اچھی طرح قائم رکھتا ہے۔ ان کو روزی پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ خود فرمایا ہے مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا۔ کوئی زمین پر چلنے والا جاندار ایسا نہیں ہے جس کی روزی خدا تعالیٰ پر لازم نہ ہو۔ یعنی کہ وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے۔ بعض لوگوں نے قیّوم کے معنی عالم امور کے بھی کہے ہیں۔ یعنی کہ وہ معبود

برحق تمام چیزوں کو جانتا ہے اور بعض نے قیوم کے معنی دائم الوجود کے بھی بتائے ہیں یعنی کہ وہ ایسا زندہ ہے کہ جس کا وجود دائم ہے جسے زوال نہیں۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ۔ وہ ایسا ہے کہ نہ اُسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ حاصل یہ ہے کہ وہ معبود برحق تغیرات اور عروض حوادث سے بری ہے۔ اُس میں وہ صفتیں بالکل نہیں ہیں جو اس کے علاوہ اور مخلوقات میں پائی جاتی ہیں وہ جسم و جسمانیات کے لوازم سے بالکل مبرا ہے جیسے نیند اور اُونگھنا۔ جو کہ لوازم حیوانیت سے ہے اس میں ان لوگوں کی رد ہے جو خدا تعالیٰ کے لئے مثل آدمیوں کے جسم و جسمانیات ثابت کرتے ہیں اور پھر بھی اپنے تئیں اسلام میں داخل سمجھتے ہیں!!
ایک مطلب اس جملہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُسے سہو اور غفلت عارض نہیں ہوتی جس طرح سونے کی حالت میں حیوانات پر غفلت عارض ہو جاتی ہے وہ ہر وقت اپنی مخلوقات کے امور کی اصلاح و تدبیر میں مصروف ہے اسے بالکل کسی فعل یا قول یا حرکت سے اپنی مخلوقات کی غفلت نہیں ہے۔ عالم بما فی الضمیر ہے اور خبیر بما فی البطون ہے۔ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں۔ یعنی کہ وہی مالک یکتا ہے۔ اس کے سوا عالم کی مخلوقات میں کسی کو شرکت نہیں ہے۔ جیسا کہ مجوسی کہتے ہیں کہ عالم سفلی اہرمن کے قبضہ میں ہے۔ اور عالم علوی یزداں کے۔ بلکہ جو کچھ بھی زمین و آسمان میں ہے سب اسی معبود حقیقی وحدہٗ لاشریک کا ہے اور اُسی کے قبضہ میں ہے۔ اُسی کو اُن میں تصرف کرنے کا حق ہے۔ اس کلام میں ان لوگوں کی بھی رد ہے۔ جو عقول کو خالق مانتے ہیں۔ یہ کلام صاف بتا رہا ہے کہ مخلوقات سماویہ و ارضیہ سب خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی اور اسی کی مملوک ہیں۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ کوئی شخص بغیر اس (معبود حقیقی) کی اجازت کے اُس کے نزدیک سفارش نہیں کر سکتا اس کلام میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ جو بعض کفار عرب کہتے تھے کہ ہم بتوں کی اس لئے عبادت کرتے ہیں تا کہ وہ ہماری سفارش خدا تعالیٰ کے حضور میں کر دیں غلط ہے۔ بلکہ کسی کو اُس کے نزدیک سفارش کرنے کا حق بغیر اُس کی اجازت کے حاصل نہ ہو گا۔ اس چھوٹے سے فقرہ نے جہاں اپنی حکومت و غلبہ و سلطنت اور جلال کو ظاہر کیا ہے۔ وہاں قیامت کے آنے کو بھی بیان فرما

دیا ہے۔ کیونکہ موقع سفارش خدا تعالیٰ کے نزدیک وہی دن ہو گا۔ جب کہ تمام مخلوقات اپنے اعمال کا بدلہ پانے کے لئے موقع حشر میں بلائی جاوے گی۔ اور اسی جملہ سے مسئلہ عدالت خدا تعالیٰ پر بھی روشنی پڑتی ہے کیوں کہ قیامت کا ثبوت موقوف ہے ثبوت عدل پروردگارِ عالم پر۔ ورنہ اگر اس کو عادل نہ مانا جائے تو سزا و جزا۔ عذاب و ثواب۔ بعثت و حشر۔ حساب و کتاب کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ کما الحکم بہ البداہۃ الفطریۃ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وہ معبود برحق جانتا ہے اُن چیزوں کو جو ادمیو کے سامنے موجود ہیں اور جو اُن کی آنکھوں سے مخفی ہیں۔ یعنی حاضر و غائب ہر شے کو جانتا ہے اُس سے کوئی شے مخفی نہیں۔ (لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا) بعضوں نے ما بین ایدیھم سے مراد۔ گذشتہ اور آیندہ امور لئے ہیں۔ یعنی کہ تمام وہ گذشتہ اور آئندہ امور جو انسانوں کی نظر سے مخفی ہیں وہ سب خدا تعالےٰ کے سامنے ظاہر ہیں۔ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ۔ لوگ اس کے علم کو احاطہ نہیں کر سکتے مگر اسی قدر جتنا وہ چاہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی معلومات کی کوئی حد نہیں ہے۔ انسان ہرگز ان معلومات کو جان نہیں سکتا۔ مگر اتنا ہی جتنا اُن کے لئے تمدن میں ضروری ہے اور جسے خدا تعالیٰ نے ان کی مصلحت کے لئے بتایا ہے!! اس سے پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ خدا تعالیٰ کے علوم دو قسم کے ہیں ایک مخزون جن پر کسی غیر کو اطلاع نہیں ہے دوسرے مبذول جسے اوروں کو بھی بتا دیا ہے تاکہ مصلحت میں فرق نہ آئے۔ وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کرسی سے مراد اس آیت میں یا تو آٹھواں آسمان ہے جو تحت عرش (فلک الافلاک) ہے یا اس سے مراد علم خدا تعالیٰ ہے جیسا کہ جناب صادق علیہ السلام اور امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے یا اس سے مراد سلطنت اور ملک ہے۔ پس بنا بر اوّل کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کا پیدا کیا ہوا آٹھواں آسمان۔ باقی آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ کیوں کہ مجموعہ عالم مثل کُرے کے ہے اور بنا بر ثانی کے یہ مطلب ہو گا۔ کہ اس کا علم آسمان و زمین کی تمام چیز کو محیط ہے۔ کوئی شے اُس کے علم سے باہر نہیں ہے اور بنا بر ثالث کے یہ مطلب ہو گا کہ اسی کی سلطنت اور اسی کا ملک ہے۔ خواہ زمین ہو یا آسمان دنیا کی

بادشاہ فرضی مالک ہیں۔ اور مالک حقیقی صرف خدا تعالیٰ ہی ہے۔ وَلَا یَؤُدُہٗ حِفۡظُهُمَا ان آسمانوں اور زمین کی حفاظت میں اُس (معبود حقیقی) کو کوئی مشقت نہیں ہے کیوں کہ وہی اقدر القادرین ہے۔ اور قوی الاقویا ہے۔ وَهُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ اور وہی تمام چیزوں سے برتر، مثل و نظیر و شریک سے بالاتر ہے اس میں کوئی نقص وعیب نہیں، صفت حدوث سے برتر و منزہ ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ علیّ کے معنی قدرت و سلطنت و علوی شان کے ہیں اور عظیم سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسا قادر ہے جسے کوئی شے عاجز نہیں کر سکتی اور ایسا عالم ہے کہ اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ اس کے مقدورات کی کوئی انتہا نہیں اور نہ اس کے معلومات کی کوئی حد ہے۔

یہ ہے خلاصۂ تفسیر اس آیت کا جس میں توحید باری تعالیٰ۔ اور اُس کے صفات جلالیہ اور جمالیہ کا ذکر بطور اکمل کیا گیا ہے کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نے تو نفی شریک اور نفی اضداد بیان کی اور کلمہ حی نے اس کی صفت حیات کو جو صفات حقیقیہ میں سے ہے اور قیوم نے اس کے انتظام و تدبیر اور صفت خالقیت و رازقیت کو اور جملہ لَا تَاۡخُذُہٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ نے اس کے تنزہ کو جسم و جسمانیات سے اور لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ نے اس کے عموم ملک و قبضہ کو اور مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ نے اس کے جبروت و سطوت کو اور یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ نے اس کے وسعت علم کو اور وَلَا یَؤُدُہٗ حِفۡظُهُمَا نے اس کی قدرت کو اور علیّ نے اُس کے علوی شان کو اور عظیمٌ نے اس کی عظمت و جلال اور جملہ نقائص سے اس کی برأت و تنزہ کو ثابت کیا۔ فتعالی اللّٰہ الملک الحق المبین۔

آیہ ثانیہ: الٓمّٓ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ۔ نَزَّلَ عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ وَاَنۡزَلَ التَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ مِنۡ قَبۡلُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ۔ وَاللّٰهُ عَزِیۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡهِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ هُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُكُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ كَیۡفَ یَشَآءُ لَاۤ

اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (آل عمران)

الٓمٓ۔ یہ حروف مقطعات ہیں۔ جن کی تفسیر آج تک کسی سے یقینی طور پر نہ ہو سکی اگر کسی نے کچھ اس کی نسبت کہا بھی ہے تو ظن و تخمین کی بنا پر نہ تحقیق اور یقین کی رو سے چنانچہ کسی نے کہا ہے کہ ان حروف سے مراد اُن کے اعداد ہیں اور وہ دلالت کرتے ہیں اس امر پر کہ بقدر ان کے عدد کے اُمت محمدیہؐ کا بقاو قیام رہے گا۔ کسی نے یہ فرمایا کہ ان مفردات کو مرکب کرنے سے خدا تعالیٰ کے اسمائے عظمیٰ معلوم ہوتے ہیں مثلاً الر۔ حم۔ ن۔ جب اُن کو ترکیب دو تو الرحمان نکلتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس۔ کسی نے ہر حرف کے معنی علیحدہ بیان کئے ہیں۔ چنانچہ الم کے معنی یہ کہے ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ۔ گویا الم اس جملہ کا مخفف ہے کسی نے فرمایا ہے کہ عرب جو قرآن کو سنتے نہ تھے بلکہ سیٹیاں اور تالیاں بجایا کرتے تھے۔ اُن کو چپ کرانے کے لئے ابتدا میں سورتوں کے یہ حروف مفردہ لائے گئے۔ غرض اسی طرح اور بھی بیانات ہیں جن میں سے کسی کی بابت رائے دینے کا کسی کو استحقاق نہیں ہے اور بے شک یہ کہنا نامناسب نہیں ہے کہ لا یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم صرف خدا تعالیٰ اور اس کی تعلیم کئے ہوئے علم میں پختہ کار حضرات ہی اس کی تاویل کو جان سکتے ہیں۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ۔ اس کے متعلق ابھی آیۃ الکرسی کی تفسیر میں تشریح کی گئی۔ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ۔ یعنی وہی معبود برحق وحدہٗ لاشریک لہ ایسا ہے۔ جس نے تم پر اس کتاب (قرآن) کو حق کے ساتھ نازل کیا جس کے بیانات سچے اور صحیح ہیں۔ یا یہ کہ جو کچھ اس میں بیان کیا گیا ہے وہ حکمت اور راستی پر مبنی ہے اور فی الواقع بھی ایسا ہی ہے۔ کیوں کہ جس قدر حکم اور عبرتیں اور مواعظ اور تعلیمات قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ وہ کسی ایک کتاب میں مجموعۃً مذکور نہیں۔ اس جملہ سے خدا تعالیٰ نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب رسول اللہؐ کی مجعول اور تصنیف کی ہوئی نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ کتاب معجزہ ہے اور مثبت رسالت جناب رسولؐ خدا ہے۔ اس کی

تحدی ہر وقت موجود ہے کہ فَاْتُوْا بِمِثْلِہٖ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اے تکذیب کرنے والو! ہماری کتاب کی اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو۔ تو ایسی ہی کوئی کتاب تم بھی پیش کرو۔ جس سے معلوم ہو کہ یہ کتاب من جانب اللہ نہیں ہے بلکہ آدمی کی بنائی اور تصنیف کی ہوئی ہے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔ اس کتاب میں ایک یہ بھی صفت ہے۔ کہ اُن تمام کتابوں اور پیغامبروں کی بھی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آچکے ہیں۔ (کیوں کہ یہ کتاب جہاں محمد مصطفیٰ ؐ کی رسالت کو بیان کرتی ہے۔ وہاں دیگر انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو بھی ثابت کرتی ہے اور کتب منزلہ من اللہ کی تصدیق کرتی ہے) وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ اسی معبود حقیقی نے تورات کو (موسےٰ پر) اور انجیل کو (عیسےٰ پر) نازل کیا۔ مِنْ قَبْلُ اس سے پہلے کہ یہ قرآن نازل ہو۔ هُدًى لِّلنَّاسِ (کیوں نازل کیا؟) اس لئے کہ یہ کتابیں آدمیوں کو سیدھی راہ بتائیں۔ جس پر چل کر لوگ قربِ خدا حاصل کریں اور عذابِ خدا سے بچیں۔ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ اور اسی معبود برحق نے ایسی دلیل بھی نازل کی جو حق اور باطل میں تفرقہ کرنے والی ہے (بعضوں نے فرقان سے مراد نصرت لی ہے۔ یعنی کہ خدا تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر نصرت اور فتح نازل کی جس سے وہ عیسائیوں پر غالب آئے) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بے شک جن لوگوں نے آیاتِ خدا کا انکار کیا اور اس کی حجتوں اور دلیلوں کو نہ مانتے ان کے لئے سخت عذاب ہے۔ کیوں انہوں نے اپنے منعم حقیقی کی نعمتوں کا کفران کیا جو عقلاً موجب عقاب ہے۔ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ اور خدا تعالیٰ قادر ہے کوئی اُس پر غالب آکر اُسے روک نہیں سکتا۔ کہ جسے وہ چاہے عذاب نہ کر سکے۔ بلکہ اس کی قدرت سب پر غالب ہے۔ ذُوانْتِقَامٍ۔ یعنی اس میں کافروں سے انتقام لینے کی قدرت ہے اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ گناہوں کی سزا نہیں دے سکتا تو یہ خیال غلط ہے بلکہ قادر و عادل ہونے کے سبب ضرور بدلہ دے سکتا ہے اور دے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ۔ بے شک خدا تعالیٰ پر کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ بلکہ جہاں کہیں کوئی شے ہے وُہ اسے جانتا ہے۔ اس

بیان سے غرض تنبیہ اور تخویف ہے یعنی کہ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ میرا فعل و قول چھپا رہ جائے گا۔ بلکہ وہ عالم الغیوب ہے جو دل کے خطرات اور دماغ کے خیالات کو بھی جاننے والا ہے۔ ہر شے کی خبر رکھتا ہے اگر کوئی شخص عمل خیر کرے گا۔ اس کا علم بھی اُسے ہے اور اس پر جزا دے گا اور جو کوئی عمل بد کرے گا اس کا معاوضہ بھی اس کے پاس سے پا جائے گا۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ۔ وہی ایسا معبود و خالق یکتا ہے کہ رحم کے تنگ و تاریک مقام میں جہاں نہ کوئی آلہ جا سکتا ہے۔ جس سے عمل تصویر ہو سکے اور نہ کوئی تدبیر ظاہر کارگر ہو سکتی ہے۔ تمہاری تصویریں بناتا ہے۔ جس طرح اس کی مشیت کا مقتضا ہوتا ہے۔ کسی کو بدصورت کسی کو خوبصورت کسی کو مرد کسی کو عورت کسی کو طویل کسی کو قصیر وغیر ذلک۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔ نہیں ہے کوئی قابلِ عبادت مگر وہی۔ غالب ہے۔ اپنی سلطنت میں۔ اور حکیم ہے۔ یعنی کہ ہر فعل اس کا اُس کی حکمت اور اُس کے کامل صانع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کے سوا کسی اور سے ممکن نہیں کہ ایک مچھر تک کو پانی سے یا کیڑے کو مٹی سے پیدا کر دے۔ چہ جائے کہ رحم کے اندر صورت انسان و حیوانات بنانا۔ اور اُس میں داخل کرنا۔ اور پھر عجائب حکم و مصالح پر اُس کے ہر جوڑ بند کو قائم کرنا۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

آیۃ ثالثہ: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ (آل عمران) یہ آیت بھی قرآن مجید کی اعظم آیات سے ہے اور اس کے متعلق احادیث امامیہ میں بہت کچھ مزیت اور فضیلت وارد ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے پدر بزرگوار سے اور انہوں نے اپنے آبائے طاہرین سے روایت فرمائی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ سورہ فاتحہ اور آیۃ

الکرسی اور آیہ شہد اللہ انّہ لا الٰہ الّا ہو اور آیۃ قل اللّٰہم مالک الملک الیٰ قولہٖ بغیر حساب
کو نازل فرمایا ہے تو ان آیتوں نے عرض کی کہ خدایا تو ہم کو گناہوں کے گھر (دنیا) میں
اور گناہ گاروں کے پاس بھیجتا ہے تو فرمایا پروردگار عالم نے کہ قسم ہے مجھے اپنی عزت وجلالت
کی کہ جو بندہ تم کو ہر نماز فریضہ کے بعد پڑھے گا۔ اس کو میں خطیرۂ قدس میں جگہ دوں گا
مع ان تمام چیزوں کے جو وہاں پر ہیں۔ اُس پر ہر روز ستر مرتبہ اپنی نظر مکنون سے دیکھوں
گا اور اس کی ستر حاجتیں پوری کروں گا۔ جن میں ادنیٰ مغفرت ہے اور اسے ہر دشمن
سے محفوظ رکھوں گا۔ اور اُسے اس پر نصرت دوں گا اور اس کو جنت میں داخل ہونے
سے سوائے موت کے کوئی شے مانع نہ ہوگی۔ قُلِ کہو اے محمدؐ۔ اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ
اے اللہ جو کہ ہر ملک کا مالک ہے (یا امر دنیا و آخرت کا مالک ہے۔ یا نبوت اور امامت
کا مالک) تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ تو عطا کرتا ہے ملک جس کو چاہتا ہے وَتَنْزِعُ
الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ اور لے لیتا ہے ملک جس سے چاہتا ہے۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ
اور عزت دیتا ہے ایمان اور اطاعت سے جس کو چاہتا ہے۔ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ
اور کفر و معصیت کی وجہ سے جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ بِیَدِکَ الْخَیْرُ۔ تیرے
ہی ہاتھ (اختیار) میں خیر دنیا و آخرت ہے۔ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ بے شک
تو ہر چیز پر قادر ہے کوئی شے تجھ کو عاجز نہیں کر سکتی۔ تو ہی معدوم کے موجود کرنے
اور موجود کے معدوم کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَتُوْلِجُ
النَّھَارَ فِی الَّیْلِ۔ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ اس طرح
پر کہ ایک کی جگہ دوسرے کو قائم کرتا یا یہ کہ رات کا حصہ گھٹا کر دن میں بڑھا دیتا ہے
اور دن کا حصہ گھٹا کر رات میں داخل کر دیتا ہے۔ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ یعنی نطفہ
سے جو کہ بے جان ہے۔ انسان زندہ پیدا کرتا ہے۔ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ اور
نطفہ بے جان زندہ انسان سے پیدا کرتا ہے یا یہ کہ مومن سے کافر اور کافر سے مومن
نکالتا ہے۔ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ اور جسے تو مصلحت سمجھتا ہے بے حساب
دیتا ہے یا یہ کہ بغیر خوف کمی کے دیتا ہے۔ کیوں کہ اُسے کسی کا ڈر نہیں کہ اگر بخشش

زیادہ کروں گا۔ تو میرے پاس کمی واقع ہو گی۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مَنْ تَشَآءُ سے مراد اہل جنت ہیں۔ کیوں کہ خدا تعالیٰ اُن کو بلا حساب مرحمت فرمائے گا جسے نہ شمار کرنے والا شمار کر سکے گا۔ اور نہ احصا کرنے والا اس کا احاطہ کر سکے گا۔ اس مطلب پہ یہ آیت دلالت کرتی ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ یعنی یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور وہاں اُن کو بے حساب عطا کیا جائے گا۔

اس آیت نے بھی خُدا تعالیٰ کی خالقیت۔ رازقیت۔ قادریت۔ غالبیت اور رحمت اور وسعت اختیار کو ثابت کیا ہے اور یہی مراد یہاں کمالِ توحید سے ہے۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (آلِ عمران) وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اور اللہ ہی کے واسطے ہے یا اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے۔ خواہ وُہ خود آسمان ہو یا وہ چیزیں جو آسمانوں میں ہیں۔ مثل ستاروں اور روحانیات اور قوائے فلکیہ وملکیہ کے وہ سب اُسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اُس میں کسی کی شرکت نہیں ہے اور علی ہذا القیاس جو کچھ زمین پہ ہے یا زمین کے نیچے وُہ بھی اُسی کی ایجاد کا اثر ہے اور سب اسی کی مملوک ہیں۔ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۔ اور اسی کی طرف تمام امور کی رجوع ہے۔ اس کا مطلب کسی نے یُوں بیان کیا ہے کہ تمام امور فنا ہو جائیں گے اور پھر جزا اور عوض دینے کے لئے بروز قیامت سب کو زندہ کر کے اپنے حضور میں طلب کرے گا۔ جس سے علاوہ صفت خالقیت وملک کے قیامت کے آنے کا بھی ثبوت ہے جو صفت عدالتِ پروردگارِ عالم پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے کہ اگر پروردگار کے لئے یہ صفت ثابت نہ کی جائے تو قیامت کا ہونا فضول ہو گا۔

اور بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دنیا میں بہت سی چیزوں کا بظاہر مالک کر دیا ہے۔ مگر بروز آخرت ان سب کی ملکیت ساقط و خارج ہو جائے گی اور صرف قبضۂ خدا تعالیٰ جل مجدہٗ باقی رہے گا۔ جیسا کہ خود ہی فرماتا ہے۔ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ۔ آج یعنی قیامت کے روز کس کے لئے ملک ہے؟

(یا کس کا ملک) جب کوئی جواب دینے والا نہ ہوگا۔ تو خود ہی فرمائے گا۔ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ آج تمام عالم پر اللہ واحد غالب ہی کا قبضہ ہے۔ کوئی اس کے ساتھ ملک و ملک میں شریک نہیں۔ اگرچہ ظاہری ہی طور پر کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ اس دن تو تمام نفسی نفسی پکارتے ہوں گے۔ کسی کو اپنے ملک و ملک کا خیال نہ ہو سکے گا۔ اور اگر ہو بھی تو موقف حساب میں اُن کو کسی امر پر اختیار ہی کب باقی ہوگا۔ پس جس طرح کہ باطناً اس وقت تمام چیزیں خدا تعالیٰ کی ملکیت میں ہیں اور بظاہر اور لوگ بھی مالک نظر آتے ہیں۔ اُس دن ظاہر و باطن ہر طرح خدا تعالیٰ ہی مالک دکھائی دے گا۔ اور سب اُسی کی مملوک نظر آئے گی۔

وَاللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ (آل عمران) وَاللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ اور اللہ زندہ کرتا اور مار ڈالتا ہے یعنی مارنا اور جلانا اسی کے اختیار میں ہے۔ خواہ سفر میں ہو یا حضر میں جب موت کا وقت آجاتا ہے۔ ہرگز اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ کیوں کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مقدم فرمایا ہے۔ اس کا مؤخر کرنے والا یا جسے مؤخر کیا ہے اس کا مقدم کرنے والا سوائے اس کے کوئی نہیں اس آیت میں پروردگار عالم نے جہاد سے پیچھے رہ جانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ یعنی کہ جہاد میں جانا باعث ہلاکت نہیں بلکہ جب موت کا وقت آجاتا ہے تو خواہ جہاد میں جاؤ یا نہ جاؤ بہر حال مر جاؤ گے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم عمل میں لاتے ہو۔ خواہ معصیت کا امر ہو یا طاعت کا۔ اُس سے کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ اس جملہ میں ترغیب و ترہیب دونوں ہی موجود ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ۔ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ۔ (انعام) اَلْحَمْدُ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ۔ تمام تعریفیں اس معبود حقیقی کے لیے ثابت ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا مع تمام اُن عجائب چیزوں کے جو اُن کے اندر ہیں۔ اور اس کی وحدانیت و کمالِ قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ بعض مفسرین کا یہ خیال ہے کہ یہ جملہ خبریہ معنی میں امر کے ہے یعنی کہ ایہا الناس تم حمد ادا کرو اُس خدائے واحد کی جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس کلام سے مقصود اظہار کمال قدرت ہے اور یہ کہ اس کی صنعت میں کوئی اُس کا شریک نہیں ہے۔ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوۡرَ۔ اور پیدا کیں تاریکیاں اور روشنی۔ اس سے مقصود رد ہے اُن لوگوں پر جو کہتے ہیں کہ نور وظلمت ہی دونوں خدا ہیں۔ نیک کاموں کا فاعل نور ہے اور بد کاموں کا ظلمت (اس فرقہ کو ثنویہ کہتے ہیں) اور ممکن ہے کہ اس سے مراد جنت و دوزخ ہو۔ یعنی کہ ان دونوں کا بھی وہی فاعل و جاعل ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس بیان سے اپنا احسان ظاہر کرنا ہو جو ان دونوں یعنی نور وظلمت کے پیدا کرنے سے اس نے اپنے بندوں پر کیا۔ کیوں کہ جس قدر فوائد روشنی اور تاریکی سے اس کے بندوں کو پہنچتے ہیں وہ بے شمار ہیں اور ان میں سے بعض کا بیان پہلے بھی آچکا ہے۔ پھر خدا تعالیٰ کفار و منکرین پر تعجب کرتے ہوئے کہ باوجود اتنے دلائل اور اتنی نشانیوں کے بھی لوگ خدائے واحد کی توحید کا اقرار نہیں کرتے اور شرک میں مبتلا ہوتے ہیں فرماتا ہے۔ ثُمَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ یَعۡدِلُوۡنَ۔ پھر بھی وہ لوگ جو منکر خدائے واحد ہیں اپنے پالنے والے کے ساتھ اوروں کو برابر سمجھتے ہیں اور اصل معبود کو چھوڑ کر یا اُس کے ساتھ مخلوقات کی بھی عبادت کرتے ہیں۔ ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ طِیۡنٍ۔ وہ خالق یکتا ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ باوجود کہ مٹی ایک بے جان چیز ہے۔ اُس میں خود قوت نمو نہیں ہے مگر اسے اس طرح کی ترکیب دی کہ اس میں قوت نمو بھی پیدا ہو گئی۔ قوت حرکت بھی اسے حاصل ہو گئی اور وہ ترکیب کے بعد ایک عجیب زندہ مصنوع بن گئی۔ جس کی حکمتوں کا احصا ناممکن ہے!! اگرچہ دراصل مٹی سے بلاواسطہ حضرت آدمؑ ہی پیدا ہوئے تھے۔ مگر چونکہ مخاطب انسانوں

کے لئے وہی اصل ہیں اور انہیں کی نسل سے یہ انسان ہیں اس لئے خدا تعالیٰ نے سب کی طرف خطاب کر کے فرمایا کہ تم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا یعنی ابتدا اور اصل تمہاری مٹی سے ہے۔ ثُمَّ قَضٰی اَجَلًا وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَہٗ۔ پھر اس نے ایک مدت زندگی مقرر کر دی (کہ اتنے دنوں تک دنیا میں رہو گے) اور ایک مدت اس کے نزدیک مقرر ہے!! ان دونوں مدتوں کے متعلق بعض کا تو یہ خیال ہے کہ ایک سے مراد مدت زندگی کے زمانہ تک ہے اور دوسرے سے مراد زندگانی آخرت ہے۔ جو دائم ہے اور اس حالت میں انسان کی ایک رُوح قبض ہو جاتی ہے۔ مگر پھر عود کر آتی ہے اور دوسرے سے مراد اجل یعنی موت ہے۔ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ۔ پھر اے کفار تم شک ہی کرتے ہو کہ ہمارا بعث و حشر و نشر نہ ہو گا۔ باوجود کہ پیدا ہونا اور مرنا اپنا دیکھتے ہو جو کافی دلیل اس امر کی ہے کہ جو اوّل امر میں پیدا کرنے اور مار ڈالنے پر قادر ہے۔ وہ دوبارہ بھی مرنے کے بعد زندہ کر سکتا ہے۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰہِ ؕ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ ؕ لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَا رَیْبَ فِیْہِ ؕ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَہُمْ فَہُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ وَلَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیْلِ وَالنَّہَارِ ؕ وَہُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَہُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (انعام)

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اے محمدؐ! ان مشرکین سے کہو۔ کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ کس کا ہے اور کس نے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے؟ پس اگر وہ کہیں یہ سب کچھ اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ قُلْ لِّلّٰہِ۔ تو تم بھی کہو کہ ہاں اللہ تعالیٰ کی ملک میں سب چیزیں ہیں۔ اسی کو اُن میں تصرف کا حق حاصل ہے۔ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ۔ اس نے لکھ لی ہے اپنے اوپر رحمت یعنی اپنے نفس پر اس نے رحمت کو لازم کر لیا ہے کہ باوجود گناہ دیکھنے کے بندوں کو مہلت دیتا ہے تاکہ اب بھی توبہ کریں اور اپنے افعال سے باز آئیں۔ یا یہ کہ اُمتِ محمدیہ

کے لئے اس نے رحمت کو لازم کر لیا ہے کہ ان پر مثل اور امم سابقہ کے عذاب نہ کرے گا۔ لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ۔ ضرور تم کو قیامت کے دن جمع کرے گا۔ اور اس روز زندہ کرکے تم سے حساب سمجھے گا۔ یا یہ کہ قیامت تک تم کو مہلت دی ہے اور تمہارے جمع کرنے کی تاخیر اس وقت تک کی جائے گی۔ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ اس میں کچھ شک نہیں ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے کہ اَلَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ فَہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ۔ جن لوگوں نے اپنے نفس کو نقصان پہنچایا۔ یعنی کفر اور معصیت کی وجہ سے اپنی جانوں کو تباہی میں ڈالا ہے۔ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ چاہو کتنے ہی دلائل و براہین ان کے سامنے بیان کرو! اس کے بعد پھر اپنی مالکیت اور دیگر صفات کو بیان فرماتا ہے۔ وَلَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ اسی کے لئے ہے جو رات اور دن میں داخل ہوتا ہے یعنی جس شے پر رات اور دن کا مرور ہوتا ہے وہ خدا ہی کی پیدا کی ہوئی اور اسی کی مملوک ہے اس سے پہلے تو خدا تعالیٰ نے آسمان اور زمین کی چیزوں کو اپنا مملوک بنایا اور یہاں رات اور دن کی چیزوں کو جس سے یہ بات پیدا ہوتی کہ عالم کی تمام چیزیں دو ہی حالتیں رکھتی ہیں۔ ایک مکانیت اور دوسری زمانیت تو خواہ اشیائے عالم مکانی ہوں یا زمانی ہوں۔ دونوں ہی مالک مطلق پروردگارِ عالم کی ہیں۔ اس بیان سے تمام ممکنات کا حصر ہو گیا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی مملوک ہے وہ شے جو رات میں ساکن اور دن میں متحرک ہو (یہ اس لحاظ سے کہ دن طلب قوت و معاش کا وقت ہے اور رات آرام کا) مگر لفظ متحرک یا تحرک کو بقرینہ ذکر ضد چھوڑ دیا گیا ہے۔ واللہ یعلم۔ قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا۔ کہو اے محمد کہ سوائے اللہ کے کسی اور کو میں اپنا مالک اور مولیٰ قرار دوں جیسے تم بتوں کو اپنا مالک اور مولیٰ بناتے ہو؟ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے یعنی ایسے معبود حقیقی کو جس کی یہ صفت ہو چھوڑ کر اوروں کو اپنا مالک سمجھوں؟ ہرگز ایسا نہ ہو گا۔ ھُوَ یُطۡعِمُ وَلَا یُطۡعَمُ وہی رزق دیتا ہے اور اُسے کسی سے رزق لینے کی ضرورت نہیں ہے وہ مستغنی بالذات ہے۔

اسی کے سب محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں پس کیوں کر اس کے سوا کوئی قابلِ پرستش ہو سکتا ہے۔ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ۔ کہہ دو اے محمدؐ کہ مجھے خدا کا حکم ملا ہے کہ میں پہلا وہ شخص ہوں جس نے حکم خدا کی اطاعت کی اور اس کے احکام پر راضی ہُوا۔ وَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۔ اور مجھے حکم خدا ملا ہے کہ ہرگز میں مشرکین میں داخل نہ ہوں۔ بلکہ ان سے الگ رہوں۔

وَاِنْ یَّمْسَسْکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗٓ وَاِنْ یَّمْسَسْکَ بِخَیْرٍ فَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ ؕ وَھُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ۔

وَاِنْ یَّمْسَسْکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗٓ اِلَّا ھُوَ۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ اپنے اختیارات اور کمالِ قدرت کو ظاہر فرماتا ہے اور اسی کے ساتھ اپنی حکمت اپنے علم اور اپنے غلبہ و اقتدار کو بیان کرتا ہے۔ فرماتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی تکلیف۔ بیماری۔ فقر یا مصیبت پہنچائے تو اس کا دور کرنے اور ہٹانے والا سوائے اس کے کوئی نہیں۔ کیوں کہ کسی دوسرے کو یہ اختیار نہیں کہ خدائی حکم کو ٹال سکے یا اس کا مقابلہ کر کے اس کی بلا کو روک دے۔ وَاِنْ یَّمْسَسْکَ بِخَیْرٍ اور اگر تم کو کسی قسم کی بھلائی پہنچائے مثلاً روزی میں وسعت کر دے یا بدن میں صحت عطا کرے یا آسائشِ دنیا کو تمہیں عنایت فرمائے تو اس میں اس کے لئے کوئی دشواری نہیں اور نہ اُسے کوئی روک ہی سکتا بلکہ فَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ وہی ہر شے پر قادر ہے چاہے بمصلحت کسی کو تکلیف پہنچائے یا بحکمت کسی کو آرام وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ ؕ اور وہی معبودِ حقیقی اپنے بندوں پر غالب اور قادر ہے اور وہ سب اس کے تحت حکم ہیں۔ وَھُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ۔ اور باوجود اس کے جو کچھ وہ کرتا ہے حکمت و تدبیر کے ساتھ کرتا ہے نہ یہ کہ قدرت حاصل ہونے کی وجہ سے جا و بے جا جسے چاہے نفع پہنچائے یا جسے چاہے نقصان پہنچائے بلکہ وہ واقعیت امر پر مطلع ہے اور ہر قسم کی حکمت و تدبیر سے باخبر ہے۔ اس لئے تمام کام باحکمت و تدبیر ہی کرتا ہے نہ اس کے برخلاف۔

إِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ
الْحَيِّ ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَأَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۔ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۔ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ
لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۔ وَهُوَ
الَّذِيْ أَنْشَأَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۔ وَهُوَ الَّذِيْ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَأَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ
شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ
دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ أَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۗ اُنْظُرُوْا
إِلٰى ثَمَرِهٖ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۚ إِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ
شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا
يَصِفُوْنَ ۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ أَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ
صَاحِبَةٌ ۖ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَا إِلٰهَ
إِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۔ (انعام)

إِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۔ بے شک خدا تعالیٰ دانے اور گٹھلی کو شگافتہ کرنے اور اس میں سے نباتات اور اشجار پیدا کرنے والا ہے۔ حالاں کہ دانہ اور گٹھلی خشک ہوتی ہے۔ پھر بھی اپنی قدرت کاملہ سے اُن میں قوتِ نامیہ مرحمت فرماتا ہے جس سے سبز سبز پتیوں اور تر و تازہ شاخوں والے نباتات اُن سے ظاہر ہوں۔ جو اس کی کمالِ صنعت پر دلالت کرتے ہیں۔ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۔ زندہ یعنی نباتات کو مُردہ یعنی خشک دانوں اور گٹھلیوں سے پیدا کرتا ہے اور مُردہ کو زندہ سے یعنی پھر انہیں نباتات سبز و شاداب سے خشک اور بے جان دانے پیدا کرتا ہے یا یہ کہ جیسا سابق میں بیان ہُوا۔ نطفہ سے حیوانات اور حیوانات سے نطفہ پیدا کرتا ہے یا کافر سے مومن اور مومن سے کافر کو نکالتا ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَأَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۔ پس وہی تمہارا اللہ ہے پھر تم کدھر بھٹکے جاتے ہو۔ اور کیوں

ایسے ایسے براہین و دلائل کے دیکھنے کے بعد بھی گمراہی اختیار کرتے ہو۔ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ تاریکی شب سے صبح کی عمود کو نکالتا ہے اگر وہ چاہتا تو ہمیشہ رات ہی رہتی۔ وَجَعَلَ اللَّیْلَ سَکَنًا اور رات کو سکون و آرام کے لئے بنایا تاکہ دن کے کاموں سے جو تھکن پیدا ہوئی ہے۔ اُسے رات میں آرام لے کر دفع کرو۔ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا اور سورج اور چاند کو بحساب و اندازہ معین جاری کیا ہے اور انہیں پر رات اور دن کا مدار رکھا ہے چاند کے لئے ۲۸ روز کی تقریباً سیر مقرر کی ہے اور سورج کے لئے تقریباً تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن کی۔ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ۔ اور یہ صبح کا روشن کرنا اور رات کو محل سکون و آرام قرار دینا اور آفتاب و ماہتاب کو بحساب مقرر چلانا ایک غالب قادر اور علم والے کی تقدیر ہے جو مصالح خلق سے بخوبی واقف ہے هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ اسی نے تمہارے نفع کے لئے ستارے پیدا کئے تاکہ تم اُن کی روشنی سے میدان اور دریا کی تاریکیوں میں ہدایت پاسکو۔ کیونکہ یہ ستارے بعضے مشرق میں ہیں بعضے مغرب میں۔ بعضے چلنے والے کے سامنے ہوتے ہیں۔ اور بعض دائیں یا بائیں بہرصورت اُن سے آدمی راہوں کا پتہ چلا سکتا ہے جیسا کہ لوگ جدی۔ شعری۔ عیوق۔ ثریا۔ سہیل۔ یمنی وغیرہ سے راہ چلنے میں بہت کچھ مدد لیتے ہیں۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ۔ بے شک ہم نے نشانیاں اپنے وجود اور اپنی قدرت کی بہ تفصیل بیان کر دیں ان لوگوں کے لئے جو جانتے اور فکر کرتے ہیں (تخصیص صرف اس لئے ہے کہ بیان و تفصیل انہیں لوگوں کو مفید ہوتی ہے جو غور و فکر کرتے ہیں نہ کہ غافلوں کو) وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وہی وہ خالق و صانع ہے جس نے تم سب کو ایک ہی نفس یعنی آدم سے پیدا کیا ہے۔ کیونکہ اول مخلوق انسانی حضرت آدم ہیں اُن کے بعد جناب حوا پیدا کی گئی ہیں اور اُن سے باقی انسان فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ۔ پس بعض تو تم میں سے رحم میں ٹھیرائے ہوئے ہیں یا روئے زمین پر اور بعض زیر زمین سپرد کر دیئے گئے ہیں تاکہ قیامت کے دن نکالے جائیں۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ

بے شک ہم نے بتفصیل اپنے وجود و قدرت کی دلیلیں سمجھنے والوں کے لئے بیان کر دیں۔ وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ وہی ایسا ہے جس نے بلندی سے مینہ برسایا (پھر غائب سے متکلم کی طرف التفات فرما کے کہتا ہے کہ) پس ہم نے اس سے ہر قسم کے نباتات پیدا کئے یعنی اسی مینہ کے ذریعے سے ہر چیز اگائی جو حیوانات وحوش وطیور وانسان وحشرات الارض وغیرہ کے لئے غذا بن سکے۔ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا پھر ہم نے اسی مینہ سے سبز نبات، تر و تازہ پیدا کی (خضر سے مراد وہ نبات ہے جو دانہ سے پھوٹ کر پیدا ہوتی ہے) نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا۔ جس سے ہم تہ بہ تہ دانے نکالتے ہیں یعنی اسی سبز نبات سے جو پہلے دانے سے اُگی ہے۔ بالیاں پیدا کرتے ہیں۔ جن میں تہ بہ تہ دانے ہوتے ہیں۔ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ۔ اور پیدا کرتا ہے درخت جڑ سے اُس کے خوشے سے گچھے دَانِيَةٌ جن کا لینا اور حاصل کرنا آسان ہوتا ہے۔ وَجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ اور باغ ہیں انگور کے یعنی ہم نے اسی مینہ سے انگور کے باغ پیدا کئے وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ اور ہم نے اسی مینہ سے زیتون اور انار پیدا کئے جو تم لوگوں کی نہایت عمدہ غذا اور دوا ہیں مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ جو درخت کے لحاظ سے متشابہ الصورت ہیں اور ذائقہ کے لحاظ سے مختلف ہیں یا یہ کہ ہم جنس اور غیر جنس یعنی ہر ایک صنف ان دونوں کی آپس میں متشابہ اور ہم صورت اور دوسری صنف سے مخالف ہے۔ یا یہ کہ بعض اُن میں سے ہیئت وصورت اور لذت وذائقہ میں متشابہ ہیں اور غیر متشابہ۔ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ۔ تم کو لازم ہے کہ دیکھو کہ کس طرح ان درختوں میں پھل لگتے ہیں۔ وَيَنْعِهٖ۔ اور کس طرح پختہ ہوتے ہیں اور کیا کیا انتظامات اُن کے واسطے معین کئے گئے ہیں حاصل یہ ہے کہ ان کی حالتوں کو اوّل سے آخر تک دیکھو اور ان سے عبرت حاصل کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ کیسی کیسی حکمتیں ان میں ودیعت کی گئی ہیں اور کیسی قدرت کاملہ کا ظہور ان سے ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ حالتیں اور تغیرات ہیں جو تم کو اس امر کے اقرار پر مجبور کریں گے کہ ان کا کوئی نہ کوئی خالق و مدبر ضرور

ہے ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۔ بے شک ان تمام چیزوں میں ایمان لانے والوں کے لئے نشانیاں ہیں جنہیں دیکھ کر اُن لوگوں کے دلوں میں ایمان اور یقین داخل ہوتا ہے وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ (دیکھو تو کیسی عجیب بات ہے کہ) ان مشرکین نے جنوں کو یعنی فرشتوں کو خدا کا شریک ٹھیرایا ہے ۔ حالاں کہ خدا تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے اور وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے ۔ پھر کیوں کر وہ خدا تعالیٰ کے شریک ہو سکتے ہیں ۔ علاوہ ازیں جو کہ مخلوق ہے وہ خالق کے درجے میں کیوں کر آسکتا ہے ۔ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِیْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۔ اور ان مشرکین نے اس کے لئے افترا و بہتان کے طور پر بے جانے بوجھے بیٹے اور بیٹیوں کی بھی تجویز کر دی ۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ ۔ پاک ہے اور برتر ہے خدا تعالیٰ ان امور سے جنہیں یہ لوگ بیان کرتے ہیں ۔ یعنی ہرگز اس کے بیٹے اور بیٹیاں نہیں ہیں ۔ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے ۔ اَنّٰی یَکُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَکُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ کہاں اس کے اولاد ہو سکتی ہے حالاں کہ اس کی کوئی بیوی ہی نہیں ۔ وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے ۔ وَهُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ اور اسی کو ہر شے کا علم ہے ۔ ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ وہی اللہ تمہارا رب اور خالق ہے جس نے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔ اس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں ہے ۔ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ پھر تاکیداً فرمایا کہ وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے ۔ خواہ جسم ہو یا جسمانی ۔ مکان ہو یا مکانی ۔ فَاعْبُدُوْهُ ۔ پس تم لوگ اسی کی عبادت کرو اور بتوں اور ستاروں کی عبادت کو چھوڑو کیونکہ استحقاق عبادت اسی کو ہے وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ ۔ اور وہی ہر شے کا حافظ و مدبر و نگہبان ہے ۔ ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے دلیلیں اور عبرتیں اور نصیحتیں اور اپنی قدرت کے آثار اور حکمت کے نمونے سب کچھ بیان فرما دیئے ہیں ۔ کاش اہل دنیا غور کریں ۔

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَمَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ

فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰہُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ فَذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ ۔ (سورہ یونس)

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ دلائل توحید وبعثت وحشر کو بیان فرماتا ہے اور نہایت نرم لہجے میں سمجھاتا ہے کہ ایسے معبود وخالق کے ہوتے ہوئے دوسرا کوئی قابلِ پرستش نہیں ہو سکتا خواہ علویات سے ہو یا سفلیات سے، روحانیات سے ہو یا جسمانیات سے ۔ اور نیز اسی کو اختیار پھر زندہ کرنے کا ہے ۔ جس نے اول مرتبہ پیدا کیا اور پھر مار ڈالا ہے ۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ کہو اے محمدؐ ان کفار ومشرکین سے کہ تم کو آسمان سے مینہ برسا کر اور زمین سے غلّہ اور میوہ اور نباتات اُگا کے روزی کون پہنچاتا ہے کیا یہ تمہارے مصنوعی معبود ایسا کرتے ہیں ۔ یا اللہ تعالیٰ ؟ اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ اور کون کان اور آنکھ کا مالک ہے کہ اُن میں قوتِ سامعہ اور قوتِ باصرہ پیدا کرتا ہے ؟ وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ اور کون مُردہ سے زندہ کو نکالتا ہے ۔ یعنی کافر سے مومن پیدا کرتا ہے یا یہ کہ مُردہ شے سے زندہ کو پیدا کرتا ہے ۔ مثلاً نطفہ سے یا مٹی سے انسان وحیوانات کو خلق فرماتا ہے ؟ وَمَنْ یُّخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ اور کون زندہ سے مُردہ کو نکالتا ہے، یعنی زندگی سے موت دیتا ہے یا مومن سے کافر پیدا کرتا ہے ؟ وَمَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ اور کون آسمان وزمین کے کاموں کا انتظام کرتا ہے ؟ کیا کسی اور میں بھی یہ قوتیں ہیں ؟ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰہُ ۔ پس تمہارے اس سوال پر عنقریب یہ لوگ یہی جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی یہ سب کام کرتا ہے اور اسی میں یہ قوتیں ہیں ۔ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ تو کہو (اے محمدؐ) کہ کیا تم اس قدر سمجھنے پر بھی خُدا سے ڈرتے نہیں اور اس کے ساتھ اوروں کو شریک عبادت کرتے ہو اور قیامت کے آنے کے منکر ہو ۔

فَذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ وہی تمہارا پروردگار ہے جو آسمان وزمین سے روزی اتارتا اور کان اور آنکھ کا مالک اور مدبرِ عالم اور مُردے سے زندہ اور زندہ سے مُردہ کو نکالتا ہے ۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۔ پس حق کو چھوڑنے کے بعد سوائے گمراہی کے

اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی تم لوگ حق کو چھوڑ کر گمراہی میں پڑتے جاتے ہو۔ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ تو کس طرف حق سے عدول کر کے جاتے ہو۔ اور باوجود دلائل توحید کے کیوں اُن سے منہ موڑتے ہو۔ سمجھو اور راہِ حق اختیار کرو۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ وَھُمْ دٰخِرُوْنَ۔ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّالْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ۔ یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ مِّنْ فَوْقِھِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (نحل)

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ۔ جو لوگ کہ وحدانیت خدا تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں اور اُس کے نبی کو جھٹلاتے ہیں کیا انہوں نے دیکھا نہیں جو خدا تعالیٰ نے سایہ دار چیزیں پیدا کیں۔ یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ۔ جن کے سائے جھکتے ہیں دائیں اور بائیں دراں حالیکہ خدا تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں۔

یعنی کہ جب آفتاب بلند ہوتا ہے تو ہر چیز کا سایہ دائیں طرف پڑتا ہے۔ پھر پیچھے کی طرف آجاتا ہے اور جب غروب آفتاب کا وقت آتا ہے تو بائیں طرف سایہ پڑنے لگتا ہے اور اس گردش و دوران میں سایہ مطیع خداوند تعالیٰ ہے اور مسخر ہے۔ کہ جدھر چاہتا ہے اسی طرف کو پھیرتا ہے اور یہی اطاعت وانقیاد اس کی سجدہ ہے کیوں کہ جس طرح ہر شے کی تسبیح اُس کے مناسب ہوتی ہے کسی کی تسبیح زبانی ہے اور کسی کی تسبیح شانی۔ اُسی طرح سجدہ بھی ہر ایک کا مختلف ہے کسی کا سجدہ سر سے ہے اور کسی کا اُس حالت کے ظہور سے جو اطاعت انقیاد پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ سجدہ دراصل اظہار اطاعت ہی کا نام ہے وَھُمْ دٰخِرُوْنَ اور سب کے سب خدا تعالیٰ کی جناب میں ذلت اور عاجزی کے ساتھ کھڑے ہیں یعنی کہ وہ جناب ایسی ہے جس میں ہر ایک کو اپنی عاجزی ظاہر کئے بغیر چارہ نہیں کیونکہ وہی سلطان السلاطین۔ رب الارباب اور ملک الملوک ہے۔ اور ان کا عاجزی ظاہر کرنا صرف اُن کی حالتوں سے معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اُن میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنا محتاج ہونا کسی خالق اور

مدبر کی طرف نہ بتاتا ہو۔ جس کے بغیر اُن کا وجود و بقا نہیں ہو سکتا۔ وَاللہُ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ ۔ اور خُدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ تمام وہ موجودات جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین پر چلنے والے ہیں۔ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ اور فرشتے تک بھی اُس کو سجدہ کرتے ہیں۔ باوجودکہ اُن کی عظمت بہ نسبت باقی مخلوقات کے بسبب تجرد اور عدم تعلقات جسمانیہ کے زیادہ ہے لیکن اُن کو بھی خدا تعالیٰ کی جناب میں سجدہ کرنے سے چارہ نہیں کیوں کہ وہ بھی اسی کے پیدا کئے ہُوئے اور اسی کے محتاج ہیں۔ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ۔ اور وہ سجدہ کرتے اور خدا تعالیٰ کی عبادت سے تکبّر بھی نہیں کرتے بلکہ نہایت خضوع و خشوع سے اس کی بندگی میں مصروف ہیں! اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ حضرت انسان جو بہمہ وجوہ ذلیل و خوار ہیں۔ گندے نطفے سے بنائے گئے ہیں۔ خون حیض اُن کی غذا ہوا ہے۔ نو مہینے تک ماں کے رحم میں بند رہے ہیں۔ پھر نہایت ذلّت کے ساتھ متولد ہوئے اور خون مستحیل دو سال تک پیتے رہے۔ اُس پر بھی وہ نخوت ہے کہ اللہ اکبر نیچے زمین پر ٹکتے ہی نہیں۔ نہ عبادت سے کام ہے نہ طاعت سے اور فرشتے جو ان تمام باتوں سے مبرا ہیں ان کو کسی قدر زیبا تھا۔ اگر عبادت سے استنکاف و انکار کرتے لیکن وہ ہمہ دم سربسجود و مطیع فرمان الٰہی ہیں۔ افسوس ہے اس انسان خاکی کی حالت پر۔ یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ مِّنْ فَوْقِھِمْ وہ فرشتے خدا سے ڈرتے بھی ہیں جو اُن سے عالی و متعالی ہے یا یہ کہ وہ فرشتے جو اہل زمین سے بدرجہا فوقیت رکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں بخلاف حضرت انسان کے کہ ہر دم مخالفت خدا پر تُلے رہتے ہیں اس آیت میں آدمیوں کو نہایت عمدہ پیرایہ میں خدا تعالیٰ نے نصیحت فرمائی ہے۔ کاش یہ اُسے سمجھیں بھی۔

تَنْزِیْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی ۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ۔ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی ۔ وَاِنْ تَجْھَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّہٗ یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی ۔ اَللہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۔ (طٰہٰ)

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى۔ یہ قرآن اس کا نازل کیا ہُوا ہے جس نے زمین کو پیدا کیا اور بلند آسمانوں کو کسی آدمی کا بنایا ہوا نہیں ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔ وہی بڑا رحم کرنے والا اور عرش پر غالب ہے۔ یعنی اپنے ملک وسلطنت پر۔ اور اگر عرش سے مراد علم ہو تو یہ مطلب ہوگا کہ اُسی کو تمام چیزوں کا علم حاصل ہے۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى اُسی کے ملک اور قبضہ میں ہے اور اسی کا مخلوق ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین پر ہے اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کے اندر ہے خزانوں اور اموال وغیرہ سے۔ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى۔ اے رسولؐ ہمارے اگر تم بلند آواز سے بولو۔ یا پست آواز سے خدا تعالیٰ تو اسے بھی جانتا ہے۔ جو آہستہ کوئی بات کسی سے کہی جائے اور اُسے بھی جسے صرف دل میں لایا جائے مطلب یہ ہے کہ صرف بلند آواز ہی سے بات کرنے کو خدا تعالیٰ نہیں جانتا۔ بلکہ آہستہ سے آہستہ اور مخفی سے مخفی راز کو بھی جانتا ہے۔ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى اللہ کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں ہے اُسی کے لیے اسماءِ حسنیٰ ہیں جو اُس کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں یا یہ کہ جو اچھے معنوں والے ہیں۔ رسولِ خدا سے منقول ہے کہ خدا تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو اُن کو احصا کرے گا جنت میں داخل ہوگا" جن کا ذکر سابق میں آچکا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً۔ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ وَهُوَ

الَّذِیْ اَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ۔ (الحج)

اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ۔ بے شک خدا تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخش دینے والا ہے۔ جب کہ آدمی بعد معصیت کے اس کی طرف رجوع کرے۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ اپنی رحمت کا ذکر فرماتا ہے اور گناہ گاروں کو امید دلاتا ہے کہ اگر وہ معافی چاہیں گے تو اُن کی بخشش ہو سکے گی۔ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَ یُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ۔ اس آیت میں اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے اس امر پہ دلیل پیش کرتا ہے جسے پہلے بیان کیا ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ ہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ یعنی کبھی دن کو گھٹا کر رات کا حصہ طولانی کر دیتا ہے اور کبھی رات کو گھٹا کر دن کا حصہ طولانی کر دیتا ہے۔ وَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ۔ اور بے شک خدا تعالیٰ سمیع و بصیر ہے۔ ایمان والوں کی دعاؤں کو سنتا اور اُن کی حالتوں کو جانتا ہے یا یہ کہ ہر امر کی اُسی کو اطلاع ہے۔ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق والا اور اپنے قول و فعل میں سچا ہے یا یہ کہ وہی صفات تعظیم میں یکتا ہے اور جو کوئی اُن صفات کا اعتقاد رکھتا ہے وہ حق پر ہے۔ وَاِنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ھُوَ الْبَاطِلُ۔ اور یہ کہ جسے یہ کفار اپنا معبود کہتے ہیں باطل ہے کیوں کہ نہ وہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ وَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ۔ اور یہ کہ بے شک خدا تعالیٰ تمام چیزوں سے بالاتر اور بزرگ ہے۔ سب چیزیں اس کے مقابلہ میں حقیر و صغیر ہیں۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ ہی نے بلندی سے مینہ برسایا نہ کسی اور نے جسے کفار اپنا معبود کہتے ہیں۔ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّۃً۔ جس سے زمین سرسبز ہو جاتی ہے اور نباتات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ۔ بے شک خدا تعالیٰ ہی لطیف و خبیر ہے۔ یعنی اپنے افعال میں لطیف ہے۔ یا یہ روزی پہنچانے میں مہربان ہے اور لوگوں کے حالات کی خبر رکھنے والا ہے۔ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ

وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے اور وہی ان میں تصرف کا اختیار رکھتا ہے۔ وَاِنَّ اللّٰہَ لَھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ۔ اور بے شک خدا تعالیٰ ہی نے تم لوگوں کے لئے زمین کی تمام چیزوں کو مسخر کر دیا ہے۔ حیوانات ہوں خواہ نباتات اور خواہ جمادات۔ عناصر ہوں یا مرکبات۔ جن سے تم اپنی غرضیں نہایت آسانی کے ساتھ پوری کر سکتے ہو۔ وَالْفُلْکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِہٖ۔ اور دریا میں کشتی بھی اسی کے حکم سے چلتی ہے اگر وہ پانی کی طاقت روک لے جس سے وہ کشتی کو اٹھائے رہتا ہے یا لکڑی میں زیادہ وزن پیدا کر دے۔ جس سے وہ پانی پر نہ ٹھیر سکے تو کیا کسی میں اتنا اختیار ہے کہ پھر بھی پانی پر کشتی کو چلا سکے۔ وَیُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِہٖ اور آسمان کو بھی زمین پر گرنے سے روکے ہوئے ہے۔ مگر یہ کہ جب وہی چاہے تو پھر ایسا ہو گا کہ آسمان ریزہ ریزہ ہو کر فنا ہو جائیں یا زمین پر پھٹ کے گر پڑے۔ اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ بے شک خدا تعالیٰ آدمیوں پر رافت اور رحم کرنے والا ہے۔ اسی سبب سے وہ باتیں کی ہیں جن سے ان کو آرام پہنچے۔ وَھُوَ الَّذِیْٓ اَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ۔ اسی نے (اے آدمیو) تم کو زندہ کیا جب کہ تم مردہ خاک تھے۔ پھر تمہیں موت دے گا۔ پھر قیامت کے قریب تم کو زندہ کرے گا۔ تاکہ اعمال نیک و بد کی سزا و جزا پاؤ۔ مگر چونکہ انسان خدا تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو کم یاد کرتا ہے بلکہ بسا اوقات بالکل نہیں یاد کرتا اور انکار پر تل جاتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ بے شک آدمی ناشکرا ہے۔ ہماری نعمتوں کی قدر نہیں کرتا بلکہ اصل خالق ہی سے انکار کر بیٹھتا ہے۔

وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ مَا کَانَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔ وَرَبُّکَ یَعْلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوْرُھُمْ وَمَا یُعْلِنُوْنَ۔ وَھُوَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَۃِ وَلَہُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔ (سورہ قصص)

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ - اور تیرا پروردگار اپنے مخلوقات میں سے جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اپنے مخلوق کی تدبیر میں جو بات قرین مصلحت دیکھتا ہے اُسے اختیار کرتا ہے کسی اور کو خلق و اختیار کا اختیار نہیں ہے اور اگر یَخْتَارُ کے معنی انتخاب کے لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ جسے وہ پسند کرتا ہے۔ اُسی کو صیغہ رسالت عطا کرتا ہے۔ رسالت کا عہدہ دینا مخصوص ہے۔ خدا تعالیٰ کے لئے کیونکہ قلوب کی حالت سے وہی واقف ہے اُسی کو خبر ہے کہ کون اس کام کو اچھی طرح پورا کر سکتا ہے۔ اسی سے نائب رسول کے اختیار و انتخاب کا بھی مسئلہ حل ہو جاتا ہے کیونکہ منصب رسالت و امامت کا فرض ایک ہی ہے۔ اور وہ ہدایت خلق اور تبلیغ احکام الٰہیہ ہے پس اگر رسولؐ کا انتخاب خدا کا فرض ہے تو امام کا انتخاب بھی اسی کا فرض ہونا چاہیئے۔ نہ کہ امت کا۔ اسی لحاظ سے شیعہ پارٹی خدا کے منتخب کئے ہوؤں کو امام جانتی ہے۔ کیونکہ یہ امر خدا تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ہے اور سنّی جماعت اپنے منتخب کئے ہوؤں کو پیشوا سمجھتی ہے۔ تاکہ خدائی رائے سے اپنی رائے بڑھی رہے۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَتَعَالٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ پاک ہے اللہ اور برتر ہے مشرکین کے شرک سے یعنی کہ انتخاب رسولؐ یا امام میں جو لوگ خدا کے شرکاء بننا چاہتے ہیں۔ یہ امر حد شرک و کفر تک پہنچا ہوا ہے۔ ہرگز یہ لوگ خدا کے ساتھ اس انتخاب میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اور وہ اس شرکت سے منزہ اور مقدس ہے! اب خدا تعالیٰ اس امر کی دلیل بتاتا ہے۔ جیسے پہلے فرما چکا ہے کہ کسی اور کو انتخاب و اختیار میں دخل نہیں ہے کہ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ - تیرا پروردگار ہی جانتا ہے جو کچھ انسانوں کے سینہ یعنی دلوں میں باتیں مخفی ہیں۔ اور جسے یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر و باطن کا حال اُسی کو معلوم ہے۔ اس لئے اسی کا انتخاب صحیح اور سچا ہو سکتا ہے پھر تاکیداً فرمایا کہ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وہی معبود برحق ہے اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں۔ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ اسی کے واسطے

دنیا و آخرت میں حمد و ثنا ہے۔ لَهُ الْحُكْمُ اور اسی کو فیصلہ کا اختیار ہے۔ وہی صحیح و سقیم۔ خود پرست اور خدا پرست کو پہچان کر حکم لگا سکتا ہے۔ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (اگر تم اس کے کہنے کو نہ مانو گے۔ تو یاد رکھو کہ) اسی کی طرف تمہاری بازگشت ہے۔ یعنی کہ روز قیامت سزا و جزا کا اختیار اُسی کے ہاتھ میں ہے اس دن معلوم ہو جائے گا کہ تم نے کیا کارروائی کی ہے اور حکم کو کیوں نہ مانتے۔

يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ۔ (سورہ عنکبوت)

يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ خدا تعالیٰ ہی مالک عذاب و ثواب ہے۔ جو بدکار بندے ہیں انہیں معذب کرے گا۔ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ اور جو نیکوکار ہیں اُن پر رحم کرے گا۔ (اس آیت میں اگرچہ یہ فرمایا گیا ہے کہ جسے چاہے گا معذب کرے گا۔ اور جس پر چاہے گا رحم کرے گا۔ لیکن چونکہ وہ حکیم ہے اور عادل۔ اسی لئے وہ وہی چاہے گا جو انصاف کا مقتضا ہو۔ اور مقتضائے انصاف وہی ہے جو بیان کیا گیا) وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ اور تم سب لوگ اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ تاکہ بروز قیامت سزا و جزا کے مستحق ہو سکو۔ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ۔ اور تم لوگ ہرگز اس کو زمین میں اور آسمان پر عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ یعنی کہ تم خواہ زمین پر ہو یا آسمان پر میرے قبضۂ اختیار سے نکل جانے کی طاقت نہیں رکھتے ہو۔ اور نہ یہ کہ آسمان پر یا زمین پر رہنے کی حالت میں خدا تعالیٰ تم کو سزا دہی سے عاجز ہو جائے گا۔ بلکہ زندگی دنیا اور زندگی آخرت تمہاری اس کے نزدیک مساوی ہے اور ہر حال میں وہ تم پر غالب اور قادر ہے۔ اس کلام سے مقصود تخویف و تہدید ہے جو مدبر بادشاہوں کا طریقہ اپنی رعایا کے ساتھ ہوتا ہے تاکہ اُن میں سرکشی نہ پیدا ہو جائے۔ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ۔ اور سوائے اللہ کے کوئی تمہارا مدبر و مالک اور مددگار نہیں

ہے۔ لہذا تم کو اپنے بتوں پر بھروسا نہ کرنا چاہیئے وہ ہرگز تمہاری مدد کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ (ولی تو اسے کہتے ہیں جو بنفس خود مدد کرے اور نصیر بھی اس سے عام ہے کہ خود مدد کرے یا کسی دوسرے کو حکم دے کہ وہ کسی کی مدد کرے۔ یہ دونوں صفتیں خدا تعالیٰ میں موجود ہیں۔)

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ وَ یُخَوِّفُوْنَکَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ ھَادٍ وَمَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّضِلٍّ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ۔ (سورہ زمر)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اس امر کو ظاہر فرماتا ہے کہ مصیبت اور سختی کے وقت میں اگر کوئی مدد کرنے والا ہے۔ تو وہ میں ہی ہوں۔ میرے سوا کسی کو یہ اختیار نہیں ہے اور یہ کہ میں ہی بادشاہ غالب و قادر اور سیاست کنندہ ہوں۔ چنانچہ فرماتا ہے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ۔ کیا نہیں ہے اللہ اپنے بندوں کی مدد کرنے والا۔ یعنی کہ ضرور وہ اپنے بندے کی مدد کرنے والا ہے۔ وَ یُخَوِّفُوْنَکَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ۔ اور اے محمدؐ تم کو اُن سے ڈراتے ہیں۔ جو خدا تعالیٰ کے علاوہ معبود بنا لیے گئے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ اے محمدؐ اگر تم بتوں کو برا کہو گے تو یہ ہمارے بت تم کو سخت نقصان پہنچائیں گے۔ (پہلے ہی کیا فائدہ پہنچاتے تھے۔ جو اب نقصان پہنچا سکیں گے) وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ ھَادٍ۔ جسے خدا تعالیٰ نے اس کے کفر اور نافرمانی کی وجہ سے جنت کے رستے سے علیحدہ کر دیا ہے۔ اُسے کوئی راہ بتانے والا نہیں یعنی کہ ہرگز کفار کو جنت کی راہ نہ ملے گی۔ وَمَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّضِلٍّ اور جسے ایمان کی وجہ سے اللہ نے راہ راست دکھلا دی اور جنت کا رستہ بتا دیا ہے۔ اُسے کوئی بھٹکانے والا نہیں ہے۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ۔ کیا یہ کفار اس امر کو جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ قادر و غالب اور کافروں کو سزا دینے والا ہے۔

وَھُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَ یَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ وَیَعْلَمُ

مَا تَفْعَلُوْنَ۔ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ۔ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌ بَصِيْرٌ۔ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ۔ (سورہ حٰمٓ عٓسٓقٓ) هو الذی يقبل التوبة عن عباده۔

وہی (معبود) ایسا ہے جو اپنے بندوں کی توبہ اور رجوع کو قبول کرتا ہے گویا پروردگار عالم اس آیت میں اپنی وسعت رحمت اور انتہائے تفضل کو ارشاد فرماتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اگر گناہ گار بندہ میرا میری طرف رجوع کرے۔ تو میں اس کے رجوع کو قبول کر لیتا ہوں۔ اور اپنے خالص بندوں میں داخل کرتا ہوں۔ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ اور بدیوں کو معاف کرتا ہے۔ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ اور جو کچھ تم کرتے ہو اُسے بھی جانتا ہے اور اس کے مطابق جزا و سزا دے گا۔ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور ایمان والے اور نیکوکار جو کچھ اس سے سوال کرتے ہیں۔ اُسے عطا بھی کرتا ہے یا یہ کہ ان لوگوں کی طاعات و عبادات کو قبول کرتا ہے۔ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔ اور اپنا فضل انہیں زیادہ دیتا ہے۔ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ۔ اور کافروں کے لئے سخت عذاب ہے۔ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ اپنی حکمت اور علم اور کمال معرفت طرق انتظام کو ظاہر فرماتا ہے۔ جس کا محصل یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ وسیع کر دے۔ اپنے بندوں کے لئے روزی کو تو زمین میں فساد و بغاوت پھیلا دیں۔ اور ظلم و غلبہ و نفسانیت و تکبر کرنے لگیں۔ اور طاعت و فرمانبرداری سے نکل جائیں۔ چنانچہ ایسا تجربہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے دنیا میں تھوڑا سا بھی آسودہ حال کر دیا ہے۔ وہ اُن لوگوں کی بہ نسبت جو تنگ حال اور مفلس ہیں بہت مغرور۔ نافرمان اور گناہ گار ہیں پس اگر سب کے ساتھ یہی معاملہ کیا جاتا تو یقیناً یہی امور واقع ہوتے۔ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ لیکن جس قدر چاہتا ہے اسی قدر روزی نازل

فرماتا ہے۔ تاکہ تمدن میں خلل نہ واقع ہو۔ اور ہر شخص اُس حالت میں جس میں خدا تعالیٰ نے اُسے رکھا ہے۔ طاعت الٰہیہ میں مصروف رہے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائے۔ اس مضمون کو ایک حدیث میں رسولؐ سے روایت کیا گیا ہے کہ جبرئیل فرشتے نے بیان کیا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ بیماری ہی اُن کو ٹھیک رکھ سکتی ہے۔ اور اگر اُن کو صحت و تندرستی دے دی جائے۔ تو اُن کی حالت فاسد و خراب ہو جائے۔ یعنی شر و فساد اُن کی ذات سے ہونے لگے۔ اور بعض بندوں میں سے ایسے بھی ہیں کہ اُن کی اصلاح سوائے صحت کے اور کوئی شے نہیں کر سکتی۔ پس اگر میں اُن کو بیمار ڈال دوں۔ تو وہ بیماری ان کو فاسد و تباہ کر دے۔

(مثلاً بیماری کا تحمل نہ کرنے کی وجہ سے کلمات کفر زبان سے کہنے لگیں اور ایمان کے دائرے سے نکل جائیں) اور بعض بندوں میں سے ایسے بھی ہیں کہ ان کو سوائے مفلسی اور فقر کوئی شے ٹھیک نہیں کر سکتی۔ اگر میں اُن کو توانگر کر دوں تو اُن کی توانگری انہیں فاسد و تباہ کر دے۔ لہٰذا میں دلوں کے اندرونی حالات کے مطابق اپنے بندوں کی تدبیر کرتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے اُن کے دل کی خبر ہے۔ (مجمع البیان) اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ۔ اور وہ اپنے بندوں کے حالات جاننے والا اور اُن کے صلاح و فساد کو اچھی طرح معلوم کرنے والا ہے۔

اس کے بعد پروردگار اپنا نہایت کرم اور غایت توجہ اپنے بندوں کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا۔ اور وہی ایسا کریم و رحیم و حکیم خدا ہے جو مینہ برساتا ہے بعد اس کے کہ لوگ اُس کے برسنے سے نا اُمید ہو گئے ہوتے ہیں۔ حالاں کہ مینہ کا رُکا رہنا ضرور کسی نہ کسی مصلحت خفیہ پر مبنی ہو گا۔ لیکن اس حالت میں جب کہ لوگوں کو یاس ہو گیا ہوتا ہے مینہ برسانا زیادہ تر شکر گزاری کی طرف لوگوں کو مائل کرتا ہے۔ وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ اور اپنی رحمت کو پھیلاتا ہے اور اپنی نعمت کو متفرق طور سے منتشر کرتا ہے تاکہ لوگ اس

سے فائدہ اٹھائیں۔ مثلاً نباتات اور پھل زمین کے اطراف میں پیدا کر دیتا ہے تاکہ ہر جگہ کے لوگ بقدر حصص اس سے منتفع ہو سکیں۔ وَهُوَ الْوَلِيُّ اور وہی اپنے بندوں کی تدبیر کا متولی اور مالک ہے۔ الْحَمِيدُ۔ اور قابل حمد و ستائش ہے۔ نہ لنگر پتھر وغیرہ جو بلاوجہ معبود بنائے گئے ہیں۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاءُ الذُّكُوْرَ۔ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَاءُ عَقِيْمًا اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ۔ (سورۃ الشوریٰ)

اس آیت میں خدا تعالیٰ اپنی وسعت ملک اور وسعت قدرت کو ارشاد فرماتا ہے اور ظاہر فرماتا ہے۔ کہ دنیا میں جو فرق مذکر و مونث کا ہے۔ یا ولود اور عقیم کا وہ سب ہماری ہی طرف سے ہے۔ خود ہم نے بمصلحت و حکمت ایسا کیا ہے۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ خدا تعالیٰ ہی کے لئے ہے ملک آسمانوں اور زمین کا۔ اسی کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اُن میں تصرف کرے۔ اس مضمون کو پروردگار عالم نے بہت مقامات پر ارشاد فرمایا ہے۔ اور غرض اس سے صرف تنبیہ ہے اُن کی جو کہتے ہیں کہ عالم کا کوئی خالق نہیں۔ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور جس طرح کی خلقت کا ارادہ فرماتا ہے خواہ نباتی ہو۔ یا حیوانی یا جمادی۔ اس کے بعد بالتخصیص فرماتا ہے کہ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاءُ الذُّكُوْرَ۔ جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے۔ یہ دونوں ہی اس کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور اُسی کے علم و قدرت سے موجود ہوئے ہیں ممکن ہے کہ کسی کے ہاں صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوں اور کسی کے ہاں صرف لڑکے ہی۔ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا یا لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی مرحمت فرماتا ہے۔ یا یہ کہ ایک ہی رحم میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں پیدا کر دیتا ہے۔ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَاءُ عَقِيْمًا اور جسے چاہتا ہے لاولد بانجھ کر دیتا ہے تو اس سے بچے ہی نہیں پیدا ہوتے۔ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ۔ بے شک وہی اپنی مخلوقات کو جاننے والا اور ہر شے پر قدرت رکھنے والا

ہے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى۔ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى۔ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا۔ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى۔ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى۔ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى۔ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى۔ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى۔ (سورہ نجم)

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى۔ اور بے شک تیرے رب کی طرف یعنی ثواب یا عقاب کی طرف انتہا ہے۔ اگر آدمی نیکوکار ہے تو اس کی انتہا ثواب تک ہوگی۔ اگر بدکار ہے تو اس کی انتہا عقاب تک۔ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى۔ اور اسی نے ہنسایا اور اسی نے رولایا۔ یعنی ہنسنے کے اسباب بھی وہی پیدا کرتا ہے اور رونے کے بھی وہی۔ یا یہ کہ اہل جنت کو جنت میں داخل کرکے اور اہل دوزخ کو دوزخ میں پہنچا کر ہنسانے اور رولانے والا وہی ہے۔ آدمیوں کو سمجھ رکھنا چاہیئے کہ ہم کس طرف جارہے ہیں۔ آیا اس طرف جہاں رونے کے سوا اور کچھ نہ بن پڑے گی۔ یا اس طرف جہاں خوشی ہی خوشی ہے) وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا۔ اور بے شک اسی نے مارا اور اسی نے جلایا۔ کیونکہ موت کا اختیار سوائے اس کے کسی کو نہیں ہے اور نہ جلانے کا اختیار۔ بلکہ اس کے اسباب اسی کی طرف سے مخلوق ہیں۔ اور ممکن ہے کہ اس سے مطلب یہ ہو کہ خدا تعالیٰ دنیا میں موت دیتا ہے۔ اور پھر جزا و سزا کے واسطے جلائے گا۔ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى اور بے شک اسی نے مذکر و مونث پیدا کئے ہیں تاکہ آئندہ سلسلہ نسل ان کے ذریعہ سے قائم رہے اگر ایسا نہ ہوتا تو باقاعدہ بقائے نسل نہ رہ سکتا۔ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى۔ (اور کیونکر پیدا کیا؟) نطفہ سے پیدا کیا۔ جب کہ وہ خارج ہوتا ہے مذکر کی صلب سے اور مونث کے رحم تک پہنچتا ہے اور ممکن ہے کہ تمنٰی سے باندازہ معین نطفہ کا رحم میں پہنچنا مراد ہو۔ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى اور بے شک اسی پر لازم ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ لوگوں کو جزا و سزا دہی کے لئے پیدا کرے۔ کیونکہ اس نے

اپنے بندوں کو مکلف کیا ہے اور احکام ان کے متعلق فرمائے ہیں اور ہر ایک کے لئے وعدہ اور وعید بھی ارشاد کر دیا ہے۔ لہذا لازم ہے کہ وہ اپنے ارشاد کو پورا کرے اور نیز یہ کہ اگر دوبارہ زندگی دے کر افعال نیک و بد کا معاوضہ نہ دیا جائے۔ تو تکلیفات شرعیہ کا عبث ہونا لازم آتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی پانچویں اصل یعنی قیامت کے آنے کو ظاہر فرمایا ہے۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ پروردگار عالم نے اپنے بندوں کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا ہے جس میں باقاعدہ عدالت ہو گی اور حق داروں کو ان کے حقوق ملیں گے اور از بسکہ خدا تعالیٰ سے بڑا کوئی بادشاہ نہیں اس لئے اس کی اطاعت اور معصیت سے بڑی کوئی طاعت اور کوئی معصیت نہیں ہو سکتی۔ لہذا اس کا معاوضہ بھی ویسا ہی ہونا چاہیئے جو خود اس کی شان کے موافق اور اس اطاعت یا معصیت کے مطابق ہو۔ اس لئے نہایت عظیم ثواب یا نہایت عظیم عذاب اس کی طاعت یا معصیت کے مقابلہ میں تجویز ہوا ہے اور وہ اسی روز دیا جائے گا جس کا نام روز قیامت ہے۔ پس یا تو جنت کی طرف بازگشت ہو گی یا دوزخ ہو گی۔ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى۔ اور بے شک اسی نے جس کو چاہا غنی کیا اور جس کو چاہا فقیر کیا۔ یعنی کہ جیسی حالت جس کے لئے مناسب جانی وہی حالت اس کے لئے قرار دی۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اقنی کے معنی ارضی کے ہیں۔ یعنی اس نے غنی کر کے اہلِ غنا کو اپنے عطا و بخشش پر راضی کر دیا اور بعضوں کی یہ رائے ہے کہ اقنی کے معنی یہ ہیں کہ اسی نے اصول مال لوگوں کو عطا کئے جسے وہ بعد خرچ سے بچنے کے جمع کر سکیں۔ وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى۔ شعریٰ ایک ستارہ کا نام ہے جس کے نام کے بت کو عرب پوجتے تھے۔ تو پروردگار عالم ایسے لوگوں کو ہدایت فرماتے ہوئے یہ ارشاد کرتا ہے کہ بے شک خدا تعالیٰ شعریٰ کا بھی خالق اور مربی اور پالنے والا ہے۔ پس کب زیبا ہے کہ خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی پرستش کرو۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ هُوَ الْاَوَّلُ

وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۔ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ (سورہ الحدید)

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ تسبیح و تقدیس کی اور پاکی بیان کی اللہ تعالیٰ کی اُن چیزوں نے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین پر۔ خواہ ذی رُوح ہوں یا غیر ذی رُوح۔ جو ذی رُوح اور ذی عقل ہیں وہ تو زبان سے تعریف و تسبیح و تقدیس خدا کی بجالاتے ہیں اور جو غیر ذی روح ہیں اُن کی تسبیح شانی ہے۔ یعنی اُن کا اس حالت میں ہونا کہ جو اُن کے مخلوق ہونے کو بتا رہا ہے۔ اور کمال صنعت و حکمت خدا تعالیٰ کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہی اُن کی تسبیح ہے۔ تسبیح کے واسطے یہی ضروری نہیں ہے کہ زبان سے ادا کی جائے۔ بلکہ تسبیح کے معنی اظہار تنزیہ کے ہیں۔ اور وہ بغیر زبان کے بھی ممکن ہے۔ صرف حالت سے اس کا ثبوت ہو سکتا ہے۔ پس چونکہ تمام موجودات عالم جو ممکن الوجود ہیں۔ اُن میں ہزاروں ہی قسم کی حکمتیں اور منافع و اغراض ودیعت کئے گئے ہیں اس لئے وہ اپنی زبان بے زبانی سے صاف کہہ رہے ہیں کہ ہمارا خالق بڑا صانع بڑا حکیم اور بڑا قادر ہے اس کی مانند کوئی نہیں اور وہی ہر شئے پر قادر ہے کوئی اس کا شریک و مثل نہیں اسی کا نام تسبیح ہے۔ بلکہ یہ تسبیح زبانی تسبیح سے زیادہ باوقعت اور قابلِ توجہ ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ اور وہی غالب قادر اپنے افعال کو احکام و اتقان سے کرنے والا ہے اور تدبیر کی تمام اچھی راہیں جاننے والا ہے لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ زمین اور سب آسمان اسی کی ملک میں ہیں اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے وہ اسی کی مملوک اور اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

يُحۡيِي وَيُمِيتُ۔ زندہ کرتا ہے اور مار ڈالتا ہے۔ یعنی معدوم سے موجود کرنا۔ اور موجود سے معدوم کرنا اسی کا فعل ہے جس پر کسی دوسرے کو ہرگز قدرت نہیں ہے اور جو کچھ بادشاہ نے حضرت ابراہیم سے کہا تھا۔ اَنَا اُحۡيِي وَاُمِيتُ۔ وہ ظاہری فریب تھا وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيۡرٌ۔ اور وہی ہر شے پر قدرت رکھنے والا جسے چاہے جلائے اور جسے چاہے فنا کرے۔ جسے چاہے قوت دے اور جس سے چاہے قوت سلب کر لے۔ هُوَ الۡاَوَّلُ وہی سب سے وجود میں سابق ہے۔ اس سے سابق کوئی نہیں اور نہ اُس کی خاص ابتدا ہے۔ وَالۡاٰخِرُ۔ اور وہی غالب ہے ہر شے پر اور سب چیزیں اس سے پست ہیں۔ وَالۡبَاطِنُ۔ اور وہی ہر شے کا علم رکھنے والا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی عالم نہیں یا یہ کہ ظاہر سے مراد یہ ہے کہ اُس کی ہستی بسبب دلائل و شواہد کے تو ظاہر ہے مگر اس کی کنہ حقیقت سب سے مخفی ہے کسی کو اس پر اطلاع ممکن نہیں۔ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ عَلِيۡمٌ اور وہی تمام چیزوں کا علم رکھتا ہے۔ هُوَ الَّذِيۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِيۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ۔ اسی نے چھ دن میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ تاکہ اس تدریج سے فرشتوں پر اُس کی حکمت و صنعت کا راز کھلتا جائے اور ان کو اور زیادہ یقین حاصل ہو۔ ورنہ وہ تو ایک دم میں بھی پیدا کر دینے پر قادر تھا۔ کیوں کہ۔ اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ۔ ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ۔ پھر اس نے عرش کو پیدا کیا یا یہ کہ ملک پر اپنا غلبہ و قدرت ظاہر فرمایا یا یہ کہ ہر شے کے علم پر اپنا غالب ہونا ظاہر کیا۔ اور بظاہر یہ مطلب اقرب ہو کیوں کہ اس کے بعد فرمایا ہے۔ يَعۡلَمُ مَا يَلِجُ فِى الۡاَرۡضِ وَمَا يَخۡرُجُ مِنۡهَا۔ وہ جانتا ہے جو زمین کے اندر پوشیدہ ہے اور جو زمین سے پیدا ہوتی ہے۔ مثل نباتات وغیرہ کے۔ وَمَا يَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعۡرُجُ فِيۡهَا۔ اور اُسے بھی جانتا ہے جو بلندی سے مینہ برساتا ہے اس کے تمام قطرے اس کے شمار میں ہیں اور جو فرشتے یا اعمال خیر بندوں کے وہاں تک جاتے ہیں اُس کی بھی خبر رکھتا ہے۔ وَهُوَ

مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو تمہارا کوئی فعل اس سے مخفی نہیں ہے اس معیت سے مراد جسمی معیت نہیں ہے بلکہ علمی معیت مراد ہے۔ کیوں کہ وہ جسم و جسمانیات سے منزہ ہے۔ جیسا کہ سابق میں معلوم ہو چکا ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کی اسے خبر ہے۔ خواہ ظاہر بظاہر کرو یا پوشیدہ۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۔ آسمان و زمین سب اسی کا ملک ہے اور تمام امور کی رجوع اسی کی طرف ہوتی ہے کیوں کہ بواسطہ یا بلاواسطہ سب کا مالک خالق وہی ہے یا یہ کہ قیامت کے دن سب کی رجوع اسی کی طرف ہوگی۔ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ۔ وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اس کی تفسیر بیان ہو چکی۔ وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ اور وہی دلوں کی باتوں کا عالم ہے خواہ ارادے ہوں۔ یا اعتقادات۔ ہرگز کوئی شخص اپنا راز اس سے مخفی نہیں رکھ سکتا۔

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (سورہ منافقون)

اور اللہ ہی کے لئے ہیں آسمانوں اور زمین کے خزانے ..... یعنی خزانہ ہائے آسمان و زمین از قسم رزق و مال و دفائن سب اسی کے مملوک ہیں جسے چاہے اس کے ذریعے سے غنی کرے لیکن اس کے تمام کام بحسب مصلحت ہوا کرتے ہیں اسی وجہ سے کبھی کسی کو فقر میں مبتلا کرتا ہے اور صبر سے ان سے عبادت لیتا ہے۔ تاکہ کامل ثواب پانے کے مستحق ہو سکیں اور اس تکلیف اٹھانے کی وجہ سے رحمت خدا سے قریب ہوں۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (تغابن)

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ اگر تم خدا تعالیٰ کو قرض حسن دو۔ واضح ہو کہ خدا تعالیٰ نے نہایت تلطف و غایت عنایت کی وجہ سے فقراء و مساکین کو

۲۱۲

کچھ دینے یا کسی صاحب کے تئیں بلا سود قرض دینے کا نام قرض حسن رکھا ہے اور اس کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ گویا کسی ضرورت والے کو قرض دینا خدا کو قرض دینا ہے اور اس ارشاد سے غرض فقط رغبت دلانی ہے ہمدردی پر جو تعلیم کے موقع میں نہایت ہی مناسب طریقہ ہے۔ اور از بس کہ اس عطیہ کا ثواب خود اس نے اپنے ذمہ پر رکھا ہے اس بخشش کا قرض دار بھی اپنے تئیں ظاہر فرمایا ہے تاکہ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ ہرگز ہمارا عمل ضائع نہ ہوگا۔ بلکہ یقیناً اس کا بدلہ ملے گا۔ چنانچہ خود ہی فرماتا ہے یُضٰعِفْهُ لَكُمْ تو تم کو اس کے بدلہ میں دُگنا دے گا بلکہ ضعف کی چونکہ کوئی حد نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ ایک کے عوض میں سات سو اور چودہ سو مل جائے۔ چنانچہ خود ہی فرماتا ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ وَيَغْفِرْ لَكُمْ۔ اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ اور اللہ تعالیٰ شکر کا قبول کرنے والا اور اس کا بدلہ دینے والا ہے حَلِيْمٌ بردبار ہے اپنے غایت کرم سے عذاب کرنے میں تعجیل نہیں کرتا۔ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ غائب و حاضر، پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ اور وہی قادر و غالب اور اپنے افعال کو نہایت احکام و اتقان کے ساتھ کرنے والا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔ (طلاق)

اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ بے شک خدا تعالیٰ جس کام کا ارادہ کرے۔ اس تک پہنچ سکتا ہے۔ اور اُسے کوئی اس کے ارادہ سے روک نہیں سکتا۔ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔ ہر شے کے واسطے اس نے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ جس کے مطابق وہ شے عالم میں ہوتی رہتی ہے۔ نہ اُس سے زیادہ ہو سکتی ہے اور نہ اس اندازہ سے کم یا یہ کہ ہر شے کی اس نے ایک مقدار بیان کر دی ہے کہ فلاں شے مباح ہے یا واجب ہے۔ فلاں شے قابلِ خوف ہے یا قابلِ رغبت ہے۔ یا یہ کہ ہر سختی اور آسانی کی ایک مقدار مقرر کر دی ہے کہ فلاں وقت تک ایک شخص باآرام زندگی بسر کر سکے گا۔ اور

فلاں وقت بہ تکلیف تاکہ شدت کی وجہ سے نخوت و تکبر میں نہ مبتلا ہو جائے۔ اور نہ کثرت تکلیف سے رحمت خدا سے نا امید ہو جائے۔ بلکہ دونوں حالتیں طاری ہوتی رہیں۔ تاکہ نہ تو نظام عالم میں فرق آئے اور نہ غرض خلقت فوت ہو۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۙ

(سورہ ملک)

تَبٰرَكَ بزرگ و برتر ہے۔ اُن تمام چیزوں سے جو اس کی ذات کے لئے شایاں نہیں ہیں۔ مثل صفات سلبیہ اور نقص و عیب کے۔ یا یہ کہ دائمی ازلی و ابدی ہے یا یہ کہ تمام برکتیں اسی کی طرف سے ہیں۔ اَلَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ۔ وہ (معبود حقیقی) جس کے قبضہ میں ملک ہے۔ ..... جسے پورا اختیار سیاست و تدبیر کا ہے۔ اُسی کو اختیار ہے کہ جسے چاہے ملک دے اور اسی کو اختیار ہے کہ جس سے چاہے ملک کو چھین لے۔ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ اور وہی ہر شے پر انعام و انتقام سے قادر ہے یا یہ کہ ہر وہ شے جس سے قدرت متعلق ہو سکتی ہے اس پر قادر ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ۔ ایسا ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کر دیا لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ تاکہ تم سے وہ معاملہ کرے جو کوئی ممتحن کرتا ہے اور تم پر اپنے اوامر و نواہی کو وارد کرے۔ جس کی مخالفت یا موافقت سے تم سزا یا جزا کے مستحق ہو سکو۔ اور معلوم ہو کہ تم سے کون نیکو کار ہے۔ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ۔ اور وہ غالب ہے اس پر جو اس کی مخالفت کرے اور بخش دینے والا ہے اُسے جو اس کے فضل کا ارادہ کر کے عمل خیر بجالائے۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ ؕ اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَیُعِیْدُ ۚ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۙ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ ۙ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ؕ (سورہ بروج)

ان آیتوں میں خدا تعالیٰ اپنی صفات کو بیان فرماتا ہے کہ وہ صاحب غضب بھی ہے۔ جس سے گناہ گاروں پر عذاب کرے گا۔ وہی خالق بھی اور وہی مرنے کے بعد

دوبارہ اپنی مخلوقات کو میدانِ حساب میں لانے والا بھی۔ وہ معاف کرنے والا بھی ہے اور اپنے بندوں پر مہربان بھی وہی مالک عرش بھی ہے اور صاحب مجد و بزرگی بھی۔ اور اسی کے ہاتھ میں کامل قدرت ہے۔ جس سے اُسے اختیار ہے کہ جو چاہے کرلے اس کو کوئی شے عاجز کرنے والی نہیں۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ۔ اے ہمارے رسول تمہارے پروردگار کا بطش۔ یعنی مواخذہ بالعذاب بہت سخت ہے جب کہ وہ ظالموں اور جباروں کو ان کے اعمال بد کے عوض میں سزا دے گا۔ تو کوئی بھی اُن کو اس سے نہ بچا سکے گا۔ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ۔ بے شک وہی اولاً پیدا بھی کرتا ہے اور وہی آخر میں واپس بھی لائے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ جو لوگ مرچکے۔ وہ مواخذہ الٰہیہ سے چھوٹ گئے بلکہ جب وہ وقت آئے گا۔ جس میں نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دی جائے۔ تو بے شک اپنی مخلوق کو وہ پھر زندہ فرمائے گا۔ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ۔ مگر یہی نہیں کہ اس کا غضب اور بطش ہی بہت سخت ہے بلکہ وہ غفور یعنی بڑا مغفرت کرنے اور معافی دینے والا ہے۔ پھر اُس کے ساتھ اپنے بندوں سے محبت بھی رکھتا ہے۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے خوف و رجا دونوں حالتوں کی طرف ہدایت فرمادی ہے یعنی کہ جیسا کہ تم کو اس کے عذاب سے ڈرنا چاہیئے۔ اُسی طرح اس کی رحمت کا اُمیدوار رہنا لازم ہے کہ اس سے خوف بھی رکھیں اور اُمید بھی۔ نہ اس قدر ڈریں جیسے کوئی کسی ظالم بادشاہ سے ڈرتا ہے اور نہ اس کی رحمت پر بھروسہ کرلیں کہ گناہوں کے کر گذرنے میں کوئی باک ہی نہ ہو۔ بلکہ دونوں حالتوں میں مساوات رکھنا ضروری ہے۔ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ۔ وہ عرش کا مالک اور صاحب مجد و بزرگی ہے۔ عرش سے مراد یا تو اُس کا علم ہے جیسا کہ سابق میں بیان ہوا یا فلک الافلاک ہے جو تمام آسمانوں کو محیط ہے۔ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے اُسے کوئی شے روک نہیں سکتی اور نہ اُسے ممکن الوجود اور ممکن الحصول کاموں میں عجز ہے بلکہ وہی اقدالقادرین ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى۔ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى۔ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى۔

وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی۔ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی۔ (سورہ اعلیٰ)

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی۔ اے ہمارے رسولؐ (مگر یہ کہ مراد تمام اُمت ہے۔ بطور کنایہ کے۔ یاد کرو اِیَّاکَ اَعْنِیْ فَاسْمَعِیْ یَاجَارَہ کو) کہو سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی یعنی پاک ہے میرا پروردگار بلند مرتبے والا۔ یا یہ کہ اے رسولؐ ہمارے پاکی بیان کرو اپنے رب کی تمام ان چیزوں سے جو اس کی شان کے موافق نہیں ہیں۔ مثلاً اس کا جسم ہونا۔ اس کا کسی جہت میں قائم ہونا اس کے لئے مکان کا ہونا اس کا محل حوادث ہونا۔ اس کے لئے کسی کا شریک ہونا۔ اس کا ظالم ہونا وغیرہ کہ ان سب اوصاف سلبیہ سے اس کی تنزیہ اور پاکی بیان کرو۔ اگرچہ اس آیت میں لفظ اسم کہا گیا ہے مگر مراد خود ذات اور مسمّٰی ہے۔ جیسا کہ لبید کہتا ہے ؎

الی الحول ثم اسم السلام علیکما

کیونکہ اس مصرع میں اسم سلام نہیں مراد ہے بلکہ دونوں مخاطبوں پر سلام کرنا مقصود ہے اور اَعْلٰی سے مراد یہ ہے کہ اس سے بڑا کوئی قادر نہیں ہے۔ وہی سب سے اعلیٰ بلند مرتبہ و بلند قدرت ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی۔ جس نے مخلوقات کو پیدا کیا۔ اور ان میں احکام کا معاملہ یکساں قرار دیا۔ یا یہ کہ مخلوقات کو پیدا کیا۔ تمام اُن کی ضروریات بقائے نوع اور لوازم بقائے شخص کو پورا کر دیا۔ مثلاً قوت قدرت۔ سمجھ۔ ادراک اور ہاتھ پاؤں آنکھ کان ناک وغیرہ۔ یا یہ کہ سوّی سے مراد معتدل القامہ ہو۔ اور خلق سے مراد صرف انسان کی خلقت ہو۔ یعنی کہ انسان کو پیدا کر کے اُسے معتدل القامہ بنایا نہ مثل اور حیوانات کے اوندھا ہُوا۔ لیکن یہ مطلب کسی قدر کمزور معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ تخصیص بلا ضرورت۔ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی۔ اور جس نے اپنی مخلوقات کو باندازہ معیّن خلق فرمایا خاص خاص اندازے سے اُن کی صورتیں، شکلیں، قدو قامت اور دیگر اسباب معیشت و رزق پیدا کئے اس کے بعد اُن کو اپنے دین کی طرف ہدایت کی اور وہ یہ کہ اُسی ایک کو یہ لوگ اپنا خالق مالک اور معبود سمجھیں۔ یا یہ کہ قَدَّرَ سے مراد یہ ہو کہ اس نے

21
NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11,
... Heights
...
... Road

اپنی تمام مخلوقات کے واسطے رزق باندازہ معین خلق فرمایا۔ پھر اُن کو ہدایت کی ان طریقوں کی طرف جن سے وہ اپنے رزق کو حاصل کر سکیں۔ مثلاً انسان کے بچہ کو اپنی ماں کے پستانوں کی طرف پیدا ہوتے میل کرنے کی ہدایت کی اور طیور کے بچوں کو اپنے ماں باپ سے باطرز تمام مانگنے کی ہدایت کی اور بعد بڑے ہونے سب کو وہ راہیں قدرتاً بتا دیں جن سے انہیں روزی مل سکتی ہے یا یہ کہ قَدَّرَ سے مراد یہ ہو کہ نو مہینے تک انسانی بچوں کو رکھا اور اُسے باہر آنے کی ہدایت کی۔ وَ الَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی۔ اور جس نے زمین سے گھاس اگائی۔ تاکہ حیوانات اپنی غذا اس سے بنا سکیں۔ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی۔ پھر اسے دو حالتوں پر تقسیم کر دیا کسی کو تو سبز اور تر رکھا اور کسی کو خشک جو باختلاف فصول حیوانات کے لئے غذا دہی میں مدد پہنچا سکیں۔ فسبحان اللّٰہ وبحمدہٖ۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ (سورہ الناس)

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ کہہ دو اے ہمارے حبیبؐ کہ وسواس خنّاس کے شر سے میں پناہ مانگتا ہوں۔ انسانوں کے پروردگار سے۔ مَلِكِ النَّاسِ جو انسانوں کا مدبّر و سردار اور ان پر قادر ہے۔ اِلٰهِ النَّاسِ جو انسانوں کا معبود ہے۔ ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ہم خدائے عزوجل کو رب یعنی پالنے والا پیدا کرنے والا جانیں۔ اور یہ کہ اُسی کو مدبّر و سید و قادر سمجھیں اور یہ کہ اسی کو معبود حقیقی یقین کریں۔ نہ کسی دوسرے کو۔ ان آیتوں میں لفظ ناس کے ساتھ جو بمعنی انسان ہے۔ تین صفتیں خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہیں جو اس امر کی مقتضی ہیں کہ ناس کی تین حالتیں مراد ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ انسان کے لئے تین حالتیں خلقت سے آخر عمر تک طاری ہوتی ہیں۔ ایک زمانہ جنین رہنے کا جب کہ انسان ماں کے رحم میں رہتا ہے اور جو نہایت کمزور اور بے اختیاری کا زمانہ ہے۔ جس میں بچہ خود اپنے لئے کوئی تدبیر آپ نہیں کر سکتا اور نہ ماں باپ ہی کو امکان ہے کہ اس وقت بچہ کی کچھ مدد کر سکیں کیوں کہ وہاں تک دسترس

نہیں۔ پھر بھی بچہ نہایت تیزی کے ساتھ نشوونما کرتا ہے۔ اور اس کے تمام اسباب زندگانی اور اسباب آسائش مہیا ہوتے ہیں۔ اُس کی حفاظت خود بخود ہوتی رہتی ہے۔ دوسری حالت طفولیت کی ہے۔ جس میں کسی قدر تو وہ خود بھی احساس و حرکت کر سکتا ہے لیکن پھر بھی اُسے بہت کچھ اصلاح و تدبیر کی ضرورت ہے جو کسی اور شخص کے متعلق ہونی چاہیئے۔ تیسری حالت عقل و شعور کے زمانے کی ہے۔ جو بلوغ سے آخر عمر تک ہے۔ جس میں آدمی آزادی سے اپنی ضروریات آپ مہیا کر سکتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ صفات کا اختلاف انہیں حالتوں کے اختلاف کے لحاظ سے ہے۔ جیسا کہ جامع العلوم نے بیان کیا ہے۔ پہلی حالت کے لحاظ سے فرمایا۔ رَبِّ النَّاسِ کیوں کہ اس وقت صرف خلق و تربیت کی ضرورت ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ اس حالت میں سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی مربی نہیں۔ کیوں کہ اس وقت ماں باپ اس کے کچھ نہیں کر سکتے اور دوسری حالت کے لحاظ سے فرمایا مَلِكِ النَّاسِ کیوں کہ آدمی کو اس حالت میں اصلاح و تدبیر کی بہت ضرورت ہے۔ جس کے لئے خدا تعالیٰ نے اس کے ماں باپ کے دل میں اس کی محبت ڈالی تاکہ وہ اُس کی پرداخت کر سکیں۔ وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ حَفِيْظٌ۔ اور تیسری حالت کے لحاظ سے فرمایا اِلٰهِ النَّاسِ کیوں کہ اس حالت میں آکر آدمی اپنے کاموں کو خود پورا کر سکتا ہے۔ اس وقت عقل و شعور کا بھی بہت کچھ حصہ اُس کو مل چکتا ہے اور نیک و بد کی تمیز کے واسطے کسی باقاعدہ معلّم کی ضرورت نہیں رہتی۔ سوائے یاددہانی اور معمولی نگرانی کے۔ لہذا یہ وقت ہے جس میں اس کی طرف باقاعدہ تکلیفات الٰہیہ یعنی عبادات متوجہ ہو سکیں اور وُہ خدا تعالیٰ کو الٰہ حق یعنی معبود حقیقی سمجھ کر اس کی طاعت میں سر تعظیم جھکائے۔

اور ممکن ہے اختلاف اوصاف اس لئے کیا گیا ہو کہ بہت سے آدمی اس وقت اس قسم کے بھی گذرے ہیں جو اپنے تئیں خدا کہتے تھے اور بہت سے ایسے بھی جو اپنے مخلوق خدا ہونے سے انکار کرتے تھے۔ بلکہ آپ سے آپ پیدا ہُوا اپنے

Managed by ... Trust
Shop No ...
Soldier Bazar ... Pakistan

تئیں جانتے تھے۔ نہیں! بلکہ اب بھی ایسے خبطی بہت سے موجود ہیں تو اُن کے جتانے کے واسطے ضرورت تھی۔ کہ انہیں بتایا جائے کہ تم بھی مربوب ہو۔ اور تمہارا رب کوئی اور ہے جو نہایت ہی عظیم الشان اور قادر و خالق اور مربّی ہے۔ پھر چوں کہ آدمیوں میں بادشاہ و مدبر ملک و سلطنت بھی ہوتے ہیں جو بسبب اپنے اقتدار و جاہ و جلال کے انتہا درجہ کے متکبر و مغرور ہو جاتے ہیں۔ اُن کو بھی جتانے کی ضرورت تھی کہ تم سے بھی بڑا کوئی اور ہے جو تمہارا بھی مدبّر و مصلح ہے لہٰذا فرمایا مَلِكِ النَّاسِ پھر چوں کہ یہ آدمی باوجود عقل و تمیز رکھنے کے بے عقل و ادراک چیزوں کی بھی عبادت کرتے ہیں۔ جو ان کو کچھ فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ لہٰذا انہیں اس امر کی غلطی بھی بتا دینی ضروری ہوئی۔ تو فرمایا کہ اِلٰهِ النَّاسِ یعنی کہ تمہارے معبود حقیقی یہ سنگ و خشت و ہیاکل مصنوعہ نہیں ہیں۔ بلکہ مستحق عبادت وہ ہے۔ جس نے تمہیں پالا اور جس نے تمہاری اصلاح و تدبیر کی۔ اس اخیر کے میرے فقرے نے اس آیت کا ایک اور لطیف مطلب ظاہر کر دیا۔ جو اہلِ تمیز پر مخفی نہیں رہ سکتا۔ اور وہ وجہ ترتیب صفت ربوبیہ و ملکیہ و الٰہیۃ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب وھو الھادی والیہ المعاد۔

تمام شد

الحمد للہ والمنۃ کہ بتاریخ ۱۲ر جمادی الثانیہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۲۵ر جولائی ۱۹۰۷ء اس کتاب کے مسودہ سے فراغ حاصل ہوا تقریباً تین ماہ میں اس کا مسودہ تیار ہوا خدا تعالیٰ اسے مقبول فرمائے اور مفید خلائق ثابت کرے وھو المجیب القریب۔

عبدہٗ محمد ہارون عفی عنہ